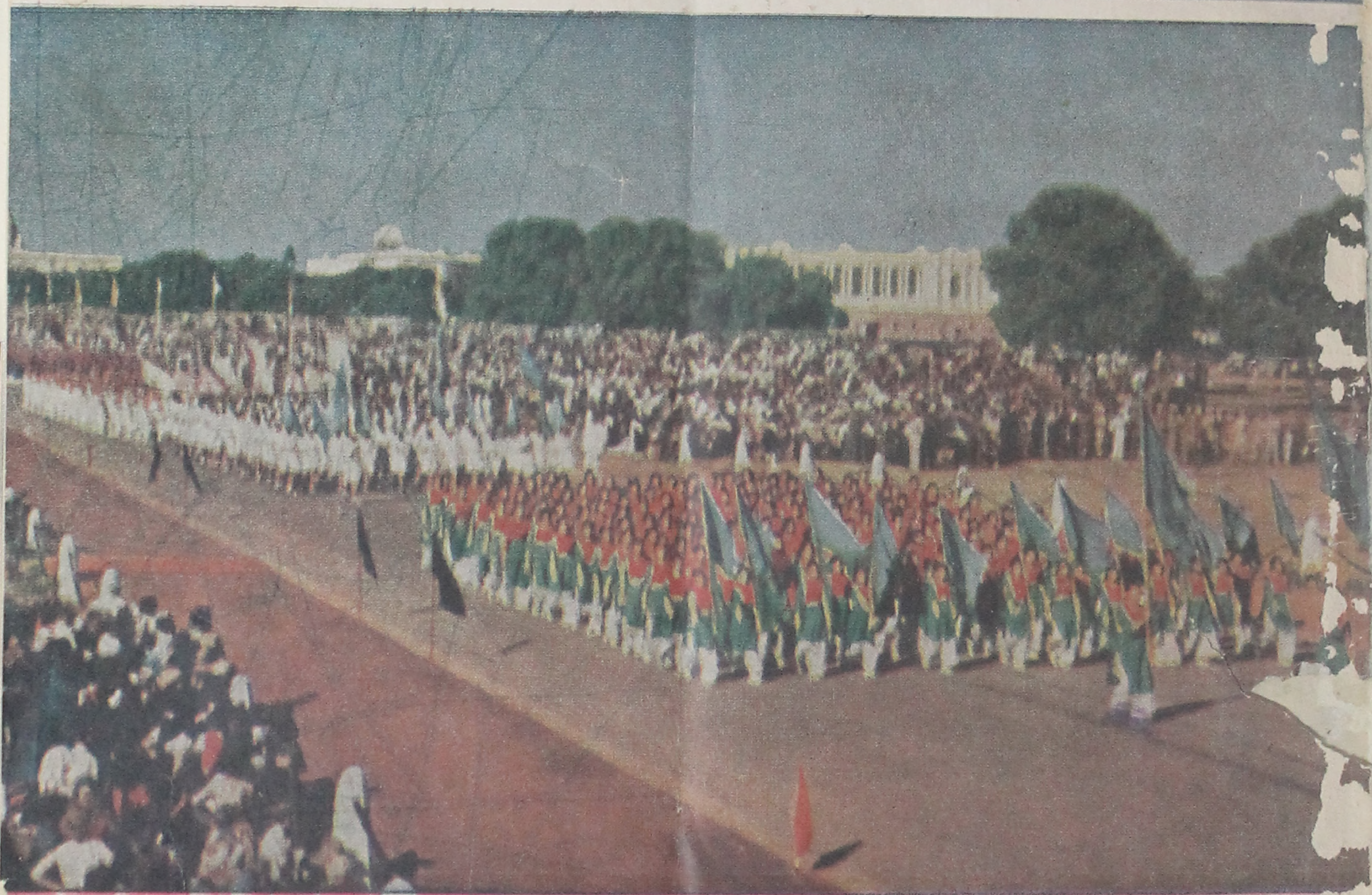
آجکل



پوس شک سمت ۱۸۸۱
جنوری سنہ ۱۹۶۰ء
۵۰ نئے پیسے

اردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ترتیب

سرورق:- دلّی میں یوم جمہوریہ کی پریڈ کا ایک منظر
رسالے کی پشت پر:- ایک کشمیری لوک کلاکار

پوس شک سمہ ۱۸۸۱

جنوری سنہ ۱۹۶۰ء

جلد ۱۸ - نمبر ۶

سالانہ چندہ:- ہندوستان میں - چھ روپے
پاکستان میں - چھ روپے (پاک)
غیر ممالک سے:- نو شلنگ یا سوا ڈالر

فی پرچہ:- ہندوستان میں ۵۰ نئے پیسے
پاکستان میں آٹھ آنے (پاک)

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومت ہند

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر آج کل' اردو اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

مُلاحظات

ہم ہر سال ۱۴- نومبر کو "بچوں کا دن" مناتے ہیں - یہ دن ایک قومی تقریب کی حیثیت رکھتا ہے - اسی دن ہمارے وزیر اعظم پنڈت نہرو کی سالگرہ بھی ہوتی ہے جنھیں بچے بہت پیارے ہیں اور ان کی فلاح و بہبود کو وہ بڑی اہمیت دیتے ہیں - آج کے بچے کل کے شہری ہیں اور ان کی تعلیم و تربیت پر مستقبل کا دارومدار ہے، اس لئے بچوں کی صحیح پرورش اور ان کی ترقی کی ذمہ داری پوری قوم پر ہے اسی سے عہدہ برا ہو کر ہی ہم سرخرو ہو سکتے ہیں - جیسا کہ راشٹرپتی نے اپنے پیغام میں کہا "بچے ملک کی دولت ہیں" ان کے رہن سہن، تعلیم اور پرورش کے معیار کو اونچا کرنے کے لئے ہمیں بھرپور کوشش کرنی چاہیئے - دوسرے تعمیری کاموں کی طرح بچوں کی فلاح و بہبود کے مسئلے کو بھی ہم ایک ملک گیر تحریک کے ذریعہ اور سماجی کارکنوں اور خود بچوں میں جوش و خروش کا جذبہ پیدا کر کے ہی حل کرنے کی توقع کر سکتے ہیں -

ہندوستانی سرحد پر چین کی اشتعال انگیز جارحانہ کارروائیوں کے باوجود ہندوستان نے جس صبر و سکون سے کام لیا ہے - وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ہندوستان اپنی میانہ روی اور پُرامن بقائے باہمی کی پالیسی پر مضبوطی سے قائم ہے اور تنازعات کو گفت و شنید کے ذریعہ طے کرنا چاہتا ہے - کیونکہ اس کے نزدیک یہی راستہ امن و سلامتی کا راستہ ہے - سرحد سے متعلق پنڈت نہرو کی جوابی تجاویز بھی اسی امر کی دلالت کرتی ہیں - اس کو ہندوستان کی کمزوری پر محمول نہیں کیا جا سکتا - اگر اس مصالحانہ رویے کے باوجود بات بگڑی تو ملک صورت حال کا ہر طرح سے مقابلہ کرے گا - چنانچہ لوک سبھا میں وزیر اعظم پنڈت نہرو نے صاف صاف کہہ دیا کہ ہندوستان اپنی حدود میں کوئی مزید مداخلت برداشت نہیں کرے گا - ہندوستان اور چین کا تنازعہ بہت ہی اہم مسئلہ ہے جس کا تعلق ہندوستان اور ایشیا کے حال و مستقبل دونوں سے ہے - اگر بدقسمتی سے جنگ لڑنی پڑی تو پھر بلاشبہ ہم اچھی طرح لڑیں گے اور اس کے لئے وہ سب کچھ کریں گے جس کی ضرورت ہوگی، منصوبہ بندی وغیرہ اور تمام اسکیموں کو حالات کے مطابق تبدیل کرنا ہوگا کیونکہ یہ معاملہ ہماری زندگی اور موت کا ہے - پھر بھی حکومت کی یہی کوشش ہوگی کہ پُرامن تصفیہ ہو جائے - بلاشبہ تاریخ کے اس نازک دور میں ایشیا کے ان دو عظیم ملکوں کا باہمی اتحاد و اتفاق نہ صرف ایشیا بلکہ دنیا کی امن و سلامتی کے لئے بڑا ضروری ہے -

۴- دسمبر کو دلی میں جمعیتہ العلماء ہند کے صدر سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید نے ۷۲ سال کی عمر میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا - ان کی اچانک وفات کو علمی، دینی اور سیاسی حلقوں میں سخت سانحہ قرار دیا گیا ہے - مرحوم آزادیٔ وطن کی جدوجہد میں ہمیشہ پیش پیش رہے اور قید و بند کے مصائب برداشت کئے - مرحوم گوناگوں خصوصیات کے حامل تھے - فصاحت و بلاغت اور خطابت میں یگانۂ روزگار تھے اسی لئے سحبان الہند کہلاتے تھے -

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

ساہتیہ اکادمی کی طرف سے اردو کے نامور ادیب پروفیسر مسعود حسن رضوی کو ان کی تصنیف 'اردو ڈراما اور اسٹیج' پر پانچ ہزار روپے کے انعام کا اعلان کیا گیا ہے اس کتاب کو ۱۹۵۷-۵۸ء کی بہترین اردو تصنیف قرار دیا گیا ہے - ادارہ 'آج کل' موصوف کو اس اعزاز پر ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہے -

نومبر ۱۹۵۹ء کے شمارے میں بلونت سنگھ کی کہانی 'صابن کی ٹکیہ' شائع ہوئی تھی - اس کے متعلق بعض حضرات نے لکھا ہے کہ یہ ایچ ایچ منرو ساکی کی کہانی ڈسک (DUSK) کا اردو روپ ہے - مصنف نے پہلے ہی ہمیں لکھا تھا کہ اس کہانی میں ایک پرانی مغربی کہانی کا ہلکا سا پرتو ہے - ہمیں افسوس ہے کہ کہانی کے ساتھ یہ حوالہ نہیں دیا جا سکا -

عبدالسلام خاں

اشک رام پوری

اشک رام پوری جو رام پور میں اچھن صاحب کے نام سے جانے پہچانے جاتے تھے بڑی رنگارنگ شخصیت تھے۔ سادگی وپُرکاری بے خودی ہشیاری کا اگر جسمانی پیکر میرے دیکھنے میں آیا تو وہ اچھن صاحب تھے۔ وہ میرے لئے کوئی اجنبی نہیں تھے۔ میرے بزرگ تھے، میرے اُستاد تھے، میرا اُن کے ساتھ دن رات کا اُٹھنا بیٹھنا تھا اور بات تو یہ ہے کہ انھوں نے بھی کبھی ایسے جذبے کا اظہار نہیں کیا جس سے ان کی شانِ بے نیازی پر اور روایتی بے تکلفی پر حرف آتا ہو۔ اب جو سُنتا ہے کہ کینسر کا شکار ہوئے اور منہ موڑ گئے تو —— جی نہیں مانتا۔ وہ بے نیاز تھے لیکن اس بے نیازی میں جو خلوص تھا جو محبّت کا اظہار تھا وہ اس خبر پر یقین نہیں کرنے دیتا۔ مجھے تو برابر یہ محسوس ہوتا ہے اور یہ ہیں بھی کل کی باتیں کہ ان کے دوستوں میں سے (اور شاید سب ہی ان کے دوست تھے) کوئی پہنچا ہے اور یہ اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ خوش آمدید کے لئے کھڑے ہو گئے ہیں بیٹھے بیٹھے کہہ رہے ہیں...... یوسف آئے ہیں ان کے لئے چائے لاؤ اور ہاں پانوں کے لئے بھی کہہ دو ..... رام پور کے آزادی پسند بزرگوں، دوستوں اور چھوٹوں کا ان کے مکان پر اجتماع ہے، رام پور کے سیاسی، اقتصادی اور تعلیمی مسائل زیرِ بحث ہیں۔ کیا ہونا چاہیئے؟ کیا کرنا چاہیئے؟ لوگ سر جوڑے غور کر رہے ہیں کہ اچھن صاحب کے کسی فقرے کسی لطیفے یا کسی مصرعے نے مجلس کی تھکا دینے والی سنجیدگی کو تھوڑی دیر کے لئے درہم برہم کر دیا۔ اور مجلس مسئلۂ زیرِ بحث پر سوچنے کے لئے تازہ دم ہو گئی۔ رام پور میونسپلٹی کا الیکشن درپیش ہے اور اچھن صاحب کا مکان مشورہ گاہ بنا ہوا ہے۔ رام پور کی تعلیمی پس ماندگی اور خصوصیت سے اعلیٰ تعلیم کے لئے کسی کالج کا نہ ہونا ہم سب کے لئے دردِ سر بنا ہوا ہے کہ اچھن صاحب کے یہاں کوچنگ کلاسز کا کھلنا طے پا گیا ہے جس کا اہتمام رام پور اکیڈیمی کے ذمے ہے اور ایم، اے تک کی تیاری کرانے کے لئے اعزازی کام کرنے والے بزرگ شہری رضیے ہی سے نہیں بلکہ کارخانوں کے مشینی ماحول تک سے تلاش کر کے جمع کر لئے گئے ہیں۔ جگہ کا انتظام ہو گیا ہے۔ اچھن صاحب بھی بے گریبان کا تکمہ دار کُرتا اور ہلکے پُھلکے چپل پہنے مغرب کے بعد پڑھانے جا رہے ہیں — کچھ ترقی پسند نوجوانوں کا اصرار ہے کہ رام پور کے مسائل میں ایم، این رائے سے بھی مدد لی جائے۔ اچھن صاحب دلّی جانے کے لئے تیار کر لئے گئے ہیں دلّی میں ایم، این رائے اچھن صاحب پر نظریں جمائے ہوئے ہیں کہ اچھن صاحب لپٹ گئے ہیں؛ تم ایم، این رائے! میں سوچ رہا تھا کہ یہ ذاتِ شریف کون ہوں گے، کیسے ہوں گے...... " حکومت رام پور کے سامنے پیش کرنے کے لئے سیاسی مطالبے مرتب ہو گئے ہیں اور اچھن صاحب دوسرے سیاسی رہنما ساتھیوں کے ہمراہ حکومت سے بات چیت کرنے جا رہے ہیں رام پور کی عام بے کاری دُور کرنے کے لئے ایک اقتصادی بورڈ بنانے کی تجویز حکومت رام پور نے قبول کر لی ہے۔ آج کل اچھن صاحب کے یہاں اسی بورڈ کے لئے مناسب کام سوچے جا رہے ہیں —— اس وقت ایک مخصوص صحبت ہے اور دارالصناعۃ کے نام سے ایک صنعتی ادارہ کھولنے اور اس میں ہونے والے کام اور اس میں تربیت کی ایک مکمّل اسکیم زیرِ غور ہے —— طے پا گیا ہے کہ رضا ٹیکسٹائل دو سو بچّوں کو تربیت دے گا۔ اس کے امیدواروں کی فہرست بن رہی ہے —— شام کا وقت ہے چائے کا دَور

چل رہا ہے۔ رام پور کے خوش گو اور منتخب شاعروں کا مجمع ہے ۔۔ منتخب
اشعار سنائے جا رہے ہیں۔ اب میاں سے فرمائش ہو رہی ہے۔ اپنے
مخصوص انداز میں انھوں نے بھی تحت اللفظ غزل شروع کر دی۔ اور یہ
اساتذۂ فن جھوم جھوم کر داد دے رہے ہیں۔ اور ایک ایک شعر کو دو دو
اور تین تین بار پڑھوا رہے ہیں ـــــ رات کے دس بجے ہیں دو چار
خوش ذوق نوجوان ساتھ ہیں اور میاں کہیں سڑک پر جا رہے ہیں۔ خاموشی
طاری ہے کہ اکبر الہ آبادی کا ظریفانہ کلام بات چیت کا موضوع ہے۔
اچھن صاحب نے فرمایا کہ ان کا سنجیدہ کلام بھی کم بامزہ نہیں اور مثال
کے طور پر شعر پر شعر سناتے چلے جا رہے ہیں کہ منزلِ مقصود آگئی ـــــ
اس وقت مضطر خیرآبادی پر تبصرہ ہو رہا ہے اور ان کی شاعری پر
بڑی شد و مد سے میاں گفتگو کر رہے ہیں ـــــ رام پور کے پڑھے
لکھے نوجوان بیٹھے ہیں اور میاں، پروفیسر براؤن سے متعلق لطیفے بیان
کر رہے ہیں، اسی وقت کیمبرج یونیورسٹی کے مشہور منطقی پروفیسر جانسن
اور ان کے شاگرد رسل مشہور فلسفی کا اپنے سامنے ایک دلچسپ مکالمہ نقل
ہو رہا ہے ـــــ علامہ اقبال کے ذکر میں میک ٹے گرٹ کا تذکرہ آگیا
ہے۔ فرما رہے ہیں کہ وہ ہمارے بھی بہت شفیق استاد تھے ـــــ ہم
کہہ رہے ہیں کہ فلاں صاحب آج کہتے تھے کہ "انگلستان میں اچھن صاحب
نوشاہانہ رہتے تھے اور یونیورسٹی کو ممنون کرنے کے لئے کبھی کبھی کالج بھی
آجاتے تھے۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ وہاں کے پروفیسر اچھن صاحب کا بہت
خیال کرتے تھے" فرمانے لگے "تو کیا پھر ان کا خیال کرتے؟" ـــــ دوپہر
کا وقت ہے جامعہ والے چودھری اکبر علی مرحوم سکریٹری تعلیمات آگئے ہیں۔
چائے پی جا رہی ہے اکبر علی مرحوم انگریزی نظم کے اعلیٰ نمونے اپنے حافظے
کی مدد سے گھنٹہ بھر سنا کر خاموش ہوئے ہیں کہ اچھن صاحب نے انگریزی
مختصر مضمون نگاری کا تذکرہ کر دیا اور اب انگریزی نثر کے اعلیٰ نمونوں کے
ٹکڑے نام بنام سنانا شروع کر دئے۔ اب یہ سلسلہ کہیں دو ڈیڑھ گھنٹے
میں چودھری صاحب مرحوم کی جانب سے اچھن صاحب کے غیر معمولی حافظے
کی داد پر ختم ہو رہا ہے ـــــ دوپہر کے کھانے پر ڈاکٹر ذاکر حسین خاں
صاحب آئے ہوئے ہیں۔ اچھن صاحب زنانے میں ہیں۔ اچھن صاحب کا
ذکر ہے۔ ڈاکٹر صاحب فرما رہے ہیں کہ اچھن صاحب ہمارے ہاں کے

مصنف بھی تو ہیں (ہم لوگ تعجب سے) کیا سچ؟ ہاں! ہاں! انھوں
نے اپنے لئے "اٹلی" انتخاب کی تھی اور مجھے اس پر مقدمہ لکھنا تھا۔ واقعی
کیا ان کی کوئی کتاب موجود ہے؟ حضرت اندر سے آجائیں تو ان کے سامنے
پوچھنا ـــــ آج کل لاہور کے اورینٹل کالج کے مرحوم پروفیسر اقبال
کا خط آیا ہوا ہے۔ اسٹیٹ لائبریری میں کچھ کام کرنا ہے۔ ایک مقررہ
تاریخ تک اپنے آنے کے متعلق ...... اچھن صاحب کے جواب کا انتظار
کریں گے۔ اچھن صاحب ان کے ٹھہرانے کے انتظاموں میں منہمک ہیں، تقریب
قریب ڈیڑھ دو سو کا سامان خرید لیا ہے ان کے اوصاف بیان ہو رہے
ہیں فرماتے ہیں کہ بھائی میں تو لکھ رہا ہوں کہ اگر اچھی جگہ ٹھہرنا چاہو تو ریاست
کے مہمان ہو اور اگر اچھا کھانا چاہتے ہو اور اچھے لوگوں سے ملنا چاہتے
ہو تو میرے گھر آجاؤ۔ ہر صبح کو خط لکھنے کے عزم کو تازہ کر لیا جاتا ہے تا ایں کہ
مقررہ تاریخ آگئی اور ان کے کسی آنے جانے والے نے اب ارجنٹ تار دینے
کی ذمہ داری ان پر ڈالنا مناسب نہ سمجھی اور خود تار دے دیا، اب ان کی
مہمانی ہو رہی ہے کہ اسی زمانے میں پٹنے کے مشہور محقق قاضی عبدالودود
صاحب کو اچھن صاحب کے یہاں ٹھہرے ہوئے مہینہ بھر سے زائد ہو گیا ہے
شہر کے باذوق حضرات آ رہے ہیں اور علمی مجلسیں منعقد ہیں، اچھن صاحب فرما
رہے ہیں کہ ہمارے قاضی صاحب ہمیشہ سے ٹی بی میں مبتلا ہیں ماشاء اللہ
ان کا ڈیل ڈول تو دیکھو قاضی جی شہر کے غم میں دُبلے ہو گئے ہیں ـــــ
کلکتہ یونیورسٹی کے اسلامک اسٹڈیز کے شعبے کے ہیڈ اور مدرسہ عالیہ
رام پور کے پُرانے فارغ التحصیل ڈاکٹر زبیر مہمان ہیں اور خواجہ عبدالمجید
کے نام کے سلسلے میں جرمنی کا لطیفہ پیش ہو رہا ہے اور ہم سب لطف لے
رہے ہیں ـــــ ریاست کی طرف سے رضا اکیڈیمی کے افتتاح کی
تقریب نہایت شاندار طریقے سے منائی جا رہی ہے۔ مرحوم علامہ
سید سلیمان ندوی اسی تقریب کے سلسلے میں اچھن صاحب کے یہاں آگئے ہیں
شہر کے علما اور پڑھے لکھے حضرات کا مجمع ہے، احمد علی شوق قدوائی کے داماد
معین الدین انصاری چیف جسٹس بشیر حسین زیدی صاحب کے فرستادہ
سید صاحب کو نواب صاحب کا پیغام پہنچا رہے ہیں کہ خاص باغ تشریف
لے چلیے۔ وہ فرماتے ہیں۔ آپ اچھن صاحب سے کہیے۔ اچھن صاحب جواب
دے رہے ہیں کہ آپ کہہ دیجئے کہ میری زندگی میں کبھی کبھار مسرت کے

کچھ مواقع نکل آتے ہیں انہیں تو آپ مجھ سے نہ چھینیے —— ابھی ابھی دروازے پر ایک کار رکی - ایک صاحب اچھن اچھن کہتے ہوئے آئے اور لپٹ گئے - بات چیت شروع ہو گئی - لوگ متعجب ہیں کہ اچھا یہ ، ہیں سید حسین صاحب ہندوستان کے مشہور سیاسی رہنما ، مصر میں سفیر - رام پور آئے ہوئے تھے کہ اچھن صاحب کی والدہ مرحومہ کے انتقال کی خبر سنی تھی اس لئے برسم تعزیت آئے ہیں —— سیرتِ محمد علی شائع ہوئی ہے ایک نسخہ کوئی صاحب اچھن صاحب کے یہاں بھی لے آئے ہیں - ورق گردانی ہو رہی ہے کہ مولانا محمد علی کی ایک تصویر بھی سامنے آ گئی - نیچے لکھا ہوا ہے "تمہارا پرانا استاد ، نیا دوست اور ہمیشہ کا بھائی محمد علی" کسی نے کہا یہ تصویر تو وہ ہے جو مولانا محمد علی نے آپ کو دی تھی - اچھن صاحب جواب دے رہے ہیں کہ ہاں جامعہ والوں نے مجھ سے مانگ لی ہے —— بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی - میں کہنا یہ چاہ رہا تھا کہ اچھن صاحب کے سلسلے میں تعارف مجھے بڑا عجیب سا معلوم ہو رہا ہے اُن کی باتیں میرے کانوں میں گونج رہی ہیں - ان کی صورت میری آنکھوں میں بسی ہوئی ہے - ان کا چلنا پھرنا اور اس کی آہٹ جیسے میں دیکھ اور سن رہا ہوں - ان کے گھر کا ماحول اور ان کی مجلسوں کے رنگا رنگ نقشے دل و دماغ میں سمائے ہوئے ہیں اور یہ جان کر کہ سچ مچ ان کے بھی تعارف کی ضرورت ہے مجھے حیرت ہوتی ہے - کہنے کو گیارہ بارہ سال کل کی بات ہے لیکن یوں یہ اتنی بڑی مدت ہے کہ اچھن صاحب جیسی عوام و خواص میں مشہور اور ہر دل عزیز شخصیت کو بھی بھلا دینے کے لئے کافی ثابت ہوئی ہے - گزرا ہوا زمانہ کتنا مختصر معلوم ہوتا ہے اور اس سمٹے ہوئے وقفے میں کیسے بڑے بڑے حادثے ہو جاتے ہیں -

جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ مجھے اچھن صاحب کی شاگردی کے ساتھ ساتھ دس بارہ سال ان کی ہم نشینی کا بھی شرف حاصل رہا ہے - اس لئے مجھے ان کو سمجھنے کا بڑا اچھا موقع ملا اور اتفاق یہ کہ ان کے بہت سے پرانے ساتھیوں سے ملنے کا اور اچھن صاحب کے بارے میں ان کے خیالات سننے کا بھی اکثر اتفاق ہوا ، اس لئے ان کے کردار کے حسین گوشوں پر میں کچھ کہوں گا وہ بڑی حد تک میرا اپنا تجربہ ہوگا ، اور ایسا تجربہ جس سے ان بزرگوں کو بھی اتفاق رہا ہے جنہیں ان کو سمجھنے کے کافی مواقع حاصل تھے -

صاحبزادہ واجد علی خاں صاحب واجد و اشک عرف اچھن صاحب ، مولانا عبدالحق صاحب خیرآبادی کے نہایت عزیز اور قابل شاگرد صاحبزادہ محمد علی خاں صاحب عرف چھٹن صاحب بہادر کے سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے - صاحبزادہ چھٹن صاحب صاحبزادہ کاظم علی خاں صاحب عرف چھوٹے صاحب ابن نواب محمد سعید خاں والیٔ رام پور کے سب سے بڑے لڑکے تھے - چھوٹے صاحب نواب یوسف علی خاں ناظم شاگرد غالب اور اردو کے مشہور صاحب طرز شاعر کے نہایت چہیتے بھائی تھے - بزرگوں سے سنا ہے کہ ریاست کا انتظام کاروبار عملاً گویا انہیں سے متعلق تھا - ابتدا میں دلی کی بود و باش کی وجہ سے ۱۸۵۷ء کے مشہور ہیرو شاہزادہ فیروز شاہ سے لڑکپن کے تعلقات تھے - ان تعلقات کو چھوٹے صاحب نے اس طرح نبھایا کہ رام پور کے روہیلہ نوجوانوں کی ایک بہت بڑی مسلح جمعیت تیار کر کے ، ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں فیروز شاہ کے ساتھ ہو کر روہیلوں کی مشہور جانبازی اور شمشیر زنی کے کرتب دکھائے - ہنگامے کے فرو ہونے پر یہ کسی نہ کسی طرح بچ کر رام پور آ گئے اور نواب یوسف علی خاں نے تدبیر سے اور اپنی وفاداریوں اور خدمت گزاریوں کی قیمت پر ان کو انگریزی حکومت کی دار و گیر سے بچا لیا - چھوٹے صاحب اپنے بھتیجے نواب کلب علی خاں سے ایک واقعے کی بنا پر کبیدہ ہو کر بریلی چلے گئے - اور چونکہ چھٹن صاحب کا رشتہ نواب کلب علیخاں کی صاحبزادی سے طے پا گیا تھا اس لئے ان کو یہیں چھوڑ گئے - چنانچہ چھٹن صاحب کا پہلا عقد نواب کلب علیخاں صاحب کی صاحبزادی سے ہوا - جب ان بیگم کا انتقال ہو گیا تو دوسرا عقد نواب یوسف علی خاں صاحب کی صاحبزادی سے ہُوا - اچھن صاحب مرحوم انہیں دوسری بیگم صاحبہ کے بطن سے اواخر ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوئے -

اچھن صاحب کی ابتدائی تعلیم و تربیت گھر پر ہوئی - قابل اتالیق مقرر کئے گئے - ان کے اُس زمانے کے خاص استادوں میں سب سے اہم نام مولانا محمد علی مرحوم کا بھی ہے - مولانا مرحوم اس ابتدائی تعلقات کی بنا پر ہمیشہ پدرانہ شفقت فرماتے تھے - غالباً ان کے اتالیقوں کے مشورے سے ہی ان کو پرانے جنرل ، عظیم الدین خاں میموریل ہائی اسکول ، اور میانی گورنمنٹ ہائی اسکول اور جدید گورنمنٹ حامد اسکول میں داخل کر دیا گیا - مولانا محمد علی مرحوم بھی اسی اسکول کے طالب علم اور پھر ہیڈ ماسٹر تھے - غالباً اسی زمانے میں

نواب صاحب سے کچھ کشیدگی ہوگئی اور چھپٹن صاحب نے کچھ دنوں کے لئے رام پور چھوڑ دیا اور مرادآباد رہنا شروع کر دیا۔ اس طرح اچھن صاحب تھوڑے دنوں مرادآباد رہے۔ عفو تقصیر پر یہ خاندان پھر رام پور آگیا۔

اچھن صاحب غالباً ۱۹۱۳ء تک اسٹیٹ ہائی اسکول کے نہایت ہر دل عزیز طالب علم رہے۔ وہ اپنے زمانے کے فٹ بال کے بہت اچھے کھلاڑیوں میں سمجھے جاتے تھے۔ اسکول کی ٹیم میں ان کا اہم مقام تھا۔ طلباء ان سے مانوس اور اساتذہ شفیق تھے اور اس میں خاندانی وجاہت اور گھر کی ریاست سے کہیں زیادہ اُن کے اپنے ذاتی عادات و خصائل کو دخل تھا۔ استادوں کی قدر و منزلت تو اُن کے والد بزرگوار کا ورثہ تھا لیکن وہ طلبہ اور خصوصیت سے ساتھیوں کی ہمدردی اور مدد میں کوئی کوتاہی نہ کرتے تھے۔

اچھن صاحب اوائل ۱۹۱۴ء میں انگلستان چلے گئے اور قریب قریب آٹھ سال تک کیمبرج کے مختلف کالجوں میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ وہ رامپور سے اگرچہ انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ولایت بھیجے گئے تھے لیکن وہاں وہ برابر اپنے مضامین بدلتے رہے لیکن ان کی دلچسپی کے خاص مضامین فلسفہ اور ادبیات تھے۔ ابھی اچھن صاحب انگلستان ہی تھے کہ ان کے والد ماجد کا انتقال ہوگیا۔ پھر کچھ دنوں بعد ریاست نے ان کا تعلیمی وظیفہ بند کر دیا اور ایک معتد بہ رقم جو ان کے گھر سے جاتی تھی اس کا پہنچنا بھی بند ہوگیا۔ اور بقدر ضرورت رقم کے بغیر ان کے لئے انگلستان رہنا ناممکن ہوگیا اور وہ وہاں سے جرمنی چلے آئے۔ یہاں انھوں نے مضمون نگاری کو ذریعۂ معاش بنا کر برلن یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ جرمنی میں تقریباً چھ سال گذارے۔ وہ جرمنی میں ہی تھے کہ مولانا محمد علی مرحوم کو ۱۹۲۸ء میں یورپ کا سفر درپیش آگیا۔ اچھن صاحب کی والدہ کو مولانا کے اس ارادے کی خبر لگی تو مرحومہ نے ان سے وعدہ لیا کہ وہ اپنے ساتھ ان کے اچھن کو ضرور لائیں گے۔ چنانچہ مولانا مرحوم نے اس وعدے کو اس طرح پورا کیا کہ برلن جا کر اچھن صاحب کو کسی کھیل کے میدان سے گرفتار کر لیا۔ اور ان کو ان کے رہائشی کمرے کی کنجی کے ساتھ ٹرکی، شام ہوتے ہوئے ہندوستان لاکر رام پور میں ان کی والدہ کے حوالے کر دیا۔ اس سفر میں اچھن صاحب کو عالم اسلامی کے اکابر سے ملنے کا اتفاق ہوا اور عصمت انونو اور مفتی امین الحسینی سے ملاقاتیں ہوئیں خصوصاً مؤخر الذکر سے بڑی دلچسپ اور مفید صحبتیں رہیں۔ عصمت انونو مصطفیٰ کمال اتاترک کے دستِ راست تھے مولانا محمد علی کمال اتاترک سے ملنا چاہتے تھے۔ عصمت انونو نے غالباً مصطفیٰ کمال کی حسب منشا یہ عذر کیا کہ چونکہ آپ میں اور اتاترک میں نظریاتی اختلاف ہے اس لئے اس ملاقات سے بجز اس کے کہ اختلاف کی خلیج مزید وسیع ہو کوئی فائدہ نہیں۔ مولانا کو انکارِ ملاقات سے بہت صدمہ ہوا اور وہ غصے میں بھر گئے اور عصمت انونو سے کہہ آئے کہ آپ میری طرف سے اتاترک سے کہئے کہ انھوں نے ایسے شخص سے ملاقات پسند نہیں کی ہے جس نے ترکی کے لئے ہر ترک سے زیادہ کام کیا ہے۔ پھر میرے تربیت یافتہ جوانوں میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو مصطفیٰ کمال کی برابری کر سکتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ وہ اپنے نصب العین میں کامیاب ہوگئے اور ہم ابھی تک ناکام ہیں لیکن اس کی وجہ ہندستان اور ترکی کے حالات کا فرق ہے لیڈروں کی نااہلیت نہیں۔

اچھن صاحب رام پور میں نواب حامد علی خاں کے آخری عہدِ حکومت میں آگئے تھے اور وقتاً فوقتاً نواب صاحب کی خصوصی مجلسوں میں باریاب ہونے کا بھی موقع ملتا رہتا تھا لیکن اس زمانے میں انھیں ریاست کی خدمت کا موقع میسر نہ ہوا اور یہ بھی واقعہ تھا کہ یہ تازہ وارد رام پوری مشرقی دربارداری کے اصول سے کچھ زیادہ واقف بھی نہ تھا اور مغرب کی حریت پسند فضا نے دل و دماغ میں بجا اور حضور کے لئے کچھ بہت زیادہ گنجائش بھی نہ چھوڑی تھی چنانچہ نواب صاحب بھی ان کو کسی اہم عہدے کے لئے کچھ زیادہ پسند نہ کرتے تھے، بلکہ بعض موقعوں پر ان کی موجودگی میں وہ اپنے اس پرانے خیال کو بھی دوہرا دیتے تھے کہ نئی تعلیم لڑکوں کو بدتمیز بنا دیتی ہے جس کا مقصد غالباً اچھن صاحب کو اُن کے کسی خلاف مزاج عمل پر تنبیہہ کرنا ہوتا تھا تاہم اس زمانے میں موجودہ اعلیٰ حضرت سے ان کے تعلقات برابر بڑھتے رہے۔

۱۹۳۰ء میں موجودہ نواب صاحب تخت نشین ہوئے اور اچھن صاحب کو پہلی مرتبہ ریاست کی خدمت کرنے کا موقع ملا اور آپ پرائیوٹ سیکرٹری کے عہدے پر سرفراز ہوئے۔ رام پور میں اب تک پرانے انداز کے عمال برسراقتدار تھے۔ اچھن صاحب کے ہی مشورے پر نئے اعلیٰ تعلیم یافتہ حکام اعلیٰ عہدوں پر مقرر ہونے شروع ہوئے۔ اچھن صاحب نے اس موقع پر اپنے دوستوں کو فراموش نہیں کیا چنانچہ اعلیٰ حکام میں زیادہ تر ان کے ہی احباب کو موقع ملا لیکن افسوس کہ ان کے احباب نے ان کے غیر معمولی اثر اور رسوخ کو اپنے لئے

کچھ زیادہ مفید نہیں جانا اور خود بھی وہ اپنی افتادِ طبع کے اعتبار سے مشرقی روٴساء کی دربارداری کے زیادہ اہل ثابت نہ ہوئے اور ان کے خلاف ریشہ دوانیاں شروع ہوگئیں تا ایں کہ انھیں ملازمت چھوڑ کر فرار ہونا پڑا۔ اعلیٰحضرت اپنی خاص ٹرین میں سفر کر رہے تھے۔ دلّی کے اسٹیشن پر گاڑی پہنچی تو اچھن صاحب نہایت خوشی سے خفیہ طور پر گاڑی سے اُتر گئے اور جامعہ ملیہ آ گئے۔ کچھ دنوں وہاں اپنے احباب کے ساتھ رہے۔ تھوڑے دنوں میں طبیعت اُچاٹ ہو گئی اور دلی سے حیدرآباد کے لئے روانہ ہو گئے اور کسی جرمن بیمہ کمپنی میں ملازمت اختیار کرلی۔ کمپنی کا کام بڑی محنت اور جانفشانی سے کیا اور کمپنی کے ہندستانی ہیڈ آفس کے سب سے بڑے سربراہوں میں شمار کیے جانے لگے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ حیدرآباد میں انھوں نے اپنی مغربی معاشرت کے ساتھ نوابوں کی سی زندگی بسر کی لیکن کچھ دنوں کے بعد اس زندگی سے بھی اُکتا گئے اور لاکھوں روپوں کے سامان سے آراستہ کوٹھی کو خیرباد کہہ کر خالی ہاتھ وہاں سے پھر رام پور آ گئے۔ اب اچھن صاحب کی زندگی نے ایک بالکل نیا پلٹا کھایا اور مغربی معاشرت اور اس میں پرورش پانے والی عادتوں سے نفرت ہو گئی اور انھوں نے صوفیانہ انداز پر مشرقی طرز کی زندگی بسر کرنی شروع کر دی اور ان کے ایک پرانے دوست ڈاکٹر نظام الدین صاحب سیکرٹری دائرۃ المعارف حیدرآباد نے اس زمانے میں انھیں پیغام بھیجا تھا کہ پیرا پہلے بھی تمھارے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور اب پھر تمھارے ہی ہاتھ پر بیعت کروں گا۔

رام پور میں کچھ دنوں گمنام زندگی بسر کی۔ یہ زمانہ ۳۴-۱۹۳۵ء کا تھا۔ اہل رام پور کو اپنی کس مپرسی اور اقتصادی اور تعلیمی پستی کا احساس ہو چلا تھا۔ کچھ بزرگ حقوق و اصلاحات کے لئے جدوجہد کی ابتدا کر چکے تھے اور تحریک عوامی رنگ اختیار کرنے لگی تھی۔ اچھن صاحب بھی ان تحریکوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انھوں نے ابتداءً رام پوری مصنوعات کے استعمال کی تحریک شروع کی اور پھر عوامی تحریکوں میں آزادانہ شامل ہو گئے اور ان میں اپنا واجبی حصہ ادا کیا۔ غالباً ۳۷-۱۹۳۸ء میں عوامی مطالبے کے تحت اچھن صاحب پھر ریاست کی ملازمت میں بحیثیت سیکرٹری صنعت و حرفت لے لئے گئے۔

اس زمانے میں انھوں نے عوامی نقطۂ نظر سے رعایائے رام پور کی نہایت اہم اور نمایاں خدمات انجام دیں۔ رام پور کا دارالصناع اس وقت تک رام پور میں اپنے اس بانی کی یاد دلا رہا ہے۔ ہمارے پیرانے مشرقی درباروں کی یہ نمایاں خصوصیت تھی کہ عوامی زاویۂ نظر اور عوامی ہردل عزیزی ان میں متاعِ کاسد سمجھے جاتے تھے۔ پھر ان میں اپنے یا اختیار رقیبوں کے سامنے ہتھیار ڈال دینے کی بھی اہلیت نہ تھی۔ ان کی نفرت اور مقاومت آشتی اور سپردگی کے پردوں میں بھی جھلک پڑتی تھی چنانچہ ان کو ایک بار پھر ملازمت کو ٹھکرانا پڑا اور وہ بھی ہمیشہ کے لئے۔

ملازمت کا سلسلہ توڑنے کے بعد کچھ زمانے تک رام پور میں رہے۔ قادری خاندان میں باپ کے ورثے کے طور پر وہ بغداد کی درگاہِ قادری کے سجادہ صاحب کے مرید پہلے سے ہی تھے اور نئی زندگی میں یہ پرانا ورثہ ذاتی عقیدت کا بھی مرکز بن گیا۔ اتفاق سے اسی زمانے میں قادری سلسلے کے مشہور بزرگ گولڑے کے پیر صاحب کی رام پور میں اپنے حلقۂ ارادت میں آمد و رفت شروع ہوئی اور اچھن صاحب سے پہلے تعارف اور پھر تعلق پیدا ہو گیا۔ پیر صاحب اچھن صاحب سے اتنے متاثر ہوئے کہ ان کو گولڑے رہنے پر آمادہ کر لیا اور اچھن صاحب نے خالی ہاتھوں ہمیشہ کے لئے جلاوطنی اختیار کر لی اور اُن کو وہ رام پور چھوڑنا پڑ گیا جس کے چپے چپے پر ان کے باپ دادا کی عظمتوں کے نشان تھے اور جس کے ذرے ذرے سے انھیں والہانہ محبت تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ملک تقسیم نہ ہوا تھا اور ہندستان پاکستان نام کے خطوں سے لوگوں کے کان آشنا نہ ہوئے تھے۔

انھوں نے قریب قریب گیارہ بارہ سال گولڑے اور راولپنڈی میں گزار دئے اور غالباً گمنامی کے ساتھ اور از سرِ نو ایک چھوٹا گھر بنا کر اس کو آباد کیا۔ رام پور میں ان سے بہت سے تعلق رکھنے والوں کے دل میں پاکستان جانے کی تمنا چٹکیاں لیا کرتی تھی اور صرف اس لئے کہ اچھن صاحب کی ہمنشینی کا ایک بار پھر لطف حاصل کر سکیں۔ اس تمنا کو بر آنا نصیب نہ ہوا تھا کہ اہل رامپور نے ۲۰-۲۱ اگست ۱۹۵۸ء کو جمعرات کی شب پاکستان ریڈیو سے اچھن صاحب سے دائمی مفارقت کا اعلان سُنا جس کو جمع کے 'ناظم' (مقامی اخبار) نے پورے شہر میں عام کر دیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

اچھن صاحب کی ۶۵-۶۶ سالہ زندگی کا یہ مختصر اور بالکل سادہ خاکہ ہے۔ اس خاکے یا نقشے میں بہت بڑے بڑے خلاء ہیں اور ہر خانے میں

بھرنے کے لئے گوناگوں واقعات اور نوع بہ نوع حالات کا ایک وافر مجموعہ ہے اور آج بہت سے چھوٹے اور بڑے موجود ہیں جو اُن واقعات اور حالات کے عینی شاہد ہیں۔ جہاں تک قیامِ رام پور کے آخری دَور کا تعلق ہے اکثر اور اہم واقعات میرے سامنے کے ہیں۔ میں نے قصداً تفصیلات کو چھوڑ دیا ہے اس لئے بھی کہ وہ ہم سب کے سامنے کی باتیں ہیں اس لئے بھی کہ اس مختصر مضمون میں ان کے بیان کی گنجائش بھی نہیں ہے۔

اچھن صاحب کی یہ مختصر زندگی کتنی گوناگوں، کتنی دل چسپ، کتنی پر عبرت اور کتنے متضاد عناصر کو سمیٹے ہوئے تھی اس کو وہی محسوس کر سکتے ہیں جن کو اُن کی رفاقت میسّر ہوئی ہے۔ ان میں تلوّن بھی تھا اور استقلال بھی۔ ان کا ذوق بھی بدلتا رہتا تھا اور رفقاء بھی، لیکن جس سے جس انداز کا تعلّق تھا اس میں وہ کسی تبدیلی کو برداشت نہیں کرتے تھے۔ ان کے فیصلے اکثر وقتی جذبات کے مرہون ہوتے تھے لیکن کوئی طاقت ان کے کسی فیصلے پر اُن سے نظرِ ثانی نہیں کرا سکتی تھی۔ ان میں اس قدر لوچ اور نرمی تھی کہ ان کے دشمن بھی اُن سے فائدہ اُٹھا لیتے تھے۔ وہ ہمہ وقت انجمن تھے۔ مجلس پسندی ان کی طبیعت تھی لیکن جب کبھی گوشہ گیری اختیار کرتے تو ان کا عزیز ترین دوست بھی اس میں خلل انداز نہ ہو سکتا تھا۔ ان کی ضرورتوں کی کوئی انتہا نہ تھی لیکن وہ جب کبھی انھیں مختصر کرتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ انھیں کسی چیز کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ انھوں نے لاکھوں روپے صرف کئے اور پوری مسرّت اور بھرپور طمانیت کے ساتھ فقیرانہ زندگی کو بھی خوش آمدید کہا۔ وہ غیر معمولی جسری تھے اور کبھی توہمات سے خائف نظر آتے تھے۔ وہ غیر معمولی محتاط معلوم ہوتے تھے لیکن اُسی لمحے محسوس ہوتا تھا کہ انھوں نے احتیاط کرنا سیکھا ہی نہیں ہے۔ وہ بہت بامروّت نرم خو تھے۔ لیکن کتنا ہی سینے میں اتر جانے والا طنز ہو اگر لطیف فقرے کے غلاف میں ان کے دماغ میں آ جائے تو پھر وہ اس کو روک نہیں سکتے تھے۔ ان میں بے نیازی تھی، بے پروائی تھی جن کی حدیں مقرر کرنا آسان نہ تھا۔ وہ مستقبل کے بارے میں کبھی نہیں سوچتے تھے۔ ان میں ماضی کو بھلا دینے کی غیر معمولی طاقت تھی۔ ان کا ماضی ان سے سدا قریب قریب ناممکن تھا۔ وہ جو کچھ تھے فقط حال تھے۔ وہ فراخ دست تھے تو فراخ دست اور تنگ دست تھے تو تنگ دست۔ فراخ دستی پر فخر یا تنگ دستی کی شکایت ان کی طبیعت کے خلاف تھی۔ خوانِ شاہی اور سفرۂ درویشی دونوں سے وہ یکساں مسرّت و اطمینان حاصل کرتے تھے۔ نوکروں چاکروں کے جھگڑے میں جس طرح خوش رہتے تھے، بغیر پیش خدمت دوستوں کو اپنے ہاتھ سے چلمیں بھر کر حقّے پیش کرنے میں بھی انھیں وہی انبساط ہوتا تھا۔ وہ حنفی المذہب ہونے کے ساتھ ساتھ صوفی منش بھی تھے اور روشن خیال ہونے کے ساتھ ساتھ توہم پسند بھی۔ کٹّرپن کے ساتھ وہ آزاد منش بھی تھے۔ شاعر تو بہت اچھے تھے ہی لیکن ماہر نقّاد بھی تھے۔ فلسفہ ان کا مضمون تھا اور ادب ان کا دل چسپ موضوع۔ غرض یہ کہ وہ اتنے کچھ تھے کہ ہر شخص کے لئے وہ سب کچھ ہونا شاید آسان نہیں۔ ان کی زندگی مشرقی اشرافیت اور مغربی بھلمنساہت کا نہایت دل کش نمونہ تھی۔

اچھن صاحب کی زندگی کا ہر چکر ان کا اپنا گھمایا ہوا تھا اور جب چاہتے تھے اس کو نئے رُخ پر پھیر دیتے تھے اور سخت سے سخت انداز کو اپنا لیتے تھے۔ زمانے نے ان کو لاتعداد زیادہ اور اتنے بڑے بڑے موقع دئے اور بار بار دئے لیکن انھوں نے ہر موقع کو کمالِ استغناء سے ٹھکرا دیا بلکہ بنی ہوئی زندگی کو خود اپنے ہاتھوں لُٹا دیا۔ ان کا حلقۂ تعارف نہیں بلکہ دائرۂ احباب نہایت وسیع اور گوناگوں تھا۔ اس میں علماء بھی تھے اور مولوی بھی، پنڈت بھی اور سادھو بھی، پروفیسر، ڈاکٹر، سیاسی، اقتصادی، حکومت کے اعلیٰ حکّام اور عوام کے لیڈر، بازاری اور خواص سب میں ان کے عزیز دوست تھے پہلی جنگِ عظیم کے بعد عظیم ہندوستان میں جو شخصیتیں اُبھر کر آئیں، ان میں سے اکثر سے ان کے تعلّقات تھے اور بہت مخلصانہ۔ ہندوستان کا شاید ہی کوئی ایسا شہر یا قصبہ ہو جہاں ان کے با اثر و رسوخ احباب ان کو سر آنکھوں پر بٹھانے کے لئے تیار نہ ہوں لیکن انھوں نے کسی سے فائدہ اُٹھانے کی کبھی کوئی کوشش نہیں کی اور اپنی قلندری پر حرف نہ آنے دیا۔

اچھن صاحب کے کم دوست ہوں گے جنھیں ان سے پوری طرح واقف نہ ہونے کے باعث شکایتیں نہ پیدا ہوئی ہوں لیکن سب ان سے محبت کرتے تھے اور ان کی طرف سے خود ہی اعتذار تلاش کر کے ان کو بے قصور سمجھ لیتے تھے۔ وہ ہر دل عزیز تھے اور مخاطب پر چھا جاتے تھے۔ لوگ ہمیشہ ان کی صحبت کے متمنی رہتے تھے۔ ان کے ساتھ مختصر سی ہم نشینی کی یاد مدتوں تازہ رہتی تھی۔

مرحوم نہایت ذہین اور طبّاع تھے۔ حافظہ قوی اور تیز تھا۔ جفاکشی اور محنت میں کم لوگ ان کا مقابلہ کر سکتے تھے لیکن ان کی بے چین طبیعت نے

ان کو کسی پہلو چین نہ دیا۔ کہنے والے کہتے تھے کہ وہ انگریزی کے بہترین انشا پرداز تھے۔ ان کا کیمبرج لہجہ بھی اچھی خاصی شہرت رکھتا تھا۔ جرمن زبان میں تقریر و تحریر کی قدرت کے ساتھ اس کے ادبیات پر ان کی گہری نظر تھی۔ ان کی اردو بول چال نرم، شستہ، مستند، بے تکلف اور دل کش تھی۔ اردو نثر نگاری میں وہ کم مایہ نہ تھے۔ ترجمے کی لیاقت غیر معمولی تھی۔ وہ اردو غزل کے بہترین نبض شناس اور شیدائی تھے۔ اچھے شعر کی دل کھول کر داد دیتے تھے اور اس صنف شاعری میں ان کا مقابلہ کسی معاصر کے لئے آسان نہ تھا۔ وہ اپنے لطیف محسوسات کو شعروں میں ڈھالتے تھے اور زبان و بیان کی تمام لطافتیں اور نزاکتیں اس میں بھر دیتے تھے۔ سننے والا ایک طرف اُن کے داخلی تجربے کو اپنے آپ میں محسوس کرنے لگتا تھا۔ دوسری طرف ان کی مرصع سازی پر عش عش کرتا تھا۔ وہ دلّی مکتب کے شاعر تھے تاہم اگر لکھنوی انداز اختیار کرتے تو اس میں بھی دلّی کی داخلیت کو اس طرح کھپا دیتے تھے کہ صنعت گری کا وہم بھی نہیں گزرتا تھا۔ تناسب ان کی محبوب صنعت تھی لیکن تکلّف کا گمان بھی نہ ہوتا تھا۔ ان کے الفاظ نازک، ترکیبیں شگفتہ، طرزِ ادا میں لوچ اور بانکپن تھا۔ حسرت، یاس، درد اور ایک طرح کا حسین پندار یہ اُن کے اپنے مضمون تھے۔

قدرت نے اچھن صاحب کو غیر معمولی عطیوں سے نوازا تھا، لیکن افسوس کہ انھوں نے ان سے کوئی خاص فائدہ نہیں اُٹھایا۔ آج اُن کی واحد یادگار ان کی غزلیں ہیں اور وہ بھی منتشر، گم گشتہ اور آوارہ۔ اس جنسِ گراں مایہ کو دوسروں نے بھی اپنایا ہے اور شاید آئندہ بھی اپنائیں۔ اگر ان کے احباب ان کو فراہم کر کے کبھی شائع کر سکے تو غالباً اردو کی غزلیہ شاعری کے لئے یہ رام پور کا نہایت بیش قیمت ارمغان ہوگا اور شاید ان کے نام کو بھی اگلی نسلوں کے لئے محفوظ کر دے گا۔

تبرکاتِ اشک مرحوم

اک دن وہ مل گئے تھے سرِ رہگزر کہیں
پھر دل نے بیٹھنے نہ دیا عمر بھر کہیں

اندازِ اعترافِ محبت تو دیکھئے
میری نظر کہیں ہے تو ان کی نظر کہیں

اہلِ وطن کے دل میں نہیں گھر تو کیا ہوا
عمرِ رواں گزرتی ہے دنیا میں ہر کہیں

بگڑی کا ساتھ خوب دیا ہمدموں نے آہ
دل سے بنا بنا کے اِدھر سے اُدھر کہیں

جب ہم خیالِ ساغر و مے لا کے رہ گئے
بادل اُٹھے، بلند ہوئے چھا کے رہ گئے

اک وہ کہ خود بلائے گئے بزمِ ناز میں
اک ہم کہ اپنے آپ کو سمجھا کے رہ گئے

اب اس کا کیا علاج کہ اے مرگِ ناگہاں
ارمان دل میں اس ستم آرا کے رہ گئے

آئی بھی اور گزر بھی گئی رنج کی گھڑی
لیکن سلوک یاد احبا کے رہ گئے

ادا تھی، ناز تھا، شوخی تھی، مسکرانا تھا
غرض شریک مرے قتل میں زمانا تھا

اُن کا وہ دورِ جوانی، ان کی وہ کافر نگاہ
جس طرف آنکھ اُٹھ گئی مے آ گئی جام آ گیا

بے رُکے وہ جو ادھر سے گزرے
تیر پہ تیر جگر سے گزرے

ہم خدا جانے کہاں راہ تکیں
وہ خدا جانے کدھر سے گزرے

خیر ہو اہلِ چمن کی یارب
چند اُڑتے ہوئے پر سے گزرے

غمِ دوراں ہی بہت کافی تھا
آپ کیوں میری نظر سے گزرے

بات میں بات اسی کی ہے سنو تم جس کی
یوں تو کہنے کو سبھی منہ میں زباں رکھتے ہیں

پھول بھی منہ سے جھڑیں بات بھی کانٹے کی رہے
یہ ادا اور سخن ساز کہاں رکھتے ہیں

جلاتی ہے دل اور بھی سمد مہری
پھر اس سے تمہاری جفا ہی بھلی ہے

جو خوں آلودہ پیکاں ہو، نکالو میرے سینے سے
جو حسرت ہو وہ پیوستِ دل ہی رہنے دو

جیتے جی محروم کیوں لینے سے دل کا ساز ہو
ٹوٹ کے تارِ نفس تو ہی کہ کچھ آواز ہو

حالتِ زخمِ دروں دیکھئے دل میں آ کر
چشمِ خونبار تو اک منظرِ بیرونی ہے

خوفِ رنجش نہ کچھ اندیشۂ بیداد آیا
لکھ دیا خط میں انھیں وقت پہ جو یاد آیا

خامیٔ وحشت نہ کر زنداں میں آ کر شرمسار
سر نہیں اُٹھتا مرا دیوار و در کے سامنے

کب کا سوتا ہوا دل جاگ اُٹھا — اک صدائے کفِ پا سے تیری
ہم نے ہر حال میں، اے بانیٔ شر — خیر چاہی ہے خدا سے تیری

کس کی شراب، اے شیخ ذرا ہوش کی پیئے — مے خانہ ان کے دورِ جوانی کا نام ہے

نگاہوں میں اٹھنے کی طاقت نہیں ہے — اب آجاؤ وقتِ ندامت نہیں ہے

نگاہوں سے ہی غائب ہو گیا کوئی تو ہوش آیا
کہ ان کم بخت ہاتھوں سے وہ دامن دُور ہی کیا تھا

ہوا خواہیٔ گل کا نشہ تو دیکھو — جھکولے ہی کھاتا رہا آشیانہ

ہر سانس میں ہے موت کا کھٹکا لگا ہوا — گویا قدم قدم پہ مسافر کو شام ہے

یہ پتیاں، یہ پھول، یہ غنچے یہ خار کیا
جب تک نہ دیں چھوٹ کے چھالے، بہار کیا

نکل بھی آیئے پردے سے باہر — زمانے میں کسے مرنا نہیں ہے

(مرسلہ۔ عبدالمجید حیرت)

سحر رام پوری

غزل

پینا نہ چاہیئے تھے جو آنسو، مگر پیے — ایسے ہی کچھ تھے عام نگاہوں کے زاویے
اے غیرتِ حیات کچھ احساس چاہیے — زندوں کی مجلسوں میں ہیں زندوں کے مرثیے
اس دل کے واسطے بھی کوئی آنکھ تر ہوئی — پھولوں نے اپنے داغ تو شبنم سے دھو لیے
اپنی طرح انھیں بھی جو دیکھا، تو ذہن میں — جیسے کسی نے سیکڑوں نشتر چبھو دیے
اب آپ کے جنوں کی غزل سے بھی ہے بعید — منہ دیکھتے رہیں غمِ دوراں کے قافیے
نوعیتِ ستم بھی نہیں ایک سی، کہ ہے — 'کچھ' بھول کے لئے تو 'بہت' یاد کے لیے
پہنچیں گے منزلوں کے سندیسے یہیں کہیں — بجھ بجھ کے جل رہے ہیں جہاں نت نئے دیے
حالانکہ چاک چاک گریباں ہے زندگی — یہ کون سا جنوں ہے، کہ بیٹھے ہیں لب سیے

ہے گردشِ جہاں بھی اسی سوچ میں سحر
اب تک، اور ایسے دور میں، ہم کس طرح جیے

عبدالمجید حیرت

کبھی اور ابھی

کبھی

ہم بھی ہوں گے خراب حال کبھی　　کس کو آیا تھا یہ خیال کبھی

کیا خبر تھی کہ کھائیں گے وہ زخم　　جس کا ہوگا نہ اندمال کبھی

دوستو، کب کسی نے دیکھے تھے　　ایسے تاریک ماہ و سال کبھی

دَور ایسا نہ تھا کبھی دشوار　　زیست ایسی نہ تھی محال کبھی

نہ ملی قید و بندِ غم سے نجات　　نہ ہُوا حل یہی سوال کبھی

وائے قسمت کہ دُور ہیں وہ بھی　　تھے جو اپنے شریکِ حال کبھی

اُن سے، اور اُن کے ہم نشینوں سے　　تھی ہماری بھی بول چال کبھی

اب وہ رندانِ پاکباز کہاں　　آپ تھے اپنی جو مثال کبھی

کون سا وہ کمال ہے حیرتؔ

جس پہ آیا نہ ہو زوال کبھی

ابھی

دُور ہے جن سے دَورِ جام ابھی　　لے رہے ہیں خدا کا نام ابھی

سامنے اور بھی ہیں کام ابھی　　جن کا کرنا ہے اہتمام ابھی

یوں پریشاں کرے نہ خلق اُنھیں　　کر رہے ہیں وہ انتظام ابھی

کچھ تو تڑپے گا، کچھ تو پھڑکے گا　　صید آیا ہے زیرِ دام ابھی

رہرووں کو جہاں پہنچنا ہے　　ہے بہت دُور وہ مقام ابھی

وہ بھی ہو جائیں گے کبھی پُورے　　ہیں فسانے جو ناتمام ابھی

اُن کی اصلاح بھی ضروری ہے　　ہیں خیالات جن کے خام ابھی

خیر، کچھ اُن سے رسم و راہ تو ہے　　نہ سہی نامہ و پیام ابھی

یہ ہمیں ہیں کہ جہلات کا بھی　　کئے جاتے ہیں احترام ابھی

کتنے دلدادگانِ بادہ و جام　　ہیں بدستور تشنہ کام ابھی

ہم سحر ہی سے خوش نہیں حیرتؔ

اور آئی نہیں ہے شام ابھی

رشید احمد صدیقی

کُندن

کُندن مرگیا اور گھنٹے بجتے رہے!

کُندن کالج کو گھنٹہ بجاتا تھا معلوم نہیں کب سے، کم و بیش ۳۰-۳۵ سال سے، اتنے دنوں سے اس پابندی سے کہ اس طرف خیال کا جانا بھی بند ہو گیا تھا کہ وہ مر جائے گا یا گھنٹہ بجانے سے باز آجائے گا!

طالب علمی کا زمانہ ختم کرکے اسٹاف میں آیا تو یہ گھنٹہ بجا رہا تھا، اسی کے گھنٹوں کے مطابق کام کرتے کرتے پوری مدّت ملازمت ختم کی یونیورسٹی سے رخصت ہوا تو اسے گھنٹے بجاتے چھوڑا۔ گھنٹے کی آواز روزمرّہ کے اوقات میں اس طرح گھُل مل گئی تھی جیسے وہ کہیں باہر سے نہیں میرے ہی اندر سے آرہی ہو جیسے وہ وظائف جسمانی کے ان معمولات میں داخل ہو گئی ہو جن کا شعوری طور پر احساس نہیں ہوتا!

کئی دن بعد کسی نے بتایا، کُندن مرگیا۔ ایک دھچکا سا لگا۔ آہ کُندن مرگیا۔ اتنے دنوں سے گھنٹے کی آواز آتی رہی اور حسب معمول یہی سمجھتا رہا کہ کُندن بجا رہا ہے۔ بتائے بغیر کیوں نہ معلوم ہو گیا کہ کُندن مرگیا۔ نادانستگی میں اس کی یاد کے ساتھ یہ کیسا قصور ہوا! پھر وہی بات ذہن میں آئی جو ہمیشہ ہر ذہن میں آتی ہے کہ موت سے مخصوص افراد چاہے جس شدّت سے متاثر ہوں، نظامِ فطرت میں اس سے زیادہ ناقابلِ التفات واقعہ دوسرا نہیں۔ اس سے فطرت کے نظام میں کوئی خلل پڑتا ہے نہ دنیا کے طور طریقوں میں فرق آتا ہے۔ اس احساس سے تسکین تو کب ہوتی، بے چارگی اور بے زاری کے احساس میں اضافہ ہو گیا۔ کیسے نہ کہوں کہ افراد کا متاثر نہ ہونا نظامِ فطرت کے متاثر نہ ہونے سے بڑا حادثہ ہے۔ انسان کی جس نہج پر ترکیب ہوئی ہے اس میں تو افراد ہی کے تاثرات سب کچھ ہیں باقی تمام شعبدہ ہائے طلسمِ بے سببی!"

کُندن کے گھنٹہ بجانے پر مہدی منزل سے لے کر مشتاق منزل تک کی کلاسیں باہر آجاتیں۔ ترکی ٹوپی، سیاہ ترکش کوٹ اور پتلون نما سفید پاجاموں میں ملبوس ملک کے کونے کونے سے آئے ہوئے شریف امیر غریب گھرانوں کے خوبرو خوش اطوار ہنستے بولتے نوجوان اس طرح برآمد ہوتے جیسے بقول انشاء "ہوا کھانے کو نکلے ہیں جوانانِ چمن"! ایک سرے سے دوسرے سرے تک کتنے خاندانوں کی امیدوں اور امنگوں کا چمن کھلتا ہوا نظر آتا۔ دو تین منٹ تک یہ ہمہمہ رہتا پھر یہی لڑکے کلاس میں جا بیٹھتے۔ مقررہ وقفے کے بعد کُندن گھنٹہ بجاتا۔ وہی سماں پھر نظروں کے سامنے آجاتا۔ پڑھائی کے دنوں میں صبح سے سہ پہر تک یہی سلسلہ جاری رہتا۔ آتے جاتے پوچھ لیتا کُندن کون سا گھنٹہ چل رہا ہے، اتنا گھنٹہ دریافت کرنے کے لئے نہیں جتنا اس سے ملنے کی تقریب منانے کے لئے۔ ہمیشہ جواب دیتا، حضور فلاں گھنٹہ، چاہے پوچھنے والا طالب علم ہو، معلّم ہو یا کلرک۔ اس کے حضور کہنے میں توقیر اور تواضع کی حلاوت تھی، خوشامد یا تصنّع کی گراوٹ نہیں!

موت اور زیست کی گردش نے کتنوں کو بڑا کتنوں کو چھوٹا کتنوں کو یکساں کردیا۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے، موت سے زیادہ ہم سطح کردینے والی دوسری کوئی شئے نہیں۔ اس ۳۰-۳۵ سال میں ہم سے قریب، ہم سے دُور، ہمارے لائے ہوئے کیسے کیسے انقلابات برپا ہوئے۔ نوجوانوں کی کتنی نسلیں اس ادارے سے نکلیں اور زندگی کے چھوٹے بڑے معارکوں میں فتح و شکست سے کس کس طرح دو چار ہوئیں یا ہیں۔ ان سب کو کیسے اور کہاں تک یاد ہیں

سیٹیوں۔ یہ سب ہوتا رہا لیکن کُندن کا گھنٹہ بجانا جوں کا توں رہا۔ جیسے اس کا گھنٹہ بجانا یونیورسٹی کے موجود اور معتبر ہونے کا اعلان تھا۔ لیکن ہوا وہی جو بالآخر ہو کر رہتا ہے۔ کُندن مرگیا۔ تقدیر کے اس معمول میں فرق نہ آیا 'بزنہ بہ سمجھو توئی یا بزِ فسق، سمجھو منی'! اگر یہ نہ ہے اور ہے بھی یہی تو یہ جنگ نامساوی طاقتوں کی ہے جس میں فتح ہمیشہ کمزور کی مانی جائے گی!

یونیورسٹی کا بالکل ابتدائی زمانہ تھا۔ مرزا اختر حسین صاحب اسسٹنٹ رجسٹرار تھے جن کے سپرد امتحان کا کام تھا۔ کُندن کو انھوں نے اپنا آنریری سکنڈ لفٹیننٹ اور کواڈرنگل (کچی بچی پارک) کے سارے مہتروں کا کمپنی کمانڈر مقرر کیا اور کچھیرا (ایک بڈھا مہتر) کو لانس کارپورل Lance corporal۔ خواص میں یہ کمپنی (مرزا اختر حسین Mirza Akhtar Hussain's Own Fussiliers اون فوسیلیرس) کے لقب سے اور عوام میں کُندن کی سفرمینا Sappers & Miners کے نام سے مشہور ہوئیں۔ امتحان کے زمانے میں شروع سے آخر تک یونیورسٹی میں مرزا صاحب، کُندن اور یہ سفرمینا پلٹن ایک دوسرے سے جُدا یا دور نہیں دیکھی گئی!

مرزا صاحب ہر کام ضابطے اور اہتمام سے کرنے کے شائق تھے۔ اس زمانے میں امیدوار کم ہوتے تھے جن کے لئے اسٹریچی ہال کافی بڑا ہال تھا۔ لیکن موصوف اس دھوم سے امتحانات منعقد کرتے جیسے نہ صرف امیدوار بلکہ ان کے والدین اور قریبی رشتہ دار سب کے شریک ہوجانے کا امکان تھا۔ اسٹریچی ہال کے سامنے سے اس زمانے میں گزر ئے تو اس کے اونچے برامدے کے صدر دروازے پر مرزا صاحب کھڑے کمانڈ کرتے ہوتے۔ کوٹ کی اوپر کی جیب میں رنگ برنگ کی پنسلیں اس ترتیب سے نظر آتیں جیسے ملٹری منصب کا کوئی امتیازی ربن لگا ہوا ہے۔ کسی پنسل کو جگہ نہ ملی ہوتی تو لبوں میں دبا رکھتے ہاتھ میں رنگین کھریا کے ایک آدھ ٹکڑے بغل میں طرح طرح کی فائلیں اور کاغذ کے پلندے۔ ڈسک یا کرسی پر یا فائلوں میں جہاں جس قسم کی ضرورت دیکھی کھریا سے نشان لگا دئے یا پنسل سے نوٹ لکھ دئے۔ زینے پر کُندن، اس سے نیچے سڑک پر مہتروں کی سفرمینا " جاروب بدست و کھریا در بغل " اٹینشن کھڑی ہوتی۔ کچھ اسی طرح کا نقشہ ہوتا جیسا آج کل قومی جھنڈے کو سلامی دینے کے لئے کوئی مینا کھڑا ہو اور دوسرے حسب مراتب نیچے صف آرا ہوں۔ مرزا صاحب کا حکم پاتے ہی کمپنی کمانڈر کُندن، سفرمینا کے ایک حصّے کو ساتھ لے کر اسٹریچی ہال میں نشستیں ترتیب دینے میں مصروف ہوجاتا، دوسرا ڈیٹچ منٹ اہم پوزیشنوں پر جھاڑو دینے لگتا یا گھاس کھودنے لگتا!

یہ زمانہ مالی مشکلات کا تھا۔ یونیورسٹی سے تنخواہ پانے والے معلموں کو پرچہ بنانے یا امتحان کی کاپیوں کے جانچنے کا معاوضہ نہیں ملتا تھا۔ اس کی تلافی مرزا صاحب نے کچھ اس طور پر کی تھی کہ جو لوگ نگرانی کے کام پر مامور ہوں لمونیڈ اور برف ان کی خدمت میں مفت پیش کی جائے۔ اس کا حساب کُندن رکھتا تھا اور مرزا صاحب ان اخراجات کی ادائیگی امتحان فنڈ سے کرتے تھے۔ ایک دن آفس پہنچا تو دیکھا کہ مرزا صاحب کُندن پر گرج رہے ہیں۔ قصّہ یہ تھا کہ ایک صاحب نے نگرانی کے دوران میں ڈیڑھ درجن بوتلیں اور اسی حساب سے برف پی ڈالی تھی۔ مرزا صاحب کُندن پر بگڑ رہے تھے کہ تو نے یہ صورت حال دیکھی تو مجھے کیوں نہ اطلاع کی۔ اس طرح تو امتحان فنڈ کا دیوالہ نکل جائے گا۔ مرزا صاحب کے حضور میں کُندن کسی قدر شوخ تھا کہنے لگا، حضور اطلاع کرتا تو پہلے ...... صاحب کے گھر والوں کو کرنا آپ کو کرنے سے کیا فائدہ تھا! مرزا صاحب نے فوراً اس وجہ پر بھی سرخ پنسل سے نشان لگا کر بل پاس کر دیا لیکن آئندہ کے لئے یہ رعایت ہمیشہ کے لئے اُٹھالی! چو از قومے یکے بے دانشی کرد!

مرزا صاحب نے اندرونی ممتحنوں کے لئے ایک رعایت اور رکھی تھی۔ ہر سال امتحان کی پرانی کاپیوں سے سادے اوراق نکال کر نئی کاپیاں بنائی جاتی تھیں۔ ہم میں سے جو لوگ مرزا صاحب کے حیطۂ خوشنودی میں کوئی ممتاز مقام رکھتے تھے اور موصوف کو یقین دلا چکے ہوتے کہ ہم کو لکھنے پڑھنے کا کام دوسروں سے زیادہ کرنا پڑتا ہے، ان کا موصوف نے منصب یا وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ جیسے مغلوں کے ہاں پنج ہزاری یا سہ ہزاری منصب دار یا نوابانِ اودھ کے ہاں وثیقہ دار ہوتے تھے اُسی طرح مرزا صاحب کے ہاں پنج سیری سے لے کر آدھ سیری تک کے منصب دار ہوتے تھے یعنی ان کو ہر سال اتنے ہی سیر یا آدھ سیر امتحان کی کاپیوں سے نکالے ہوئے سادے اوراق دئے جاتے تھے۔ بعض اس کو مرزا صاحب کے جلوسِ شاہی کا یوم تقریب، دوسرے اس کو فصل کی تیاری اور بٹائی کا زمانہ قرار دیتے تھے۔

یہ منصب داری یا وثیقہ یابی عظمت الٰہی زبیری کے عہدِ رجسٹراری تک برقرار رہی۔ اس کے بعد یہ قصّہ ختم ہوگیا۔ کُندن کے سپرد یہ کام تھا کہ وہ یہ اوراق تول تول کر بنڈل باندھتا اور ہمارے گھروں پر پہونچا دیتا اور ہم سب کی توفیق کے مطابق انعام پاتا۔ کُندن یہ بنڈل لے کر آتا تو میں پوچھ بیٹھتا کہ کیوں کُندن مرزا صاحب کے حضور میں ہماری کارگزاری میں کوئی فرق تو نہیں آیا۔ تول ٹھیک ہے؟ کہتا، حضور بالکل ٹھیک ہے کھاتر جمع رکھیں۔ ایک دن کُندن کی عملداری میں سے گذرا۔ نئی کاپیوں کے لئے پُرانی کاپیاں پھاڑی جارہی تھیں۔ پوچھا، کُندن ہمارے وثیقے کا کیا ہوا۔ بولا، حضور اب نوابی (نوابی) نہیں رہی، دوسری عملداری ہے! میں نے کہا کوئی بات نہیں، تم تو اپنا وثیقہ وصول کرنے کے لئے نوابی زمانے والوں کے پاس آہی جایا کرو۔

کچھ دنوں بعد مرزا صاحب رجسٹرار ہوکر بیٹھ چلے گئے اور امتحانات کے لئے، جہاں تک سیٹیں فراہم کرنے اور ان کو ترتیب دینے کا سوال تھا، کُندن کو پورے اختیارات مل گئے۔ امتحانات سے آگے بڑھ کر سرکاری اور غیر سرکاری تقریبوں میں نشستوں کے انتظام کا فریضہ بھی رفتہ رفتہ کُندن کے حصے میں آگیا۔ اختیارات کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ کہیں سے کسی کو تفویض کئے جاتے ہیں، بعض لوگ جوڑ توڑ سے حاصل کرتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو بزم سے میں کوتاہ دستی کے قائل نہیں ہوتے بلکہ خود بڑھ کر ہاتھ میں اُٹھا لیتے ہیں تو مینا انھیں کا ہوجاتا ہے۔ لیکن کہیں کہیں ایسے اشخاص بھی ملتے ہیں جن کی طرف اختیارات خود کھنچے چلے جاتے ہیں جیسے پانی نشیب کی طرف مائل ہوتا ہے۔ ان ہی میں سے ایک کُندن تھا! تقریب کہیں ہو، کیسی ہی ہو، وقت کم ہو، مہمانوں کے بیٹھنے کا سامان فراہم کرنے میں کتنی ہی دشواریاں کیوں نہ حائل ہوں، گذشتہ ۳۰-۴۰ سال سے یہ مہم کُندن اس خوبی سے انجام دیتا تھا کہ سب حیران رہ جاتے!

مسلم یونیورسٹی میں یوں بھی طرح طرح کی جتنی چھوٹی بڑی صاف ستھری تقریبیں 'صلائے عام' کے اصول پر منعقد ہوتی رہتی ہیں میرا خیال ہے ہندوستان میں شاید ہی کہیں اور، اتنے سے مختصر رقبے اور آبادی میں جتنی کہ یونیورسٹی کی ہے، ہوتی ہوں۔ یہ اچھا ہے یا بُرا اس بحث سے قطع نظر واقعہ وہی ہے جو بیان کیا گیا۔ ان تقریبوں سے خوبی یا خرابی کا غالباً وہ تقاضا یا توازن نیم شعوری طور پر پورا کرلیا جاتا ہے جو بڑے بڑے شہروں مثلاً دہلی، کلکتہ، بمبئی وغیرہ کا امتیاز یا آشوب سمجھا جاتا ہے! یونیورسٹی کے بڑے عہدہ داروں کی ایک اہم صفت اوران کی ثبات همت و حواس کا قوی ثبوت ایک یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ انھوں نے ایک ہفتہ تک یونیورسٹی کے کھانے پینے کی ساری تقریبوں میں جہاں وہ بالضرور مدعو ہوتے ہیں خورد و نوش کے ساتھ شرکت کی اور اپنے معالج سے سرخرو رہے!

کسی شعبے یا شعبے کے کس کمرے میں کتنے ڈسک اور کرسیاں ہیں، کس حالت میں ہیں، کتنی ٹوٹ پھوٹ میں آگئیں، ان کے بدلے میں کتنی اور آئیں اس کی خبر جتنی کُندن کو تھی خود شعبے کے چپراسی کو نہ تھی۔ امتحان کا کاروبار پہلے کی نسبت بہت بڑھ گیا ہے۔ فرنیچر کی کمی، وقت کی تنگی، کمروں کی کمی' ان سب سے نپٹنے کے لئے کُندن کی' ایک شخصی وزارت' کا مشورہ اور مدد لازمی تھی۔ کُندن ہی بتا سکتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ کتنی نشستوں کا کہاں کہاں کس طرح انتظام ہوسکتا ہے۔ امتحان قریب ہوتا تو ہر شعبہ کے صدر کے نام رجسٹرار آفس سے ایک گشتی مراسلہ آجاتا کہ امتحان کے لئے زیادہ سے زیادہ جتنی کرسی اور ڈسک مہیا کئے جا سکیں، تشکر گزاری کے موجب ہوں گے یہ خط لے کر کُندن آجاتا۔ پوچھتا کُندن کیسے ادھر آنکلے؟ حضور امتحان نہ ہے' کُرسی ڈسک چاہئیں، بھئی یہ تو ہمیشہ کا دھندا ہے اس میں ایسا پوچھنا کیا، میاں خاں (شعبے کا چپراسی) اور تم آپس میں سمجھ لو۔ کُندن سامان اُٹھوا لے جاتا۔ امتحان کے ختم ہونے پر کُرسی اور ڈسک اسی کمرے میں اسی قرینے سے رکھی ہوئی مل جاتی جس طرح لے جائی گئی تھی۔

شعبہ کے فرنیچر پر نام اور نمبر کا اندراج بہت بعد کی چیز ہے۔ اس سے پہلے ان پر پہچان کا کوئی نشان نہ ہوتا۔ لیکن کُندن کے پہچان اور اٹکل کو کیا کہئے کہ ہزاروں میز کرسیوں کو پہچانتا تھا کہ ان کا گھر کہاں ہے، کس خاندان کی ہیں، ان کو وہیں پہنچا دیتا۔ فرنیچر کے گھرانوں (شعبہ جات جن کی امانت اور نگہداشت میں وہ فرنیچر تھے) میں کسی کو کبھی اس کی شکایت نہیں ہوئی کہ کسی بازار یا میلے میں اس کا کوئی عزیز غائب ہوگیا یا کسی کو اغوا کرلیا گیا!

کنووکیشن (جلسہ تقسیم اسناد) کی تقریب عام طور سے ساڑھے گیارہ بجے سے شروع ہوکر ڈیڑھ پونے دو بجے ختم ہوتی ہے۔ اسی پنڈال میں تقریباً

اتنے ہی اشخاص کے لئے عصر میں چائے کا انتظام کیا جاتا ہے۔ کنووکیشن کا جلسہ جس نوعیت کا ہوتا ہے جس طریقے سے جیسی گنجان نشستوں کا انتظام کیا جاتا ہے، چائے کے لئے اس سے بالکل مختلف ترتیب لازم آتی ہے۔ جلسے میں چھوٹی میزوں کی ضرورت نہیں ہوتی، چائے کے لئے ہوتی ہے۔ پھر ہر میز کے گرد چار یا چھ مہمانوں کے بیٹھنے کے لئے انتظام۔ تین گھنٹے کے اندر اندر اسی طرح کی صدہا میزوں کا لگانا اور سجانا اور جمع کی ترتیب کو یک لخت بدل دینا آسان کام نہیں ہے۔ دوپہر کے جلسے میں جو حضرات شریک ہوئے تھے سہ پہر کو چائے پر آئے تو دیکھا کہ سارا نقشہ ہی بدلا ہوا ہے جیسے صبح کا جلسہ کہیں اور نہیں تو کسی اور دن ہوا تھا۔ اسی پنڈال میں رات کو مشاعرہ ہونے والا تھا۔ بیٹھنے کا انتظام پھر بدلا جائے گا۔ جیسے دیتے ہوں دھوکا یہ بازیگر کھلا! رات گئے تک یہ ہنگامۂ شعر و سخن برپا رہے گا۔ دوسرے دن کندن اور کمپنی تمام میز کرسیاں حسب معمول اپنی اپنی جگہ پر پہنچا دیں گے!

جلالۃ الملک شاہ سعود اور اعلیٰحضرت شہنشاہ ایران کے مختلف اوقات میں ورود کی تقریبیں لوگوں کو یاد ہوں گی۔ چھ سات ہزار نشستوں کا انتظام اس میدان میں کیا گیا تھا جس میں اب یونیورسٹی لائبریری کی نئی عالیشان عمارت کھڑی ہے یہیں اُن کو اعزازی ڈگریاں دی گئی تھیں۔ سہ پہر کی چائے کا انتظام ایک دفعہ کرکٹ دوسری بار سوئمنگ باتھ لانس پر کیا گیا تھا، دونوں تقریبوں میں حسب معمول مشکل سے تین گھنٹے کا فصل تھا۔ پنڈال کا تقریباً تمام فرنیچر اتنے ہی عرصہ میں منتقل کرکے پلان کے مطابق ترتیب دینا کندن اور اس کے رفقا کا کام تھا۔

اس کے بعد اتنی بڑی پارٹی کو سجانے اور کھانے پینے کی اشیاء کو حسب منشا میزوں پر چن دینا دوسرے کندنوں کا کام تھا۔ انھوں نے ان پارٹیوں کا انتظام حسب معمول اس خوش اسلوبی سے کیا جیسے معلوم نہیں کتنی دیر پہلے سے وہ اس اہتمام میں مصروف تھے اور معلوم نہیں کیسے اور کہاں انھوں نے اس فن میں دستگاہ پیدا کی تھی۔ علی گڑھ میں ہر فن مولا نہیں تو ہر فن کے مولا مل جائیں گے جو اپنی اپنی وادی کے مسلمہ طور پر امام مانے جاتے ہیں اور کام کتنا ہی دشوار اور بڑا کیوں نہ ہو اس کو اس خوش اسلوبی سے اتنا جلد انجام دیں گے جیسے اُن کے پاس جادو کی کوئی چھڑی ہو یا موکل قبضے میں ہو۔

یونیورسٹی میں نجی تقریبیں بھی چھوٹے بڑے پیمانے پر ہوا کرتی ہیں۔ نشستوں کے لئے میز کرسی کی فراہمی کا انتظام کندن کے سپرد ہوتا تھا۔ بڑے سے بڑے پیمانے پر جتنی جلد اور جس خوبی سے وہ یہ سب انتظام کر دیتا اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا فرنیچر صحیح و سالم اپنی اپنی جگہ پر واپس پہنچا دیتا وہ صرف اسی کے بس کی بات تھی۔ چیخ پکار نہ دوڑ دھوپ نہ تو لنگار، کام اس طرح انجام پاتا جیسے کام کیا نہیں جا رہا ہے بلکہ خود ہوتا جا رہا ہے جیسے دن رات کا تواتر۔ ساتھی کام کرنے والوں کا جتنا پکا تعاون کندن کو نصیب تھا کم دیکھنے میں آیا کبھی بعض ممبرانِ اسٹاف کو کہیں سے فرنیچر منگانے یا ملنے میں اُن لوگوں کا سامنا ہوتا، یہ مرحلہ کندن بڑی آسانی سے طے کر لیتا۔ اس کا کسی شعبہ میں جا کر محض یہ کہہ دینا کافی ہوتا تھا کہ فلاں صاحب کے ہاں فلاں تقریب ہے، فرنیچر چاہیئے۔ اس کہنے کو تو کوئی نہیں ٹالتا تھا۔ حجت یا ٹال مٹول تو اس سے کی جاتی جس کے ہاں تقریب تھی، لیکن مانگنے والا تو کندن تھا۔ وہ ہر ایک کی خدمت کر چکا تھا اس کی کون نہ مانتا!

میرا خیال ہے کندن شاید اس سے زیادہ نہیں جانتا تھا کہ ٹوٹے پھوٹے ہندی رسم خط میں کچھ ہندسے یا ایک آدھ عبارت نوٹ کر لیتا ہو لیکن اس کی اٹکل اور قوتِ حافظہ غیر معمولی تھی۔ اپنے کاموں کے علاوہ مدتوں وہ امتحان کے دفتر میں بہت سے کام انجام دیتا رہا۔ اس دفتر میں کام کرنے کی ذمہ داری ہر شخص کے سپرد نہیں کی جا سکتی تاوقتیکہ اس پر کامل بھروسا نہ ہو۔ کندن کی ایمان داری اور راست بازی ہر شخص کے نزدیک اتنی مسلّم اور مستحکم تھی کہ امتحان کے دفتر ہی کا نہیں دوسرے سرکاری غیر سرکاری اور پرائیویٹ کام بے تکلف سپرد کر دئے جاتے تھے۔ کندن کے بیان پر کوئی جرح نہیں کرتا تھا وہ جو کہہ دیتا لوگ مان لیتے۔ دفتر نے ایک بار بالکل نئی سرکاری بائسکل پر اسے بینک یا سنٹرل پوسٹ آفس کسی ضروری کام سے بھیجا۔ کندن نے آکر بتایا کہ سائکل کوئی اُٹھا لے گیا۔ اس کی اطلاع تو احتیاطاً پولیس کو کر دی گئی لیکن یونیورسٹی میں کسی نے کندن سے سوال جواب نہیں کیا۔ یہ بات مان لی گئی کہ سائیکل چوری گئی اور بس!

امتحان کی کاپیوں کا ایک بنڈل کسی ممتحن کے پتے پر باہر بھیجا گیا۔ کچھ عرصہ بعد معلوم ہوا کہ پارسل سرے سے وصول ہی نہیں ہوا۔ یہ بہت بڑا اسٹیشن تھا جہاں کے گودام میں پارسلوں کی ایسی کثرت ہوتی ہے کہ کہیں

کوئی گڑبڑ ہو جائے تو کسی خاص پارسل تک رسائی ناممکن ہو جاتی ہے۔

اس مہم پر کُندن کو مامور کیا گیا۔ اس نے جا کر اسٹیشن پر ادھر اُدھر دریافت کیا۔ بابوؤں نے جیسا کہ ان کا قاعدہ ہے کبھی انکار کیا، کبھی ٹالنا چاہا، بالآخر کُندن نے وہ تیور اور لہجہ اختیار کیا جو کبھی کبھی بہ درجۂ مجبوری وہ یہاں اپنی سفر مینا کے بعض ممبروں سے اختیار کرتا تھا اور کہا کہ پارسل گھر میں لے چلو میں خود تلاش کر لوں گا۔ یہ آخر یا چیلنج اُن کو قبول کرنا پڑا۔ اس نے جا کر پارسلوں کے جنگل میں سے اپنا پارسل پہچان کر نکال لیا۔ امتحان کا زمانہ تھا۔ امتحان ہی کے طرح طرح کے بے شمار دوسرے پارسلوں کے علاوہ یکساں رنگ کے معلوم نہیں کتنے اور پارسل کہاں کہاں سے آئے ہوئے تلے اوپر گڈمڈ رکھے ہوں گے۔ ان میں سے کُندن کا اپنے پارسل کو دریافت کر لینا کتنے اچنبھے کی بات ہے!

۱۹۴۷ء کی قیامت برپا تھی۔ علی گڑھ کے نواح میں قتل غارت گری کی جیسی ہوش ربا خبریں آتی تھیں اور ہر طرف مایوسی اور درندگی کا جو عالم طاری تھا اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اس زمانے میں یہاں تھے۔ کُندن کا مکان دودھ پور میں تھا جو یونیورسٹی سے بالکل ملا ہوا ایک مختصر سے گاؤں کی شکل میں اس سڑک کے ہر دو طرف آباد ہے جو یونیورسٹی فارم کو چلی گئی ہے۔ یونیورسٹی کھلی ہوتی تو تقریباً ہر روز کُندن سے دوچار ہونے کا اتفاق ہو جاتا، پوچھتا کہو کُندن کب تک یہ خون خرابا رہے گا، گاؤں میں کیا خبر ہے، کُندن سر جھکا لیتا جیسے ندامت اور رنج کے بوجھ سے دبا جا رہا ہو کہتا حضور، کالج پر سیّد صاحب کی دعا ہے۔ سب خیریت رہے گی، کالج کا بڑا نمک کھایا ہے، پرمیسر لاج رکھ لے! اس زمانے میں میں نے کُندن سے زیادہ مضطرب یونیورسٹی میں کسی اور ہندو کو نہ پایا۔ جیسے واقعی وہ اپنے آپ کو 'سیّد صاحب' کے سامنے جواب دہ سمجھتا ہو!

اس زمانے میں یونیورسٹی کے ایک مسلمان گھرانے کے بچے دہلی کے ایک ایسے محلے میں گھر گئے جہاں حادثے وقوع میں آ رہے تھے نہ کوئی جا سکتا تھا نہ وہاں سے کوئی باہر نکل سکتا تھا۔ کسی طرح کی مدد کہیں سے پہنچانے کی سبیل نہیں نکلتی تھی۔ علی گڑھ میں خاندان والے جس بے قراری کے عالم میں تھے وہ بیان سے باہر ہے۔ اس واقعے کا علم کُندن کو ہوا تو اس نے بے تکلف اپنی خدمات پیش کر دیں۔ صورتِ حال ایسی تھی کہ اس مہم میں خود کُندن کی جان کا خطرہ کچھ کم نہ تھا لیکن اس نے اس پر بالکل دھیان نہیں دیا۔ اتا پتا دریافت کیا اور بے محابا دلّی کی آگ میں کود پڑا۔ سب کو نکالا اور بہ حفاظت تمام علی گڑھ لا کر ان کے گھر پہنچا دیا۔ کیسے کیسے خطرات کا کس دلیری اور عقلمندی سے کہاں کہاں اس نے مقابلہ کیا اس کا ذکر اس نے خود کبھی نہیں کیا لیکن جن کو چھڑا لایا تھا وہ بتاتے تھے کہ کُندن پر کیا کیا گزری!

کُندن نے اس یونیورسٹی میں اپنے تمام چھوٹے بڑے ہم مذہبوں کی طرف سے یہ خدمت ایسی انجام دی ہے جس کو بھلایا نہیں جا سکتا اور وہ لوگ تو خاص طور پر نہیں بھول سکتے جن پر وہ زمانہ گزرا ہے۔ بڑے آدمی چھوٹی بات کر کے بھی بڑے بنے رہتے ہیں، چھوٹا آدمی بڑے کام کر کے بھی چھوٹا ہی رہ جاتا ہے۔ اسے کیا کہئے یا کہہ کر کوئی کیا کرے گا!

عرصے کے بعد حالات کچھ راہ پر آئے تو ایک دن یونیورسٹی میں یہ صدا سنائی دی کہ قلندروں نے کُندن کو دودھ پور کا راج پرمکھ قرار دے دیا۔ پوچھا، کیوں کُندن چپکے چپکے راج پرمکھ بن گئے، خبر نہ کی۔ بولا حضور، یہ لڑکے ہیں نا جب چاہیں خود راج پرمکھ بن جائیں جب چاہیں دوسرے کو بنا دیں، ان کا کیا!

اسٹریچی ہال کے دائیں بائیں زینے دار دو راستے ہیں جن کے سروں پر عالی شان کھلے محرابی دروازے ہیں جن سے سیّد محمود اور سرسیّد کورٹ میں آمد و رفت رہتی ہے۔ ان راستوں سے متوازی آمنے سامنے سہ دریاں ہیں جن کے پہلو میں ایک ایک کوٹھڑی ہے۔ ان میں سے ایک کُندن کے قبضے میں تھی۔ معلوم نہیں کب سے۔ یونیورسٹی کھلی ہو، اِدھر سے گزر رہئے تو کُندن اکثر سہ دری میں بیٹھا بیڑی پیتا یا کسی سے بات کرتا ملتا۔ اسٹاف کا کوئی ممبر ہو یا آفسوں کا کوئی عہدہ دار، دیکھ کر فوراً کھڑا ہو جاتا، سلام کرتا، مزاج پوچھتا، کبھی کبھی یہ بھی پوچھ لیتا کہ کوئی خدمت ہو تو وہ بجا لانے پر تیار تھا۔ جب تک دروازے میں سے گزر نہ جائیں کھڑا رہتا۔ تکریم کے خیال سے بھی اور شاید ذمہ داری کے اس تقاضے کے بنا پر بھی جس کا ممکن ہے نیم شعوری طور پر احساس ہو کہ اس کی عملداری سے آپ خیریت سے خوش خوش گزر جائیں!

عمر ستر کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ شکل سے پچاس سے زیادہ کا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ کبھی کبھی اس طرح کا احساس بھی ہوا جیسے کُندن کی عمر ایک خاص حد پر آکر ٹھہر سی گئی ہو۔ کم سے کم مجھے اس کے قویٰ، شکل وصورت اور رفتار وگفتار میں عرصے سے نمایاں تبدیلی محسوس نہیں ہوتی۔ ممکن ہے جسے روز دیکھتے اور عزیز رکھتے ہوں وہ ایسا ہی معلوم ہوتا ہو!

درمیانہ قد، گندمی رنگ، پتلا نقشہ، معمولی جُثہ، مضبوط جسم، گھنٹے ہی کی طرح بجتی ہوئی پاٹدار آواز۔ چہرہ بشرہ شریفانہ اور مردانہ۔ کس بلا کا مستعد اور محنتی یہ شخص تھا نہ دن دیکھتا نہ رات، نہ سردی نہ بارش۔ کبھی کوئی کہتا، کُندن بوڑھا ہوا اتنی محنت نہ کیا کر۔ تو وہی کلمہ دہرا دیتا جو اس کا تکیہ کلام سا بن گیا تھا یعنی "ہجو رہ کالج کا نمک کھایا ہے۔ پرمیشر نباہ دے!"

یونیورسٹی کی دی ہوئی وردی خاکی یا بھورے رنگ کا کوٹ، کبھی پاجامہ کبھی دھوتی پہنے اپنی عملداری میں، دکٹوریا گیٹ سے لے کر باب اسحٰق تک گشت لگاتا رہتا۔ آج وہ فضا ان لوگوں کو کتنی سونی اور سوگوار معلوم ہوتی ہوگی جنھوں نے ۳۰۔۳۵۔۴۰ سال تک مسلسل کُندن کو کام کرتے اور اس نواح میں چلتے پھرتے دیکھا تھا اور اس کی موجودگی کو یونیورسٹی کے اہم اور غیر منقطع معمولات سے تعبیر کرنے کے عادی ہو چکے تھے!

ایک دن میں نے کہا کُندن تم اپنے اس بارہ ماسی یونیفارم (بھورے کوٹ) میں خاص طور پر جب اپنی پلٹن کے ساتھ کام پر ہوتے ہو تو نپولین جیسے معلوم ہوتے ہو۔ نپولین کو جانتے ہو کون تھا۔ بولا میں جاہل کیا جانوں۔ میں نے کہا ہسٹری ڈپارٹمنٹ تمھارے سائے میں بسا ہوا ہے کسی دن وہاں پوچھ آنا۔ ایک زمانے میں کالے کوسوں دور ولایت میں تمھاری ہی طرح وہ بھی گھنٹے بجاتا رہتا اور کلاس کے طالب علموں کی طرح وہاں کے لوگ اور وہاں کی راجدھانیاں اُلٹ پلٹ ہوتی رہتیں!

آخر زمانے میں کُندن نے اپنے لئے ایک بڑا اور اچھا سا گھر بنوانا شروع کر دیا تھا۔ "کالج کا نمک کھانے کا" ایک تصرف یہ بھی ہے کہ ہم میں سے ہر شخص چاہے وہ منصب یا دولت کے اعتبار سے چھوٹا ہو یا بڑا تقریب منانے، تعلیم دلانے اور مکان بنانے کا منصوبہ بڑے ہی پیمانے پر باندھتا ہے ستم یہ کہ اپنا ہی نہیں دوسرے کا کام بھی اسی پیمانے پر کرتے کرانے یاد رکھئے کا جی چاہتا ہے۔ اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑتا ہے لیکن اب تک اس حرکت سے کسی کو باز آتے نہیں دیکھا گیا!

کُندن کی نظر اور نگرانی میں سرسیّد کی بنائی ہوئی عمارتیں رہیں۔ اسٹریچی ہال کا وہ تنہا تمام عمر کلید بردار رہا۔ یہ مضبوط شاندار تاریخی عمارتیں اس کے ذہن و دماغ پر مستولی تھیں۔ زندگی بھر وہ انھیں عمارتوں میں بیدار رہا۔ کالج کی تمام تقریبوں کی بساط وہی بچھاتا ظاہر ہے ان عوامل کا اثر اس کے فکر وعمل پر کیا پڑا ہوگا۔ "کالج کا نمک کھانے" کا ایک اور اثر بھی ہے سب اثروں سے زیادہ کاری اور خطرناک جو کُندن کیا وقت پر سبھی بھول جاتے ہیں یا خاطر میں نہیں لاتے وہ یہ کہ جتنا بڑا منصوبہ ذہن میں آتا ہے اس کو پورا کرنے کے وسائل اتنے ہی محدود ہوتے ہیں! کُندن بھی اسی تقدیر کا شکار ہوا!

تعمیر کے اخراجات آمدنی کی رفتار اور مقدار سے دن بدن تیزی سے بڑھنے لگے۔ اسی اعتبار سے فکر اور پریشانی میں اضافہ ہوا۔ اس کے قریب جو لوگ تھے ان کا بیان ہے کہ اس تعمیر کے چکر میں کُندن ادھ موا ہو گیا تھا۔ اقربا کی بے مہری اور سخت گیری نے بقیہ کمی بھی پوری کر دی۔ ایسے میں ایسا ضرور ہوتا ہے۔ سوچنے کی بات ہے نا قابلِ تسخیر کُندن نے کہاں پہنچ کر شکست قبول کی۔ شاید کُندن کو بچایا جا سکتا تھا!

کُندن کے بارے میں جیسے خیالات ذہن میں آئے اور جس طرح کے جذبات اُمڈے ان کی قدر وقیمت کا اندازہ اس طرح کر سکتے ہیں کہ اس کی جن باتوں سے اور مدت العمر کی غیر منقطع وفا شعاری اور فرض شناسی سے جو تاثرات ایک نارمل شخص کے دل پر بے اختیار طاری ہو جاتے ہیں ان کو رد کیا جا سکتا ہے یا ان سے روگردانی کی جا سکتی ہے یا نہیں۔ اگر نہیں کی جا سکتی تو آج یا کل دنیا کا چاہے جیسا رنگ ڈھنگ ہو، کُندن کی یاد تازہ رہے گی۔ ہم میں بہت سے ایسے ہوں گے بالخصوص نو وارد جو اس سے واقف نہ ہوں گے۔ وہ تو خیر گھنٹہ بجانے والا ایک معمولی شخص تھا یہ ادارہ اب اتنا پھیل گیا ہے اور پھیلتا جا رہا ہے کہ خود اسٹاف کے بہت سے اراکین آج یا کل ایک دوسرے سے واقف نہ ہو پائیں گے۔ اس

صورت حال پر ماتم کرنا تو اب کا کام نہیں ہے لیکن ان کو کیا کیجیے کہ جب تک ہم "گزشتہ سے پیوستہ" ہیں گزشتہ کا ذکرِ خیر ایک ایسی روایت ہے (اور یہی ایسی روایت ہے) جو نہ اب تک بدلی ہے نہ کبھی بدلے گی!

آج کی دنیا میں یہ بات خاص طور پر دیکھنے میں آتی ہے کہ وہ اتنی دیر تک نئی نہیں رہتی جتنی جلد پرانی ہو جاتی ہے۔ یہ سائنس کے نت نئے انکشافات اور ایجادات کا کرشمہ ہے۔ پرانی دنیا میں زیادہ دیر تک پرانی بنے رہنے کی صلاحیت تھی۔ پرانی دنیا کی یہ بات قابلِ فخر ہے یا نئی دنیا کی وہ۔ اس پہ یہاں کون بحث کرے۔ قابلِ لحاظ اور قابلِ فخر تو وہ شخصیتیں ہیں جو نئی پرانی کی قید سے آزاد ہوتی ہیں۔ ایسی ہی ایک شخصیت کندن کی تھی!

تاریخی دستاویزات کا تحفظ

ہمارے ملک میں بہت سی قدیم تاریخی دستاویزات افراد کے نجی قبضے میں ہیں۔ یہ دستاویزات ہماری نہایت قیمتی ثقافتی میراث ہیں۔ ان لوگوں کے پاس ان کو سائنٹفک طریق پر محفوظ رکھنے کا کوئی انتظام نہیں ہے نہ ہی وہاں قدیم دستاویزات کو مناسب طریق پر محفوظ رکھنے کی کوئی خاص پروا کی جاتی ہے۔ اس لئے بھارت کے قومی محافظ خانہ (نیشنل آرکائیوز) نے ایسے افراد سے اپیل کی ہے کہ وہ ان قیمتی دستاویزات کو محفوظ رکھنے میں امداد دیں جو بھارت کے ماضی پر روشنی ڈالتی ہیں تاکہ یہ ہمیشہ کے لئے برباد نہ ہو جائیں۔

بھارت کا نیشنل آرکائیوز (قومی محافظ خانہ) یہ کوشش کرتا رہا ہے کہ جن لوگوں کے ذاتی قبضے میں قدیم دستاویزات، فرمان، نشان، پروانہ جات، سندیں اور تاریخی اہمیت کے نادر قلمی نسخے ہیں، ان سے تحفے کے طور پر یا قیمتاً خرید کر ان کو محفوظ کیا جائے۔ ان کوششوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ اب تک یہ محکمہ دو ہزار سے زاید قلمی نسخے اور دستاویزات حاصل کر چکا ہے۔ پھر بھی قدیم دستاویزات کا بڑا بھاری ذخیرہ اب بھی لوگوں کے نجی قبضے میں ہے۔ نیشنل آرکائیوز ایسی قدیم دستاویزات "تحفتاً" قبول کرے گا اور اگر ان کے موجودہ مالکان اس امر کے خواہش مند ہوں تو ان مجموعوں کو ان کے نام سے معنون کیا جائے گا۔ جو مالکان اپنی دستاویزات مفت دینے پر رضامند نہ ہوں نیشنل آرکائیوز ان کی قیمت ادا کرے گا بشرطیکہ مطلوبہ قیمت مناسب ہو۔ اگر مالکان اپنی دستاویزات مفت نہ دینا چاہتے ہوں اور نہ ہی ان کو فروخت کرنے پر آمادہ ہوں تو اگر محکمہ ہذا کو چند یوم کے لئے دستاویزات دے دی جائیں تو وہ ان کے مائیکروفلم عکس حاصل کر لے گا۔ اگر کوئی شخص اس خدشے کے زیرِ اثر اصل دستاویزات اُدھار دینے پر تیار نہ ہو کہ ان کی دستاویزات محکمہ کو بھیجنے یا وہاں سے واپس آنے کے دوران میں گم نہ ہو جائیں تو نجی مالکان کے مکانات پر ان کے مائیکروفلم عکس تیار کرنے کے انتظامات کئے جا سکتے ہیں۔

شمیم کرہانی

غزل

جب تک نہ خوگرِ غمِ مہر و وفا تھے ہم — کچھ لذّتِ حیات سے نا آشنا تھے ہم

بیگانہ کر دیا تھا غمِ روزگار نے — ہم سے نہ وہ خفا تھے نہ اُن سے خفا تھے ہم

آوارہ گردِ عالمِ آشفتگی ہیں آج — کل رہگزارِ گل میں رفیقِ صبا تھے ہم

تا دُور چل سکا نہ زمانہ ہمارے ساتھ — نو وارد آشنا تھے لوگ تو دیرآشنا تھے ہم

کس سے کریں گلہ کہ جو غرقاب ہو گئی — اُس خوش نصیب ناؤ کے خود ناخدا تھے ہم

جھونکے خزاں کی گرم ہواؤں کے آئے ہیں — اُمیدوارِ آمدِ بادِ صبا تھے ہم

یارانِ سست گام سے مجبور ہو گئے — ورنہ ہوائے شوق سے پوچھو کہ کیا تھے ہم

آزادئ مزاج کی پابستگی شمیم
گلشن کی وسعتوں میں اسیرِ صبا تھے ہم

حسرت سہروردی

ترو ولّور

(تامل زبان کا ایک عظیم شاعر)

شاعری وہبی ہے اکتسابی نہیں۔ شاعر پیدا ہوتا ہے بنتا نہیں۔ شاعری جزو لیست از پیغمبری ہے۔ شاعر اپنی آنکھوں سے مستقبل کا مشاہدہ کرتا ہے کائنات کے تمام سربستہ راز شاعر کے سامنے از خود عریاں ہو جاتے ہیں۔ بڑا شاعر کسی قوم خطّے یا جماعت کے لئے نہیں ہوتا بلکہ وہ ساری کائنات کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ تمام دلائل ترو ولّور پر صادق آتی ہیں۔

ترو، ولّور اس نام کے دو جزو ہیں۔ ترو تامل زبان کا لفظ ہے جس کے معنے مقدّس کے ہیں اور ولّور جنوبی ہند کے ایک مخصوص طبقے کا نام ہے۔ اس شاعر کا نام اب تک نہیں معلوم ہو سکا ہے۔ یہ صرف اپنے طبقے کے نام کی مناسبت سے مشہور ہے۔ معتقدین نے ترو (یعنی مقدّس) کا جز بڑھا کر گویا اس کی عظمت کا اعتراف کیا اور یہ ترو ولّور کے نام سے آج بھی مشہور ہے۔

ترو ولّور کے متعلق اب تک جو معلومات حاصل ہوئی ہیں وہ تسلّی بخش نہیں ہیں۔ اب تک اس کے زمانے کا بھی تعیّن نہیں ہو سکا۔ نجی حالات اور ماحول کے متعلق بہت سی باتیں پردۂ خفا میں ہیں۔ تحقیقات جاری ہے شاید تامل زبان کے محقق مستقبل قریب میں ان امور پر روشنی ڈال سکیں گے۔

ترو ولّور کی تصنیف ترو کورل (مقدّس آواز) صرف تامل زبان ہی کی نہیں بلکہ دنیا کی قدیم ترین کتابوں میں شمار ہوتی ہے

جہاں تک روایتوں کا تعلق ہے اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ علاقہ مدراس ضلع مدورا میں پیدا ہوا۔ جو اس زمانے میں پانڈیوں کا دارالخلافہ تھا۔ یہ آگے چل کر شہر مدراس کے قریب میلا پور میں ایک جُلاہے کی حیثیت سے نمودار ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ جُلاہوں کے پیشے سے ولّور کو دلی رغبت تھی اور وہ اس پیشے کو دنیا کے تمام پیشوں سے افضل سمجھتا تھا۔ اس کی علمی لیاقت کے متعلق صرف یہ معلوم ہو سکا ہے کہ اس کا علم خداداد تھا۔ بظاہر وہ پڑھا لکھا آدمی نہیں تھا۔

نجی زندگی کے متعلق صرف یہ معلوم ہو سکا ہے کہ اس کی ازدواجی زندگی بڑی خوشگوار تھی۔ بیوی کا نام "واسوکی" تھا۔ بیوی کے انتقال کے بعد اس نے دوسری شادی نہیں کی اور سنیاس اختیار کر لیا۔

اس کے زمانے کے متعلق مختلف آراء ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کا زمانہ پیدائش حضرت مسیح کے بعد کا ہے، اور بعض لوگ اس کے زمانے کو پیدائشِ مسیح سے پہلے کا زمانہ بتلاتے ہیں۔ گمان غالب ہے کہ اس کی پیدائش مسیح کے فوراً بعد کی تو ہے لیکن مسیح کے بعد جلد ہی یہ عالم وجود میں آیا۔ تامل زبان کی دو اور مشہور نظموں 'سلاپدیکارم' اور 'منی میکالئی' میں ترو کورل کے اقتباسات ملتے ہیں جو پیدائشِ مسیح کے فوراً بعد کی تصانیف ہیں۔

ترو ولّور سے متعلق تامل عوام میں بہت سے قصّے مشہور ہیں جن میں زیادہ تر مبالغے کا پہلو نظر آتا ہے لیکن یہ سبق آموز ضرور ہیں۔ بیوی کے انتخاب کے متعلق جو قصّہ مشہور ہے۔ اس کا یہاں پیش کر دینا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ اس قصّے سے ترو ولّور کے نجی زندگی کے تصوّر پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

ترو ولور کے نزدیک ایک مشرقی عورت میں دو صفات کا ہونا لازمی ہے۔ سادگی اور شوہر کی اطاعت۔ ترو ولور کی خوش گوار ازدواجی زندگی کے قصے اطراف واکناف میں اتنے مشہور ہوگئے تھے کہ لوگ اس کا مشاہدہ کرنے کے لئے دور دور سے چلے آتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک شخص نے ترو ولور سے کہا کہ میں شادی رچانا چاہتا ہوں۔ بیوی کے انتخاب کے متعلق نصیحت کیجئے۔ ترو ولور نے جواب دینے کے بجائے اسے چند دن اپنے گھر پر مہمان رکھ لیا۔ دوسرے دن صبح جب میزبان اور مہمان دونوں ناشتہ کر رہے تھے اور ترو ولور کی بیوی واسوکی کنوئیں سے پانی لے رہی تھی۔ ترو ولور نے اپنی بیوی سے کہا کہ چاول بہت گرم ہیں۔ بیوی نے فوراً ڈول چھوڑ دیا اور پنکھا جھلنے لگی۔ مہمان کو بڑا تعجب ہوا کہ ٹھنڈے چاول کو بیوی بغیر چوں چرا ہوا دے رہی ہے۔ اس سے ترو ولور یہ بتانا چاہتا تھا کہ بیوی کو چاہیئے کہ شوہر کے ہر حکم کے سامنے سر تسلیم خم کردے۔

ترو کورل (یعنی مقدس آواز) ترو ولور کی تصنیف ہے جو آج سے دو ہزار سال قبل لکھی گئی۔ یہ تامل زبان کی اخلاقی شاعری کا ایک لاثانی کارنامہ ہے جس کا مقام تامل کے کلاسکی ادب میں بہت ہی بلند ہے۔

تامل زبان کے اسکالرز کا کہنا ہے کہ اگر تامل ادب العالیہ سے ترو کورل کو الگ کردیں تو کچھ نہیں رہ جاتا۔ دنیا کی تمام بڑی بڑی زبانوں میں اس کے تراجم ہوچکے ہیں۔ سب سے پہلے دو سو سال قبل کنسٹانشیس بشی نے جو ایک یہودی مشینری تھا اس کا ترجمہ لاطینی زبان میں کیا۔ بعد میں ڈاکٹر گرول نے جرمن اور لاطینی میں اس کا ترجمہ کیا۔ آگے چل کر مختلف لوگوں نے انگریزی زبان میں اس کا ترجمہ کیا۔ ۱۸۱۸ء سے ۱۸۸۶ء تک مختلف زبانوں میں اس کا ترجمہ کیا گیا۔ اس کتاب کے چند مخصوص ابواب کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں بھی ہوا۔ اس کے ترجمے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس کا ترجمہ فرانسیسی میں بہت پہلے سن ۱۷۶۷ء ہی میں ہوچکا ہے۔ ترو کورل کا مکمل ترجمہ فرانسیسی زبان میں حال ہی میں ایم لامارسی نے کیا ہے۔ اس کے علاوہ دنیا کی تمام جدید زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو رہا ہے۔ حال ہی میں روس نے اس کے ترجمے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ ہندوستان کی اکثر زبانوں مثلاً بنگالی، تلگو، ملیالم اور کنڑ میں اس کے ترجمے موجود ہیں۔ شری شنکر راج نائیڈو ریڈر ہندی مدراس یونیورسٹی قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اس کا بہترین ترجمہ ہندی زبان میں کیا ہے جسے مدراس یونیورسٹی نے شائع کیا ہے۔ اردو میں اب تک کسی نے اس کا ترجمہ نہیں کیا ہے۔ اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے ساہتیہ اکاڈمی نے اس کا انتظام کردیا ہے۔ جلد ہی یہ ترجمہ ارباب ذوق کی خدمت میں پیش ہوگا۔

ترو کورل مختلف عنوانات کے تحت تین حصوں میں اور کل ۱۳۳ ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب میں ۱۰ کورل ہیں۔ جس طرح دو مصرعوں سے ایک شعر بنتا ہے اسی طرح ایک کورل دو مصرعوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے کے ۱۹ ابواب نجی زندگی سے متعلق ہیں۔ ۱۳ ابواب میں یوگ اور اس کے فوائد بیان کئے گئے ہیں۔ اول کے چار ابواب میں پوری کتاب کا مختصر سا تعارف درج ہے۔ دوسرا حصہ سیاسیات پر مشتمل ہے۔ یہ پہلے حصے سے دوگنا اور تیسرے حصے سے تگنا بڑا ہے۔ اس حصے کا بڑا ہونا ہی ثابت کرتا ہے کہ ترو ولور کی نظر میں "سیاست" سماجی زندگی کے لئے ریڑھ کی ہڈی کا مقام رکھتی ہے۔ شاعر اس حصے کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ تیسرا حصہ "عشق و محبت" پر مشتمل ہے۔ تامل زبان کے اسکالرز اس حصے کو محبت کرنے والے دو دلوں کی پہلی ملاقات سے لے کر عارضی جدائی کے بعد دائمی ملاقات تک کے مختلف اوقات کے تاثرات کا حال بتاتے ہیں۔

اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ایک کورل (دو مصرعوں) میں ایک مکمل خیال کو پیش کیا گیا ہے جس کی نشست الفاظ اور انداز بیان کی تعریف نہیں ہوسکتی۔ ایک اور خصوصیت جس کا اظہار ضروری ہے وہ یہ ہے کہ کورل کا پہلا مصرعہ چار ارکان پر مشتمل ہے اور دوسرا تین رکنوں پر۔ اس کے باوجود صوتی لحاظ سے کانوں پر بار نہیں معلوم ہوتا۔

اوپر بیان کیا گیا ہے کہ یہ تین حصوں پر اور مختلف عنوانات کے تحت ۱۳۳ ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب دس کورل پر مشتمل ہے اور کل کورل کی تعداد ۱۳۳۰ ہے۔ ذیل میں حصہ اول کے پہلے تین باب سے چند کورل کے تراجم پیش کئے جاتے ہیں جن سے ترو کورل کی عظمت کا بخوبی اندازہ ہوسکے گا۔

۱۔ خدا کی تعریف۔ (۱) 'ا' سے جس طرح ہر زبان کے حروف تہجی کی ابتدا ہوتی ہے اسی طرح موجودات عالم کی ابتدا ذات خداوندی سے ہوئی ہے۔

(ب) وہ علم ہی کیا جو "عقلِ کُل" خدا کے قدموں کو چھو کر حاصل نہ ہوا ہو۔

(ج) انسان کے پھول جیسے دل میں بسیرا کرنے والے خدا کے چرنوں سے چمٹ جانے والا ہی زندۂ جاوید ہے۔

(د) وہ لوگ جو نفرت اور خواہشات سے بلند تر خدا کے چرنوں تلے بسیرا کرتے ہیں ہمیشہ دنیا کی مصیبتوں سے محفوظ رہتے ہیں۔

(ہ) وہ لوگ جو ذاتِ خداوندی کو سچی جان کر اس میں خود کو جذب کر دیتے ہیں غیر شعوری طور پر سود و زیاں کے غم سے محفوظ رہتے ہیں۔

۲۔ برسات کی تعریف

(ا) برسات پر زندگی کا دارومدار ہے۔ برسات جانداروں کے لئے 'امرت' کا درجہ رکھتی ہے۔

(ب) برسات ضروری غذاؤں کو پیدا کرنے کے علاوہ بذاتِ خود ایک غذا ہے۔

(ج) برسات نہ ہو تو بھوک کو مٹانے والی غذاؤں کو پیدا کرنے والے کسان ہل نہیں جوت سکتے۔

(د) آسمان سے بارش کے قطروں کا برسنا رک جائے تو یہ ہری دوب بھی اُگنا بھول جائے۔

(ہ) سمندر ہی سے اُٹھتا ہوا ابر برسات کی شکل میں پھر سے سمندر پر نہیں برسے گا تو یہ وسیع سمندر بھی خشک ہو جائے گا۔

۳۔ دنیا کو تیاگ دینے والوں کی بڑائی :۔

(ا) جو لوگ دنیا کی خواہشات کو چھوڑ کر سچائی کی راہ پر گامزن ہوتے ہیں ان کے کارناموں کو محفوظ کر لینا ہی صحیفوں کا کام ہے۔

(ب) جس طرح مرے ہوؤں کی تعداد کا اندازہ مشکل ہے، اُسی طرح ان لوگوں کی بڑائی کا اندازہ لگانا بھی ناممکن ہے جو خواہشات کی زندگی سے بہت بلند ہیں۔

(ج) یہ دُنیا اُسی کی ہے جو حواسِ خمسہ کی مختلف قوتوں کا صحیح علم رکھتا ہے۔

(د) بڑے لوگوں کے زندۂ جاوید اقوال خود اُن کی بڑائی اور بزرگی کے شاہد ہیں۔

(ہ) جو لوگ بلندیٔ اخلاق کی اِنتہا کو پہنچ چکے ہیں ان کا غصہ بڑا ہی خطرناک ہوتا ہے خواہ وہ ایک لمحے کے لئے ہی کیوں نہ ہو۔

نامیاتی کھاد کی پیداوار بڑھانے کے اقدام

خوراک اور زراعت کی مرکزی وزارت نے ریاستی سرکاروں اور مرکزی علاقوں سے کہا ہے کہ وہ کیمیاوی کھاد کے ساتھ ساتھ نامیاتی کھاد کے استعمال کی بھی ہمت افزائی کیا کریں۔

اس خیال کے پیشِ نظر کسان سبز کھاد اور ملواں کھاد کی پیداوار بڑھائیں اور ان کا زیادہ استعمال کریں۔ یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ کسانوں کو غیر نامیاتی کیمیاوی کھاد دیتے وقت ان سے یہ معلوم کر لیا جائے کہ وہ اپنے کھیتوں میں کتنی مقدار میں کھاد تیار کر سکتے ہیں یا دوسرے ذرائع سے حاصل کر سکتے ہیں۔

موجودہ تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ اگر ۴۰ ٹن نامیاتی کھاد کو ایک ٹن سلفیٹ آف امونیا کے ساتھ استعمال کیا جائے تو اس کے بہترین نتیجے نکلتے ہیں۔ خوراک کی فصلوں کے لئے اوسطاً ۲۰ سے ۴۰ پونڈ نائٹروجن فی ایکڑ استعمال ہوتی ہے اس طرح فی ایکڑ ۴ء ۱ ٹن سے ۶ء ۲ ٹن تک نامیاتی کھاد کی ضرورت ہوگی۔ نامیاتی کھاد کی پیداوار بڑھانے کے لئے پنچ سالہ پلانوں کے تحت متعدد اسکیمیں جاری کی گئی ہیں تاکہ مقامی طور پر بھی کسانوں کی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں۔





وزیراعظم پنڈت جواہرلال نہرو جامعہ رورل انسٹی ٹیوٹ دہلی،
کے پہلے جشنِ تقسیمِ اسناد سے خطاب فرما رہے ہیں



"پچھلے دنوں ایک سو بھوٹانیوں کی ایک پارٹی
بھارت درشن کے دورے پر آئی تھی۔ پارٹی
کے کچھ ممبر پروفیسر ہمایوں کبیر وزیر سائنسی تحقیقات
و ثقافتی امور کے ساتھ بیٹھے ہیں

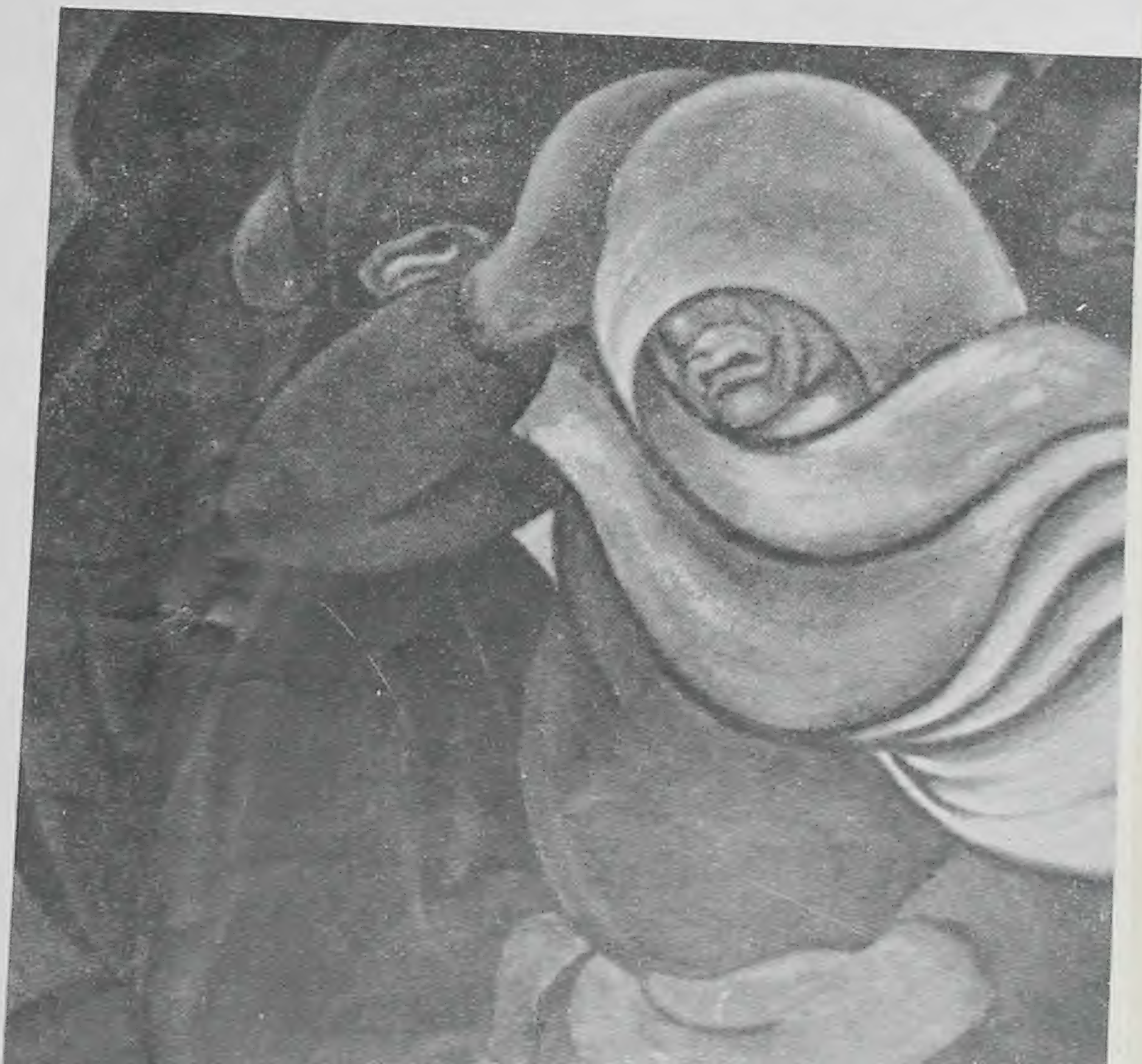


ایتھوپیا کے ولی عہد اور
ان کی بیگم سری نگر کے گورنمنٹ
آرٹ ایمپوریم میں کشمیری شال
ملاحظہ فرما رہے ہیں





یادگار



ماتمِ انبوہ



فن کار خود اپنی نظر میں



خاموشی



ستیش گجرال کے فنی شاہکار

آپ کے فن پر من موہن تلخ کا
مضمون صفحہ ۲۹ پر ملاحظہ فرمائیں



صاحبزادہ واجد علی خاں اشکؔ رام پوری

آپ کے باب میں عبدالسلام خاں کا

مضمون اسی شمارے میں شامل ہے۔



'تاریخ سلطنتِ خداداد' کے مصنف

محمود خاں محمودؔ بنگلوری مرحوم

آپ کے سوانح حیات صفحہ ۲۷ پر درج ہیں

نعمانی بنگلوری

محمود خاں محمود بنگلوری

علامہ ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کی حسرت ناک وفات کو ابھی چند مہینے بھی پورے نہ ہوئے تھے کہ دنیائے تاریخ و ادب خصوصاً جنوبی ہند کے علمی حلقوں کو ایک اور اہم شخصیت کی افادیت سے محروم ہونا پڑا ۔ یہ حادثہ جناب محمود خاں صاحب محمود کا دنیائے دنی کو خیرباد کہنا ہے ۔ مرحوم کافی عرصے سے ضیق النفس کی شکایت میں مبتلا تھے ۔ لیکن ستمبر ۱۹۵۹ء سے مرض نے شدت اختیار کرلی تھی ۔ علاج معالجہ سے کبھی افاقہ ہوجاتا تھا مگر دو تین مہینوں سے بالکل فریش ہوگئے تھے ۔ بالآخر جنوبی ہند کے اس ادیبِ شہیر اور مایۂ ناز مؤرخ نے ۷۲ سال کی عمر میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا ۔ اس طرح ملک و قوم اور علم و ادب کا ایک مخلص خدمت گزار ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہوگیا ۔

مرحوم بڑے خوش خلق ، ملنسار ، علم دوست ، علم پرور ، خوش فکر اہلِ قلم ، جنوبی ہند کے ممتاز و مسلّم مؤرخ تھے ۔ آپ کے رشحاتِ قلم قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے اور اپنی تاریخی تصانیف کے ذریعہ نہ صرف ہند بلکہ بیرونِ ہند میں بھی شہرت و مقبولیت حاصل کرچکے تھے ۔ آپ کا حلقۂ احباب ہند و پاکستان تک وسیع تھا ۔

مرحوم نے بنگلور کے سینٹ جوزف ہائی اسکول میں تعلیم پائی ، اور اپنی خداداد ذہانت سے انگریزی ادب میں کافی استعداد حاصل کرلی ۔ آپ اردو میں بھی اچھی دسترس رکھتے تھے ۔ شعر و شاعری کا بھی ذوق تھا ۔ محمود تخلص کرتے تھے ، لیکن فنِ تاریخ سے خاص بلکہ فطری لگاؤ رکھتے تھے اور سیاسیات سے بھی کافی دلچسپی تھی ۔ تحریکِ خلافت و سوراج کی تحریکوں میں نمایاں حصہ لیا ۔ برطانوی سامراجیت اور اس کی خارجی پالیسی پر بڑی بے باکی اور جرأت کے ساتھ تنقید کیا کرتے تھے ۔ آپ کے حریت پرور مقالات و مضامین زمیندار لاہور ، خلافت بمبئی ، ہلال بنگلور وغیرہ موقر اخبارات میں شائع ہوتے رہتے تھے ۔ تاریخ سے فطری مناسبت کے پیشِ نظر آپ نے اپنی زندگی کا مشن حضرت سلطان ٹیپو شہید اور ان کی سلطنتِ خداداد کے صحیح تاریخی حالات و کوائف کی تحقیق و تدقیق قرار دے رکھا تھا کیونکہ ہندوستان کے حریت پسند بادشاہوں میں سلطان شہید رح کی ہی ایک ایسی شخصیت تھی جس کی بصیرت نے انگریزوں کے خطرناک منصوبوں کو بھانپا اور ہندوستان کو انگریزی سامراجیت سے نجات دلانے کے لئے جہادِ حریت کا علم بلند کیا اور اس راستہ میں اپنی جان کی بازی تک لگادی لیکن اس مردِ مجاہد کی سیرت و کردار اور اس کی حکومت کے قابلِ تقلید کارناموں پر انگریزی سیاست نے ایسے دبیز پردے ڈال رکھے تھے کہ اصلی خد و خال کا منظر عام پر آنا تقریباً ناممکن ہوگیا تھا حضرت عالمگیر رح کی طرح یہ مردِ مجاہد بھی انگریز دلوں کی پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو ، کی رسوائے زمانہ پالیسی کی بدولت "ستمگر اور ہندو کش" ہو کر رہ گیا تھا ۔

مرحوم نے شیرِ میسور کی اصل شخصیت اور اس کی مظلومی کو منظرِ عام پر لانے کے کام کو اپنی زندگی کا مشن بنا کر ایک عزمِ راسخ کے ساتھ اس میدان میں قدم رکھا اور پوری ہمت و پامردی کے ساتھ اپنے نیک مقاصد میں کامیابی حاصل کرکے رہے ۔ اس سلسلے میں مرحوم کو بڑی جد و جہد اور عرق ریزی کرنی پڑی ۔ اس موضوع سے متعلق تمام فارسی ، اردو اور انگریزی کتابیں

کو فراہم کیا۔ میسور کے قدیم خاندانوں اور معمر بزرگوں کا پتہ لگایا۔ ان تک پہنچ کر ان سے مستند زبانی روایتیں اور قلمی مخطوطات حاصل کئے۔ بڑی ہی صبر آزما کاوش کے بعد ایک کتاب مرتب اور شائع کی جس کا نام "تاریخ سلطنت خداداد" رکھا۔ یہ فخر اور خوشی کی بات ہے کہ مؤلف کی محنت ٹھکانے لگی، اصحاب فن و منظر نے اسے حسن قبول بخشا اور اس کو سلطنت خداداد اور شیر میسور کی مستند تاریخ تسلیم کر لیا۔ فی الحقیقت مرحوم کا یہ کارنامہ ان کا حاصل زندگی اور شاہکار تھا۔ ملک کے تمام مؤقر اور وقیع جرائد نے اس تالیف کا خیر مقدم کیا اور بہترین ریویو لکھے۔ اور اس تالیف کو ملک و قوم پر مرحوم کا احسان عظیم قرار دیا۔ قبولیت عام کے نتیجہ میں اس کتاب کے اب تک چار اڈیشن نکل چکے ہیں اور ہر نیا ایڈیشن سابق ایڈیشن سے بہتر صورت میں اور جدید تحقیقاتی اضافوں کے ساتھ شائع ہوتا رہا ہے۔ پہلے ایڈیشن کی بہ نسبت جو تھا ایڈیشن ضخامت میں تین گنا ہو گیا ہے۔ مرحوم کو سلطان شہید سے کچھ ایسی عقیدت تھی کہ مرتے دم تک انھوں نے تحقیقات کے کام کو جاری رکھا۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ واقعات کی تحقیق کے سلسلہ میں مرحوم نے متعدد بار سرینگا پٹم کا سفر کیا اور سلطان ٹیپو کے مسمار شدہ قلعہ کے کھنڈر کا بار بار معائنہ کیا اور تاریخی شواہد کی روشنی میں دورانِ جنگ کی بعض تاریخی واردات کا محل وقوع تلاش اور متعین کیا۔ مثلاً آخری جنگ کی ابتدا کہاں سے ہوئی۔ غداروں نے دشمنوں کو قلعہ کے اندر گھس آنے کا موقعہ کیسے پیدا کیا۔ سلطان شہید سے فیصلہ کن معرکہ کس جگہ ہوا۔ اور کس جگہ شہادت ہوئی۔ غدار میر صادق کو کس مقام پر قتل کیا گیا وغیرہ وغیرہ۔ اب قلعہ سرینگا پٹم میں جہاں جہاں کتبے لگائے گئے ہیں یہ مرحوم ہی کی تحقیق و کوشش کا نتیجہ ہیں۔ مرحوم کی تمام تصنیفات و تالیفات اپنے اندر بہت افادیت رکھتی ہیں اور قوم کے جذبۂ آزادی اور حب الوطنی کو ابھارتی ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کی کتابوں کی نوعیت و افادیت پر ایک اجمالی نظر ڈالی جائے:۔

۱۔ سلطان شہید اس سلسلہ کی ابتدائی مختصر سی کتاب ہے جو حضرت سلطان شہید کی سیرت سے متعلق ہے۔

۲۔ دوسری جامع تصنیف "تاریخ سلطنت خداداد" ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے کہ اس سے مستند اور صحیح تاریخ دوسری کوئی اب تک شائع نہیں ہوئی۔

۳۔ حیدر علی۔ ایک ناول ہے جس میں حیدر علی کی سیرت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

۴۔ صحیفۂ ٹیپو سلطان۔ دو جلدوں میں ہے۔ یہ سلطان شہید کے خطوط فرامین و احکام کا انگریزی سے اردو ترجمہ ہے۔ لیکن ان خطوط و فرامین پر جا بجا جو وضاحتی نوٹ اور حواشی مرحوم نے لکھے ہیں اس سے مترجم کی وسعتِ نظر اور فکری کاوش کا پتہ چلتا ہے۔

۵۔ تاریخ جنوبی ہند۔ مرحوم کی ایک اہم تالیف ہے جس کو قبول عام نصیب ہوا۔ یہ کتاب بعض امتحانات میں بطور کورس پڑھائی جاتی ہے۔

۶۔ "ہندوستان کی فیصلہ کن جنگیں" یہ بھی ایک تالیف ہے جن میں ان جنگوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کے نتیجہ میں ہندوستانیوں کو انگریزی سامراج کے چنگل میں بے بس ہونا پڑا۔

۷۔ "تاج" مرحوم کی قابلِ قدر تالیف ہے جس میں تاریخ کے ناقابل تردید ثبوت کے ساتھ یہ ثابت کر دیا گیا ہے کہ ہندوستان کی عجائب روزگار حسین و جمیل عمارت تاج محل آگرہ کے بنانے والے اطالوی یا فرانسیسی نہیں ہیں بلکہ ہندوستان ہی کے مایۂ ناز مہندس ہیں۔ علامہ ڈاکٹر سید سلیمان ندوی مرحوم نے اس تحقیق کی داد دی اور اس کے لئے ایک طویل دیباچہ بھی لکھا ہے۔ علامہ مرحوم کی اس قدر افزائی پر مصنف کو زندگی بھر ناز رہا۔

۸۔ "انقلابات ہیں زمانے کے" اور "اتفاقات ہیں زمانے کے" دو تاریخی افسانے ہیں۔ آخر الذکر کتاب میں ایک مفید جدت سے کام لیا ہے اور ہر افسانے کے شروع میں اس افسانے کا تاریخی پس منظر پیش کر دیا ہے۔ مرحوم کی خواہش تھی کہ اس جدید طرز پر اسلامی اور ملکی تاریخی افسانے لکھے جائیں۔ اس کے لئے کام بھی شروع کر دیا تھا۔ ایک دو افسانوں کے مسودات بھی پورے ہو چکے تھے کہ مرض کے جان لیوا حملے نے تکمیل کی مہلت نہیں دی اور اس کے ساتھ عمر کا پیمانہ بھی لبریز ہو گیا۔

غرض مرحوم کی زندگی کا بیشتر حصہ علم و ادب کی خدمت اور قوم کے نوجوان افراد میں جذباتِ حریت و آزادی پیدا کرنے میں بسر ہوا۔ مرحوم اگرچہ اب ہم میں موجود نہیں ہیں لیکن ان کی بیش قدر تاریخی تصنیفات موجود ہیں جو ان کی یاد کو مدتوں تک باقی رکھیں گی

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالے مرحوم کو ان کی خدمات حسنہ کا بہترین اجر عطا فرمائے اور اپنی خوشنودی سے سرفراز کرے اور مرحوم کی بیوہ اور دیگر پس ماندگان کو صبر کی توفیق دے۔

من موہن تلخ

ستیش گجرال — ایک موضوعِ بحث مصوّر

ہندوستانی فنِ مصوّری کی گذشتہ پچاس برسوں کی تاریخ میں شاید ہی کوئی ایسا مصوّر پیدا ہوا ہوگا جس کے بارے میں اتنی مختلف رائیں اتنی شدّت سے سننے اور پڑھنے میں آئی ہوں۔

۱۹۵۲ء کی بات ہے دہلی کے اخبارات میں ایک نوجوان مصوّر کے بارے میں کچھ لکھا گیا — کچھ کیا؟ اتنا کچھ لکھا گیا کہ تمام ملک کی نگاہیں اس آرٹسٹ کی طرف اٹھیں اور پھر یہ فن کار ایک آندھی کی طرح اُٹھا اور نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دنیا میں گھوم گیا۔ جہاں کہیں اس کے فن کی نمائش ہوئی وہیں کے اہلِ نظر چونک اُٹھے۔ اس کی ایک خاص وجہ تھی ستیش گجرال نے اپنے فن میں اُس غم و کرب کی ترجمانی کی تھی جس نے ایک بار تو ہندوستان کی تہذیبی بنیادوں کو جڑ سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میرا مطلب ہے ۱۹۴۷ء کے واقعات ا

ستیش گجرال ۲۴ دسمبر ۱۹۲۵ء کو جہلم میں پیدا ہوئے تھے۔ بچپن میں ایک مہلک بیماری کے ہاتھوں سُننے کی نعمت سے محروم ہو گئے۔ قدرت نے ایک ننھے اور معصوم دل پر اتنی کاری ضرب لگائی لیکن واہ رے انسانی فطرت! ایسا حسین انتقام لیا کہ قدرت کو صفحۂ قرطاس پہ اُتار کے رکھ دیا۔

ہاں تو بات ۱۹۵۲ء کی تھی۔ یہ ستیش گجرال کی پہلی نمائش تھی اور دہلی کے صاحبِ نظر نقّادانِ فن اس نوجوان فن کار کے جذبے اور پیرایۂ اظہار کو دیکھ کر انگشت بدنداں ہو کر ہی نہیں رہ گئے بلکہ اُنھوں نے جی کھول کر داد دی اور ستیش گجرال کے فن سے بہت بڑی بڑی اُمیدیں وابستہ ہو گئیں۔ گجرال نے تقسیمِ وطن کے خونیں مناظر کو جس جذبے کے ساتھ فنِ مصوّری کا روپ عطا کیا تھا وہ سب کے بس کا روگ نہ تھا۔ انھوں نے کسی ایک طبقے یا فرقے کا ماتم نہیں کیا بلکہ ایک تہذیب اور پوری انسانیت کے خونِ ناحق کا ماتم کیا۔ اس مصوّری کے لئے ایک ایسی نظر درکار تھی جس کے سامنے کچھ بھی نہ چھپ سکتا ہو۔ ستیش گجرال کی نگہِ تیز حقائق کی تہ تک پہنچ گئی اُن کی تصویر "ماتم انبوہ" اُسی زمانے کی تخلیق ہے۔ تصویر میں عالم یہ ہے کہ سب چہرے، سب چہروں کے خط و خال اپنا اپنا انفرادی رنگ روپ کھو کر سراپا المیہ بن کے رہ گئے ہیں۔

دہلی کی نمائش کی کامیابی کے بعد ستیش گجرال فنِ مصوّری کی مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے میکسیکو چلے گئے۔ ۱۹۵۳ء میں میکسیکو کے پرستارانِ فن عوام اور صاحبِ نظر فن کاروں نے آپ کے فن کی داد دی۔ ۱۹۵۴ء میں امریکہ کے ہنرمند اصحاب نے اس ہندوستانی فن کار کے کمالات کو دیکھا اور ۱۹۵۵ء میں سرزمینِ انگلستان کے مہذّب و متمدّن، نکتہ دان و سلیقہ مند طبقے نے ستیش گجرال کے فن کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ یہ سب کچھ بتانے کا مقصد یہ تھا کہ ستیش گجرال اُن فن کاروں میں سے ہیں جنھیں قدرت جب حسنِ فن عطا کرتی ہے تو اُس کے ساتھ ہی قبولِ عام کی سند بھی بخش دیتی ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ ستیش گجرال بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں تو اس میں کسی قسم کی مبالغہ آمیزی نہ ہوگی۔

لیکن جب دُنیا بھر سے خراجِ تحسین حاصل کرنے کے بعد ستیش گجرال نے ۱۹۵۵ء میں دوبارہ دہلی میں اور پہلی بار بمبئی میں اپنے فن کی نمائش کی تو

وہ طوفان اٹھا کہ گجرال نے سُننے کی طاقت نہ رکھتے ہوئے بھی اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ اُن کی اس نمائش کو انتہائی طور پر مایوس کُن تو کہا ہی گیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان پر کچھ ایسے بھی الزامات آئے جن سے یہ طے کرنا مشکل ہو گیا کہ بیرونی ممالک کے دورے نے ستیش گجرال کے فن کو تقویت دی ہے یا نقصان پہنچایا ہے۔ پھر فن کی دُنیا ہے بھی تو ایسی ہی بے لاگ، بے باک بے رحم کہ یہاں ناکامی اور کامیابی کی حدیں بہت زیادہ ملتی جلتی ہیں۔ ذرا سی لغزش یا غفلت سب فیصلے بدل کے رکھ دیتی ہے۔ بے شمار اعتراضات میں سے ذیل کے دو بہت بڑے اعتراض تھے۔

۱۔ ستیش گجرال کے فن میں کوئی ارتقا نہیں ہوا۔ وہ اسپین اور میکسیکو کے قدیم عظیم مصوّر حضرات ایل گریکو اور آرزوکو کے اسلوبِ فن سے اس قدر مغلوب ہو کے رہ گئے ہیں کہ اُن دونوں عظیم مصوّروں کی چھاپ سے بچ نہیں سکتے۔ اُن کا اپنا اسلوب اس پرچھائیں میں دب کے رہ گیا ہے۔

۲۔ ستیش گجرال محض غم و یاس، حزن و کرب حتیٰ کہ قنوطیت کے مصوّر ہیں اور مزید برآں وہ بات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے لگے ہیں۔

آیئے! ہم اس تمہید کے پیشِ نظر ستیش گجرال کے فن کا تفصیلی جائزہ لیں۔ ان اعتراضات کی صحت میں شبہ کیا بھی جا سکتا ہے اور نہیں بھی لیکن ۱۹۵۵ء میں جو اعتراضات کئے گئے تھے آج ۱۹۵۹ء میں انھیں کو اور زیادہ شدّت اور تلخی سے دہرایا جانے لگا ہے۔ بقول[لہ] "دیویک" ستیش گجرال نے اپنے غم کو بہت زیادہ Dramatize کیا ہے۔ اور اگر ڈرامائی احساسات کو، جو کہ فن اور فنکار میں موجود ہوتے ہی ہیں، اپنی فکر کی جمالیاتی نگہِ انتخاب میسّر نہ آئے تو یہی حشر ہوتا ہے۔"

لیکن اس سلسلے میں جو افسوس ناک بات ہوتی وہ یہ تھی کہ ستیش گجرال کے مزاج پر اس تنقید کا کوئی اچھا اثر نہ پڑا ۔۔ جب میں نے اسی موضوع پر اُن سے بات کی تو وہ تلخی سے بولے "قوّت اور یاسیت کا امتزاج ایک ہی چیز میں کیسے پایا جا سکتا ہے یہ میری سمجھ سے باہر کی بات ہے۔ فن کی قوّت اُس کے موضوع میں نہیں اُس کے بیان میں ہوتی ہے۔ میں نے انسانی المیہ کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر ناظر کے نزدیک اُس بیان میں قوّت ہے تو ظاہر ہے کہ فن کار نہ تو خود المیہ کے آگے بے دست و پا ہے اور نہ ہی یہ کیفیت ناظر میں پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔"

اب یہاں جو بات معرضِ بحث میں آ جاتی ہے وہ یہ ہے کہ اوّل تو غم ہی ایک ایسا موضوع ہے جہاں ذرا سا بھی ذہین فن کار بلا کی قوتِ اظہار پر قادر ہوتا ہے ستیش گجرال تو ٹھہرے صفِ اوّل کے مصوّروں میں! اور پھر یہ بات بعید از فہم ہے کہ اس سوال کو ہیئت اور موضوع کا رنگ کیوں دیا جائے؟ یہ بات ٹھیک ہے کہ یوں تو فنونِ لطیفہ کے سبھی شعبوں میں ہیئت اور موضوع کا مسئلہ بہت گمبھیر ہوتا ہے اور فنِ مصوّری میں تو یہ مسئلہ جان لیوا صورت اختیار کر جاتا ہے لیکن آخر اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے؟ دُنیا کے ادب یا مصوّری کے عظیم شہ پاروں میں جو دخل ٹریجڈی کو رہا ہے زندگی کے اور کسی پہلو یا عنصر کو نصیب ہوا ہے؟ میرا بنیادی سوال یہ ہے کہ اگر کوئی فنّی تخلیق واقعی رُوح کی گہرائیوں میں اُتر جاتی ہے تو غم اور یاسیت کا کیا قصور! اُس سے فنّی تاثر میں کمی کہاں سے واقع ہو گئی! لیکن ان باتوں کا جواب ستیش گجرال کو ڈھونڈنا ہے نہ کہ نقادانِ فن کو۔ کیوں کہ جو سوال دیویک نے اٹھایا ہے وہ بہت بنیادی اور گہرا سوال ہے۔ جمالیاتی نگاہ ایک مصوّر کے لئے اتنی ہی ضروری ہے جتنا ایک جان دار کے لئے سانس لینے کا فعل۔ ستیش گجرال کی تصویریں ڈرائنگ رُوم کی زینت نہیں بن سکتیں۔ اس بات کا خود انھیں بھی نہ صرف پورا پورا اعتراف ہے بلکہ اس کی انھیں قطعی پروا بھی نہیں ہے۔ اور پھر وہ تو خود بھی Mannerism کے کچھ اتنے زبردست حامی نہیں ہیں۔

اُن کی اس بات سے کس کافر کو انکار ہو سکتا ہے کہ ۔۔" آج حُسن کی قدریں بدل گئی ہیں۔ اُس کا مفہوم بدل چکا ہے۔ آج حُسن کی تعریف یہ ہے کہ جو چیز کار آمد ہو وہی حسین ہے۔ جس چیز کا کوئی مصرف نہیں وہ خوبصورت بھی نہیں ہے۔" بہت بڑی بات ہے یہ، لیکن جب اسی سماجی روش پر فن کا سہارا لے کر چوٹ کی جائے گی تو اس بات کا اہتمام لازم ہو جائے گا کہ وہ چوٹ بھی جمالیاتی اور وجدانی احساس پر گراں نہ گذرے۔ اشاریت فن کی جان ہوتی ہے اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا، ہیئت اور موضوع دونوں دنیائے فن میں ایک دوسرے کے بغیر بے تاثیر و بے جان ہیں۔ مطلب یہ کہ گوئیم مشکل وگرنہ گوئیم مشکل کہنا اتنا مشکل نہیں ہے جتنا یہ کہ ؎

شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

لہ حوالہ از انگریزی جریدہ "سرج"۔ شمارہ بابت ۱۳ جنوری ۱۹۵۶ء

اب آپ شعروں کی جگہ "رنگوں کا انتخاب" کہہ لیجئے، بات وہی ہے۔ اس سے ذرا فن کار کی سلیقہ مندی کا پتہ چل جاتا ہے۔

ستیش گجرال کے فن میں جو بات بہت زیادہ نمایاں ہے وہ ہے اُن کے اظہارِ بیان کی شدّت، لاوے کی مانند اُن کے اُبلتے ہوئے جذبات کا دوٹوک اظہار۔ اُن کی تصویروں کے رنگ مجموعی طور پر ناظر کے ذہن کو کچھ اس طرح متاثر کرتے ہیں جیسے ایک اندھیری رات، ایسی اندھیری رات جب کہ ملگجی اندھیرے ہر چیز کی اصل حالت کو ڈھانپ کر اُسے محض احساساتی نقوش کی صورت عطا کر دیتے ہیں۔ وہ اندھیرے ماحول کو تصوّراتی نقوش کی صورت عطا نہیں کرتے۔ یہ فرق واضح رہے کیوں کہ محض احساساتی نقوش ہی انسانی آنکھ کو ذرا ذرا سی تفصیل کے لئے بے چین کر دیتے ہیں۔ تصوّراتی نقوش تو خود ہماری اپنی تخلیق ہوتے ہیں۔ انھیں تو خود ہم ذرا ذرا سی تفصیل دے کر اُبھارتے ہیں اور واضح کرتے ہیں۔ ہیئت اور موضوع کا یہی فرق ہے میں اس بات کو مزید تفصیل سے واضح کرتا ہوں۔

ذرا تصوّر کیجیے کہ رات کا گہرا سناٹا ہر طرف چھایا ہوا ہے سب بے ترتیب سامان سے اٹے پڑے ایک چھوٹے سے تاریک کمرے میں ایک موم بتی جل رہی ہے۔ کبھی کبھی ہوا کے جھونکے سے اُس موم بتی کی لَو تھرتھرا اٹھتی ہے۔ اُس کے تھرتھراتے ہی روشنی اور دھندلکے سے ملی جُلی اُس بے ترتیب سامان کی پرچھائیاں کمرے کی دیواروں پر ایک پُراسرار خاموشی کے ساتھ لہرا جاتی ہیں۔ اُن پرچھائیوں کی ہیئت اُن کے رنگ اور اُن کی وضع قطع کا اندازہ اُسی آنکھ کو ہو سکتا ہے جو اُس ہُو کے عالم میں کسی لاعلاج کرب کے مارے پلک نہ جھپکا سکتی ہو۔ اور اُن ناچتی ہوئی کبھی ہولناک، کبھی بے معنی سی پرچھائیوں میں اپنے دُکھ کو تلاش کر رہی ہو۔ یاد رہے کہ وہ آنکھ اُن پرچھائیوں میں اپنے دُکھ کی تلاش کر رہی ہے اُس دُکھ کا علاج نہیں ڈھونڈ رہی۔ ورنہ آرٹ اور صوفیانہ ادب میں کوئی فرق نہ رہ جائے گا۔ اب آپ اس عالم کو تصوّر پرستی، رومانیت یا ہیئت اور خوف کے فلاسفر کیرک گرڈ کے الفاظ میں "انہونی دہشت" کہہ لیجئے لیکن اسے ضبط اور جنون نہیں کہہ سکتے۔ اسی فنی مبالغہ آمیزی سے تاثرات حاصل کرنے والی بالغ نگاہ اُن تھرکتی اور ناچتی ہوئی پرچھائیوں کو خوف زدہ ہو کر نہیں دیکھتی بلکہ ایک حیرت و استعجاب کے ملے جُلے عالم میں اُن سے مطلب اخذ کرنے کی سعی کرتی ہے۔ ہاں اگر وہی فن کارانہ نگاہ اُن سایوں

سے لُطف اندوز بھی ہو سکے تو فن میں عمیق گہرائیاں اور بے پناہ وسعتیں آ سکتی ہیں۔ ہو بہو یہی بات ویلیک نے دوسرے الفاظ میں کہی ہے۔

ستیش گجرال کے سارے فن میں کوئی ایسی ہی رُوداد اپنی پرچھائیاں سمیٹتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ رُوداد یا تو فن کار کے دل و دماغ میں بار بار کوندے کی طرح لپک جاتی ہے اور فن کار اُس کے سایوں کا اس طرح تعاقب کرتا رہ جاتا ہے۔ع

جس طرح کرتی ہو دُوری کا تعاقب دُوری

یا وہ رُوداد ایک بار کوند کر فن کار کے ذہن پر کچھ ایسا نقش چھوڑ جاتی ہے کہ فن کار اُسے صفحۂ قرطاس پر اُتارنے کے باوجود اُس کے سایوں سے کھیلتا رہتا ہے۔ اُسے انگریزی میں Obsession بھی کہتے ہیں۔ ستیش گجرال کے فن میں دوسرا عالم زیادہ نمایاں ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں المیہ جس صورت میں بھی دیکھا ہے وہ اُن کے ذہن پر ایک امٹ نقش چھوڑ گیا ہے فن کار بنیادی طور پر تخیّل کا پُتلا تو ہوتا ہی ہے۔ ستیش گجرال نے جو کچھ دیکھا اُسی کی بناء پر اُن تمام حادثات کا تصوّر اور جائزہ لینا چاہا ہے جو اُن کے خیال میں کبھی پہلے یا پُرانے وقتوں میں گذر چکے ہوں گے۔ انھوں نے اُن تمام حادثات کا شکار انسان کو محسوس کیا اور اُن کا یہ احساس اب اتنی پختگی اور شدّت اختیار کر چکا ہے کہ انھیں اس بات کا بھرپور یقین ہے کہ انسان روزِ ازل سے ظلم و ستم کا شکار رہا ہے۔ یہ خیال بجائے خود ایک بہت بڑا المیہ ہے۔

اسی احساس میں اُن کا فن کہیں کہیں ڈرامائی ہو جاتا ہے۔ اسی احساس کے طفیل، وہ کبھی کبھی حقیقت کو اس طرح اپنی گرفت میں لے آتے ہیں کہ اُن کا فن اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک اُٹھتا ہے۔ مثلاً اُن کی تصویر "مناجات" ایک زبردست شدّتِ احساس کی حامل ہے۔ ستیش گجرال کے فن میں یہ خوبی بدرجہ اتم موجود ہے کہ وہ جہاں کہیں حقیقت کی تلاش میں کامیاب رہے ہیں وہاں انسانی رُوح کو اس طرح جھنجھوڑ کے رکھ دیتے ہیں کہ بات کہنے اور سُننے کی حدوں سے نکل کر دیدنی بن جاتی ہے۔ کون ایسا بے حس ہو گا جو "مناجات" دیکھنے کے بعد یہ نہ کہہ اُٹھے گا کہ یہ تصویر Compassion اور سچائی کی حامل ہے۔ اس تصویر کو بیان کرنے کے لئے اگر ہمیں ادب کا سہارا لینا پڑے تو ذہن میں ہیملٹ " "پینڈورا اینڈ دی فلائنگ ڈچ مین" کے ہیرو یا کسی بھی شیکسپیرین ٹریجک کیریکٹر یا ٹریجڈی کے بھرپور معانی کے پیشِ نظر جتنے بھی عظیم کرداروں کا تصوّر اُبھرے گا، یہ تصویر اُن سب کرداروں کی

ایک سرا نہیں دکھائی دیتی۔ تصویر کیا ہے گویا انسان اپنے آپ کو بد دعا دے رہا ہے۔
لیکن اس کے برعکس اسی انسانی المیہ کے احساس کی بنا پر جہاں اُن کے فن میں داخلیت دب کے رہ گئی ہے وہاں ستیش گجرال کا فن حدودِ مصوری سے نکل کر عالمِ تخیّل میں جا پہنچتا ہے۔ اور چوں کہ مصوّری الفاظ سے نہیں کی جا سکتی لہٰذا اُن کا فن ڈرامائی ہو کے رہ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اُن کی تصویر "یادگار" صریحاً پروازِ تخیّل کی تخلیق ہے۔ یہ تصویر ایک ایسی ڈرامائی شکل اختیار کر گئی ہے جس کی اصلیت کو فن کار کی آنکھ نے دیکھا نہیں بلکہ محض اُس کا تصوّر کیا ہے۔ دیکھنے اور تصوّر کرنے کے علاوہ ایک منزل پہچاننے کی بھی ہوتی ہے۔ انھوں نے اس تصویر میں اپنے جذبے کو پہچاننے کی بجائے بلکہ پہچانے بغیر اپنی قوتِ اظہار کے زور سے دوسروں کو احساس دلانا چاہا ہے۔ وہ اپنی تصویر "یادگار" کی وضاحت یوں کرتے ہیں۔

"یادگار بجائے خود ایک بہت بڑی ستم ظریفی ہے اور ہم اُس پر مزید ستم ظریفی یہ کرتے ہیں کہ پہلے کسی سچائی کا خون کر دیتے ہیں اور پھر اپنے ضمیر کی تسکین کے لئے ایک یادگار قائم کر دیتے ہیں۔"

اس وضاحت کے پیشِ نظر مصوّر نے تصویر میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ جس شخص کی یہ یادگار قائم کی گئی ہے وہ اس ستم ظریفی کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے تمام پردوں اور دیواروں کو چیر کر باہر نکلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ نیز کھینچی ہوئی لکیروں، مختلف انداز کے خطوط اور سرمئی اور گہرے رنگوں اور نقوش کے ذریعے مصوّر نے اپنے ایک ذہنی تاثر کو ہمارے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اصل خرابی یہیں سے شروع ہو جاتی ہے جب فن کار جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ کہہ نہیں پاتا اور پھر جو کچھ کہہ دیتا ہے اُسی میں اپنے ذہنی تاثر کو ڈھونڈھنے کی کوشش کرتا ہے۔ محض عنوان سے یہ تصویر اس مفہوم کی حامل نہیں ہو پاتی اور ہر جگہ اس عنوان کی وضاحت بھی پیش نہیں کی جا سکتی۔ یہ اکثر ہوتا آیا ہے کہ فن کار ایک خاص دلی کیفیت کا حامل ہوتا ہے۔ اب یہ سب باتیں اس بحث کو بہت دور تک نہیں لے جاتیں کہ موضوع کو کیا حیثیت عطا کی جا رہی ہے۔ کیوں کہ ایک تو تصویر کا اپنا مجموعی تاثر اس ساری بحث سے الگ ہو کے کھڑا ہو جاتا ہے اور فن کار، ناظر اور نقّاد ایک دوسرے سے بحث کرتے رہتے ہیں۔ دوسرے رنگوں کا جو مزاج ہوتا ہے، اُن میں جو جذبہ پنہاں ہوتا ہے، انھیں جس طرح مخصوص انداز سے انفرادی اور امتزاجی صورت میں پیش کیا جاتا ہے وہ اس ساری بحث کو بے معنی بنا دیتے ہیں اور تصویر کو اپنے ہی معانی عطا کر دیتے ہیں۔ سوائے ڈراموں کے (اور وہ بھی کہیں کہیں) اور کہیں بھی فن میں ڈرامائی انداز کو سراہا نہیں جاتا۔ کاش ستیش گجرال جیسا ذی ہوش مصوّر اس قسم کے فن میں کوئی جاہ و جلال ڈھونڈنے کی سعی نہ کرے۔ کیوں کہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ستیش گجرال کے فن میں زیادہ تر کون سے رنگ نمایاں ہیں۔ انتھاہ اُداسیوں کا ماحول پیدا کرنے والے سُلگتے ہوئے سُرمئی رنگ کی تہوں سے کہیں کہیں گلابی رنگ کی جھلک، تصویر کے ظاہری حصوں میں سبز رنگ کی پرچھائیاں، یا تصویر کے مرکز یا پس منظر سے گہرے پیلے رنگ پر سُرخ اور سرمئی رنگ کا گھر گھر آنا مصوّر کے مزاج کی ترجمانی اور عکّاسی کرتا ہے۔ ظاہر ہے ان تمام رنگوں میں غم و درد کے عنصر کے ساتھ ساتھ ایک ڈرامائی عنصر بھی موجود ہے۔ ذرا سی لغزش ہوتی نہیں کہ ساری تصویر اصلیت سے پرے ہٹ کر زور دار ڈرامائی انداز میں ڈھل گئی۔

آج ہمارے دَور میں ایک یہ روش بھی عام ہو گئی ہے کہ ایک معیار کو پرکھنے کے لئے کسی دوسرے معیار کو کسوٹی مانا جا رہا ہے۔ ستیش گجرال کے آرٹ پر بیرونی اثرات اور خاص کر میکسیکو کے مصوّروں کے اثرات کا جو الزام آتا ہے اس کا بیان خارج از بحث نہ ہوگا۔ بیرونی اثرات کے بارے میں جب میں نے اُن سے سوال کیا تو پوچھنے لگے "کیا آپ کے خیال میں جدید ہندوستانی زندگی بیرونی اثرات سے خالی ہے؟ فن ہمیشہ زندگی کا ترجمان ہوتا ہے۔ ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ تاثرات بذاتِ خود کوئی چیز تخلیق نہیں کرتے۔ وہ زیادہ سے زیادہ ایک فن کار کو تحریک دے سکتے ہیں۔"

میں اپنے ملک کے اس قابلِ قدر فن کار کے اس خیال سے متفق ہوتے ہوئے بھی اس حقیقت کی طرف اُن کا دھیان دلانا چاہوں گا کہ یہ بیان ایک طرح کا اعتراف بھی ہے اور اگر بیرونی تاثرات سے تحریک ملنے پر ہمارے دیش کا مصوّر سنبھلنے کی کوشش نہ کرے گا تو اُس کا فن واقعی نقّالی ہو سکتا ہے۔ یا کم از کم Original تو نہیں رہے گا۔ لیکن اگر اپنی اسی

بات کے ساتھ میں ستیش گجرال کے اُن چند الفاظ کا حوالہ نہ دوں تو یہ ایک ذہنی بد دیانتی کے علاوہ اُس مصوّر اور آپ کے ساتھ ناانصافی بھی ہوگی۔ اپنی بات کی وضاحت میں انھوں نے کہا تھا:

" ہندوستانی مصوّری کی روایات میں کوئی ایک اسٹائل نمایاں نہیں ہے۔ راجپوت، مغل، کانگڑہ، بنگال —— سب اپنا اپنا رنگ لیے ہوئے اسی مٹّی میں ختم ہو کے رہ گئے۔ جو باہر سے آئے وہ بھی یہیں گھُل مل کر رہ گئے۔ فن ایک ایسی تحریک ہے جس سے ماضی کا پورا آرٹ مستقبل میں جاری رہ کر اس ملک کے تمدّن کی روحِ رواں بن جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں انگریزی حکومت کی وجہ سے یہ ارتقا رُک گیا۔ یورپین تمدّن ہم پر ٹھونس دیا گیا۔ اس تمدّن کی قلم اس مٹّی میں ٹھیک طرح سے لگ نہیں سکی۔ لیکن سو برسوں میں یہ قلم بہت پرانی، بڑی اور مضبوط ہو چکی ہے۔ اب اسے توڑا نہیں جا سکتا کیونکہ انھیں سو برسوں کے طویل عرصے میں ہماری قدیم مصوّری کی جڑیں بھی سڑ گئیں۔"

غالباً اسی غلط قلم نے ہمیں بیرونی معیار کا محتاج بنا دیا ہے۔ اسی سے بیرونی تاثرات پنپتے ہیں اور غالباً اسی نے ہمارے ہاں اس روایت کو جنم دیا ہے کہ اگر کوئی تخلیق ہر پہلو سے عظیم نہیں ہے تو سرے سے بیکار ہے۔ اور یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ ہمارے ہونہار مصوّر اپنے اسلوب اور Originality کو نظر انداز کیے بیٹھے ہیں اور ہیئت اور موضوع کی غیر تخلیقی بحث میں نقّادوں سے لوہا لے رہے ہیں۔

میں امید کرتا ہوں کہ ہمارے ملک میں کوئی نہ کوئی مصوّر ایک نہ ایک دن ضرور کوئی نہ کوئی ایسی بات کر دکھائے گا جو خالص ہندوستانی ہوگی جو ہمیں خالص ہندوستانی مزاج اور معیار سے آشنا کرائے گی، اور ہمارے ملک میں کسی قومی معیارِ نظر کو جنم دے گی جس سے ہمیں اپنی کہی ہوئی بات کو اپنی نظر سے جانچنے اور پرکھنے کی توفیق ملے گی اس قسم کے مصوّروں کی فہرست میں ستیش گجرال کے شامل ہونے کے امکانات قوی ہیں۔

عمیق حنفی

گھٹا ہی جاتا ہے دم کاغذی حصاروں میں

مرے دماغ کے اطراف تا بہ حدِّ نظر
اُڑے ہوئے ہیں دواوینِ فیصل تن کتنے
کوئی بتائے کتابوں کے ان پہاڑوں کے
پہنچ سکے ہیں اُدھر صاحبانِ فن کتنے
سحر کی پہلی کرن بھی اِدھر نہیں آتی
ہوائے تازہ کے جھونکے اُدھر ہی رہتے ہیں
تھکی تھکائی اِدھر آتی ہے بسنت کی رُت
لطافتوں کے ہیولے اُدھر ہی رہتے ہیں
ریاضِ دہر کے پھولوں کو دیکھنا ہے محال
مرے بیان میں رنگت ہے کاغذی گُل کی
مری نگاہ سے فطرت کے ساز اوجھل ہیں
صدائیں سنتا ہوں عنقا نژاد بلبل کی
اسی جہانِ سیاہ و سفید میں رہ کر
مری زبان کتابوں سے لفظ چنتی ہے
مئے خیال بیاضوں سے کھینچتا ہے دماغ
اسی کمال پہ سر میری فکر دُھنتی ہے
نقوشِ کرمِ کتابی مجھے حدیثِ شعور
مری روش ہیں حواشی کے درمیاں کے سطور
سُنا ہے میں نے کہ محنت کدوں میں ہوتا ہے
ہر ایک لمحہ اشاراتِ نو بہ نو کا جنم
بدل دیا ہے محبّت نے استعاروں کو
نئے نئے ہیں پجاری نئے نئے ہیں صنم
علامتوں کا صنم زار ہے جہانِ بسیط
مگر وہ دیکھے جو پھاندے یہ کاغذی دیوار
مری غزل میں تشابیہہ، مہر و ماہ و نجوم
ہوئی ہیں شمس و قمر سے عمل کی آنکھیں بیمار
بڑھا دے ہاتھ مری زندگی کہ پہلی بار
یہ علم ہو کہ ترا ہاتھ کھُردرا ہو کہ نرم
ٹھٹھر رہا ہوں کتابوں کے برف خانوں میں
سمیٹ لے مجھے باہوں میں اور کر دے گرم
کھلی فضاؤں میں لے چل اڑا کے ساتھ مجھے
اُتار دے مجھے اپنے گرم خزانوں میں
علامتوں کے، اشاروں کے وہ صنم بتلا
جو ڈھلتے رہتے ہیں کھیتوں میں کارخانوں میں
سمجھ سکے مرا محبوب بھی مری طرزِ بیاں
کسی زبان میں پہنچے رہے خیال عیاں

نہ کوئی لفظ نہ کوئی خیال اچھوت رہے — مرا کلام، مری زندگی، ہو تیرا کلام
وہ کوئی رنگ کوئی بو کوئی صدا ہو تری — ہر ایک طرزِ ادا کو مرے قلم کا سلام
وہ لفظ ہو کہ معانی اگر کتاب سے آئے — بغیر تیری وساطت کے پا سکے نہ مجھے
بغیر تیری سفارش کے، کاغذی بُت کی — ادائے خاص بھی اپنا بنا سکے نہ مجھے
جو کرتے رہتے ہیں مرعوب مجھ کو ناموں سے — جو میرؔ و غالبؔ و اقبالؔ کے پجاری ہیں
نکال لیتے ہیں مجھ سے بھی رسم و راہِ قدیم — یہ اجنبی مرے ذہنِ رسا پہ طاری ہیں
خدا کے واسطے اس نرغۂ اجانب سے — بڑھا کے ہاتھ، مری زندگی، نکال مجھے
نکال کر مجھے پاتال سے زمین پہ چھوڑ — کھُلے گگن کی فضاؤں میں پھر اچھال مجھے

زبان، زندہ جہانوں میں سانس لینے لگے
خیال، تیری وفا کا ثبوت دینے لگے

سراجؔ حیدرآبادی

غزل

جنونِ شوق ابھی حدِّ اعتبار میں ہے — وہ سامنے ہیں، نظر اُن کے انتظار میں ہے
نہ جوئبار میں ہے اور نہ آبشار میں ہے — وہ رازِ غم جو مری چشمِ اشکبار میں ہے
نگاہ و دل کے حجابات اُٹھ گئے شاید — اک اضطرابِ مسلسل نگاہِ یار میں ہے
نفس نفس ترا پیغام سُن رہا ہوں مگر — قدم قدم تری منزل ابھی غبار میں ہے
بدل نہ دے کہیں تقدیرِ کائنات وہی — وہ ایک خم جو تری زلفِ تابدار میں ہے
کسی کے درد کو راحت بنا لیا میں نے — کسی کا جبر بھی اب میرے اختیار میں ہے

سراجؔ اُٹھ نہ سکے گا حجابِ حُسن ابھی
کوئی تو اہلِ نظر جلوہ گاہِ یار میں ہے

محبوب اللہ مجیب

ہندوستانی علوم کی مقبولیت مشرقی ممالک میں

محمد بن عبدالرحیم قلبیشی غرناطی نے "تحفۃ الالباب" میں لکھا ہے:-

"ہندوستانی علوم و فنون دنیا میں ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ فلسفہ میں بھی ماہر ہیں، طب میں بھی اور ریاضی میں بھی طرح طرح کی صنعتوں میں بھی۔"

ہنٹر کی رائے کے مطابق ہندوستان کا مشرقِ وسطیٰ سے تجارتی رشتہ بہت قدیم ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ہندوستان سے چاندی، مور اور بندر کرنت کے سامنے عرب، فلسطین اور مصر جاتے تھے۔ ان ملکوں کے تجار سلیمان آخر سے یعنی موجودہ جے پور سے چاندی اور جانوروں کو حاصل کرتے تھے۔

شام اور ایران پر قبضہ کرنے کے بعد عرب مشرق کی طرف بڑھے اور آہستہ آہستہ ہندوستان آ گئے۔ اس وقت جہازرانی کوئی آسان بات نہ تھی ہواؤں کے رخ پر کشتی اور زندگی کی کشتی دونوں کا دارومدار ہوتا تھا لیکن خوش نصیبی کی بات کہ بحر قلزم کی ہوائیں ہندوستان آنے کے لئے اتنی موافق پڑتی تھیں کہ جہاز کسی حادثے سے دوچار ہوئے بغیر یہاں تک آ جاتے تھے تجارت سے سکونت تک کی بھی بات آئی اور وہ مالابار کے ساحلی نواح میں آباد ہونا شروع ہو گئے۔ اسٹرک کے بیان سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ساتویں صدی سے ایرانی اور عرب تجار ہندوستان کے مختلف حصوں میں آ کر آباد ہونے لگے تھے۔

دوسری صدی اور اس کے بعد

لیکن جہاں تک ہندوستانی علوم و فنون کی مقبولیت کا سوال ہے وہ مشرقی ممالک میں بہت پہلے ہو چکی تھی۔ چھٹی صدی عیسوی میں ایران کے شہنشاہ خسرو نے اپنے دربار کے ہردل عزیز حکیم بارزوئی کو ہندوستان بھیجا اور اسے تلقین کی کہ ہندوستان میں آبِ حیات ملتا ہے اور وہ اسے ہر قیمت پر حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ بارزوئی یہاں مدتوں گھومتا رہا لیکن آبِ حیات نام کی کوئی شئے دریافت نہ ہو سکی۔ لاچار ہو کر وہ اپنے ملک واپس جانا ہی چاہتا تھا کہ کسی نے اس کو "پنچ تنتر" کا نسخہ دیا اور ہدایت کی کہ وہ اسے آبِ حیات کہہ کر اپنے شہنشاہ کے حضور میں پیش کرے۔ جب یہ نسخہ لے کر وہ ایران پہونچا تو بادشاہ بہت خوش ہوا اور فوراً پہلوی زبان میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد نوشیرواں کے زمانے میں اس کا ترجمہ فارسی زبان میں "انوار سہیلی" کے نام سے ہوا۔ اس کے بعد بھی ایک عربی ترجمہ ہوا اور اس کا نام "کلیلہ و دمنہ" رکھا گیا۔ یہ کام ابن مقفع کے ہاتھوں انجام پایا۔

سنسکرت قواعد پر حسین بصری نے ایک کتاب لکھی جس کا نام "کتاب البیان" رکھا۔ ہندوستانی علوم پر عربی میں جتنا کام ہوا اس کا مفصل بیان احمد بن یعقوب بن جعفر نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔ دوسرے عالم محمد بن اسحاق ابن الندیم نے اپنی کتاب "الفہرست" میں ایسی ہی کتابوں کا حوالہ دیا ہے۔ اس وقت تک ہندوستانی اطباء کا نام سرِ فہرست تھا۔ قاضی سعید اندلسی اور ابن ابی اصیبعہ نے اپنی اپنی کتابوں میں جن کا نام "طبقات الامم" اور "عیون الانباء فی طبقات الاطباء" ہے، ہندوستانی اطباء کا الگ الگ بیان کیا ہے۔ ابو زید سیرافی نے اپنی کتاب

"سفر نامہ" میں ہندوستان کی سماجی زندگی، رسوم اور بدھ مذہب کے بھکشوؤں اور دیوداسیوں کا بیان تفصیل سے کیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے مؤرخ اور سیّاح ہوئے ہیں جن کو ہندوستان سے خاص دلچسپی رہی۔ مثلاً "عجائب الہند" کا مصنف بزرگ بن شہریار "مالک الممالک" کا مصنف اصطخری، ابوالفراج، دمشقی، ابن بطوطہ، ابن حوقل اور ادریسی وغیرہ۔ ہندوستان کے مذہبی اصول پر شہرستانی کی ایک کتاب ہے جس کا نام "الملل والنحل" ہے

ہندوستان پر عربوں کے حملے آٹھویں صدی عیسوی سے پہلے ہی شروع ہوگئے تھے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا نام عبیداللہ کا ہے جو ایک عرب جنرل تھا لیکن اس کو شکست ہوئی اور وہ مارا گیا۔ یہی صورت بدایل کے ساتھ ہی اور وہ بھی مارا گیا۔ تیسری بار محمد بن قاسم نے جو ایک بیس برس کا خوبصورت نوجوان[1] تھا، اپنا ایک فوجی دستہ لے کر جس میں ۶ ہزار آدمی تھے، سندھ پر حملہ کیا[2] اور تین سال (۷۱۲ - ۷۱۵ء) کے اندر ہی اندر پورا قبضہ جمالیا، ساتھ ہی پنجاب کا حصہ بھی فتح کرلیا۔ لیکن خلیفہ سلیمان کے حکم سے واپس بلا لیا گیا اور مار ڈالا گیا۔ ۸۷۱ء تک سندھ خلیفہ ہی کے زیرِ اثر رہا اور مقامی اُمراء کے ہاتھوں اس کا انتظام ہوتا رہا۔ ہندوستان کا مشرقی ممالک سے یہ پہلا رشتہ تھا جو مضبوطی سے قائم ہوا اور ہندوستان میں مشترکہ تہذیب کا آغاز ہوا۔

ہندوستانی اطباء بغداد میں

بغداد شروع ہی سے علم وادب کا مرکز رہا۔ علوم وفنون کے شعبے کا کوئی آدمی ایسا نہیں تھا جو وہاں نہ رہا ہو۔ چنانچہ ہندوستان سے بھی بہت سے علماء بغداد گئے۔ بغداد میں جہاں ایک طرف فارسی اور عربی کے علماء جمع تھے تو دوسری طرف سنسکرت زبان کے ماہر، اطبّاء، ماہر نجوم اور اہلِ قلم بھی اکٹھے ہوگئے۔

عبّاسی خاندان نے ۷۴۹ء سے ۱۰۹۲ء تک حکومت کی۔ ان کے وسیع عہدِ حکومت میں زندگی کے مختلف شعبوں میں ترقی ہوئی۔ عرب علماء واہلِ دانش پہلے ہی سے علم وادب میں دلچسپی رکھتے تھے۔ انھوں نے تمام علماء کو اپنے یہاں اکٹھا کرلیا۔ چنانچہ جب عبّاسی خاندان کی حکومت کا دارالسلطنت دمشق سے بغداد منتقل ہوا تو دنیا کے مختلف حصوں سے علماء وہاں پہونچے اور شہر بغداد کی زینت اور رونق پہلے سے کہیں زیادہ ہوگئی۔ ہندوستانی علماء بھی کافی تعداد میں وہاں پہنچے۔ جن طبیبوں نے بغداد کو رونق دی ان میں سے مانک، صالح، دھان، شاناق اور کنکیرا کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

۱۔ صالح - یہ آیورویدک طرزِ علاج کے ماہروں میں سے تھا۔ صالح نے خلیفہ کے چچازاد بھائی ابراہیم کا علاج کیا اور بہت شہرت حاصل کی۔ کہا جاتا ہے کہ ابراہیم قریب المرگ تھا مگر صالح نے اس کی جان بچائی۔ صالح بہلا کا لڑکا تھا جو بذاتِ خود آیورویدک طرزِ علاج کا ماہر تھا۔

۲۔ دھان - یہ بھی مشہور حکیموں میں سے تھا اور بغداد کے اسپتال میں بحیثیت طبیب مقرر ہوا۔ جہاں بعد میں اس کا لڑکا اس کا جانشین ہوا۔ جس نے بہت سی سنسکرت کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا۔

۳۔ کنکیرا - یہ طب اور نجوم دونوں کا ماہر تھا۔ اس کی مختلف کتابوں کا عربی میں مندرجہ ذیل نام سے ترجمہ ہوا۔

ا۔ کنش (ادویات پر)

ب۔ النمودار (عمر کے بارے میں)

ج۔ احسن السلسلہ و دور فی القرآن (کائناتِ عالم کی حرکت کے بارے میں)

د۔ قرینۃ الکبیر و قرینۃ الصغیر (ماہ وسال کے بارے میں)

۴۔ مانک - ان سب حکماء میں مانک کا مرتبہ بلند تھا۔ یہ شخص فارسی اور سنسکرت دونوں زبانوں پر عبور رکھتا تھا۔ ان دونوں زبانوں کو وہ جس طرح پڑھ سکتا تھا اسی طرح لکھ بھی سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے ترجموں میں اصل جیسی روانی ہے۔ اس نے فارسی میں بھی ایک طب کی کتاب کا ترجمہ کیا جو زہر کے اثرات کے بارے میں ہے۔ مانک عرب دنیا سے پہلے پہل اس وقت روشناس ہوا جب خلیفہ ہارون رشید کی حکومت تھی۔ اس کی رسائی اپنی ذاتی قابلیت کی بناء پر خلیفہ کے دربار میں بہت جلد ہوگئی اور پھر اپنی ذہانت اور خلوص کی وجہ سے خلیفہ کے قریب ہوگیا۔ یہاں تک کہ جب خلیفہ ایک مہلک مرض میں گرفتار ہوا تو اس نے اس کا دل لگا کر علاج کیا اور خلیفہ اچھا ہوگیا۔ اس کے بعد اس کی اور بھی شہرت ہوئی۔

---

[1] ات المروۃ والسجۃ والنبل ہے محمد بن القاسم بن محمد۔ حمزہ ابو بیز (جنفی) (مغلوں سے پہلے ہندوستان میں فارسی ادب) عبدالغنی

[2] "این آؤٹ لائن آف اسلامک کلچر" اے ایم اے شستری جلد اوّل

ہ۔ شانق کے[1] ۔ یہ بھی اس زمانے کے مشہور و معروف حکیموں میں سے تھا۔ اس کی بیشتر کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہوا۔

ا۔ ایک کتاب اس نے زہر کے اثرات کے بارے میں لکھی اور جس پر ابنِ حاتم اور خود مانک کا تنقید و تبصرہ شامل ہے۔

ب۔ اخلاقیات پر اس کی کتاب کا عربی میں "منتہا الجواہر" کے نام سے ترجمہ ہوا۔

ج۔ اس نے مویشیوں کے علاج کے بارے میں اور علم نجوم پر کتابیں لکھیں۔

اس کے علاوہ دوسرے بہت سے حکیموں اور عالموں کی ایک طویل فہرست ہے جو علم ادویات کے علاوہ فلسفہ، حکمت اور نجوم پر عبور رکھتے تھے۔ مثلاً انکال، جبار، راجا، بھش، کراچار اور تانک وغیرہ۔

خالد بیارمکی کے حکم سے بھی سنسکرت سے عربی میں کچھ تراجم ہوئے۔ زہر اور خوراک کے بارے میں بھی ایک کتاب کا ترجمہ ہوا۔ مہابھارت کے کچھ ابواب کا ترجمہ صالح ابنِ شیب نے کیا۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں پہلے ہی سے علم موسیقی پر بہت سی کتابیں تھیں۔ انھیں میں سے ایک کا ترجمہ عربی میں ہوا جس کا نام "نفیر" ہے۔ عباسی خلفاء نے سنسکرت زبان کے جواہر پاروں کو اکٹھا کرنے کے لئے اپنے یہاں سے عالموں کی ایک بڑی تعداد بھی ہندوستان بھیجی۔ چنانچہ نویں صدی عیسوی میں محمد بن اسماعیل تنوکی جو علم نجوم کا ماہر تھا، ہندوستان آیا اور اس علم میں تحقیق کا کام شروع کیا۔

علوم و فنون کا مرکز بغداد نہیں ہندوستان

رفتہ رفتہ زمانے کے ہاتھوں ساری سلطنتیں برباد ہوگئیں۔ علم و ادب کا مرکز اب ہندوستان بن چکا تھا۔ عرب دنیا کا مشہور مورخ ابو ریحان البیرونی محمود غزنوی کے ساتھ ہندوستان آیا۔ اس کی پیدائش خیوا میں ۹۷۳ء میں ہوئی۔ اس نے یہاں آکر سب سے پہلے سنسکرت کے عالموں سے دوستی پیدا کی اور اس زبان پر پوری عبور حاصل کر لیا۔ اس کو تاریخ، مذہب، فلسفہ، ہیئت اور ریاضی سے بڑی دل چسپی رہی۔ تاریخ نویسی کی طرف اس کا رجحان پہلے ہی سے تھا۔ "کتاب الہند" میں اس امر کا انکشاف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "جن چیزوں کا سمجھنا مشکل ہو، اس کو جان لینے سے منزل آسان ہو جاتی ہے اور اس کو نہ سمجھنے کا سبب بھی معلوم ہو جاتا ہے، اس لئے کہ بے تعلقی کی حالت میں جو چیزیں نہیں معلوم ہو سکتیں وہ میل جول کی حالت میں معلوم ہو جاتی ہیں۔" چنانچہ ہندوستان میں رہ کے وہ لوگوں میں اُٹھ بیٹھ کر، بحث و مباحثہ کر کے چیزوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ "کتاب الہند" کے علاوہ "آثار الباقیہ" "پاتنجلی" (یوگ پر) "برہما سدھانت" (علم نجوم پر) تصنیف کیں۔

اس کے بعد دہلی سلطنت کا دور شروع ہوا۔ سلاطین دہلی نے بھی علوم و فنون میں گہری دل چسپی لی۔ دارالانشاء کا شعبہ قائم کیا گیا اور بہت سے لوگوں کو ترجمے کے کام پر مامور کیا گیا۔ بہرام شاہ کے دورِ حکومت میں اور اس کے بعد تک یعنی سلطان ابراہیم کے دورِ حکومت تک میر انشاء کا عہدہ ابو المعانی نصر بن عبدالحمید مستوفی کے ہاتھ میں رہا جس نے ابنِ مقفع کے کلیلہ و دمنہ کے عربی ترجمے کو فارسی میں منتقل کیا۔ جوالامکھی کے مندر سے سلطان فیروز شاہ تغلق کو قریب تیرہ سو سنسکرت کے نسخے ملے۔ اس نے فوراً سنسکرت کے عالموں کو اپنے دربار میں اکٹھا کیا اور ان کے ترجمے کا حکم دیا ان میں دلائل فیروز شاہی بھی شامل ہے جو کہ علم نجوم کے بارے میں ہے۔ شمس سراج عفیف اپنے زمانے کا زبردست مورخ گزرا ہے، اس نے بھی فیروز شاہ کے حکم پر موسیقی کی ایک کتاب کا "غنیۃ المنیات" کے نام سے ترجمہ کیا۔

سکندر لودی کے دورِ حکومت میں بھی کارہائے نمایاں ہوئے۔ خواص خاں کا بیٹا طب کے موضوع پر سنسکرت کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کرنے پر مامور ہوا۔ اور اس کا نام "طب سکندری" یا "معدن شفائے سکندری" رکھا گیا۔

کشمیر میں زین العابدین کے دورِ حکومت میں بھی مہابھارت اور راج ترنگنی کا فارسی میں ترجمہ ہوا۔ اس کے علاوہ اس نے ہندوستان کی تہذیبی زندگی کو سنوارنے اور بنانے میں بڑی مدد کی۔

مسعود سعد سلمان اور عبدالنتی دو فارسی کے بڑے شاعر تھے۔ انھوں نے ہندی الفاظ کا استعمال اپنے فارسی اشعار میں کیا۔ عوفی نے سعد سلمان (۱۰۴۶ء - ۱۱۲۱ء) کے بارے میں لکھا ہے کہ "وا ورا سہ دیوان است یکے بتازی یکے بہ پارسی و یکے بہ ہندوی"۔ سعد کے ہندی دیوان کے بارے

---

[1] "این آؤٹ لائن آف اسلامک کلچر" صفحہ ۳۲۳ جلد اول اے۔ ایم۔ اے شستری

[2] منتخب التواریخ - عبدالقادر بدایونی - جلد اول صفحہ ۲۴۹

میں تو کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن فارسی اشعار میں ضرور ہندی الفاظ کی آمیزش ہے :۔

برشگال اے بہارِ ہندوستاں　　　اے نجات از بلائے تابستاں

اے پرستار سنگ و گھر و رہن　　　دے گرفتارِ عشقِ شیخ و لگن

امیر خسرو ہندوستان کی قابلِ قدر ہستیوں میں سے تھے۔ خسرو امیر سیف الدّین کے لڑکے تھے۔ ان کے والد التمش کے زمانے میں خاص حیثیت کے مالک تھے۔ انھوں نے عماد الملک کی لڑکی سے شادی کی۔ اُن کی پیدائش پٹیالی میں ہوئی۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ وہ بلخ میں پیدا ہوئے۔ لیکن نُہ سپہر سے اس امر کا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان ہی میں پیدا ہوئے۔ ”ہست مرا مولد و ماوائے وطن“ (نہ سپہر) اس سے یہ بات یقین کرنے کی حد تک پہونچ جاتی ہے کہ وہ ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ خسرو ہندوستان میں فارسی شاعری کے چراغ تو تھے ہی لیکن دوسرے علوم کی روشنی پھیلانے میں بھی نمایاں حصہ لیا۔ علاؤ الدّین خلجی کے دربار کا استاد موسیقی گوپال نایک کا بھی چراغ ان کے سامنے نہ چل سکا۔ موسیقی میں مختلف قسم کے راگ اور راگنیاں انھیں کی ایجاد ہیں۔ خسرو نے ۶۷۱ھ میں حضرت نظام الدّین اولیاء کے ہاتھوں پہ بیعت کی۔ اتفاق کی بات کہ جس وقت شیخ کا انتقال ہوا تو خسرو ناصر الدین محمد تغلق کے ساتھ بنگالہ میں تھے۔ جب دہلی واپس ہوئے اور اپنے پیر کے وصال کی خبر سُنی تو ہوش کھو بیٹھے۔ بھاگتے ہوئے خانقاہ میں آئے جہاں حضرت شیخ ابدی نیند کا مزہ لے رہے تھے۔ دیوانگی میں آکر ان کے چہرے سے چادر ہٹادی اور روتے ہوئے بولے ”گوری سوئے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس“ اکثر خسرو کی ایک منظوم لغت کا بھی تذکرہ کیا جاتا ہے۔ اس میں کل ۲۱۵ اشعار ہیں۔ شروعات اس طرح ہوتی ہے :

خالق باری سرجن ہار　　　واحد ایک بدا کرتار

شہنشاہ اکبر کے زمانے میں ہندوستانی علوم و فنون، ہندی سنگیت، شاعری اور سنسکرت کی بیش قیمت کتابوں کے فارسی ترجمے کی طرف بڑی توجہ دی گئی۔ اکبر کو بھی کتابوں کا بڑا شوق تھا۔ ابو الفضل[۱] کا کہنا ہے کہ دربار میں روزانہ مختلف زبانوں کی کتابیں جن میں ہندی، سنسکرت اور عربی و فارسی کی کتابیں ہوتی تھیں، لائی جاتی تھیں اور بادشاہ کے سامنے پڑھی جاتی تھیں۔“ وہ لوگ جو سنسکرت سے ترجمہ کرنے پر مامور ہوئے، ان میں سے ابو الفضل نے عبد القادر بدایونی، شیخ سلطان تھانیسری، ملا شیری اور نقیب خاں کے نام لئے ہیں۔ اکبر نے ایک دار الترجمہ[۱] بھی کھولا۔ اس کے انچارج میر جمال الدّین حسین انجو بنائے گئے اور ان کی نگرانی میں ان کتابوں کے ترجمے ہوئے :

۱۔ سنگھاسن بتیسی	بدایونی
۲۔ اتھربن بید	شیخ فیضی، شیخ بھاون اور حاجی ابراہیم
۳۔ رامائن	بدایونی
۴۔ تاریخ کشمیر	ملا شاہ محمد شاہ آبادی
۵۔ لیلاوتی	فیضی
۶۔ مہابھارت	ابو الفضل (رزم نامہ)
۷۔ ہربنس	ملا شیری
۸۔ جوتش	خانخاناں
۹۔ عیار دانش	ابو الفضل
۱۰۔ تاجک (نجوم)	مکھن دل گجراتی

دربار کے مشہور ہندی کے شاعروں میں سے راجہ منوہر داس تھا۔ گنگا پرشاد یا گنگ کوی دربار کا سب سے با عزت شاعر تھا۔ یہ سنسکرت زبان پر بھی عبور رکھتا تھا۔ عبد الرحیم خانخاناں نے اس کی ایک نظم سے خوش ہو کر اس کو ایک یا چھتیس لاکھ روپے انعام دئے۔ اس کے علاوہ نرہر سہائے کرن، کرپارام، ہردل رائے پاتری (ایک شاعرہ جس کے نام ہندی کے مشہور شاعر لیکھشو داس نے اپنا دیوان 'کوی پریا' معنون کیا) بلبھدر مشر، کیشو داس، جیا اور بال کرشن ترپاٹھی ناتھ وغیرہ جیسے بڑے بڑے ہندی کے شاعر تھے۔

شہزادہ داراشکوہ کو بھی جسے شاہجہان شاہزادہ بلند اقبال کہا کرتا تھا، ہندوستانی فلسفہ و مذہب سے بڑی دل چسپی رہی[۲]۔ اس نے

۱۔ آئینِ اکبری (بلاخ مین۔ انگریزی) جلد اوّل، صفحہ ۱۱۰

[۱] تاریخ آگرہ اور اکبر اعظم، انتظام اللہ شہابی، صفحہ ۳۱

[۲]۔ داراشکوہ اور اس کی تصانیف، آج کل (اردو) اپریل ۱۹۵۹ء

اپنشد کا ترجمہ فارسی میں 'سرِ اکبر' کے نام سے کیا۔ ۱۶۵۴ء میں اس نے ویدانت اور تصوف پر ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام "مجمع البحرین" رکھا۔ اس نام میں بھی بڑا استعارہ چھپا ہے۔ یعنی دو سمندروں کا اجتماع۔ دوسرے معنی میں دو مذہبوں کے ملے جلے اور یکساں تصور۔ اس کی دوسری کتابوں میں سفینۃ الاولیاء، سکینۃ الاولیاء اور حسنات العارفین شامل ہیں۔

۱۷۰۷ء کے بعد سے ہندوستان متواتر انقلابات کا شکار ہوتا رہا۔ مغلیہ سلطنت کی چولیں ڈھیلی ہونا شروع ہو گئیں۔ اور لسانی انقلابات نے بھی جنم لینا شروع کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری زندگی انتشار سے دوچار ہو گئی۔ 'بزم' کو فروغ دینے والے اب صرف 'رزم' کی باتیں کرنے لگے اور زندگی تلوار کی پناہ میں آ گئی۔ پھر بھی ایسے وقت میں ادبی اور علمی ذوق کم نہیں ہوا۔ شاہ عالم ثانی نے باقاعدہ ہندی میں شعر کہے ہیں۔ شاہ عالم کا ایک ہندی دیوان منتخباتِ ثانی کے نام سے رامپور سے شائع ہوا ہے۔

فی زمانہ بھی عرب ممالک میں ہندوستانی علوم و فنون میں اُسی طرح دلچسپی لی جا رہی ہے۔ حال ہی میں ہندوستانی کونسل برائے ثقافتی امور نے شکنتلا (کالیداس) کا ترجمہ فارسی میں ڈاکٹر ہادی حسین صاحب سے کروا کر شائع کیا ہے وزیر اعظم جواہر لال نہرو کی کتاب 'ڈسکوری آف انڈیا' کا ترجمہ ابھی فارسی میں دیکھنے میں آیا ہے۔

اُمید ہے کہ صدہا سال پہلے کی روایت اسی طرح پروان چڑھتی رہے گی۔ اور ہندوستان و عرب ممالک ایک دوسرے کے ادب، تہذیب، کلچر اور طریقِ زندگی سے دلچسپی لیتے رہیں گے اور اس طرح ہمارے تہذیبی رشتے مضبوط ہوتے جائیں گے۔

حمید انصاری

جادۂ نو

حریفِ جوششِ تمنا نہیں ہے جادۂ نو
ابھی بلند ہے اے دوست ہر ارادۂ نو

محیطِ بادۂ دیرینہ کا شناور ہوں
بقدرِ ظرف نہیں ہے خمارِ بادۂ نو

رموزِ منزلِ ہستی کا رو شناس نہیں
اگرچہ برق در آغوش ہے پیادۂ نو

ہجومِ رنگ سے گھبرا گیا ہے ذوقِ نظر
کہاں سے ڈھونڈ کے لاؤں جہانِ سادۂ نو

طریقِ بیعت و آداب بھی نیا ہو گا
"ہوا ہے فائزِ سجادہ پیر زادۂ نو"

ملے تو خیر بڑی چیز ہے شرابِ کہن
نہیں ملے تو غنیمت ہے دُردِ بادۂ نو

حمید تا سرِ منزل پہونچ ہی جائے گا
نظر میں جادۂ دیرینہ ہے نہ جادۂ نو

مقالہ نما برائے شبلی

نمبر ۱	مقالہ نگار ۲	مقالہ ۳	رسالہ / کتاب ۴	صفحہ ۵	تاریخ اشاعت ۶
۱-	احمد، اسحاق نعمانی	۱- شبلی کی محرومیاں	علی گڑھ میگزین	۷۶	شمارہ اول ۱۹۵۷ء
		۲- شبلی کی شاعری اور ہم	صبا، حیدرآباد	۲۶	جلد ۵ شمارہ ۶۵
		۳- شبلی اور انقلاب			
		۴- شبلی اور ہندوستانی نشاۃ الثانیہ			
۲-	احمد، سید لطیف	۱- مولانا شبلی ایک علیگ شاگرد کی نظر سے	ادبی دنیا لاہور	۱۷	جلد ۱۰ ۱۹۴۷ء
۳-	احمد، عبداللہ	۱- شبلی اور جدید شاعری	مجلہ مکتبہ	۶	جلد ۲ شمارہ ۶
۴-	احمد، مفتون	۱- شبلی کا اسلوب تحریر	خاور، ڈھاکہ	۱۹	جولائی ۱۹۵۲ء
		۲- مولانا شبلی اور ندوۃ العلماء	نگار، لکھنؤ	۳	مارچ ۱۹۵۳ء
		۳- مولانا شبلی علی گڑھ سے پہلے اور بعد	"	۷۳	جولائی ۱۹۵۶ء
		۴- شبلی اور اُن کے عہد کے سیاسی تحریکات	مشرب، کراچی		تاریخ اردو ادب نمبر ۵۶ء
		۵- مولانا شبلی کے بعض نقاد	نگار، لکھنؤ	۲۲	اپریل ۱۹۵۷ء
۵-	احمد، محی الدین	۱- مولانا شبلی نعمانی کی فارسی شاعری	صبا، حیدرآباد	۷۷	شبلی نمبر ۱۹۵۸ء
۶-	احمد، مقبول مولانا	۱- علامہ شبلی اور تنقید سیاست	ادبی دنیا، لاہور		ستمبر ۱۹۴۱ء
۷-	احمد، مقبول خواجہ	۱- شبلی بحیثیت سوانح نگار	نئی قدریں، حیدرآباد دکن	۱۲	نومبر ۱۹۵۶ء
۸-	اصلاحی، امین مولانا	۱- مدرسۃ الاصلاح اور علامہ شبلی	الاصلاح، سرائے میر		اگست ۱۹۳۶ء
۹-	اصلاحی، بدرالدین	۱- علامہ شبلی پر فتوائے تکفیر	"		"
۱۰-	آغا، ڈاکٹر وزیر	۱- شبلی نعمانی کی سیاسی نظر	البصیر، چنیوٹ	۶۱	شبلی نمبر
۱۱-	افادی، مہدی	۱- تمدن عرب اور پروفیسر شبلی	"افادات مہدی"		

نمبر ۱	مقالہ نگار ۲	مقالہ ۳	رسالہ / کتاب ۴	صفحہ ۵	تاریخ اشاعت ۶
	افادی، مہدی	۲- علامہ شبلی کا ماہوار علمی رسالہ	"افاداتِ مہدی"		
		۳- آدھ گھنٹہ علامہ شبلی کے ساتھ	,,		
		۴- شعر العجم پر ایک فلسفیانہ نظر	,,		
		۵- ملک میں تاریخ کا معلم اول یعنی شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی	,,		
		۶- اردو لٹریچر کے عناصر خمسہ (سرسید، آزاد، نذیر، حالی اور شبلی)	,,		
		۷- شبلی سوسائٹی	,,		
		۸- حالی و شبلی کی معاصرانہ چشمک	,,		
۱۲-	اقبال، ڈاکٹر شیخ محمد	۱- شعر العجم اور عمر خیام	ہمایوں	۳۳۶	جون ۱۹۴۴ء
		۲- شعر العجم پر ایک نظر	ادبی دنیا، لاہور	۱۷	مئی ۱۹۴۵ء
۱۳-	انصاری، مولانا سعید	۱- اردو کے عناصر اربعہ میں علامہ شبلی کا درجہ	الناظر، لکھنؤ	۱	اپریل و مئی ۳۵ء
		۲- یادِ رفتگان - شبلی	ادبِ لطیف، لاہور		اپریل ۱۹۵۴ء
		۳- (شبلی کی) عربی انشاء	البصیر، چنیوٹ	۱۱۲	شبلی نمبر
۱۴-	انوار الحسن	۱- شبلی نعمانی	فروغِ اردو، لکھنؤ	۳۲	۱۹۵۷ء
۱۵	ایڈیٹر 'برہان'	۱- تنقید شعر العجم پر تبصرہ	برہان	۱۶۰	فروری ۱۹۴۴ء
۱۶	ایک طالب علم (عبدالماجد)	۱- الکلام مؤلفہ مولانا شبلی پر ایک تنقیدی نظر	الناظر، لکھنؤ	۱	جنوری ۱۹۱۱ء
۱۷-	باسط، محمد عبدل	۱- عربی شاعری اور مثنوی (بہ نظر شبلی)	دکن ریویو، حیدرآباد	۲۶	فروری ۱۹۰۹ء
۱۸-	بیگ، مرزا احسان احمد	۱- علامہ شبلی کی فارسی شاعری	علی گڑھ میگزین	۲۴	نومبر، دسمبر ۱۹۲۲ء
۱۹-	بشیر، میاں	۱- شبلی بہ حیثیت مصنف	ہمایوں	۴۳۳	مئی ۱۹۳۰ء
۲۰-	بیگم رضیہ	۱- شبلی کی سخن فہمی	ضیا، حیدرآباد	۱۸	شبلی نمبر
۲۱-	تبسم، پروفیسر	۱- مولانا شبلی فارسی شاعر کی حیثیت میں	مخزن، لاہور	۲۵	مارچ و اپریل ۱۹۲۸ء
۲۲	جوناگڑھی، قاضی احمد میاں	۱- مولانا شبلی بہ حیثیت شاعر	ہندوستانی، الہ آباد	۲۸	۱۳ جنوری ۲۶ء
۲۳-	جیراجپوری، مولانا اسلم	۱- الفاروق	شبلی کالج میگزین، اعظم گڑھ	۲۲	
۲۴	حالی، خواجہ الطاف حسین	۱- سیرۃ النعمان (تبصرہ)	مقالاتِ حالی، جلد دوم	-	
۲۵	حسین، احفاد	۱- شبلی نعمانی	علی گڑھ میگزین	۱۴	جنوری ۱۹۲۲ء
۲۶	حسین، سید اکبر	۱- شبلی اور ڈارون (ایک اہم خط)	دکن ریویو، حیدرآباد	۲۰	ستمبر ۱۹۰۸ء

نمبر	مقالہ نگار	مقالہ	رسالہ/کتاب	صفحہ	تاریخ اشاعت
۱	۲	۳	۴	۵	۶
۲۷-	خان، رشید حسن	۱- شبلی کا فارسی تغزل	نگار، لکھنؤ	۱۵	مئی ۱۹۵۰ء
۲۸-	خان، ظفر علی	۱- موازنۂ انیس و دبیر	دکن ریویو، حیدرآباد		اگست ۱۹۰۸ء
۲۹-	خان، عبیداللہ	۱- مقالاتِ شبلی	البصیر، چنیوٹ	۱۶۸	شبلی نمبر
۳۰-	خان، محمد حبیب اللہ	۱- مولانا محمد شبلی نعمانی	البصیر، چنیوٹ	۵۳	،،
۳۱	خان، محمد ظفر	۱- مولانا شبلی آئینۂ تحقیق و تنقید میں	،،	۳۱	،،
۳۲	خواجہ غلام الثقلین	۱- مولانا شبلی پر ایک نظر	عصر جدید، میرٹھ	۴۱	دسمبر ۱۹۱۴ء
۳۳	دردائی محمد حسین الدین	۱- شبلی ایک مجاہد کے روپ میں	علی گڑھ میگزین	۱۱	جولائی ۱۹۳۷ء
۳۴	ذکاء اللہ	۱- تبصرہ مجموعۂ نظم شبلی	علی گڑھ گزٹ		ستمبر ۱۸۹۳ء
۳۵	ڈار، محمد ابراہیم	۱- حیاتِ شبلی پر ایک نظر	نوائے ادب، بمبئی	۲۲	جنوری ۱۹۵۰ء
۳۶	زبیری امین	۱- شبلی کا جرمِ محبت اور سلیمان ندوی	نگار، لکھنؤ	۴۹	اکتوبر ۱۹۴۵ء
۳۷	زور، محی الدین قادری	۱- شبلی کے بارے میں چند غیر مطبوعہ اطلاعات	صبا، حیدرآباد	۳۳	شبلی نمبر
۳۸	زیدی، علی جواد	۱- شبلی کے سیاسی رجحانات	ادیب، دہلی		۱۹۴۳ء
۳۹	سرور، پروفیسر آل احمد	۱- شبلی میری نظر میں	'تنقید کیا ہے'۔		
۴۰	سہیل، مولانا اقبال	۱- شبلی کی جامعیت	تابشِ سہیل	۷۱	
		۲- علامہ شبلی کے مکاتیب	،،	۱۰۳	
		۳- سیرتِ شبلی	الاصلاح، سرائے میر		اکتوبر ۳۶-۳۹ء
۴۱-	ساجدہ زینت	۱- حیاتِ شبلی	صبا، حیدرآباد		شبلی نمبر
۴۲	شرر، عبدالحلیم	۱- تبصرہ "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم"	دل گداز، لکھنؤ	نمبر ۱۲	
		۲- شبلی کی یاد میں	الناظر، لکھنؤ		دسمبر ۱۹۱۴ء
		۳- مجموعۂ نظم شبلی			
۴۳	شروانی محمد حبیب الرحمن خاں	۱- المامون (تبصرہ)			۱۸۸۷ء
		۲- سفرنامہ مصر و روم و شام (تبصرہ)	مقالاتِ شروانی	۳۰	اخبار آزاد، ۱۷، ۱۸ اگست ۱۸۹۴ء
		۳- الفاروق ،،	،،	۳۳	معارف، جولائی ۱۸۹۹ء
		۴- سوانح مولانا روم ،،	مخزن، لاہور		اکتوبر ۱۹۰۶ء
		۵- مرحومی علامہ شبلی نعمانی	مقالاتِ شروانی	۱۶۷	علی گڑھ گزٹ جنوری ۱۹۱۵ء
۴۴-	شروانی، محمد مقتدا خان	۱- علامہ شبلی کا قیام علی گڑھ	العلم، کراچی	۵۵	اپریل، جون ۱۹۵۸ء
۴۵-	صدیقی، ڈاکٹر ابواللیث	۱- شبلی اور اردو	علی گڑھ میگزین	۱۴۲	جنوری ۱۹۳۹ء

نمبر	مقالہ نگار	مقالہ	رسالہ / کتاب	صفحہ	تاریخ اشاعت
۱	۲	۳	۴	۵	۶
۴۶۔	صدیقی، ڈاکٹر آفتاب احمد	۱۔ شبلی کا اسلوب نگارش	خاور، ڈھاکہ	۱۰	نومبر ۱۹۵۲ء
		۲۔ موازنۂ انیس و دبیر پر ایک نظر	"	۲۶	مئی ۱۹۵۲ء
		۳۔ شعر العجم	"	۱۸	فروری ۱۹۵۲
		۴۔ شبلی۔ متکلم	البصیر، چنیوٹ	۲۶	شبلی نمبر
		۵۔ شبلی و حالی کا ایک تقابلی مطالعہ	مہر نیمروز، کراچی	۱۲	نومبر ۱۹۵۶ء
۴۷۔	صدیقی، حفیظ	۱۔ علی گڑھ تحریک اور شبلی	علی گڑھ میگزین	۲۵۸	علی گڑھ تحریک نمبر ۱۹۵۵ء
۴۸	صدیقی، محمد عبداللطیف لکھنوی	۱۔ اردو کے انشاپرداز۔ مولانا شبلی نعمانی	الناظر، لکھنؤ	ضمیمہ	جولائی ۱۹۲۷ء
۴۹۔	صدیقی، ڈاکٹر خورشید الاسلام	۱۔ شبلی	تنقیدیں	۳۴	(علی گڑھ میگزین)
۵۰۔	ظفر الملک	۱۔ دیباچہ مجموعۂ کلام شبلی	الناظر، لکھنؤ		۱۹۲۴ء
۵۱۔	عبداللہ، شیخ	۱۔ مولانا شبلی مرحوم مغفور	البصیر، چنیوٹ	۶۸	شبلی نمبر
۵۲	عبداللہ، ڈاکٹر سید	۱۔ شبلی کا نظریۂ تاریخ (قسط اول دوم)	معارف، اعظم گڑھ	۳۸/۳۴	مارچ، اپریل ۱۹۳۸ء
		۲۔ اردو سوانح نگاری سرسید کے زمانے میں (شبلی)	ماہِ نو، کراچی	۱۲	اگست ۱۹۵۳ء
		۳۔ شبلی فکر جدید سے کیونکر روشناس ہوئے	اورینٹل کالج میگزین لاہور		
		۴۔ شبلی کا اسلوب بیان	"بحث و نظر"		
		۵۔ شبلی کے تصنیفی کام کی مجموعی قدر و قیمت	البصیر، چنیوٹ	۸۴	شبلی نمبر
۵۳	عبدالرحمٰن، صباح الدین	۱۔ مولانا شبلی نعمانی	نقوش، لاہور	۱۸	جنوری ۱۹۵۶ء شخصیات نمبر
۵۴	عبدالواحد، ابوالظفر	۱۔ مقالات شبلی	صبا، حیدرآباد	۵۷	شبلی نمبر
۵۵	عبدالحق، مولوی	۱۔ مقدمہ خطوط شبلی	خطوط شبلی مرتبہ امین زبیری		
۵۶	عبدالغنی	۱۔ شبلی بحیثیت ادیب	البصیر، چنیوٹ	۵۵	شبلی نمبر
۵۷	عطاء اللہ، شیخ	۱۔ شبلی - ایک پین اسلامسٹ	"	۱۴	"
		۲۔ الفاروق	"	۷۱	"
		۳۔ سفرنامۂ روم و مصر و شام	"	۹۹	"
۵۸	عقیدت مند	۱۔ حیاتِ شبلی اور مولانا سہیل	فاران	۱۵	اگست ۱۹۵۷ء
۵۹	علی، ڈاکٹر سید شاہ	۱۔ حالی اور شبلی سوانح نگار کی حیثیت سے	نگار، لکھنؤ	۱۶	جولائی، اگست ۱۹۵۶ء
۶۰۔	فاروقی، اطہر علی	۱۔ مولانا شبلی کی مقالہ نگاری	آج کل، دہلی	۷۴	اگست ۱۹۵۱ء
۶۱۔	فاروقی، ڈاکٹر محمد احسن	۱۔ شبلی کی موازنۂ انیس و دبیر میں ایک فرد پر تنقید	"اردو تنقید"	۸۱	
۶۲	فیضی، بیگم عطیہ	۱۔ شبلی اور خاندانِ فیضی	ادبی دنیا، لاہور	۲۶	جون ۱۹۴۶ء
		۲۔ مولانا شبلی	صبح امید، بمبئی	۴۴	اپریل ۱۹۵۹ء

نمبر ۱	مقالہ نگار ۲	مقالہ ۳	رسالہ/کتاب ۴	صفحہ ۵	تاریخ اشاعت ۶
۶۳۔	قادری، اظہر	۱۔ حالی و شبلی	ساقی، کراچی	۶۹	اکتوبر ۱۹۵۴ء
۶۴۔	قادری، خالد حسن	۱۔ شبلی اپنے خطوط کے آئینہ میں	نگار، لکھنؤ		۴۵ء
۶۵۔	قریشی، ڈاکٹر وحید	۱۔ حالی اور شبلی کے ہاں تنقیدی اصطلاحات	ادبی دنیا، لاہور	۳۹	جون ۱۹۴۷ء
		۲۔ خالد صاحب اور علامہ شبلی	کتاب، لاہور	۲۱	فروری ۱۹۴۷ء
۶۶۔	کاظمی، تمکین	۱۔ علامہ شبلی نعمانی	صبا، حیدرآباد	۲۱	شبلی نمبر
۶۷۔	ماہر القادری	۱۔ شبلی نعمانی کی شاعری	ماہِ نو، کراچی	۴	اگست ۱۹۵۰ء
۶۸۔	مسرور، احمد عبداللہ	۱۔ شبلی اور جدید شاعری	مجلہ مکتبہ جلد ۴ شمارہ ۶	۵۰	
۶۹	مسیح الزماں	۱۔ شبلی کا "موازنہ"	"تعبیر، تشریح، تنقید"	۵۰	
		۲۔ شبلی موازنے کی روشنی میں	"	۱۶۳	
		۳۔ شبلی اور دبیر	"	۱۵۳	
۷۰۔	مکی، مولوی احمد	۱۔	ہماری کتابیں		اگست، ستمبر ۱۹۴۶ء
۷۱۔	مہدی، عالم خوند	۱۔ اسلامی فکر کی تشکیل جدید میں شبلی کا حصہ	صبا، حیدرآباد	۴۷	شبلی نمبر
۷۲۔	ندوی، احتشام احمد	۱۔ مفتون احمد اور شبلی	نگار، لکھنؤ	۳۳	جولائی ۱۹۵۷ء
۷۳۔	ندوی، مولانا سید سلیمان	۱۔ مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین پر خواجہ کا تکفیر	الاصلاح، سرائے میر		اگست ۱۹۳۶ء
		۲۔ شعر العجم اور عمر خیام	معارف، اعظم گڑھ		فروری ۱۹۲۴ء
		۲۔ مولانا شبلی شاعر کے لباس میں	"کلیاتِ شبلی"		
۷۴	ندوی، نجیب اشرف	۱۔ شبلی اور بمبئی	اسماعیل کالج میگزین، بمبئی		
۷۵	ندوی، محمد اسمٰعیل	۱۔ علامہ شبلی	البصیر، چنیوٹ	۸۸	شبلی نمبر
۷۶	نعمانی، محمد عبدالقیوم حسرت	۱۔ اردو میں تنقید کا ارتقاء (شبلی)	نگار، لکھنؤ	۴۲	فروری مارچ ۱۹۴۶ء
۷۷	ہاشمی، نصیر الدین	۱۔ علامہ شبلی اور حیدرآباد	صبا، حیدرآباد	۴۰	شبلی نمبر

اجتماعی ترقّی کا مقصد

اجتماعی ترقّی کا پروگرام آزادی کے بعد ۱۹۵۲ء میں شروع کیا گیا تھا۔ ہمارے ½ ۵ لاکھ گاؤں میں تقریباً ۳۰ کروڑ انسان آباد ہیں۔ اس پروگرام کا مقصد ان لوگوں کا معیارِ زندگی بلند کرنا ہے۔ کھانا، کپڑا اور مکان ہر شخص کی نہایت اہم ضرورت ہے۔ بچّوں اور بالغوں دونوں کے لئے تعلیم، علاج و معالجہ، روزگار کے مواقع اور اسی طرح کی دوسری چیزیں بھی اہم ہیں۔ ایک فلاحی ریاست میں ان باتوں کا انتظام ہونا ہی چاہیئے۔

اجتماعی ترقّی کے ذریعے اس سمت میں صحیح قدم اٹھایا گیا ہے اور یہ پروگرام حسبِ توقع کامیابی حاصل کر رہا ہے۔ فی الحال ۳ لاکھ دیہات (جن کی آبادی سولہ کروڑ سے بھی زائد ہے) اس پروگرام سے مستفید ہو رہے ہیں۔ ۱۹۶۳ء میں ہمارے سارے دیہات اس پروگرام کے ماتحت آ جائیں گے۔

چند سال قبل ہمارے وزیرِ اعظم نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا۔ کہ "اس بیج (اجتماعی ترقّی) سے ایک پودا نکلے گا جو بعد میں ایک گھنا درخت بن جائے گا اور پورا ملک اس کے زیرِ سایہ آ جائے گا۔" ان کی یہ خواہش بہت جلد پوری ہو جانے کی توقع ہے۔

ہمارا ملک بہت بڑا ہے۔ اُتر سے دکھن تک اس کی لمبائی دو ہزار میل ہے۔ پورب سے پچھم کی دُوری بھی اتنی ہی ہوگی۔ اس کا فائدہ اور نقصان دونوں ہیں۔ فائدہ یہ ہے کہ بڑے ملک میں ہی بڑا کام کیا جا سکتا ہے لیکن نقصان یہ ہے کہ اتنی بڑی آبادی کا معیارِ زندگی بلند کرنا یقیناً مشکل ہے۔ جہاں ہم مادّی فائدوں کے لئے مادّی ذرائع کام میں لا رہے ہیں وہاں ہم نے انسانوں کو بھی بہتر بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس چیز نے ہمارے کام کو اور مشکل بنا دیا ہے۔

آپ نے رومی مورّخ پلینی کا نام سُنا ہوگا۔ وہ حضرت عیسٰی کی پیدائش سے قبل گذرا ہے۔ وہ اس بات کا شاکی تھا کہ روم کی ساری دولت ہندوستان چلی جا رہی ہے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستان کی مصنوعات کی روم میں بہت مانگ تھی۔

یہ بات کس طرح ممکن تھی؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اتنی چیزیں پیدا کر لیتے تھے کہ ہماری روزمرّہ کی ضرورتیں پوری ہو جانے کے بعد اتنی چیزیں بچ جاتی تھیں کہ ہم دوسرے ملکوں کے ہاتھ فروخت کر دیتے تھے۔ اس لئے ہمارا ملک بہت خوش حال تھا۔

ایک روایت ہے کہ ایک مغل شہنشاہ نے اپنے افسروں کو حکم دیا کہ اس کی سلطنت میں جتنا سونا ہے اس کا وزن کیا جائے۔ ۶ مہینے بعد اُسے معلوم ہوا کہ اس کے افسر ابھی تک دلی اور آگرہ کا سونا تولنے میں لگے ہوئے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ ہمارے ملک میں کتنی دولت تھی۔ یہ دولت کیا ہوئی؟

ہم سب جانتے ہیں کہ ہمارے ملک کی دولت کس طرح غائب ہوئی ملک کی یہ جمع شدہ دولت آزادی چھن جانے کے بعد ہم سے چھن گئی۔ ہمارے غیر ملکی آقاؤں کی پالیسی ایسی تھی جس سے صرف ان کو فائدہ پہنچے۔ اس طرح ہم مفلس ہو گئے۔ اور آزادی کے ملنے کے بعد ہم نے دیکھا کہ ہمارا ملک جو پہلے اناج کا بھنڈار اور دولت کا گہوارہ تھا۔ اب ہر چھوٹے بڑے معاملے میں دوسرے ملکوں کا دستِ نگر ہو گیا ہے۔

اس لئے آزادی کے بعد ہمارا سب سے پہلا فرض اپنے ملک کو خوش حال بنانا ہے جس کا مطلب بنیادی طور پر دیہاتوں کی تعمیرِ نو ہے



ٹیلی فون کے ذریعے تار زیادہ جلدی پہنچتا ہے

اب آپ ٹیلی فون نمبر پر بھی تار بھیج سکتے ہیں۔ مثلاً

بینرجی
ٹی ایف ۳۱۲۷۰
نئی دہلی

جیسے ہی پیغام تار گھر میں موصول ہوگا ٹیلی فون کے ذریعے اُسے پہنچا دیا جائے گا۔ شخصی طور پر تار پہنچانے میں جو تاخیر واقع ہوتی ہے، اس صورت میں نہیں ہوگی۔

ٹیلی فون کے ذریعے تار بھیجنا سستا بھی پڑسکتا ہے۔ کیونکہ ٹیلی فون نمبر اور ٹی ایف کے الفاظ کو ایک ہی لفظ مان کر اس کے دام لگائے جاتے ہیں

جہاں جہاں مقامی ٹیلی فون سروس ہے وہاں وہاں یہ سہولت دستیاب ہوسکتی ہے۔

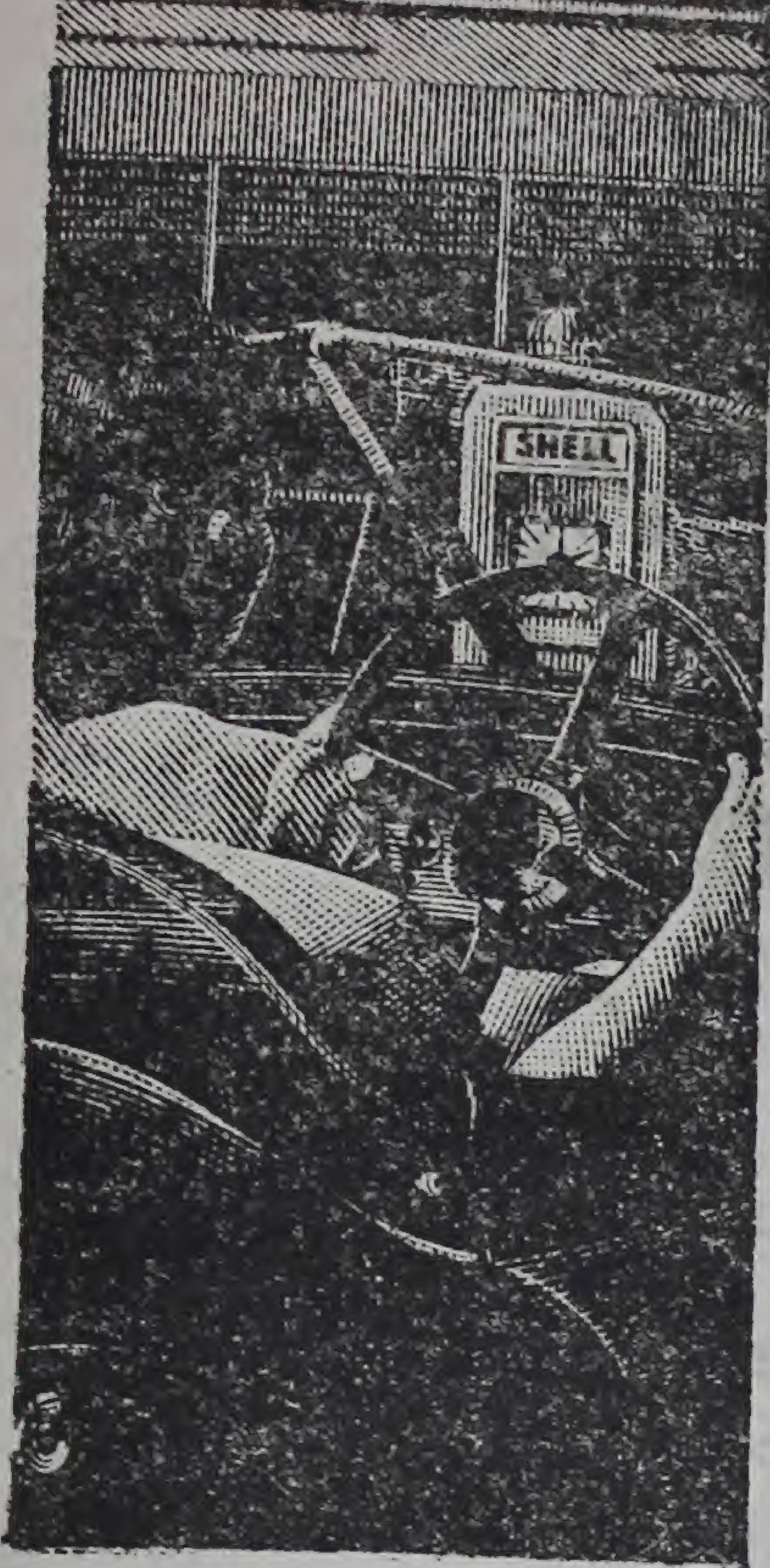
تار کی نقل اسی روز پہلی ڈاک سے بھیج دی جائے گی۔

ٹیلی فون پر تار وصول کیجئے

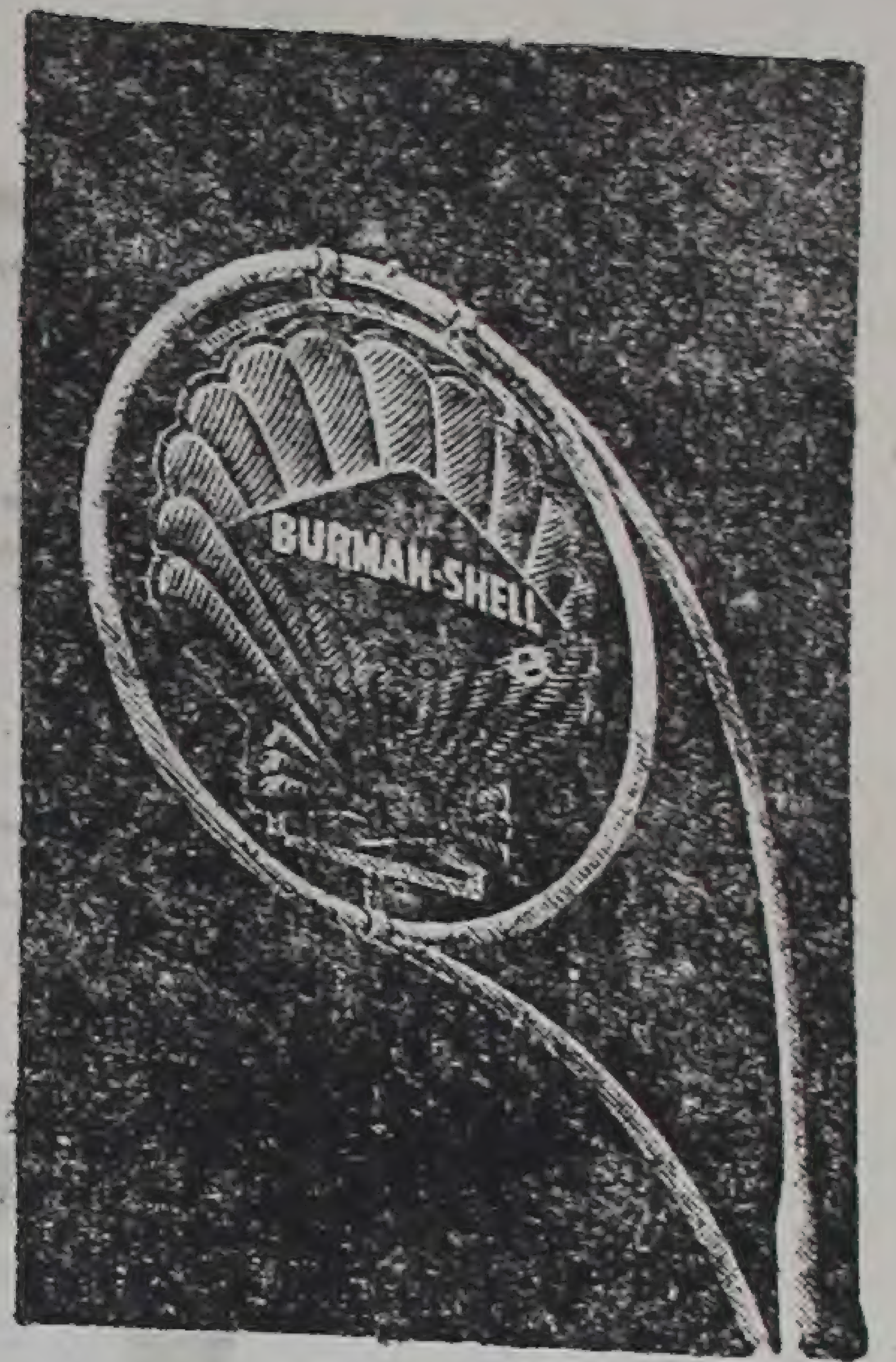
اگر تار بھیجنے والے نے آپ کا ٹیلی فون نمبر نہ لکھا ہو، جب بھی تار آپ کو مل سکتا ہے ایسا صرف چند شہروں ہی میں ممکن ہے۔ آپ اپنا ٹیلی فون نمبر تار گھر میں درج کرا دیجئے۔ آپ کو ہمارے تار ٹیلی فون پر ملیں گے۔ اور تار کی نقل ڈاک سے پہنچے گی۔ ٹیلی فون پر تار رسانی کی یہ سروس آگرہ، احمد آباد، الہ آباد، امرت سر، بنگلور، بمبئی، کلکتہ، کوئمبٹور، دہلی، اندور، کانپور، مدراس، ناگپور، نئی دہلی، سیلم اور سکندرآباد میں دستیاب ہے۔

ہمیں بہتر خدمت کا موقع دیجئے
پوسٹس اینڈ ٹیلی گرافس ڈیپارٹمنٹ

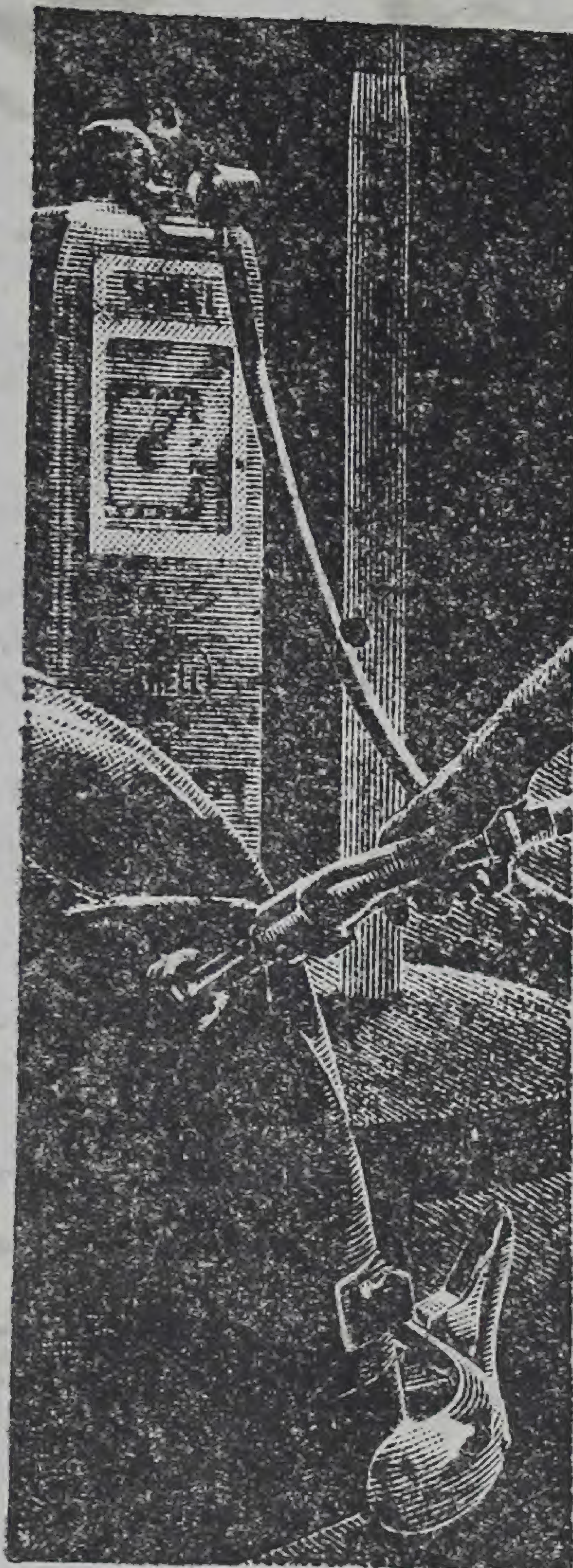
DA.۹۹/۰۰۴



تپاک
تیزی
عمدگی







خندہ پیشانی، فوری توجہ، ذاتی خدمات کے چھوٹے مگر اہم اشاروں سے آپ کو برماشیل کے ہر پمپ پر جاتے ہی محسوس ہوگا کہ آپ ایک معزز گاہک ہیں۔

"محترم" کیا آپ کی کار میں تیل پورا ہے؟ اور بیٹری کا پانی؟

"ریڈی ایٹر میں پانی ٹھیک بھرا ہے اور ٹائر کی ہوا درست ہے"! غرضیکہ جانچ پڑتال میں کمی نہیں رہی اور آپ کی تمام ضروریات بخوبی پوری کر دی گئیں۔

یہ جانتے ہوئے کہ آپ عموماً مصروف ہوتے ہیں ہمارے ڈیلروں کے ملازمین کو تربیت دی جاتی ہے کہ وہ آپ کی ضروریات باقاعدگی پھرتی سے پوری کر سکیں۔

یہ ہے
برماشیل
سروس!

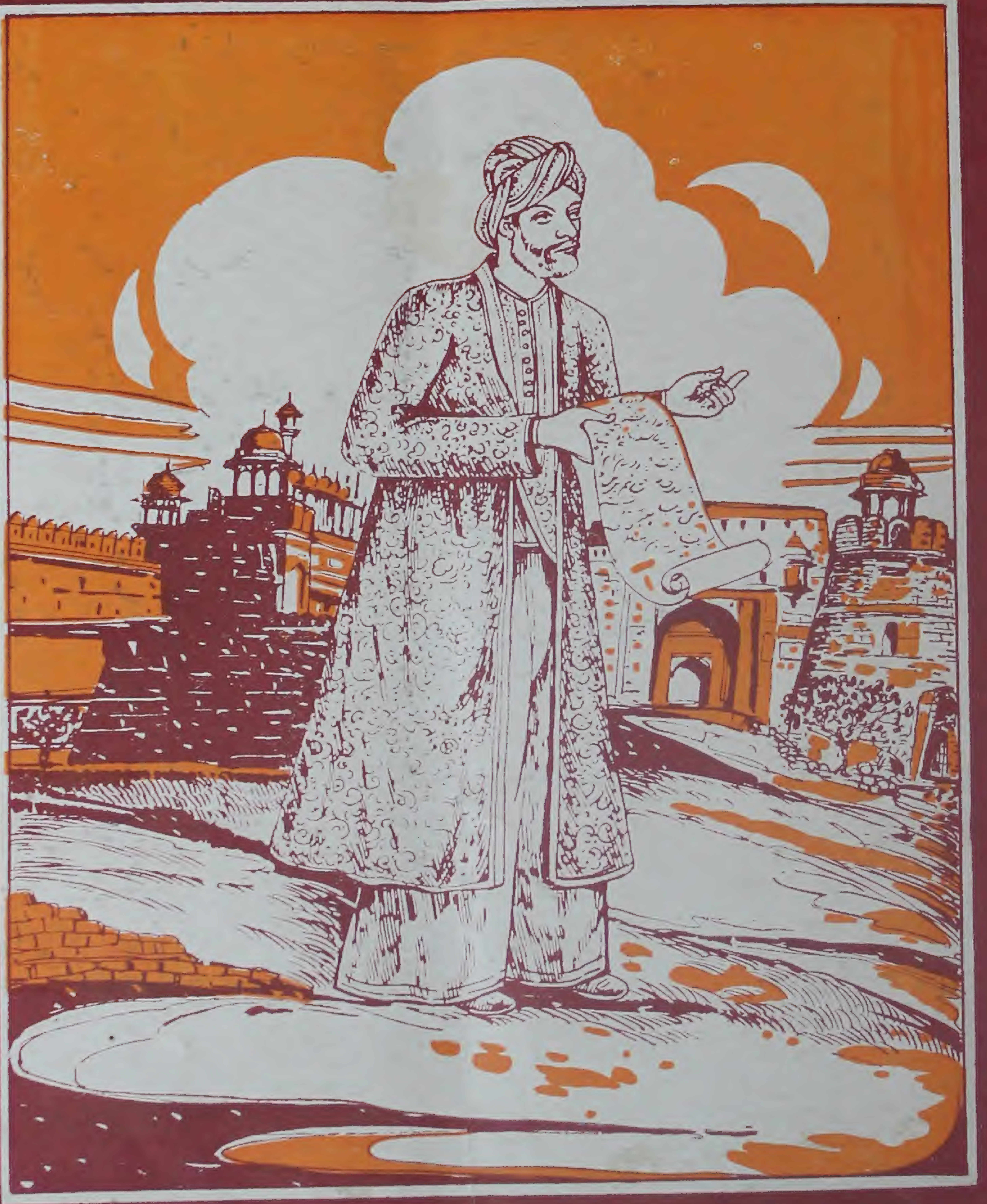


Edited & Published by the Director, Publications Division, Old Secretariat, Delhi—8 and printed by the Manager, Government of India Press, Faridabad.

Regd. No. D—509.

آجکل

غالب نم



ماگھ شک سمت ۱۸۸۱ فروری ۱۹۶۰ء

۵۰ نئے پیسے

ترتیب

سرورق :- شبیہہ مرزا غالب
رسالے کی پشت پر - تاج محل

سالانہ چندہ :- ہندوستان میں - چھ روپے
پاکستان میں - چھ روپے (پاک)

غیر ممالک سے :- نو شلنگ یا سوا ڈالر

فی پرچہ :- ہندوستان میں - ۵۰ نئے پیسے
پاکستان میں - آٹھ آنے (پاک)

جلد ۱۸ - نمبر ۷

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر آج کل (اردو) اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

اردو کا مقبول عوام مصور ماہنامہ

آج کل

دہلی

غالب نمبر

ماگھ شک سمت ۱۸۸۱

فروری سنہ ۱۹۶۰ء

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومت ہند

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس نمبر ۲۰۱۱ دہلی

مُلاحظات

پچھلے دنوں پیرس میں مغربی ممالک کے سربراہوں کی جو کانفرنس ہوئی تھی اس میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ ۲۷۔ اپریل ۱۹۶۰ء کو پیرس میں چار بڑوں کی کانفرنس منعقد کی جائے۔ اس فیصلے کے مطابق روس کے وزیر اعظم مسٹر خروشچیف کو دعوت نامہ بھیج دیا گیا، انھوں نے دعوت نامہ منظور کر لیا لیکن کانفرنس کی تاریخ سے اتفاق نہیں کیا۔

اب روس نے مغربی طاقتوں کی یہ تجویز مان لی ہے کہ یہ کانفرنس اس سال ۱۶۔ مئی کو پیرس میں ہو۔ اس کانفرنس میں عالمی سیاست کے بہت سے مسائل زیر بحث آئیں گے۔ لیکن سب سے بڑا مسئلہ تخفیف اسلحہ اور خاص کر اسلحہ پر کنٹرول اور ہائیڈروجن بموں پر پابندی عائد کرنے کا ہے ہمیں امید کرنا چاہیئے کہ عالمی امن اور انسانیت کی فلاح و بہبود کی خاطر یہ سارے مسائل بخیر و خوبی طے پا جائیں گے۔

دلّی میں ۱۱۔ دسمبر ۱۹۵۹ء کو صدر جمہوریہ نے دنیا کی سب سے بڑی زراعتی نمائش کا افتتاح فرمایا۔ اس عالمی زراعتی میلے کا انتظام بھارت سیوک سماج نے کیا ہے۔ یہ اپنے قسم کا انوکھا میلہ ہے۔ اس میں چھوٹے بڑے سولہ ملک حصہ لے رہے ہیں، ہندوستان کی ۱۷ ریاستوں نے اپنے اپنے خوبصورت پویلین لگائے ہیں۔ اس نمائش سے ہمارے کسانوں کو بہت فائدہ پہونچے گا، وہ لوگ زرعی ترقی کے جدید ترین طریقوں کا مطالعہ کر سکیں گے جیسا کہ صدر جمہوریہ نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا، ہمارا ملک ایک زرعی ملک ہے، ہمارے کسانوں کو پرانے تجربوں پر ہی اکتفا نہیں کرنا چاہیئے بلکہ سائنسی طریقوں کو اپنا کر نئے ڈھنگ سے اپنی کھیتی کو ترقی دینا چاہیئے۔

صدر جمہوریہ کے ہاتھوں درگاپور میں فولاد کے کارخانے کی پہلی بھٹی کا افتتاح ملک کی صنعتی ترقی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ کارخانہ ہندوستان اور برطانیہ کے سرکاری اور غیر سرکاری تعاون سے قائم کیا جا رہا ہے۔ ایسے دو کارخانے بھلائی اور رورکیلا میں پہلے ہی کام شروع کر چکے ہیں۔ فولاد چھوٹی اور بڑی صنعتوں کی بنیادی ضرورت ہے۔ فولاد کی پیداوار سے ملک کی صنعتی ترقی میں بڑی مدد ملے گی۔

حیدرآباد کا 'دائرۃ المعارف' ایک قدیم علمی ادارہ ہے۔ یہ ادارہ گذشتہ ۷۰ سال سے علوم مشرقیہ کی ترویج و ترقی کے لئے نمایاں خدمات انجام دے رہا ہے۔ اس کی خدمات کو مشرق و مغرب کے ممتاز علماء اور فضلاء نے سراہا ہے۔ دائرۃ المعارف نے روس، ٹرکی، مصر، شام، عراق، سعودی عرب، ایران اور دیگر ممالک کے مشہور کتب خانوں سے نایاب علمی نسخے حاصل کر کے انھیں شائع کیا۔ ان مطبوعات نے نہ صرف تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے آسانیاں بہم پہنچائیں بلکہ اس طرح مشرق و مغرب کی دیگر قوموں کے ساتھ ہندوستان کے ثقافتی تعلقات کو بھی مضبوط کیا۔ ادارہ اپنی ان خدمات کے لئے ہر طرح کی داد و تحسین اور امداد و تعاون کا مستحق ہے۔

مالک رام

نواب مختار الملک میر تراب علی خاں بہادر سالار جنگ

حضرت اویس قرنی رح کا نام تاریخِ اسلام میں نادیدہ عاشقِ رسولؐ کی حیثیت سے بہت مشہور و معروف ہے۔ قرن با ختلافِ روایت یمن کے ایک قریہ (تذکرۃ الاولیا) یا ایک قبیلے (روضۃ الصفا) کا نام ہے۔ حضرت اویس رح اسی سے منسوب تھے۔ ان کی نویں پشت میں ان کے ایک ہم نام اویس ثالث ہوئے۔ یہ مدینہ کے متولّیِ اوقاف تھے۔ معلوم نہیں کیوں، وہ اپنے بیٹے محمدؐ علی کو ساتھ لے کر ہندستان چلے آئے۔ یہاں ان دنوں بیجاپور کے تخت پر علی عادل شاہ جلوہ افروز تھا۔ دونوں باپ بیٹے اس کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کی خاندانی وجاہت اور علم و فضل کا لحاظ کرتے ہوئے، ان کی مناصب آؤ بھگت ہوئی اور ان کے صاحبزادے شیخ محمدؐ علی کو دبیری کا عہدہ عطا ہوا۔

رفتہ رفتہ اس خاندان نے بہت عروج حاصل کیا۔ شیخ محمدؐ علی کے پڑپوتے شمس الدین محمدؐ حیدر (بن محمدؐ تقی بن محمدؐ باقر بن محمدؐ علی) نظام علی خان، نظام الملک آصف جاہ اوّل کے عہد میں سلطنتِ دکن کے دیوان مقرر ہوئے۔ حیدر یار خاں بہادر، بشیر جنگ، منیر الدولہ، منیر الملک ان کے خطاب تھے۔ ۸۷ برس ان کی عمر تھی، جب ۱۷۷۵ء میں انتقال کیا۔ تاریخ ہوئی: حیدر یار خانِ عادل۔ ۱۱۸۹ھ۔ اورنگ آباد میں دفن ہوئے۔ اس عہد کی تمام تاریخیں ان کی قابلیت اور اوصافِ حمیدہ کے بیان سے مملو ہیں۔

شمس الدین محمد حیدر کے دو بیٹے تھے — محمد صفدر خاں اور تقی یار خاں۔ تقی یار خاں ۱۷۸۲ء میں لاولد فوت ہوئے۔ بڑے محمد صفدر خاں نے بھی بہت اعزاز و اکرام پایا، مختلف اوقات میں نظام کی طرف سے غیور جنگ بہادر، اشجع الدولہ، اشجع الملک، خان خاناں کے خطابات سے سرفراز ہوئے۔ انھوں نے ۱۷۹۰ء (۱۲۰۴ھ) میں بعارضۂ خفقان انتقال کیا، "حشر اُومی شود بآلِ رسول" (۱۲۰۴) تاریخِ وفات ہے۔ اورنگ آباد میں اپنے والد کے مقبرے ہی میں مدفون ہیں۔ دیگر خوبیوں کے علاوہ فارسی میں شعر بھی کہتے تھے۔

محمد صفدر خاں کی شادی درگاہ قلی خاں سالار جنگ کی دختر نیک اختر بہجت بیگم سے ہوئی تھی۔ اس سے ان کے چار بیٹے ہوئے۔ محمد تقی خاں، حسن رضا خاں، علی زمان خاں، رضا یار خاں۔ ان میں سے تیسرے بیٹے (علی زمان خاں) کا نکاح ابو القاسم میر عالم وزیر اعظم دکن کی بڑی صاحبزادی نفیسہ بیگم سے ہوا تھا۔ لیکن جب زچگی میں ان کا انتقال ہو گیا، تو میر عالم نے حضور نظام کے ایما سے اپنی دوسری بیٹی صاحبہ بیگم ان کے نکاح میں دے دی۔ میر عالم ہی وہ شخص ہیں، جو ٹیپو سلطان شہید کی بربادی کا باعث ہوئے۔ بڑے زیرک اور معاملہ فہم اور کارکن شخص تھے۔ انگریزوں کو ان پر خاص اعتماد تھا۔ حیدرآباد دکن کی متعدد مشہور عمارتیں انھی کی توجہ بلکہ خرچ پر تعمیر ہوئیں۔ بڑے فاضل شخص تھے۔ نظم و نثر پر پوری قدرت حاصل تھی اور صاحبِ تصنیف و تالیف تھے۔

میر عالم کی وفات ۱۸۰۸ء (۱۲۲۳ھ) کے بعد ان کے داماد علی زمان خاں بہادر، منیر الدولہ، منیر الملک ثانی، امیر الامراء ان کی جگہ دیوانِ حیدرآباد مقرر ہوئے۔ لیکن "جو چاہتے ہیں، سو آپ کریں ہیں"

ریاست کے مالی معاملات میں سیاہ و سپید کے کرتا دھرتا پیشکار مہاراجہ چندو لال بہادر تھے۔ اس لیے ان کی دیوانی محض برائے نام اور گویا انھیں ''بدنام'' کرنے کا ایک حیلہ بن کے رہ گئی تھی۔ بہرحال یہ ۲۵ برس تک وزیر ریاست رہ کر ۱۸۳۳ء (۱۲۴۸ھ) میں راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔ اس کے بعد مہاراجہ چندو لال ہی کو ریاست کی مستقل مدارالمہامی کا عہدہ بھی تفویض ہوگیا، جس پر وہ گیارہ برس، ۱۸۴۳ء تک فائز رہے۔ معزولی کے بعد ۱۸۴۵ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔

نواب علی زمان خاں منیرالملک ثانی کے اس دوسرے نکاح سے دو بیٹے پیدا ہوئے تھے — میر محمد علی خاں اور میر عالم علی خاں۔ یہی میر محمد علی خاں ہمارے نواب مختارالملک سالارجنگ کے والد ماجد ہیں۔

میر محمد علی خاں ۱۸۰۷ء (۱۲۲۲ھ) میں پیدا ہوئے۔ تاریخ ولادت سید مرزا خاں نے کہی تھی: ''ستارۂ روشن''۔ ان کی مہر کا سجع تھا: بود جانشینِ محمد علی۔ خطاب شجاع الدولہ، سالارجنگ تھا۔ ان کا نکاح امیرِ سلطنت سید کاظم علی خاں مختارالدولہ کی صبیہ زینت النساء بیگم سے ہوا تھا، جو سادات نیشاپور میں سے تھے۔ اسی محل سے ان کے ۲ جنوری ۱۸۲۹ء (۲۵ جمادی الثانی ۱۲۴۴ھ) کو وہ بیٹا پیدا ہوا، جو آگے چل کر اس سلسلۂ زرتاب کے لیے بھی باعثِ صد فخر و مباہات ثابت ہوا۔ والدین نے اس کا نام تراب علی خاں رکھا۔ خاندان کا دستور یہ تھا کہ نومولود کو سب سے پہلے تبرکاً کسی عابدہ، زاہدہ سیدانی کا دودھ پلواتے تھے۔ یہ پیدا ہوئے، تو انھیں ریاست کے ایک معزز منصب دار میر چراغ علی خاں کی بیگم کا، جو بہمہ صفت موصوف خاتون تھیں، دودھ پلایا گیا۔ اسی لیے میر چراغ علی خاں کے صاحبزادے، میر تہور علی خاں مختار جنگ، جلال الدولہ اور نواب سر سالارجنگ دونوں کی ایک ساتھ پرورش ہوئی اور وہ ان کے رضاعی بھائی ہونے کے باعث ان کے کوکہ کہلاتے تھے۔

میر محمد علی خاں کا عین شباب میں بعمر ۲۵ برس ۱۸۳۲ء (۱۲۴۷ھ) میں انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد تراب علی خاں کی پرورش ان کے جدِ بزرگوار نواب منیرالملک ثانی نے اپنے ذمے لی، جو ان سے دیوانہ وار محبت کرتے

جان کے لالے پڑ گئے۔ روایت ہے کہ جب سب کو یاس ہوگئی تو نواب منیرالملک نے دعا مانگی کہ بارِ الٰہا! اگر اس بچے کی موت مقدر ہی ہے، تو اس کی جگہ مجھے اٹھالے اور اسے صحت عطا فرمادے۔ جانے وہ کون سی گھڑی تھی، جب یہ لفظ ان کے منہ سے نکلے۔ دعا بارگاہِ الٰہی میں مقبول ہوگئی۔ چند دن میں بچہ بھلا چنگا ہوگیا اور نواب منیرالملک ثانی اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

ہونے کو یہ ٹھیک تو ہوگئے، لیکن بیماری کا حملہ اتنا شدید تھا کہ اس سے تندرستی بالکل تباہ ہوگئی اور یہ دائمی طور پر نحیف الجثہ اور منحنی ہو کے رہ گئے۔

منیرالملک کی وفات کے بعد ان کی تعلیم و تربیت، ان کے چچا میر عالم علی خاں بہادر سراج الملک کی نگرانی میں ہونے لگی۔ چونکہ صحت ٹھیک نہیں رہتی تھی اور اندیشہ تھا کہ مزید بوجھ پڑنے سے یہ اور خراب ہو جائے گی، اس لیے ایک زمانے تک ان کی باقاعدہ تعلیم شروع نہ ہو سکی اور یہ گیارہ بارہ برس کی عمر تک معمولی شد بد سے آگے نہیں بڑھے۔ اس کے بعد جب کچھ اچھے ہوئے تو اس پر زیادہ سنجیدگی سے توجہ دی گئی اور انھوں نے اس زمانے کے رواج کے مطابق فارسی اور عربی، حساب کتاب، انشا پردازی اور خوش نویسی کی معقول تعلیم کے علاوہ مردانہ کھیلوں میں بھی خاصی مہارت حاصل کی۔ چنانچہ نشانہ لگانے اور نیزہ بازی اور شہ سواری میں پورے طاق تھے۔ خاص طور پر گھوڑے کی سواری کے بہت شائق تھے۔ بڑے سے بڑے منہ زور گھوڑے پر بے تکلف سوار ہو جاتے۔ زمانۂ شباب میں انگریزی حاصل کرنے کا خیال پیدا ہوا تو رفتہ رفتہ اس سے بھی بقدرِ ضرورت اچھی خاصی واقفیت پیدا کر لی تھی۔

نواب منیرالملک نے وفات کے وقت پچیس لاکھ قرض چھوڑا تھا۔ غفران منزل نواب ناصرالدولہ بہادر آصف جاہ چہارم نے قرضہ تو بے باق کر دیا لیکن ان کی بیشتر متروکہ جائیداد نزول قرار دے دی۔ اس سے خاندان پر گویا عسیر الحالی کا دور آگیا۔ نواب سراج الملک اگرچہ اپنے والد کی جگہ مدارالمہام ریاست تو ہوگئے، لیکن ان کی آمدنی اتنی قلیل تھی کہ ان کے مرتبے کے مطابق داد و دہش کے لیے کفایت نہیں کرتی تھی۔ لامحالہ

انھیں قرض لینا پڑتا تھا۔ لیکن ساہوکار جانتے تھے کہ اس کی واپسی کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں، اس لئے وہ کافی ضمانت کے بغیر قرض دینے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ لطیفہ یہ کہ وہ بالعموم مطالبہ کرتے کہ اگر آپ کے بھتیجے میر تراب علی خاں ضامن ہو جائیں تو ہم قرض دے دیتے ہیں۔ میر تراب علی خاں اس کم سنی کے باوجود حساب کتاب کے معاملات میں بہت ہوشیار تھے۔ جب نواب سراج الملک ان سے کہتے کہ تم ضمانت دے دو، تو یہ عرض کرتے: خاکسار کو بھلا اس میں کیا عذر ہو سکتا ہے، لیکن میری التماس یہ ہے کہ جاگیر میں سے کسی علاقے کا انتظام میری تحویل کر دیا جائے، تاکہ میں اس کی آمدنی سے قرضے کی ادائی کا انتظام کر سکوں۔ اس سے دو فایدے ہوئے۔ اوّل یہ کہ بہت سا قرض بتدریج ادا ہوتا گیا۔ ورنہ وہی صورت ہوتی، جو نواب منیر الملک کی وفات پر پیش آئی تھی۔ دوسرے انھیں چھوٹی سی عمر ہی میں مالی اور انتظامی معاملات کا غیر معمولی تجربہ یہ حاصل ہو گیا۔

۱۸۴۸ء میں جب نظام نے نواب سراج الملک کو دوبارہ وزارتِ اعلیٰ پر مقرر فرمایا، تو ان کی خاندانی جایداد بھی واگذاشت کر دی۔ میر تراب علی خاں نے اپنے حسنِ انتظام سے پہلی جاگیر کی دیکھ بھال ایسی عمدگی سے کی تھی کہ چچا دل و جان سے ان کی قابلیت اور کارکردگی کے قایل ہو گئے تھے۔ اب جو انھیں ساری جایداد واپس ملی، تو انھوں نے اسے بھی اپنے ہونہار بھتیجے کے ہاتھ میں دے دیا۔

نواب سراج الملک نے چند دن کی علالت کے بعد ۲۶ مئی ۱۸۵۳ء (۱۷ شعبان ۱۲۶۹ھ) کو لاولد انتقال کیا۔ اس کے پانچ دن بعد نواب ناصر الدولہ آصف جاہ چہارم نے میر تراب علی خاں کو طلب کیا اور انگریز ریذیڈنٹ کی موجودگی میں انھیں خلعتِ دیوانی اور سالار جنگ کے خطاب سے مفتخر فرما کر اپنا مدار المہام یعنی وزیر اعظم مقرر کر دیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف چوبیس (۲۴) برس کی تھی۔ میرزا ہمدم شیرازی کے طویل قطعۂ تاریخ کے آخری چند شعر ہیں ؎

فلک رتبہ نواب سالار جنگ — تراب علی، نورِ چشمِ جہاں
شہِ باستاں میر احمد لوا — میر راستاں آصفِ جم نشاں
وزیرِ خرد مند دانش پذیر — جوانِ جواں بختِ روشن رواں
بجائے نیاگاں بہ مسند نشست — بہ تدبیر پیر و بہ بخت جواں
پئے سالِ تاریخ ہمدم بگفت — "وزارت مبارک بہ صدرِ جہاں"
۱۲۶۹

جب یہ مدار المہام ہوئے ہیں، تو اس وقت یہاں کی حالت کس درجہ ابتر تھی اس کا اندازہ صرف اس سے لگایئے کہ ریاست پر دو کروڑ ستر لاکھ کا سودی قرض تھا۔ اس کے علاوہ عرب جمعداروں کے پاس ریاست کی نصف سالانہ آمدنی (یعنی ۵۰ لاکھ) کا علاقہ رہن تھا، اور کوئی پندرہ بیس لاکھ سالانہ کی جاگیریں بھی انھی جمعداروں کے مستقل قبضے میں تھیں اور مزید کم و بیش تیس لاکھ کے علاقے ٹھیکے پر تھے۔ غرض خزانہ خالی تھا اور روز بروز قرض کی مقدار میں اضافہ ہو رہا تھا۔ فوج اور سپاہ کو مہینوں تنخواہ کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوتا تھا جب یہ لوگ سخت تنگ آ جاتے تو "بجنگ آمد" پر عمل کرتے ہوئے شاہی محل پر ہلّہ بول دیتے، فساد پر آمادہ ہو جاتے اور بغاوت کی دھمکی دیتے۔ لامحالہ اس پر مزید قرض لے کر دو ایک مہینے کی باقی ادا کر دی جاتی تا آنکہ یہ لوگ پھر مرنے مارنے پر تیار نہ ہو جاتے۔

مالی بدحالی کا یہ حال تھا۔ رہا انتظامِ حکومت تو وہ اس سے بھی بدتر تھا۔ ریاست میں عرب جمعداروں اور روہیلے پٹھانوں کا دور دورہ تھا ان کی شورہ پشتی اور رعایا پر ظلم و ستم کے ایسے ایسے واقعات لکھے ہیں کہ انھیں پڑھ پڑھ کے حیرت ہوتی ہے۔ ایک عرب نے راہ چلتے ایک شریف آدمی سے کہا کہ صاحب! ذرا یہ دستاویز تو پڑھ دیجیے۔ اس نے دیکھ کر کہا کہ یہ چار سو روپئے کا تمسک ہے۔ عرب نے بگڑ کے کہا: واہ، خوب آدمی ہے، پانسو کے تمسک کو چار سو کا بتاتا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ اس میں تو چار سو ہی لکھا ہے۔ اگر اعتبار نہیں، تو کسی اور سے پڑھوا لو۔ اس پر عرب نے غیظ و غضب سے کاغذ اس کے ہاتھ سے چھین پھاڑ کے پھینک دیا اور اس غریب کے گلے میں رومال ڈال کے کہنے لگا: اچھا چلو اس وقت چار سو ہی ادا کر دو، بقیہ کی پھر دیکھی جائے گی۔ اب تو وہ شخص چیخنے لگا کہ میں نے کب تم سے کچھ لیا ہے۔ لیکن کون سنتا ہے، وہ عرب اسے کھینچ کے ساتھ لے چلا۔ آخر بڑی مشکل سے کچھ دے دلا کر گلو خلاصی کرائی۔ ان کے ظلم کا ایک اور افسوس ناک واقعہ سنیے۔

کے مصداق جملہ احکام خود نظام سکندر جاہ بہادر جاری فرماتے اور ریاست کے مالی معاملات میں سیاہ و سپید کے کرتا دھرتا پیشکار مہاراجہ چندو لال بہادر تھے۔ اس لیے ان کی دیوانی محض برائے نام اور گویا انھیں "بدنام" کرنے کا ایک حیلہ بن کے رہ گئی تھی۔ بہر حال یہ ۲۵ برس تک وزیر ریاست رہ کر ۱۸۳۳ء (۱۲۴۸ھ) میں راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔ اس کے بعد مہاراجہ چندو لال ہی کو ریاست کی مستقل مدار المہامی کا عہدہ بھی تفویض ہوگیا، جس پر وہ گیارہ برس، ۱۸۴۳ء تک قابض رہے۔ معزولی کے بعد ۱۸۴۵ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔

نواب علی زمان خاں منیر الملک ثانی کے اس دوسرے نکاح سے دو بیٹے پیدا ہوئے تھے ـــــ میر محمد علی خاں اور میر عالم علی خاں۔ یہی میر محمد علی خاں ہمارے نواب مختار الملک سالار جنگ کے والد ماجد ہیں۔

میر محمد علی خاں ۱۸۰۷ء (۱۲۲۲ھ) میں پیدا ہوئے۔ تاریخِ ولادت سید مرزا خاں نے کہی تھی: "ستارۂ روشن"۔ ان کی مہر کا سجع تھا: بود جانشینِ محمد علی۔ خطاب شجاع الدولہ، سالار جنگ تھا۔ ان کا نکاح امیر سلطنت سید کاظم علی خاں مختار الدولہ کی صبیہ زینت النساء بیگم سے ہوا تھا، جو سادات نیشا پور میں سے تھے۔ اسی محل سے ان کے ۲ جنوری ۱۸۲۹ء (۲۵ جمادی الثانی ۱۲۴۴ھ) کو وہ بیٹا پیدا ہوا، جو آگے چل کر اس سلسلۂ زرناب کے لیے بھی باعثِ صد فخر و مباہات ثابت ہوا۔ والدین نے اس کا نام تراب علی خاں رکھا۔ خاندان کا دستور یہ تھا کہ نومولود کو سب سے پہلے تبرکاً کسی عابدہ، زاہدہ سیدانی کا دودھ پلواتے تھے۔ یہ پیدا ہوئے، تو انھیں ریاست کے ایک معزز منصب دار، میر چراغ علی خاں کی بیگم کا، جو ہمہ صفت موصوف خاتون تھیں، دودھ پلایا گیا۔ اسی لیے میر چراغ علی خاں کے صاحبزادے، میر تہور علی خاں مختار جنگ، جلال الدولہ اور نواب سر سالار جنگ دونوں کی ایک ساتھ پرورش ہوئی اور وہ ان کے رضاعی بھائی ہونے کے باعث ان کے کوکہ کہلاتے تھے۔

میر محمد علی خاں کا عین شباب میں بعمر ۲۵ برس ۱۸۳۲ء (۱۲۴۷ھ) میں انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد تراب علی خاں کی پرورش ان کے جدِ بزرگوار نواب منیر الملک ثانی نے اپنے ذمے لی، جو ان سے دیوانہ وار محبت کرتے تھے۔ یہ چار برس کے تھے کہ انھیں ایسا شدید تپ کا عارضہ لاحق ہوگیا کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ روایت ہے کہ جب سب کو یاس ہوگئی تو نواب منیر الملک نے دعا مانگی کہ بار الٰہا! اگر اس بچے کی موت مقدر ہی ہے، تو اس کی جگہ مجھے اٹھا لے اور اسے صحت عطا فرما دے۔ جانے، وہ کون سی گھڑی تھی، جب یہ لفظ ان کے منہ سے نکلے۔ دعا بارگاہِ الٰہی میں مقبول ہوگئی۔ چند دن میں بچہ بھلا چنگا ہوگیا اور نواب منیر الملک ثانی اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

ہونے کو یہ ٹھیک تو ہوگئے، لیکن بیماری کا حملہ اتنا شدید تھا کہ اس سے تندرستی بالکل تباہ ہوگئی اور یہ دائمی طور پر نحیف الجثہ اور منحنی ہو کے رہ گئے۔

منیر الملک کی وفات کے بعد ان کی تعلیم و تربیت، ان کے چچا میر عالم علی خاں بہادر سراج الملک کی نگرانی میں ہونے لگی۔ چونکہ صحت ٹھیک نہیں رہتی تھی اور اندیشہ تھا کہ مزید بوجھ پڑنے سے یہ اور خراب ہو جائے گی، اس لیے ایک زمانے تک ان کی باقاعدہ تعلیم شروع نہ ہو سکی اور یہ گیارہ بارہ برس کی عمر تک معمولی شُد بُد سے آگے نہیں بڑھے۔ اس کے بعد جب کچھ اچھے ہوئے تو اس پر زیادہ سنجیدگی سے توجہ دی گئی اور انھوں نے اس زمانے کے رواج کے مطابق فارسی اور عربی، حساب کتاب، انشا پردازی اور خوش نویسی کی معقول تعلیم کے علاوہ مردانہ کھیلوں میں بھی خاصی مہارت حاصل کی۔ چنانچہ نشانہ لگانے اور نیزہ بازی اور شہ سواری میں پورے طاق تھے۔ خاص طور پر گھوڑے کی سواری کے بہت شایق تھے۔ بڑے سے بڑے منہ زور گھوڑے پر نڈر سوار ہو جاتے۔ زمانۂ شباب میں انگریزی حاصل کرنے کا خیال پیدا ہوا تو رفتہ رفتہ اس سے بھی بقدر ضرورت اچھی خاصی واقفیت پیدا کر لی تھی۔

نواب منیر الملک نے وفات کے وقت پچیس لاکھ قرض چھوڑا تھا۔ غفران منزل نواب ناصر الدولہ بہادر آصف جاہ چہارم نے قرضہ تو بے باق کر دیا لیکن ان کی بیشتر متروکہ جایداد نزول قرار دے دی۔ اس سے خاندان پر گویا عسیر الحالی کا دور آگیا۔ نواب سراج الملک اگرچہ اپنے والد کی جگہ مدار المہام ریاست تو ہوگئے، لیکن ان کی آمدنی اتنی قلیل تھی کہ ان کے مرتبے کے مطابق داد و دہش کے لیے کفایت نہیں کرتی تھی۔ لامحالہ

انھیں قرض لینا پڑتا تھا۔ لیکن ساہوکار جانتے تھے کہ اس کی واپسی کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں، اس لئے وہ کافی ضمانت کے بغیر قرض دینے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ لطیفہ یہ کہ وہ بالعموم مطالبہ کرتے کہ اگر آپ کے بھتیجے میر تراب علی خاں ضامن ہو جائیں تو ہم قرض دے دیتے ہیں۔ میر تراب علی خاں اس کم سنی کے باوجود حساب کتاب کے معاملات میں بہت ہوشیار تھے۔ جب نواب سراج الملک ان سے کہتے کہ تم ضمانت دے دو، تو یہ عرض کرتے: خاکسار کو بھلا اس میں کیا عذر ہو سکتا ہے، لیکن میری التماس یہ ہے کہ جاگیر میں سے کسی علاقے کا انتظام میری تحویل کر دیا جائے، تاکہ میں اس کی آمدنی سے قرضے کی ادائی کا انتظام کر سکوں۔ اس سے دو فایدے ہوئے۔ اوّل یہ کہ بہت سا قرض بتدریج ادا ہوتا گیا۔ ورنہ وہی صورت ہوتی، جو نواب منیر الملک کی وفات پر پیش آئی تھی۔ دوسرے انھیں چھوٹی سی عمر ہی میں مالی اور انتظامی معاملات کا غیر معمولی تجربہ حاصل ہو گیا۔

۱۸۴۸ء میں جب نظام نے نواب سراج الملک کو دوبارہ وزارتِ اعلیٰ پر مقرر فرمایا، تو ان کی خاندانی جایداد بھی واگذاشت کر دی۔ میر تراب علی خاں نے اپنے حسنِ انتظام سے پہلی جاگیر کی دیکھ بھال ایسی عمدگی سے کی تھی کہ چچا دل و جان سے ان کی قابلیت اور کارکردگی کے قایل ہو گئے تھے۔ اب جو انھیں ساری جایداد واپس ملی، تو انھوں نے اسے بھی اپنے ہونہار بھتیجے کے ہاتھ میں دے دیا۔

نواب سراج الملک نے چند دن کی علالت کے بعد ۲۶ مئی ۱۸۵۳ء (۱۷ شعبان ۱۲۶۹ھ) کو لاولد انتقال کیا۔ اس کے پانچ دن بعد نواب ناصر الدولہ آصف جاہ چہارم نے میر تراب علی خاں کو طلب کیا اور انگریز ریذیڈنٹ کی موجودگی میں انھیں خلعتِ دیوانی اور سالار جنگ کے خطاب سے مفتخر فرما کر اپنا مدار المہام یعنی وزیر اعظم مقرر کر دیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف چوبیس (۲۴) برس کی تھی۔ میرزا ہمدم شیرازی کے طویل قطعۂ تاریخ کے آخری چند شعر ہیں ؎

فلک رتبہ نوّاب سالار جنگ   تراب علی، نورِ چشمِ جہاں
شہِ باستاں میر احمد لوا   مہِ راستاں آصفِ جم نشاں
وزیرِ خرد مند دانش پذیر   جوانِ جواں بختِ روشن رواں
بجائے نیاگاں بمسند نشست   بہ تدبیر پیر و بہ بخت جواں
پئے سالِ تاریخ ہمدم بگفت   "وزارت مبارک بہ صدرِ جہاں"
۱۲۶۹

جب یہ مدار المہام ہوئے ہیں، تو اس وقت یہاں کی حالت کس درجہ ابتر تھی، اس کا اندازہ صرف اس سے لگائیے کہ ریاست پر دو کروڑ ستّر لاکھ کا سودی قرض تھا۔ اس کے علاوہ عرب جمعداروں کے پاس ریاست کی نصف سالانہ آمدنی (یعنی ۴۵ لاکھ) کا علاقہ رہن تھا، اور کوئی پندرہ بیس لاکھ سالانہ کی جاگیریں بھی انہی جمعداروں کے مستقل قبضے میں تھیں اور مزید کم و بیش تیس لاکھ کے علاقے ٹھیکے پر تھے۔ غرض خزانہ خالی تھا اور روز بروز قرض کی مقدار میں اضافہ ہو رہا تھا۔ فوج اور سپاہ کو مہینوں تنخواہ کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوتا تھا جب یہ لوگ سخت تنگ آ جاتے تو "بجنگ آمد" پر عمل کرتے ہوئے شاہی محل پر ہلّہ بول دیتے، فساد پر آمادہ ہو جاتے اور بغاوت کی دھمکی دیتے۔ لا محالہ اس پر مزید قرض لے کر دو ایک مہینے کی باقی ادا کر دی جاتی تاآنکہ یہ لوگ پھر مرنے مارنے پر تیار نہ ہو جاتے۔

مالی بدحالی کا یہ حال تھا۔ رہا انتظامِ حکومت تو وہ اس سے بھی بدتر تھا۔ ریاست میں عرب جمعداروں اور روہیلے پٹھانوں کا دور دورہ تھا۔ ان کی شورہ پشتی اور رعایا پر ظلم و ستم کے ایسے ایسے واقعات لکھے ہیں کہ انھیں پڑھ پڑھ کے حیرت ہوتی ہے۔ ایک عرب نے راہ چلتے ایک شریف آدمی سے کہا کہ صاحب، ذرا یہ دستاویز تو پڑھ دیجیے۔ اس نے دیکھ کر کہا کہ یہ چار سو روپیے کا تمسّک ہے۔ عرب نے بگڑ کے کہا: واہ، خوب آدمی ہے، پانسو کے تمسّک کو چار سو کا بتاتا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ اس میں تو چار سو ہی لکھا ہے۔ اگر اعتبار نہیں، تو کسی اور سے پڑھوا لو۔ اس پر عرب نے غیظ و غضب سے کاغذ اس کے ہاتھ سے چھین پھاڑ کے پھینک دیا اور اس غریب کے گلے میں رومال ڈال کے کہنے لگا: اچھا چلو اس وقت چار سو ہی ادا کر دو، بقیہ کی پھر دیکھی جائے گی۔ اب تو وہ شخص چیخنے لگا کہ میں نے کب تم سے کچھ لیا ہے۔ لیکن کون سنتا ہے، وہ عرب اسے کھینچ کے ساتھ لے چلا۔ آخر بڑی مشکل سے کچھ دے دلا کر گلو خلاصی کرائی۔

ان کے ظلم کا ایک اور افسوس ناک واقعہ سنیے۔

احمد علی خاں شہید تخلص منصب دارِ ریاست تھے۔ ان کی ایک نابالغ بیٹی تھی۔ عربوں کے جمعدار ناصر رستم جنگ نے اپنے بھتیجے کے لیے شہید سے اس لڑکی کی خواستگاری کی۔ شہید نے کسی وجہ سے انکار کر دیا زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ایک شام ان کے دروازے پر ایک فقیر نے آ کے سوال کیا۔ اتفاق سے اس وقت ان کی بیوی اور اس معصوم لڑکی کے سوائے گھر پر کوئی نہیں تھا۔ ماں نے بیٹی سے کہا کہ جاؤ، فقیر کو روٹی دے آؤ۔ جب دیر تک لڑکی واپس نہ آئی، تو ماں پکارتی ہوئی دوڑی۔ دیکھا تو لڑکی غائب ہو گئی ہے۔ بہت چیخی چلائی، لیکن بے سود۔! اگلی صبح شہید غریب نے مکان کا دروازہ کھولا، تو دیکھا کہ سامنے گلی میں ایک گٹھڑی پڑی ہے۔ اسے کھولا، تو اس میں سے دخترِ گم شدہ کی لاش کے ٹکڑے ملے۔ کوتوالی گئے، فریاد کی، لیکن اب کیا ہوتا تھا۔ کچھ بھی نہ ہوا۔

روہیلے پٹھان بھی ان عربوں سے کم نہیں تھے۔ چونکہ یہ لوگ اپنے پیر سلطان میاں کو مہدیِ زمان مانتے تھے، اس لیے مہدوی کہلاتے تھے۔ ان کے تمرّد اور سرکشی کا اس سے اندازہ لگائیے کہ ایک دن ان کے پیرزادے کی سواری، جن کا نام محمد تھا، حسبِ معمول بڑی دھوم دھام سے بازار میں جا رہی تھی۔ بلّم برداروں اور جھال داروں کا ایک گروہ ان کے جلو میں، ہٹو بچو کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ دوسری طرف سے حضور نظام کے پیش امام مولوی مرتضیٰ کے بھتیجے گھوڑے پر سوار آ رہے تھے۔ اس شور و شغب سے ان کا گھوڑا چمکا اور کارِ قضا اس کے پاؤں سے کیچڑ کا ذرا سا چھینٹا اڑ کر پیرزادے صاحب کے دامن پر آ پڑا۔ بس غضب ہی تو ہو گیا۔ ان کے اشارہ کرنے کی دیر تھی کہ ایک بلّم بردار نے بلّم کی نوک سے مولوی زادے کی پگڑی اُچھال کے زمین پر پھینک دی۔ یہ غیرت اور غصّے کے مارے بے حال ہو گئے اور ساتھ کے خدمت گار سے تلوار لینے کو ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ دوسرے نے تلوار کا ہاتھ مارا۔ جس سے ان کی چاروں انگلیاں کٹ کے الگ ہو گئیں۔ پھر کیا تھا پیرزادے کے ہمراہی ان پر ٹوٹ پڑے اور تلوار، کٹار، بھالے سے ان کے پرزے اڑا دیے۔ دارالخلافے میں، دن دہاڑے، عین سرِ بازار یہ حادثہ پیش آیا اور کوئی ان ظالموں کا کچھ بگاڑ نہ سکا۔

ہر ایک رئیس نے جمعیت اکٹھا کر رکھی تھی۔ یہ لوگ رعایا پر ظلم و تعدّی کرتے اور ان سے جو چاہتے، وصول کر لیتے۔ اگر کوئی انکار کرتا تو اسے کھلے بندوں موت کے گھاٹ اُتار دیتے۔ پھر اُن کی آپس میں خانہ جنگیاں بھی ہوتی رہتی تھیں۔

غرض ریاست کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اندرونی طور پر کامل خلفشار کا عالم تھا اور باہر نہ اس کی کوئی عزت تھی نہ وقار۔

سالار جنگ نے زمامِ وزارت ہاتھ میں لیتے ہی سب سے پہلے ریاست کی مالی حالت کی اصلاح پر توجہ دی کہ دراصل یہی جملہ خرابیوں کی جڑ تھی۔ لیکن یہ کام اتنا آسان نہیں تھا۔ جن لوگوں کے پاس پشت ہا پشت سے اتنی بڑی بڑی جاگیریں چلی آ رہی تھیں، جن کی لاکھوں کی آمدنی سے اُن کی حیثیت گویا خود مختار رئیس کی ہو گئی تھی، وہ بھلا کیوں آسانی سے دست بردار ہونے لگے تھے۔ لیکن سالار جنگ نے بہت صبر اور دُور اندیشی اور حکمتِ عملی سے کام لیا۔ کہیں نرمی سے جاگیرداروں کو رام کیا اور کہیں ضرورت پڑے پر سختی سے کام نکالا۔ یوں تیرہ برس کے عرصے میں ریاست کا تمام قرض بھی ادا کر دیا، مرہونہ علاقے بھی واگزار ہو گئے، فسادی عناصر کا بھی قلع قمع ہو گیا، اور وہی ریاست جس کی نہ گھر میں کوئی ساکھ تھی، نہ باہر پوچھ، اب ہندستان کی سب سے طاقتور ریاست شمار ہونے لگی۔

ان سے پہلے ریاستی کاروبار میں کسی منظم و ترتیب کا پتا ہی نہیں تھا۔ سب کچھ نظام اور ان کے مدارالمہام کی ذاتی رائے پر موقوف تھا۔ اب ریاست کے تمام محکمے سالار جنگ بہادر کی توجہ اور بیدار مغزی سے عالمِ وجود میں آئے۔ سب سے پہلے خزانۂ عامرہ قائم ہوا پھر لوگوں کو تنخواہ باقاعدگی سے مہینے کے مہینے ملنے لگی۔ اس کے بعد انھوں نے کاروبارِ ریاست کو چار انتظامی شعبوں میں تقسیم کر کے انھیں چار امیروں کے سپرد کیا، جن کی حیثیت گویا وزیروں کی تھی۔ یہ صدر المہام کہلاتے تھے۔ اس طرح گویا ایک کابینہ مرتب ہو گئی۔ غرض ان کے عہد میں یہ سب کام کاج ایک مہذّب اور متمدّن نظام کے مطابق ہونے لگا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ سب کچھ بے غل و غش آسانی سے ہو گیا۔ صرف حاسدوں اور فتنہ پردازوں ہی نے قدم قدم پر روڑے اٹکائے ہوتے، تو اس سے تعجب نہ ہوتا، کیونکہ ان کا تو مقصد ہی یہ تھا کہ انھیں بدنام کریں اور

ناکام ہوتی ہیں۔ سب سے بڑی مشکل خود غفران منزل نواب ناصر الدولہ کی تھی۔ سالار جنگ مرحوم جی جان سے چاہتے تھے کہ نہ صرف ریاست میں انگریزی طرزِ حکومت ہی رائج کیا جائے بلکہ خود انگریزوں سے بھی پورا ربط ضبط اور دوستی کا رشتہ قایم ہو جائے۔ انھیں اس کا پوری دیانتداری سے یقین تھا کہ اسی میں ریاست کی بھلائی ہے۔ دوسری طرف نواب ناصر الدولہ سخت دیندار قسم کے انسان تھے۔ وہ انگریز اور انگریزی قانون اور انتظام کے نام تک سے بھڑکتے اور برہم ہوتے تھے۔ جب حکمران کے یہ خیالات ہوں تو وزیر کی حالت قابلِ رحم کیوں نہ ہو۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سالار جنگ کو کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ لیکن وہ کسی حال میں بھی مایوس نہیں ہوئے۔ پورے استقلال اور وقار سے اپنی حکمتِ عملی پر قایم رہے اور بتدریج ریاست میں اصلاحات کا نفاذ کرکے رہے۔

غفران منزل نواب ناصر الدولہ کا ۱۸۵۷ء میں انتقال ہو گیا۔ بسترِ مرگ پر انھوں نے اپنے وارث نواب افضل الدولہ (آصف جاہ پنجم) اور وزیر نواب سالار جنگ کو وصیت کی کہ حکومت انگریزی کا برتاؤ ہماری ریاست سے ہمیشہ دوستانہ رہا ہے، اس لیے تمھارا فرض ہے کہ تم بھی اس سے وفاداری کا تعلق رکھو۔ جس دن نواب افضل الدولہ گدی پر بیٹھے ہیں، اسی دن دلی سے اس ہنگامے کے شروع ہونے کی خبر حیدرآباد پہنچی، جس نے آہستہ آہستہ پھیل کر پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ پھر ان دونوں نے جس طرح مرحوم کی آخری نصیحت پر عمل کیا، وہ ان کے کردار کی بلندی پر دال ہے۔ انھیں ہر طرح کی دھمکیاں دی گئیں بلکہ دھمکیوں سے گزر کر ان پر واقعی قاتلانہ حملے ہوئے، لیکن ان کے قدم نہیں ڈگمگائے۔ جو راستہ انھوں نے اختیار کیا تھا، اس پر بے خوفی اور مضبوطی سے قایم رہے۔

نواب افضل الدولہ نے تخت نشین ہوتے ہی انھیں خطابِ مختار الملک سے سرفراز فرمایا۔ میر احمد علی خاں شہید نے تاریخ کہی ؎

بہ نواب سالار جنگ اہلِ حشمت | خطاب مہ جواہر سزاوار بادا
بہ دل داشتم فکرِ سالِ ہمایوں | خرد گفت: "جاوید مختار بادا"

(۱۲۷۳)

نواب افضل الدولہ کے عہد میں بھی پورا زمانہ یہی مدار المہام رہے۔ خوش اعتقادی اور دینداری میں یہ بھی اپنے والد مرحوم نواب غفران منزل سے کم نہیں تھے۔

اسی لیے ان کی نئی نئی جدتوں سے اکثر جز بز ہوتے، بلکہ معاندوں کی ریشہ دوانیوں کے باعث برافروختہ اور ناراض تک ہوتے رہتے تھے لیکن انھیں بھی ان کی وفاداری اور خیر خواہی پر کامل اعتماد تھا۔ اور سالار جنگ نے بھی اپنی جاں فشانی اور اخلاص سے دن رات محنت کرکے ریاست کو چار چاند لگا دیے۔ ۱۸۵۷ء میں ریاست نے جو رویہ اختیار کیا تھا اس سے انگریزی حکومت ان کی دوستی کی قایل ہو گئی تھی۔ چناں چہ جب ہر طرف امن و امان ہو گیا اور ملک کے سب حصوں پر انگریزی تسلط از سرِ نو قایم ہو گیا، تو ۱۸۶۰ء میں انگریزوں نے اظہارِ خوشنودی کے طور پر نواب افضل الدولہ کے لیے ایک لاکھ روپے کے اور مختار الملک کے لیے بتیس ہزار کے تحائف ارسال کیے۔ اس کے بعد ۱۸۶۶ء میں مختار الملک کو "سر" کا خطاب بھی دیا، پھر ۱۸۷۱ء میں نائٹ گرانڈ کمانڈر آف دی آرڈر آف سٹار آف انڈیا G. C. S. I. کا خطاب اور ۱۸۷۷ء میں ملکہ وکٹوریہ کی جوبلی پر اکیس توپ کی سلامی کا ذاتی اعزاز ملا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد سلطان عبد الحمید خلیفۃ المسلمین نے بھی تمغۂ مجیدی درجہ اوّل عطا کیا۔

مغفرت مکان نواب افضل الدولہ کا ۱۸۶۹ء میں انتقال ہو گیا اور ان کے ڈھائی سالہ صاحبزادے میر محبوب علی خاں آصف جاہ ششم ان کے جانشین ہوئے۔ اب مختار الملک کی ذمہ داریاں اور بھی بڑھ گئیں۔ سرکار انگریزی نے ان کے ساتھ نواب شمس الامرا امیر کبیر بہادر کو شریک ریجنٹ مقرر کیا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نواب شمس الامرا نے کبھی ان کے کام پر اعتراض نہیں کیا۔ اور یہ ہر معاملے میں اپنی صواب دید ہی سے فیصلہ کر دیتے تھے۔ جب نواب شمس الامرا کا اپریل ۱۸۷۷ء میں انتقال ہو گیا، تو ان کی جگہ نواب رشید الدین خاں وقار الامرا شریک ریجنٹ مقرر ہوئے۔ چار برس بعد دسمبر ۱۸۸۱ء میں وہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے، تو اب ان کی جگہ کسی اور کو مقرر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ اب گویا "مختار الملک" اسم با مسمیٰ ہو گئے۔

شروع میں برار کا علاقہ دراصل ریاست حیدرآباد ہی کا حصہ تھا۔ ۱۸۵۳ء میں انگریزوں نے اسے انگریزی فوج متعینہ ریاست کی بقایا تنخواہ کے عوض میں اپنی تحویل میں لے لیا۔ مختار الملک نے

مدارالمہام مقرر ہوتے ہی اس انتظام کی خرابی محسوس کرلی تھی، لیکن اب کیا ہو سکتا تھا، تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ جب تک ریاست کی مالی حالت خستہ رہی، اس کی واپسی کی کوشش بھی بے سود تھی۔ جب انھوں نے اپنی مسلسل مساعی اور اصلاحات سے ریاست کو پھر سے اپنے پاؤں پر کھڑا کر دیا اور انگریزوں پر بھی ثابت ہو گیا کہ حیدرآباد کا نظم و نسق کسی دوسری جگہ سے کم نہیں، تو انھوں نے استردادِ برار کی کوشش شروع کی۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کو ہندستان میں جن خطرناک حالات کا سامنا تھا، اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ ان ایام میں بھی نواب مختار الملک نے سخت مخالفانہ صورتِ حال کے باوجود پوری وفاداری اور ثابت قدمی سے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ انھیں توقع تھی کہ انگریز ان کی خدمات کے اعتراف میں برار واپس کر دیں گے۔ لیکن چونکہ اس قضیے کا فیصلہ بہر حال ولایت میں ہوتا تھا اور ہندستان کے حکام محض وہاں کے احکام نافذ کرنے والے تھے، اس لیے انھوں نے فیصلہ کیا کہ انگلستان کا سفر کیا جائے اور ذاتی گفت و شنود سے یہ معاملہ طے کرایا جائے۔ حسنِ اتفاق سے ۱۸۷۵ء میں پرنس آف ویلز (جو بعد میں ایڈورڈ ہفتم کے نام سے ملکہ وکٹوریہ کے جانشین ہوئے) ہندستان کی سیر کو آئے۔ ان کے حاشیہ میں ڈیوک آف سدرلینڈ بھی تھے۔ وہ سیر کے لیے جنوری ۱۸۷۶ء میں حیدرآباد پہنچے اور یہاں نواب مختار الملک کی ملاقات سے بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے روانگی سے پہلے انھیں انگلستان آنے اور اپنے ہاں مہمان بننے کی دعوت دی۔ یہ تو پہلے ہی سے اس سفر کے لیے پر تول رہے تھے۔ اس دعوت نے گویا سمندِ شوق کے لیے تازیانے کا کام دیا چنانچہ وہ ۸۔ اپریل ۱۸۷۶ء کو (۵۲) آدمیوں کے قافلے کے ساتھ بمبئی سے جہاز پر سوار ہوئے۔ راستے میں وہ روما میں شاہ وکٹر عمانویل بادشاہِ اطالیہ اور پوپ سے ملے اور اس کے بعد اطالیہ کے بعض دوسرے شہروں کی سیر کرتے ہوئے ۱۳۔ مئی کو پیرس پہنچے۔ ارادہ یہ تھا کہ یہاں صرف ایک دن رک کر آگے روانہ ہو جائیں گے، جہاں کا مفصل پروگرام پہلے سے بن چکا تھا۔ لیکن پیرس میں ایک افسوسناک حادثہ پیش آیا جس سے سارا انتظام تلپٹ ہو گیا۔ جس دن یہ یہاں پہنچے ہیں، اسی شام کو اپنی قیامگاہ گرانڈ ہوٹل کی سیڑھیوں سے اترتے ہوئے ان کا پاؤں پھسل گیا، جس سے ہڈی ٹوٹ گئی۔ ان کی بے بسی کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ وہ چلنے پھرنے تک سے معذور تھے۔ اس حالت میں سفر کیونکر ہو سکتا تھا۔ غرض انھیں علاج کے لیے مجبوراً دو ہفتے یہاں رکنا پڑا۔ جب قدرے افاقہ ہوا اور وہ سفر کے قابل ہوئے تو یکم جون کو ایک خاص بحری جہاز پر سوار ہو کر ولایت پہنچے۔ یہاں ان کی جتنی خاطر مدارات اور اعزاز و اکرام ہوا، اس کا تفصیلی ذکر غیر ضروری ہے۔ ہر جگہ جلسے اور دعوتیں ہوئیں۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کی طرف سے ڈاکٹر آف سول لا D. C. L. کی اعزازی ڈگری ملی۔ لندن کی کاؤنٹی کونسل نے ایک خاص اجلاس میں انھیں آزاد شہری Freedom of the city of London کا اعزاز دیا۔ خود ملکہ وکٹوریہ نے ایک دن ونڈسر محل میں مہمان رکھا۔ بے شک یہ سب کچھ تو ہوا، لیکن جس مقصد کے لیے انھوں نے اتنا دور دراز کا سفر اور بے شمار خرچ گوارا کیا تھا اس میں کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ نہ صرف یہ، بلکہ اس سے متعلق کوئی گفتگو تک نہ ہو سکی۔ جب انھوں نے وزیر اعظم انگلستان سے ملاقات کے لیے وقت مقرر کرنے کی درخواست کی، تو جواب ملا کہ ہم بہت مسرت سے ملیں گے، لیکن برار کے مسئلے پر کوئی بات چیت نہ کی جائے۔ یہ حقیقت ہے کہ حکومت انگریزی کی اس سرد مہری اور بے رخی سے نواب مختار الملک کے دل کو سخت صدمہ پہنچا اور وہ اپنے مقصد میں اس ناکامی کو کبھی نہیں بھولے۔ یہ قافلہ بہ حسن و خوبی ۲۴۔ اگست کو واپس بمبئی اور اگلے دن ۲۵۔ اگست کو حیدرآباد پہنچا۔

فروری ۱۸۸۳ء میں ڈیوک آف مکلنبرگ حیدرآباد تشریف لائے۔ یہ ولایت کے شاہی خاندان کے فرد تھے اور وہاں کے سفر کے زمانے سے نواب صاحب موصوف کے ان سے بہت دوستانہ تعلقات تھے۔ نواب مختار الملک کا ارادہ تھا کہ ۸۔ فروری کو بڑے وسیع پیمانے پر ان کے اعزاز میں پُر تکلف دعوت دیں۔ سوءِ اتفاق سے اس سے دو ایک دن پہلے نواب افضل الدولہ مغفرت مکان کی صاحبزادی کا انتقال ہو گیا۔ یہ نواب شمس الامرا مرحوم کی بیگم تھیں۔ اس پر وہ دھوم دھامی دعوت منسوخ کرنا پڑی اور فیصلہ ہوا کہ اس کی جگہ صرف ساٹھ آدمیوں کی ایک مختصر سی دعوت دی جائے۔ لیکن کارکنانِ قضا و قدر کو یہ بھی منظور نہیں تھا۔ سات کی شام کو وہ حسب معمول بہت رات گئے تک اپنے فرائضِ منصبی کی

دیکھ بھال میں مشغول رہے۔ دو بجے شب کو یکایک طبیعت خراب ہو گئی۔ اطبّا نے تشخیص کی کہ ہیضہ کا حملہ ہوا ہے، لیکن کسی نے معاملے کی سنگینی کا احساس نہیں کیا اور سب اپنے اپنے کام کاج میں مشغول رہے یہاں تک کہ دونوں صاحبزادے بھی صبح کے وقت باریاب ہو کر پروگرام کے مطابق مہمانِ معظم کے ساتھ شکار پر روانہ ہو گئے۔ پہلے اپنے ذاتی معالج کا علاج رہا۔ اس کے بعد حیدرآباد کے مشہور طبیب میرزا علی سے رجوع کیا گیا، لیکن مرض میں کوئی تخفیف نہیں ہوئی اور ان کی حالت رفتہ رفتہ بد سے بدتر ہوتی گئی۔ سہ پہر کو دو بجے کے لگ بھگ مسٹر جونس W. B. Jones انگریز ریذیڈنٹ عیادت کے لئے آیا۔ اس نے واپس جا کر ریذیڈنسی کے ڈاکٹر بوماں Beaumont کو دیکھنے کے لیے بھیجا۔ لیکن وقت آ لگا تھا۔ قے اور اسہال کی کثرت سے سخت نڈھال ہو گئے تھے۔ دوا اور دعا سب بے کار ثابت ہوئیں۔ القصہ پورے تیس برس تک اپنے ملک اور مالک کی نیک طینتی اور دیانت، دانائی اور بیدار مغزی کے ساتھ خدمت کرنے کے بعد ۸۔ مئی جمعرات کی شام کے ساڑھے سات بجے جاں بحق ہوئے۔ اِنّا لِلّٰہ وَاِنّا الیہ رَاجِعُون

تاریخِ وفات کا مصرع ہے ع

گم بشد معدنِ فطرت ز دکن

ایک دوسری تاریخ "جنازہ وزیر اعظم" میں بہت حضرات کو توارد ہوا۔

جنازہ جمعے کے دن ۹۔ مئی کو اٹھا۔ حیدرآباد کے مشرقی حصے میں تالاب میر جملہ کے قریب دایرہ میر مومن میں محو خوابِ ابدی ہیں، جہاں اس زمانے میں یہاں کے شیعہ اصحاب دفن ہوا کرتے تھے۔ خاندانِ مختار الملک کے مدافن اسی دایرے میں ایک الگ چار دیواری میں ہیں۔ مختار الملک کی قبر اندر چبوترے کی سیدھی جانب واقع ہے۔

نواب مختار الملک کا نکاح ۱۲۷۰ھ (۱۸۵۴م) میں نواب میر غلام حسین خاں فخر الملک بہادر کی صاحبزادی حیات النسا بیگم سے ہوا تھا۔ شادی کے بعد شوہر نامدار کے گھر میں ان کا عزیز النسا بیگم نام اور دولھن پادشاہ خطاب قرار پایا۔ نواب صاحب کی وفات کے وقت ان کی مندرجہ ذیل اولاد موجود تھی:-

دو بیٹیاں نور النسا بیگم عرف بڑی صاحبزادی اور سلطان بخت افروز بیگم عرف چھوٹی صاحبزادی۔

دو بیٹے تھے، میر لائق علی خاں۔ ولادت ۱۲۔ نومبر ۱۸۶۱ء۔ خطابات: سر، سالار جنگ، مختار الملک، عماد السلطنت، کے سی ایس آئی۔ صرف ۲۳ برس کی عمر میں جنوری ۱۸۸۴ء میں مدار المہام دکن ہوئے۔ عین شباب کے عالم میں ۶ جولائی ۱۸۸۹ء کو انتقال کیا۔ میر یوسف علی خاں سالار جنگ انھیں کے اکلوتے بیٹے تھے۔ یہ اپنے والد کی وفات کے وقت صرف ۲۵ دن کے تھے۔ بڑے صاحب ذوق اور ماہرِ فنونِ لطیفہ تھے۔ حیدرآباد کے سالار جنگ میوزیم کا جملہ سامان اور کتاب خانہ بیشتر انھی کا جمع کیا ہوا تھا۔ یہ ۱۹۴۶ء میں لاولد فوت ہوئے۔

دوسرے بیٹے نواب مختار الملک کے میر سعادت علی خاں تھے۔ ان کی ولادت اپریل ۱۸۶۲ء میں ہوئی۔ غیور جنگ، شجاع الدولہ، منیر الملک ثالث بہادر ان کے خطاب تھے۔ انھوں نے بھی ۲۷ برس کی عمر میں ۲۷۔ دسمبر ۱۸۸۹ء کو لاولد انتقال کیا۔

از خاندانِ کسریٰ دیگر کسے نماند

(۲)

غالب نے اگست ۱۸۶۰ء (صفر ۱۲۷۷ھ) میں اپنے دیوان اردو کا ایک نسخہ، معلوم نہیں کس کی تحریک پر، نواب مختار الملک کی خدمت میں نذر بھیجا۔ ان کی طرف سے تو کوئی جواب نہ ملا، لیکن منشی محمد حبیب اللہ ذکا نے، جو ان کے میر منشی تھے، انھیں ایک خط لکھا، جس میں میرزا سے ان کے دیوان فارسی اور ماہِ نیم ماہ کی فرمائش کی تھی۔ غالب نے خیال کیا کہ یہ فرمائش نواب مختار الملک بہادر کے ایما سے ہوئی ہے اور جواب میں لکھا[۵] کہ ماہِ نیم ماہ وجود میں آیا ہی نہیں اور کلیاتِ فارسی کا پہلا ایڈیشن کہیں سے دستیاب نہیں ہو سکتا۔ جو نسخے تھے وہ ۱۸۵۷ء کی رستخیز میں ضائع ہو گئے۔ اس کی دوبارہ اشاعت کی کوشش ہو رہی ہے۔ اگر ڈول بن گیا، تو مطبوعہ نسخہ حاضر خدمت ہو گا اور

---

۵ کلیات نثر فارسی (غالب) ص ۲۴۶-۲۴۷

اگر اس کا انتظام نہ ہو سکا تو کاتب سے لکھوا کے قلمی نسخہ بھجوا دوں گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی کے بعد انھوں نے وہ قصیدہ نواب مختار الملک بہادر کی مدح میں لکھا اور ان کے منشی انشا مولوی موید الدین خاں کی وساطت سے ان کی خدمت میں گزرانا، جس کا مطلع ہے ؎

در مدح سخن چنساں نگویم شرطست کہ داستاں نگویم

اور جو کلیات مطبوعہ میں نمبر ۴۳ پر چھپا ہے۔ غالب بالعموم قصاید خاص اہتمام سے خوشنویس سے افشانی کاغذ پر لکھوا کے ممدوح کی خدمت میں پیش کیا کرتے تھے۔ لیکن یہ قصیدہ انھوں نے اپنے قلم سے لکھ کے حیدرآباد بھیجا تھا۔ ان کی اصلی تحریر آج بھی سالار جنگ میوزیم میں دیکھی جا سکتی ہے۔

معلوم ہوتا ہے، صلۂ ستایش تو درکنار، ممدوح کی طرف سے اس کی رسید تک موصول نہ ہوئی۔ اس پر انھوں نے ایک عرضداشت لکھی جو ان کے کلیاتِ نثر فارسی میں شامل ہے (ص ۴۷۲-۴۸۲)۔ اس پر بھی صدائے برنخاست۔ اس کے بعد انھوں نے تو خط یکے بعد دیگرے نواب صاحب ممدوح کے نام لکھے۔ لیکن جب کسی کا جواب نہ ملا تو انھوں نے مولوی موید الدین سے استمداد کی (جن کے ان سے پہلے کے مراسم تھے) اور پہلی عرضداشت کی نقل بھی ملفوف کر دی۔ مولوی صاحب نے نواب مختار الملک کو اپنے نام کا یہ خط دکھایا اور عرضداشت بھی پیش کی۔ اس پر حکم ہوا کہ دارالانشا میں تفتیش اور تلاش کی جائے، تاکہ میرزا صاحب کو جواب لکھا جا سکے۔ اس دوران میں کلیات نظم فارسی کا دوسرا ایڈیشن بھی چھپ چکا تھا۔ میرزا نے حسب سابق اس کا ایک نسخہ بھی مولوی موید الدین خاں کی معرفت نواب صاحب کی خدمت میں بھیج دیا اور لکھا کہ اگر پہلا قلمی قصیدہ دارالانشا میں دستیاب نہ ہو سکے، جب بھی یہ کلیات مطبوعہ میں ممدوح کی نظر سے گزر سکتا ہے (نگار لکھنؤ اپریل ۱۹۵۹ء، ص ۹-۱۰)

یہ معلوم نہ ہو سکا کہ انھیں قصیدے پر کچھ انعام ملا یا نہیں۔

کتابیات

۱- مرقعۂ عبرت از نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی (ترجمہ مولوی مہدی حسن)
اعظم اسٹیم پریس، حیدرآباد (۱۳۰۰ھ)

۲- ریاضِ مختاریہ سلطنت آصفیہ از میر دلاور علی دانش
مطبع ہزار داستاں، حیدرآباد (۱۹۴۲ء)

۳- سر سالار جنگ اعظم از ابوالمکارم فیض محمدؐ
افتخار پریس، حیدرآباد (۱۹۵۰ء)

۴- تاریخ حیدرآباد دکن از مولوی محمد نجم الغنی
نولکشور پریس، لکھنؤ (۱۹۳۵ء)

۵- کلیات نثر غالب (فارسی) از غالب
مطبع نولکشور، لکھنؤ (۱۸۸۴ء)

۶- کلیات نظم غالب (فارسی) از غالب
مطبع نولکشور، لکھنؤ (۱۹۲۴ء)

۷- اُردوی معلی از غالب
کریمی پریس، لاہور (۱۹۲۲ء)

۸- نگار (ماہنامہ) لکھنؤ- اپریل ۱۹۵۹ء

۹- دستاویز Pol. A-Sept., 1880- NOS. 150/158
(موجودہ دفتر خانۂ قومی ہند، نئی دہلی)

۱۰- دستاویز Pol. A-April 1383- NOS. 95/100
(موجودہ دفتر خانۂ قومی ہند، نئی دہلی)

غزل

اہلِ جنوں کی لغزشِ پیہم — دنیا کے سنگیت کا سرگم
ایک حقیقت ایک فسانہ — آنکھ میں آنسو پھول پہ شبنم
حسن کی اک معصوم نظر سے — دل کی دنیا درہم برہم
وہ تصویرِ حسن و جوانی — گنگا اور جمنا کا سنگم
اُن کی ہستی کیف سراپا — اپنی ہستی درد مجسّم
جب سے مری محفل سے گئے وہ — نبض کی جنبش مدّھم مدّھم
اے شبِ ہجراں ہم کو اُن کے — غم کا بھی غم اپنا بھی غم
تیرے سوا اے جلوۂ جاناں — جو کچھ دیکھا بھول گئے ہم
جانِ سخن ہے شانِ سخن ہے — شوقِ زلیخا عصمتِ مریم
ایک تبسّم غنچہ غنچہ — ایک تجلّی عالم عالم

وجد جہاں میں اہلِ نظر کا
کوئی نہیں ہے مونس و محرم

میکش اکبرآبادی

مرزا غالب ایک صوفی کی حیثیت سے

(اپنے چند غیر مطبوعہ خطوط کی روشنی میں)

"علم تصوف سے جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ "برائے شعر گفتن خوب است" ان کو (مرزا غالب کو) خاص مناسبت تھی اور حقائق و معارف کی کتابیں اور رسالے کثرت سے ان کے مطالعے سے گزرے تھے اور سچ پوچھئے تو انہیں متصوفانہ خیالات نے مرزا کو نہ صرف اپنے ہمعصروں میں بلکہ بارھویں اور تیرھویں صدی کے تمام شعراء میں ممتاز بنا دیا تھا۔"

یادگارِ غالب صفحہ ۵۴
مطبوعہ مطبع فیض عام علی گڑھ

"انھوں نے تمام عبادات اور فرائض و واجبات میں سے صرف دو چیزیں لے لی تھیں ایک توحید وجودی اور دوسرے نبی اور اہلبیتِ نبی کی محبت" یادگارِ غالب صفحہ ۶۷

"لیکن اس میں شک نہیں کہ میں موحد ہوں۔ ہمیشہ تنہائی اور سکوت کے عالم میں یہ کلمات میری زبان پر جاری رہتے ہیں۔
لا الہ الا اللہ، لا موجود الا اللہ، لا موثر فی الوجود الا اللہ"

یادگارِ غالب صفحہ ۹۴

ان اقتباسات سے ثابت ہے کہ مرزا غالب کا صوفی ہونا کوئی نئی دریافت نہیں ہے۔ وہ عقیدے کے اعتبار سے صوفی تھے۔ انکا تصوف کی کتابوں کا مطالعہ بہت عمیق تھا اور یہ کہ وہ خالی اوقات میں مسئلہ وحدۃ الوجود پر غور بھی کیا کرتے تھے۔

اس غور و فکر کو تصوف میں بڑی اہمیت حاصل ہے اور مجاہدہ و اعمال پر اسے بہ مراتب فوقیت دی گئی ہے۔ الطبقات الکبریٰ میں علامہ عبدالوہاب شعرانی رحؒ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک خاص صحابی حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے:

وکان رضی اللہ عنہ یقول تفکر ساعۃ خیر من قیام اربعین لیلۃ

"وہ (ابودرداء رضی اللہ عنہ) کہا کرتے تھے ایک ساعت کا تفکر چالیس راتوں کے قیام (عبادت و نماز) سے بہتر ہے"

طبقات صفحہ ۲۱ جلد اوّل

"تصوف ایک مسلک اور عقیدہ بھی ہے، ایک مستقل علم اور فلسفہ بھی ہے اور ایک مخصوص حال اور وجدان بھی۔ کسی ایک ذات میں ان تینوں باتوں کا جمع ہو جانا ایک بڑی اہم بات ہے۔ مرزا غالب کا مسلک اور عقیدہ ان کے اشعار اور مختلف تحریروں سے معلوم ہو چکا ہے۔ لیکن اس فلسفے کے عالم کی حیثیت سے اور صاحبِ حال وجدان کی حیثیت سے ہم اُن سے واقف نہیں ہیں۔ یہ واقفیت اُن چند غیر مطبوعہ خطوط سے حاصل ہوئی ہے جو مرزا غالب اور حضرت جی خدا نما غمگین رحمۃ اللہ علیہ کے مابین لکھے گئے اور جو حضرت غمگین کے ایک مرید خاص حضرت ہدایت النبی صاحب قادری گوالیاری نے ایک رسالے کی شکل میں

مرتب کرلئے ہیں۔ یہ خطوط حضرت غمگین رح کے سجادہ نشین عالی جناب کپتان سردار سید غنی محمد شاہ حضرت جی کی ملکیت ہیں اور ان کے صاحبزادہ حضرت سید رضا محمد حضرت جی کی نوازش خاص کے سبب سے میں ان سے استفادہ کرسکا ہوں۔

یہ سب خط تعداد میں ۱۲ ہیں جن میں سے ۹ مرزا غالب کے اور باقی حضرت غمگین رحمۃ اللہ علیہ کے ہیں۔ مرزا غالب نے حضرت صاحب کو قبلۂ حاجات اور پیر و مرشد کے القاب سے مخاطب کیا ہے اور حضرت صاحب نے مرزا صاحب کو مشفق کے لقب سے یاد فرمایا ہے۔ ان خطوط میں سے اکثر حقائق اور مسائل تصوف کے اعتبار سے بہت اہم ہیں اور اس علم سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ایک نعمت الٰہی اور لطیفۂ غیبی۔ لیکن انداز بیان اور فلسفیانہ اصطلاحات اور خود مسائل کے دقیق ہونے کی وجہ سے عام دلچسپی کی چیز نہیں البتہ مرزا غالب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے چند انکشافات بہت اہم ہیں۔

(۱) یہ کہ مرزا غالب اپنے صوفیانہ عقائد کے علاوہ عملاً بھی صوفی تھے اور شغلِ برزخ ان کا معمول تھا۔ یہ شغل صوفیوں میں منتہی حضرات کا شغل سمجھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ فنا و بے خودی کی کیفیت سے بھی سرفراز تھے اور یہ حال ان پر اکثر طاری ہوجاتا تھا۔ اس حال کی صوفیوں کے تمام مکاتیب فکر میں بڑی قدر و قیمت ہے اور اسلامی اور غیر اسلامی صوفیوں کی ایک اہم منزل ہے۔

(۲) مرزا غالب کی واقفیت فلسفۂ ما بعد الطبیعیات اور مسائل تصوف سے غیر معمولی تھی۔ یہ قابلیت اُن کے خطوں سے بھی معلوم ہوتی ہے اور خود حضرت غمگین نے بھی اس کا اعتراف فرمایا ہے۔ ایک خط میں حضرت نے لکھا ہے کہ جو واقفیت آپ کو ہے وہ اس دور کے علماء ظاہر کو نہیں ہے۔

(۳) مرزا صاحب اپنے شغل مے نوشی کو اپنے بزرگوں اور قابلِ احترام شخصیتوں سے بھی پوشیدہ نہیں رکھتے تھے لیکن اپنے کمالاتِ باطن کو اپنے احباب پر بھی ظاہر نہ کرتے تھے۔ درحقیقت یہ ایک بڑی نادر اور اخلاقی اعتبار سے بہت اہم خوبی ہے جس سے عموماً بڑے بڑے صاحبانِ باطن اور علماء و متقی بھی محروم ہیں۔

اصل مسائل کی تفصیل کے لئے پورے خطوط کا مطالعہ ضروری ہے پھر بھی اس مضمون سے خطوط کے مضامین اور مسائل کا بہت کچھ اندازہ ہوجائے گا۔

حضرت غمگین اور مرزا غالب کے ان خطوں میں خاص زیر بحث مسئلہ وحدۃ الوجود اور فنا کا ہے۔ بے خودی یا فنا دراصل وحدۃ الوجود ہی کا ایک ذیلی یا ضمنی مسئلہ ہے۔ یہ دونوں نظریے اسلامی اور غیر اسلامی تصوف میں مشترک ہیں۔ وحدۃ الوجود کو ان سادہ الفاظ میں بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ برہما یا خدا کے سوا کوئی موجود نہیں ہے۔ لیکن اربابِ وحدۃ الوجود کے مختلف مکاتیب خیال ہیں۔ ان کے فرق کو سمجھے بغیر اس مسئلے کو اچھی طرح نہیں سمجھا جاسکتا۔ اس مسئلے کا اندازِ بیان اور طرزِ استدلال ابتدائی عہد کے اسلامی صوفیوں کا وہی تھا جو قرآن و حدیث اور اس دور کی دوسری اہم تصانیف کا تھا۔ یہ سادہ انداز بیان سنائی عطار اور شیخ شہاب الدین سہروردی کے زمانے تک ملتا ہے۔ اس اندازِ بیان کے علاوہ دوسرا انداز جو یونانی فلسفے کے اثر سے پیدا ہوا وہ شیخ محی الدین ابن عربی کا ہے۔ شیخ اکبر محی الدین عربی شیخ شہاب الدین سہروردی کے ہم عصر ہیں۔ وہ اپنے نظریات کا ماخذ اور اصل قرآن و حدیث کو ہی قرار دیتے ہیں۔ مگر ان کے استدلال کا انداز صاف اور سادہ نہیں ہے بلکہ اس میں نو فلاطونی نظریات اور فلسفے کی اصطلاحات شامل ہوگئی ہیں۔ ابن عربی کے بعد کی تصانیف میں منطق اور فلسفے کی اصطلاحات اور زیادہ شامل ہوتی گئیں اور جن دلیلوں سے متاخرین فلاسفہ اپنے نظریات ثابت کرتے تھے۔ ان دلیلوں سے ہی صوفیہ نے ان کے مسلک کی تردید اور اپنے مسلک کی تائید کی۔ مرزا غالب اور حضرت غمگین کے زمانے میں یہی طرز مقبول تھی اور یہ خطوط اسی طرز کا کامیاب نمونہ ہیں۔ مولانا فضل حق خیرآبادی جو اپنے زمانے میں علوم معقول کے امام

لہ حضرت غمگین رح کا حال مختلف کتابوں میں ہے اور اتنا معروف ہے کہ اس موقع پر اس کی تفصیل غیر ضروری معلوم ہوئی۔ حضرت کا سنہ پیدائش ۱۱۶۷ھ مطابق ۱۷۵۳ء اور وفات ۱۲۶۷ھ (۱۸۵۱ء) ہے جب کہ مرزا غالب کا سال پیدائش ۱۲۱۲ھ (۱۷۹۷ء) اور سال وفات ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۹ء ہے۔

سمجھے جاتے تھے وحدۃ الوجود کے بڑے زبردست حامی تھے اس پر ان کی ایک معرکۃ الآرا تصنیف بھی ہے جس کا نام "فیض الموجود فی اثبات وحدۃ الوجود" ہے۔ مجھ سے مولانا کے بھتیجے مولانا اولاد حسین صاحب خیرآبادی فرماتے تھے کہ مولانا کے اثر سے ہمارے خاندان کی لونڈیاں تک وحدۃ الوجود کو حق سمجھتی تھیں۔ اس کے علاوہ حسن اتفاق سے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی بھی جو علوم منقول (تفسیر حدیث وغیرہ) کے امام تھے اس مسئلے کی حقانیت کے قائل تھے اور اس وجہ سے علماء ظاہر بھی اس سے متاثر تھے۔ غالب اور مولانا فضل حق میں بہت زیادہ ارتباط تھا اس لئے قیاس یہ ہے کہ علاوہ اور وجوہ کے۔ مولانا کی صحبت بھی ان پر اثر انداز ہوئی ہوگی۔ لیکن یہ سب باتیں صرف علمی اعتبار سے مرزا غالب کو متاثر کرسکتی تھیں اور ان کے عقیدے کے قیام میں مدد دے سکتی تھیں مگر دیکھنا یہ ہے کہ مرزا غالب کو صوفیوں کے اشغال کے طریقے اور ان کی مشق و مزاولت کے سلیقے کیسے معلوم ہوئے۔

اس بارے میں مولانا محمد حسین آزاد کی یہ اطلاع رہنمائی کر سکتی ہے کہ مرزا غالب کو مولانا فخرالدین دہلوی کے خاندان میں بیعت تھی۔ آب حیات میں آزاد نے یہ صراحت نہیں کی ہے کہ وہ کس سے بیعت تھے لیکن مولانا حالی نے یادگار غالب میں کئی جگہ یہ ذکر کیا ہے کہ مرزا صاحب حضرت میاں کالے صاحب کے مکان میں کئی سال رہے اور حضرت کے ذریعے سے مرزا غالب کی رسائی قلعہ معلا تک ہوئی۔ حضرت میاں کالے صاحب حضرت مولانا فخرالدین دہلوی کے پوتے اور جانشین تھے اور خود بہادر شاہ بھی حضرت سے بیعت تھے اس لئے گمان غالب یہ ہے کہ مرزا غالب کو صوفیانہ تعلیمات حضرت میاں کالے صاحب ہی سے پہونچی ہوں گی۔

اس تمہید کے بعد اصل خطوط میں سے کچھ مخصوص موضوعات و مضامین کی طرف اشارات پر اکتفا کی جاتی ہے جس سے ان خطوط سے اجمالی تعارف بھی ہو جائے گا اور کوئی خاص قابل ذکر بات رہ بھی نہ جائے گی۔ اصل خط فارسی میں ہیں ان کی عبارات نقل کرنے سے قصداً گریز کیا گیا ہے۔ کیونکہ وہ خط حضرت جی کے خاندان کی ملکیت ہیں۔

پہلا خط مرزا غالب کا ہے۔ یہ خط حضرت جی کے دو خطوں اور ایک غزل کی رسید میں ہے۔ مرزا صاحب کے جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جی نے مرزا صاحب سے استمزاج کیا ہے کہ میں رباعیات کے دیوان کے دیباچے میں آپ کا ذکر کردوں اور یہ بھی تحریر کیا ہے کہ جب دیوان رباعیات آپ تک پہونچے تو اسے غیر کی نظر سے پوشیدہ رکھئے گا۔

مرزا غالب نے اس کا شکریہ ادا کیا ہے کہ آپ نے یہ رباعیاں میرے لئے لکھیں اور لکھا ہے کہ دیباچے میں میرا ذکر نہ صرف میرے لئے بلکہ میرے باپ دادا کے لئے باعث ناز و فخر ہے۔ دیوان رباعیات کے اخفا میں تعمیل ارشاد کی جائے گی۔ مگر حضور نے لکھا ہے کہ غیر کی نظر سے پوشیدہ رکھنا تو یہاں غیر کون ہے۔ یہ ایک لطیفہ کے طور عرض کیا گیا ہے ورنہ بات یہ ہے کہ ان حقائق و معارف کے سمجھنے والے کتنے ہیں اور جو سمجھنے والے ہیں وہ غیر نہیں ہیں۔

یہ خط دس تاریخ ذالحجہ کو لکھا گیا سنہ درج نہیں ہے۔

اس خط کے جواب میں حضرت جی نے تحریر فرمایا ہے کہ لفظ غیر پر جو اعتراض آپ نے کیا ہے میں اس سے خوش ہوا۔ اس جودت طبع اور سخن رندانہ کے ساتھ خدا ملاقات جسمانی بھی کرامت فرمائے۔ غیر تو ایک بے معنی لفظ ہے اس کے معنی بھی عین ہی کے ہیں کیونکہ عین اور غیر دونوں حق کے نام جیسے ہادی اور مضل۔ الفاظ سے حقیقت نہیں بدلتی لیکن اگر "میں اور تو" یہ اور وہ کے الفاظ عبارت سے نکال دئے جائیں تو عبارت کے معنی ہی سمجھ میں نہ آئیں گے۔

اس کے بعد حضرت جی نے ابن عربیؒ، جنیدؒ و شبلیؒ کے اقوال اور احادیث کے حوالے سے یہ ثابت کیا ہے کہ اسرار و رموز کو ان حضرات نے بھی پوشیدہ رکھنے کی تاکید کی ہے۔ حالانکہ یہ لوگ تمام عالم کو عین حق سمجھتے تھے۔ اس عالم میں ہم خود ہی اپنے بےخبر ہیں۔ یہ باتیں باریک ہیں اور بغیر اس مقام پر پہونچے ہوئے سمجھ میں نہیں آتی ہیں۔ رسول خدا کے زمانے سے آج تک تمام صوفی ان باتوں کو پوشیدہ رکھتے آئے ہیں آپ بھی میرے کہنے پر عمل کریں جب تک مجھ سے آپ نہ ملیں گے ان

باتوں کا سمجھنا مشکل ہے۔

روئی سے ہی تمام کپڑے بنتے ہوتے ہیں اور کپڑا روئی ہی کی ایک شکل ہے لیکن کوئی چادر اور عمامے کو روئی نہیں کہتا اسی پر عین اور غیر کو قیاس کر لیجیے۔ رباعی

اس ایک وجود میں یہ کیا گیا ہے سیر زاہد ہے حرم ہے اور غمگیں ہے دَیر
اسما و صفات ہیں یہ نمائش کے کہنے سے عین ہو نہ کہنے سے غیر

گو چرخِ چہارمیں کی تجھ کو سیر اس کا تو غیر اور تیرا ہے وہ غیر
یہ شہرِ خودی نہ جائے جب تک تجھ سے حاصل عینیتِ غمگیں ہے خیر

اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ اگر آپ اسے تجربہ نہ سمجھیں اور اس میں اپنا فائدہ سمجھیں تو بات یہ ہے کہ میرا غیر آپ کے عین سے اچھا ہے

رباعی

وہ شخص لطیف اور وہ فہم ہے پاک شائستہ ہوا سبب عقل جس کا چالاک
غمگین جو رخش بے محابا ہو تیز انسان کو شرط اس سے ہے خوف ہلاک

مرزا غالب نے اس خط کے جواب میں جو خط لکھا ہے وہ افسوس اور معذرت پر مبنی ہے اور خط کا ایک حصہ اسی معذرت پر صرف کیا ہے کہ میں نے عین اور غیر کے متعلق جو کچھ لکھا وہ گستاخی تھی حق بات یہی ہے جو حضرت نے لکھی ہے میرا مقصد صرف بذلہ سنجی تھا کوئی ادعا یا سرکشی نہ تھی خیال یہ کیا تھا کہ یہ بات ذوق آفریں ہوگی مگر خوبیٔ قسمت یہ کہ اس نے مجھے پریشانی میں ڈال دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ خط کے علاوہ حضرت جیؔ نے کوئی اور خط بھی مرزا صاحب کو لکھا تھا جس میں اظہار ناراضی تھا اور دیوانِ رباعیات کے نہ بھیجنے کے قصہ کا اظہار تھا۔ اس سے مرزا غالب کو بہت تکلیف پہونچی اور انھوں نے اپنی تکلیف کے اظہار کے ساتھ ہی اپنی نازک مزاجی کی طرف بھی اسی طرح اشارہ کیا اور لکھا کہ

میرے رنج و غم کا سبب یہ ہے کہ آپ کا پہلا خط ارشاد و ہدایت لیکن دوسرا خط عتاب آمیز ہے جس کا تحمل میں اپنی ناتوانی کی وجہ سے نہیں کر سکتا ہوں۔ پھر یہ شعر لکھا ہے

ما تنگ ظرفاں حریفِ ایں قدر سختی نہ ایم دانۂ اشکیم مارا گردشِ چشم آسیاست

پھر لکھا ہے کہ رباعیات کے نہ بھیجنے کی شہرت میرے لئے دور باش کے ہم معنی ہے جو میرے دل کو خون کئے دیتی ہے حالانکہ مجھے آپ کے وعدے سے بے اندازہ مسرت تھی اور میں منتظر تھا کہ رباعیات مجھے کب موصول ہوں۔

اسی سلسلے میں مرزا غالب لکھتے ہیں کہ آپ نے اسی خط میں لکھا ہے کہ میں نے سنا ہے کہ عقل کی رسائی اور ذہن کی تیزی میں آپ تفضّل حسین خاں کے ہم پایہ ہیں۔ اس بارے میں میری گزارش یہ ہے کہ تفضّل حسین خاں ایک شخص تھے جو انواع علوم کے عالم تھے۔ طب، نجوم ہیئت اور ہندسہ خوب جانتے تھے اور ہر قسم کے علم میں بات کر سکتے تھے۔ میں نے تو صرف و نحو بھی نہیں پڑھی اور منطق و معانی بھی نہیں جانتا ایک ناتمام فارسی کی واقفیت سے میں ان کے مرتبے تک کیسے پہونچ سکتا ہوں۔ اس موقع پہ مجھے اپنی ایک غزل کا مطلع اور حسنِ مطلع یاد آگیا۔

دولت بہ غلط نبود از سعی پشیماں شو کافر نہ توانی شد ناچار مسلماں شو
نبیں ہر زہ رواں گشتن قلزم نتواں گشتن جوئے بہ خیاباں رَو سیلے بہ بیاباں شو

اس کے بعد مرزا صاحب نے پھر تصوّف کے اسی خاص مسئلے کا تذکرہ کیا ہے جو اُن کا محبوب ترین نظریہ ہے۔ انکسار کے بعد فرماتے ہیں کہ میں اتنا جانتا ہوں کہ مجھے بزرگی کی طرف مائل کر دیا اور تھوڑی سی بے خودی عنایت کر دی ہے۔ وجود کی تقسیم یہ جیسا کہ اہلِ ظاہر کا اعتقاد ہے میں یقین نہیں رکھتا کیونکہ وجود ایک ہے اور ہرگز تقسیم قبول نہیں کر سکتا نہ اس میں تغیر تبدّل واقع ہو سکتا ہے اور وجود کے مقابلے میں عدم کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ وجود اور ہستی کے علاوہ جو کچھ ہے وہ کچھ بھی نہیں ہے اور حق کے سوا جو کچھ ہے وہ باطل ہے۔

ما ہماں عین خودیم اما خود از وہم دوئی
درمیانِ ما و غالب ما و غالب حائل است

ہر قسم کے ذکر و فکر اور ذوق میں سے میرے دل کو محی الدین ابن عربی کے ایک فقرے نے اپنی طرف کھینچ لیا ہے کہ "الحق محسوس والخلق معقول" (یعنی خلق کا وجود ہماری عقل و فہم کے سوا کہیں نہیں ہے اور جو کچھ بھی محسوس ہوتا ہے وہ حق کے سوا کچھ نہیں) میرا ایمان یہی ہے باقی سب وہم ہے اور اس عالم میں جو کچھ ہے از قسم نبوت و ولایت، حشر و نشر، عذاب و ثواب

سب درست ہے اور ان سب پر میرا ایمان ہے ـــــ اس کے بعد لکھتے ہیں کہ آپ کی توجہ باطنی سے مجھے بے ارادہ اس وقت حضرت امام حسین علیہ السلام کا قول مبارک یاد آگیا ماشمت الاعیان الثابتہ رائحۃ الوجود یعنی اعیانِ ثابتہ نے وجود کی بو بھی نہیں سونگھی۔ اس موقع پر مرزا غالب نے اپنے یہ شعر لکھے ہیں

چوں پردۂ شب یار مصور بہ خیال است — ایں کارگر وہم ز بیدائی اشیا
اندیشہ دو صد گل کدہ گل بردہ بدامن — اما ہمہ از نقش و نگار پر عنقا
آئینہ بہ پیش نظر و جلوہ فراواں — دل پر ہوس و صاحب خلوت کدہ تنہا

پھر لکھتے ہیں کہ مرشد کے حضور میں ان حالات کا عرض کرنا ایسا ہے جیسے کوئی ایک گھڑا پانی کا دریا کے لئے لائے یا ایک پھول کی پنکھڑی باغ کی نذر کرے۔ لیکن مقصد صرف اپنے عقیدے کا اظہار ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ عقیدہ رکھنے والا کسی چیز کا منکر نہیں ہے اور سب کو ایک کیفیت کے ساتھ قبول کرتا ہے۔ کفر کو بھی اور اسلام کو بھی، عین کو بھی اور غیر کو بھی یہ سب تصور کی حیثیت سے موجود ہیں لیکن وہ تصور نہیں جو ہم کرتے ہیں بلکہ وہ تصور جو اس کیفیت خاص کو حاصل ہے اس موقع پر بہت ہی مناسب ہے کہ اسے سمندر اور موج اور آفتاب اور روشنی سے تشبیہ دی جائے۔

اس کے بعد مرزا غالب نے جس بات کا ذکر کیا ہے وہ بوجوہ اہم ہے اور اس سے ہمیں مرزا صاحب کے متعلق ایک عجیب اور جدید انکشاف ہوتا ہے۔ وہ حضرت غمگین رحمۃ اللہ علیہ کو لکھتے ہیں کہ،

سید امانت علی صاحب جو حضور کے تربیت یافتہ ہیں اکثر مجھے نوازتے رہتے ہیں اور جب خلوت میسر آتی ہے تو ان سے راز کی باتیں ہوتی ہیں ابھی دو تین روز ہوئے کہ برزخی کا ذکر آگیا۔ چونکہ میں آج کل برزخی کے نظارے میں مبتلا ہوں اس لئے میں نے اس بارے میں مبالغہ کیا اور کہا کہ اس سے بلند کوئی اور مقام نہیں ہے۔ میر امانت علی صاحب نے کہا کہ اس مقام کا چھوڑنا بھی ایک مقام ہے۔ میں نے کہا یہ صحیح ہے لیکن کہنے کی بات نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا مقام ہے جو استغراق کی زیادتی کے بعد خود ہی حاصل ہو جاتا ہے اور اس کا حاصل کرنا مشاہدۂ بے رنگی پر توجہ کرنا ہے نہ یہ کہ اس سے قطع نظر کر لی جائے۔۔۔

پھر حضرت سے مرزا صاحب عرض کرتے ہیں کہ خدا کے لئے مجھ پر ایسی توجہ فرمائیں کہ میرا یہ شغل ترقی کر جائے تاکہ رفتہ رفتہ میں بالکل مستہلک اور مستغرق ہو جاؤں اور رنگ اور بے رنگی دونوں سے چھوٹ کر عدم محض ہو جاؤں۔

اس خط پر صرف تاریخ، دن اور وقت ہے سنہ نہیں ہے۔ یہ خط ۲۸ محرم ہفتے کے دن چاشت کے وقت لکھا گیا ہے۔

مرزا صاحب کے اس خط کے جواب میں حضرت شاہ غمگین نے مرزا صاحب کے عقیدے کی تصدیق و تحسین فرمائی ہے اور فرمایا ہے کہ:

مجھے آپ کا عقیدہ معلوم کرکے ناقابلِ اظہار اور بے اندازہ خوشی ہوئی۔ مجھے آپ سے دلی محبت ہے اور میرا دل خود بخود آپ کی طرف کھنچتا ہے۔ میں آپ سے کیسے ناخوش ہو سکتا ہوں میں نے جو کچھ لکھا تھا محبت سے لکھا تھا۔ آپ مجھ سے خدا کے واسطے محبت رکھتے ہیں نہ آپ کو مجھ سے کوئی دنیاوی غرض ہے نہ دینی۔۔۔۔

اس کے بعد حضرت نے مرزا صاحب کے شغل پر تبصرہ فرمایا ہے اور حیرت مذموم اور حیرت محمود کا فرق بتایا ہے اور اپنے سلوک، واشغال و واردات بیان کئے ہیں۔ اپنے پیر اور اپنے سفر کا حال بیان فرمایا ہے۔ اس خط سے حضرت غمگین کے مجاہدہ و ریاضت اور مقام کا اندازہ ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ یہ خط دوسرے سالکین راہ کی رہنمائی بھی کرتا ہے۔ غالباً اسی خیال سے حضرت نے مرزا صاحب کو تفصیل سے اپنے حالات لکھے ہیں۔ اس خط میں جو رباعیاں حضرت نے لکھی ہیں وہ ارباب ذوق کی خدمت میں پیش کرنا نامناسب نہ ہوگا۔

غمگیں ہوتا اگر تجھے علمِ یقیں — بے عینِ یقیں نہ ہوتی دل کو تسکیں
پھر حقِ یقیں کے ذوق اور شوق میں یار — ہوتا بس حق حق ترا ملت و دیں

ا؎ شغل برزخ، صوفیوں کا ایک خاص شغل ہے جو آنکھیں کھول کر آسمان یا خلا میں نظر جما کر کیا جاتا ہے اور اس کا نتیجہ بے خودی اور ربودگی کی شکل میں نمودار ہوتا ہے جسے فنا بھی کہتے ہیں اور جس کا حصول تمام سلاسل تصوف میں بہت اہم سمجھا جاتا ہے۔

ایک عمر رہی ہے میری اللہ کی جنگ　　دنیا رہا میں شکست سو سو فرسنگ
غمگین مغلوب اب ہوا ہوں ایسا　　نہ فوج رہی نہ میں نہ وہ نام و ننگ

عقل کہے جو اسے نہیں وہ عاقل　　وجدانی جو سمجھے وہ نہیں ہے واصل
کہتے نہ رسول ما عرفنا غمگیں　　جز عجز نہ ہوتی معرفت گر حاصل

تو قولِ علی ہیں اور مت لا شبہات　　غمگیں ہے یہی عرفت ربی کی بات
ہے فسخ عزائم اس لئے فرمایا　　آتی ہی نہیں ہے علم میں کنہ ذات

ہو حس میں کہ یافت ہے وہ جیرت محمود　　مذموم ہے ہو شہود جس میں نہ کشود
ہر چند کہ اس کی دید غمگیں ہے محال　　ممکن نہیں پر سوائے اس کے مشہود

اس کے بعد حضرت جی نے لکھا ہے کہ ایک تازہ مضمون کی رباعی کہی ہے جو داد کی غرض سے آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں

کر ظلم نہ اس شراب ربانی پہ　　مت کبر کر اپنی زہد پیشانی پہ
گر کفر دوئی نہیں تجھے اے زاہد　　قشقۂ کبود ہے کیوں پیشانی پہ

مرزا غالب نے اس خط کے جواب میں حضرت کی اس آخری رباعی کی بہت داد دی ہے اور لکھا ہے کہ اس رباعی کے مضمون کی تازگی نے مجھے بے خود کر دیا واللہ کہ کسی سخن ور کا ذہن اس نکتے تک نہ پہونچا اور کسی نے زاہد کے پیشانی کے داغ کو قشقۂ کبود سے تشبیہ نہیں دی۔ اس کے بعد ایک رباعی کے متعلق لکھا ہے کہ شاید میر حیدر علی سے رباعی کی نقل میں سہو ہو گیا ہے کیونکہ پہلے بیت میں قافیے کے بعد 'کو' آیا ہے اور دوسرے بیت میں 'کو' نہیں ہے یہ بات قاعدۂ شعر کی رو سے جائز نہیں ہے۔ رباعی یہ ہے

چل راہ بریدہ پائے لنگی چھوڑ　　رکھ جاں کو فراخ دل کی تنگی کو چھوڑ
رنگوں میں نہ قید رہ مشائخ کی طرح　　غمگیں آزاد ہے تو بے رنگی چھوڑ

مرزا غالب نے حضرت کے اس فقرے کو بہت محسوس کیا ہے کہ نہ آپ کو مجھ سے غرض دینی وابستہ ہے نہ دنیاوی۔ لکھتے ہیں کہ

آپ کے اس فقرے نے میرے دل کو بہت افسردہ اور ملول کر دیا اور میں اس بات پر مجبور ہو گیا کہ بات کو تفصیل سے عرض کر دوں۔ قبلہ و کعبہ! راستی میرا آئین اور محبت میرا دین ہے میں سچ کو ایمان اور جھوٹ کو کفر سمجھتا ہوں۔ خدا گواہ ہے کہ مجھے جو ارادت اور محبت آپ سے ہے وہ شرح و بیان میں نہیں آ سکتی .... عنایت اور عتاب دونوں التفات کا نتیجہ ہیں۔ رہا اغراض دنیاوی و دینی کے بارے میں تو الحمد للہ کہ میرا دل ان دونوں چیزوں سے پاک ہے میں محبت کے سوا نہ دنیا سے واقف ہوں نہ دین سے۔ میں ہیچ اور نادان ہونے کے باوجود اتنا جانتا ہوں کہ وجود ایک ہے اور ہرگز منقسم نہیں ہو سکتا اگر میں دنیا اور دین کو مان لوں تو شرک فی الوجود میں گرفتار ہو جاؤں گا۔ جو شرک کی بدترین قسم ہے۔ میرے نزدیک دین بھی دنیا کی طرح ایک نقشِ موہوم ہے اور وہم سے دل لگانا نہیں چاہیئے۔ دنیا کے طلبگاروں کو دنیا اور دین کے طلبگاروں کو دین مبارک۔ ہم ہیں اور سواد الوجہ فی الدارین[1] جس کا مطلب ہے نیستیِ محض۔ اس بارے میں یہ قول حق ہے کہ اعیان نے وجود کی بو بھی نہیں سونگھی (الاعیان ما شمت رائحۃ الوجود) یہاں وجود کا مطلب اس ہستیٔ موہوم سے ہے یعنی اس ہستی موہوم کا ظہور اور نمائش۔ اور یہ نمائش محض وہم اور باطل ہے اور یہ سب کچھ محض اعتبار ہے اس کی حقیقت نہیں ہے۔ اعیان ثابتہ سے لے کر حشر تک جو کچھ نمائش اور ظہور ہے سب باطل ہے وجود میں کوئی تغیر نہیں ہوا وہ اسی ایک حالت پر ہے...

اس کے بعد مرزا صاحب نے تفصیل سے اعیانِ ثابتہ پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ وہ جو بات اوپر بیان کی گئی ہے اس کی تشریح کی ہے اس کے بعد بے رنگی کا ذکر اس طرح کرتے ہیں اور حضرت جی نے جو ایراد کیا تھا اس کا جواب دیتے ہیں

---

[1] صوفیہ ایک حدیث بیان کرتے ہیں الفقر سواد الوجہ فی الدارین فقر دنیا و دین کی روسیاہی ہے اور اس کا مطلب وہی بیان کرتے ہیں جو مرزا غالب نے بیان کیا ہے یعنی نیستی محض ــــ از سواد الوجہ فی الدارین گر داری خبر چشم بکشا و جمال کفر و فقر ما نگر

حضرت! اس غلام نے اپنی نظر خلا میں نہیں بھٹکائی ہے بلکہ دل کو بے رنگی سے باندھ لیا ہے اور اعیان ثابتہ کی بحث میں جو ذکر کیا گیا ہے یہی میرا منظور نظر ہے۔ میری کوشش یہ ہے کہ میں اپنی اصل نیستی کی طرف لوٹ جاؤں۔ نہ میں ذکر جانتا ہوں نہ شغل ع دانی ہمہ اوست ورنہ دانی ہمہ اوست تحریر میں تقریر کی سی بات نہیں آسکتی میں اس دن کا آرزومند ہوں کہ شرف قدمبوسی حاصل کروں اور آپ کی زبان سے آپ کے ارشاد سنوں۔ آپ نے فرمایا ہے کہ تمہارے تصوّف کی طرف سے مجھے پورا اطمینان ہوگیا تو جناب واقعہ یہ ہے کہ میں تو ایک بے علم اور جاہل سپاہی زادہ ہوں میرے باپ دادا صحرانشین ترک تھے۔ میں دو ایک مصرعے موزوں کر لیتا ہوں اور ایک دو لطیفے ہر فن کے کہہ لیتا ہوں۔ تصوّف سے میرا کیا تعلق اور درویشی سے مجھے کیا نسبت۔ میرا حال اس سے زیادہ نہیں ہے کہ وحدتِ وجود اور اشیا (موجودات) کا معدوم ہونا میرے خمیر میں ڈال دیا گیا ہے اور "حق محسوس ہے اور خلق معقول" میرا عقیدہ بنا دیا گیا ہے میں اتنا جانتا ہوں کہ صرف ایک موجود ہے اور اس کے سوا کچھ موجود نہیں ہے اس کے سوا میری ہمّت کوشش و ریاضت اور دولت و مال صرف ایک دو شراب کے پیمانے پر منحصر ہے جو رات کو پی لیتا ہوں اور مست ہو کر سو جاتا ہوں نہ دین سے واقف ہوں اور نہ دنیا سے اللہ بس ماسوی ہوس۔ حاضر ہونے اور سفر کرنے میں گرمی اور بے سامانی مانع نہیں ہے ایک خرقہ تن پر ڈال لوں اور روانہ ہو جاؤں۔ مگر میرا مقدمہ جو ولایت گیا ہوا ہے اسے دو سال ہو گئے مجھے امید ہے کہ امروز فردا یا "ہفتہ دو ہفتہ" اور "مہینہ دو مہینہ" بعد ولایت سے حکم آجائے گا اور اس وقت میں گو انسیار روانہ ہو جاؤں گا۔

اس خط پر ۱۸۔ ربیع الاوّل روز شنبہ ہنگام نیمروز ۱۲۵۵ھ درج ہے۔

اس خط کے جواب میں حضرت جیؒ نے جو خط مرزا غالب کو لکھا ہے اس میں وضاحت اور فراخ دلی سے اس کا اعتراف فرمایا ہے کہ

رباعی میں قافیے کی غلطی سہو کاتب کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ میری بے حواسی اور پریشان خیالی اس کا سبب ہے۔ یہ ایسی غلطی ہے جو کوئی نادان بھی نہ کرے گا حالانکہ تقریباً بیس دفعہ میں نے اس رباعی کو پڑھا لیکن اس عیب کی طرف خیال ہی نہ گیا اگر آپ اس کی اصلاح نہ کرتے تو یہ رباعی دیوان میں اسی غلطی کے ساتھ درج ہو جاتی....

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ:

اسی سبب سے میں نے بارہا آپ کو لکھا ہے کہ چوں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو فنِ سخنوری میں یکتائے زمانہ کیا ہے لہٰذا آپ میرے دیوان کو اوّل سے آخر تک اصلاح کی نظر سے دیکھ لیں لیکن آپ تساہل سے کام لیتے ہیں۔ اگر آپ مجھ سے محبّت رکھتے ہیں تو میری اس عرض کو ضرور قبول کرلیں۔ یہاں میرے ہم نشینوں کو اتنی جرأت نہیں ہے کہ میرے اغلاط پر مجھے مطلع کریں۔

اس کے بعد مرزا غالب کی حقائق فہمی کا ان الفاظ میں اعتراف فرماتے ہیں:

آپ کو علم تصوّف میں جو دستگاہ ہے جس کا اظہار آپ کے خطوں سے ہوا وہ علمائے ظاہر کو بھی نہیں ہے...

اس کے بعد اعیان ثابتہ کی بحث کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

اس قول میں (اعیان نے وجود کی بو بھی نہیں سونگھی) وجود سے مراد وہی وجود نہیں ہے بلکہ اعیان تو عینِ ذات ہیں۔ آپ نے جو تشبیہ اس سلسلے میں آفتاب کی شعاعوں کی دی ہے وہ مجھے صحیح معلوم نہیں ہوتی۔ آفتاب بیں شعاعوں کا احساس تو نقصانِ بصارت کا سبب ہے ورنہ جو لوگ کہ آفتاب کا مشاہدہ کرتے ہیں ان کو شعاعیں نظر نہیں آتیں چنانچہ میں نے بھی ابتدا میں دو سال تک یہ کام کیا ہے[1]....

---

[1] اسے شغلِ آفتابی کہتے ہیں۔ صبح کو طلوعِ آفتاب کے وقت آفتاب پر نظر جماتے ہیں اور اس کے ساتھ کچھ تصوّر بھی کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد تنزلات کا بالاجمال، بیان فرما کر فرماتے ہیں کہ:
یہ قول (اعیان نے وجود کی بو بھی نہیں سونگھی) حضرت امام حسین علیہ السلام کی طرف کسی نے بھی منسوب نہیں کیا ہے۔ اگر آپ نے کسی معتبر کتاب میں یہ قول حضرت امامؑ کی طرف منسوب دیکھا ہو تو مجھے بھی مطلع فرمائیں[1]۔ آئندہ سے مسائل تصوّف کو ملاقات پر موقوف رکھئے۔ مجھے آپ کا آزادانہ رویہ بہت پسند ہے اور اسی لئے میں آپ کی ملاقات کا خواہش مند ہوں اگر ایسا شاہباز ہاتھ آجائے تو پھر سوائے عنقا کے شکار کے کسی طرف توجہ نہ کرے گا۔
شاہجہاں آباد (دہلی) میں ہزاروں آدمی ہیں لیکن مجھے ان سے کیا تعلق وہ لوگ تو لانبی ڈاڑھی اکڑی ہوئی مونچھیں تسبیح اور ڈھیلے ڈھالے جبّے چاہتے ہیں اور یہ چیزیں یہاں کہاں ہیں آپ کے طریقے سے بہت خوش ہوں۔ خدا تعالیٰ آپ کی بیرنگی میں ترقی دے۔ جب مجھ سے ملاقات ہوگی تو میں بھی اسی کی تائید کروں گا۔ یہ طریق میرا پسندیدہ ہے

از دروں شو آشنا و از بروں بیگانہ وش
ایں چنیں زیبا روش کم می بود اندر جہاں

دیوان رباعیات بھی تیار ہو جائے تو وقت ملاقات آپ کو دوں گا۔
اس خط پر بھی ۱۲۵۵ھ ہجری درج ہے۔ مرزا غالب نے اس خط کا جو جواب لکھا ہے وہ کلیات نثر غالب میں درج ہے اور سوائے اظہار عقیدت کے کوئی خاص بات اس میں نہیں ہے۔ اس کے بعد پھر مرزا غالب کا

لہ معلوم نہیں مرزا غالب کے ذہن میں یہ کس طرح جاگزیں ہو گیا کہ الاعیان ما شمت رائحۃ الوجود حضرت امام حسین علیہ السلام کا قول ہے۔ دراصل یہ قول شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کا ہے۔ حضرتؑ امام کے زمانے میں اعیان وغیرہ کی اصطلاحیں عرب میں نہیں پہونچی تھیں۔

خط ہے جو اس مجموعے میں مرزا غالب کا پانچواں خط ہے۔ کوئی بات قابل ذکر اس میں بھی نہیں ہے سوائے اس کے کہ مرزا صاحب نے اس بات کو قبول کر لیا ہے کہ مسائل وحدت و کثرت آئندہ خطوط میں بیان نہ کئے جائیں گے اور ملاقات پر موقوف رکھے جائیں گے۔
اس کے بعد مرزا غالب کا چھٹا خط ہے یہ خط مرزا غالب نے اس انداز سے شروع کیا ہے کہ عبارت کا رُخ مسائل تصوّف کی طرف پھر گیا ہے۔ فرماتے ہیں" میں کافر ہوں اگر کبھی میں نے غیر سے شکر و شکوہ کیا ہو۔ کسی[1] نے کیا خوب کہا ہے:

دریا بہ وجود خویش موجے دارد
خس پندارد کہ ایں کشاکش با اوست

اس خط میں بھی وحدت وجود کا ذکر اور فنا و عدم محض ہو جانے کی تمنا ہے۔ اس خط پر ۳۰ ربیع الثانی۔ پیر ۱۲۵۳ھ لکھا ہے غالباً سنہ کی نقل میں غلطی ہوئی ہے۔
مرزا غالب کا ساتواں خط ۲۷ شعبان ۱۲۵۵ھ منگل کا لکھا ہوا ہے اور حضرت صاحب کی رباعیات کی ستائش و ثنا پر مشتمل ہے۔
آٹھواں خط بھی حضرت صاحب کے نام ہے اس میں حضرت کے دیوان کی تعریف اور اس کے پہونچنے کی رسید اور شکریہ ہے۔ اس خط میں وحدۃ الوجود کا ذکر اور اپنا نظریہ اور حال مختصراً بیان کرکے دعا و توجہ کی خواہش کی ہے
نویں خط میں مرزا غالب نے لکھا ہے کہ احباب نے دلّی میں طرح دی تھی اس میں میں نے دس شعر کہے ہیں جو بہ نظر اصلاح حاضر کر رہا ہوں غزل کا مطلع یہ ہے

در وصل دل آزاری اغیار ندانم — دانند کہ من دیدہ ز دیدار ندانم

اس خط پر تحریر تاریخ ۱۸۔ رجب ۱۲۵۵ھ درج ہے

لہ جہاں تک مجھے یاد ہے یہ رباعی سحابی کی ہے اس کا پہلا بیت یہ ہے
عالم بہ خروش لا الٰہ الا ہو ست
غافل بہ گماں کہ دشمن است او یا دوست

محمد عتیق صدیقی

حبیب اللہ ذکاؔ اور مرزا غالبؔ

انیسویں صدی کے اوائل میں جب اس برِّ صغیر کے بیشتر حصّوں پر "خلق خدا کی، ملک بادشاہ کا اور حکم کمپنی بہادر کا" ڈنکا بجنے لگا تھا، تو اس وقت ہندوستان کی دفتری، کاروباری اور علمی زبان فارسی تھی۔ امراء، شرفاء اور متوسّط طبقے کے پڑھے لکھے لوگ فارسی ہی کو خط و کتابت اور اظہارِ خیال کا ذریعہ بناتے تھے۔ اس کی ایک اچھی مثال یہ ہے کہ اس دور میں اردو شاعری کا مذاق اگرچہ عام ہو چکا تھا، لیکن اردو شعراء کے تذکرے بھی فارسی ہی میں لکھے جاتے تھے۔

۱۸۳۰ء میں کمپنی انگریز بہادر نے اپنے سیاسی و انتظامی مصالح کی بنا پر فارسی کی سرکاری و دفتری حیثیت ختم کر دی، اور اس کے ساتھ ہی فارسی کے زوال دواں سوتے خشک ہونے لگے اور بالآخر انیسویں صدی کے وسط میں اس نے دم توڑ دیا۔ لیکن یہ سانحہ پیش آنے کے بعد بھی ایک مدت تک ایسے لوگوں کی خاصی تعداد باقی رہی جو اس مردہ لاش کو سینے سے لگائے رہے۔ اس گروہ سے تعلق رکھنے والوں میں ایک بزرگ حبیب اللہ ذکاؔ بھی تھے، جو فارسی کا صرف اچھا ذوق ہی نہیں رکھتے تھے بلکہ اس زبان پر ان کو بڑی قدرت حاصل تھی۔ اور اس کا ثبوت ان کا "مجموعۂ نظم و نثر فارسی" ہے "خاش و خاشاش" جو ان کے انتقال کے تقریباً نو سال کے بعد ۱۳۰۲ ہجری مطابق ۱۸۸۴ عیسوی میں مطبع آصفی (حیدرآباد) سے طبع ہوا تھا۔ اس مجموعہ کا "والا جناب مستطاب نواب اسد اللہ خاں غالبؔ دہلویؒ کی ایک مختصر اردو عبارت سے آغاز ہوتا ہے، جس کو ہمارے زمانے کی اصطلاح میں "پیش لفظ" کہتے ہیں۔ اس پیش لفظ کے عنوان کی عبارت، جو غالب کی نہیں بلکہ صاحب کتاب مولوی ذکاؔ کی ہے، حسب ذیل ہے:

"سواد عبارتے کہ والا جناب مستطاب نواب اسد اللہ خاں غالب دہلوی در سال ہزار و دو صد و ہشتاد و یک بر پشت مجموعۂ نظم و نثر کہ بغرض اصلاح خدمت والا شان فرستادہ شدہ بود، بقلم خویش رقم فرمودہ اند و پایان آں مہر خود زدہ اند۔"

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنّف نے اپنا مجموعۂ نظم و نثر فارسی مرزا غالب کے پاس اصلاح کے لئے ۱۲۸۱ھ (مطابق ۱۸۶۴ء) میں بھیجا تھا۔ اسی مجموعے کی پشت پر مرزا غالب نے اپنی رائے لکھ دی تھی اور اس کے نیچے اپنی مہر بھی لگا دی تھی۔ وہ عبارت یہ ہے:

"یہ کلام کسی بادشاہ کا نہیں، کسی امیر کا نہیں، کسی شیخ شیادؔ کا نہیں۔ یہ کلام میرے ایک دوست روحانی کا ہے، اور فقیر اپنے دوست کے کلام کو معرضِ اصلاح میں بہ نظرِ دشمن دیکھتا ہے۔ پس جب تملّق نہیں، مدارا نہیں، تو جو مجھ کو نظر آیا ہے بے حیف و حیل لکھوں گا۔

" نثر میں نعمت خانِ عالی کے طرز کا احیا کیا ہے، مگر پیرایہ کچھ اس سے بہتر دیا ہے۔ قصائد میں انوری کا چربہ اتارا ہے، مگر طبیعت نے اچھا زور دکھایا ہے۔ غزل میں متاخرین کا انداز عاشقانہ سوز و گداز، منشی حبیب اللہ ذکاؔ کا سخنور، ہمہ دانِ یکتا، لفظ طراز، معنی آفرین، آفریں آفریں صد آفریں

مرزا آفریں۔"

منشی حبیب اللہ ذکا کے 'خاش و خماش' پر مرزا غالب کا یہ مختصر اردو پیش لفظ ہے۔ اس تحریر کا قابلِ ذکر اور قابلِ غور پہلو یہ ہے کہ مرزا غالب جن کو فارسی پر صرف مہارت و قدرت ہی نہیں حاصل تھی بلکہ جو فارسی کے مقابلے میں اردو کو پوچ و بے حقیقت سمجھتے تھے، انھوں نے ذکا کے 'مجموعۂ نظم و نثر فارسی' پر پیش لفظ اردو میں لکھا تھا۔ یہ بات اگر ایک طرف غالب کی حقیقت پرستی کا ٹھوس ثبوت فراہم کرتی ہے تو دوسری طرف ان حضرات پر ایک گہرا طنز بھی ہے جو اس وقت بھی فارسی ہی پر جان چھڑک رہے تھے اور کسی طرح بھی ماضی سے اپنے دامن کو جھٹک کر حال سے وابستہ کرنے پر رضامند نہ تھے۔

خاش و خماش کی فارسی نظم و نثر کو یا اس سے متعلق مرزا غالب کے اظہارِ خیال کو تنقید کی کسوٹی پر کسنا ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ اس مجموعے کے صرف ان حصوں سے ہم کو اس وقت دلچسپی ہے جن کا مرزا غالب کی ذات سے براہِ راست یا بالواسطہ تعلق ہے ۔ ان پہلوؤں کا اجمالی ذکر کرنے سے پہلے منشی حبیب اللہ ذکا سے بھی سرسری ملاقات کر لینا ضروری ہے۔

ذکا کا وطن " من مضافات مدراس" تھا جہاں ۱۲۴۴ ہجری (مطابق ۱۸۲۸ء) میں پیدا ہوئے۔ خود ان کی اپنی فکر کے مطابق "بے خود و بدخوے" ان کی تاریخ میلاد ہے۔ ابتدائی تعلیم اپنے 'برادرِ مہربان محمد رحمت اللہ رسا' سے حاصل کی اور میر مہدی علی ثاقب اور سید مرتضیٰ حسینی بینش کے سامنے "زانوئے سبق تہہ" کئے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد تلاشِ معاش کی فکر ہوئی۔ چناں چہ 'صدر وزارت دکن' کا "غلغلۂ نظم امور و آوازۂ قدردانی" سن کر حیدرآباد کا رُخ کیا۔ وہاں پہنچنے کے بعد کم و بیش ایک سال "وسیلت و واسطہ" کی جستجو میں کھپایا۔ ایک بزرگ عبدالوہاب حسینی نے ان کی دست گیری کی اور اس کش مکش سے ان کو نجات دلائی۔ ان کے 'قصیدہ' 'عرض داشت' نے ممدوح تک رسائی پائی۔ بالآخر یکم ذی الحجہ ۱۲۷۲ھ (مطابق ۱۸۵۵ء) کو ذکا نواب مختار الملک کی سرکار سے باضابطہ وابستہ ہوگئے۔

غالب اور ذکا کے تعلقات کب اور کیوں کر پیدا ہوئے؟ جہاں تک 'کب' کا تعلق ہے، اس کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ رہا 'کیوں کر' کا معاملہ، اس باب میں غالباً ذکا ہی نے پہل کی تھی۔ خاش و خماش میں غالب کے نام جو رقعات ہیں، ان میں جو پہلا خط ہے، وہی ذکا اور غالب کے تعلقات کی غالباً پہلی کڑی ہے۔ جو یوں شروع ہوتا ہے:

" آن کہ در حضرت او خامہ بعرض ادب است
شاہ مردان سخن غالبؔ عالی نسب است
بندگی با مقبول و کورنشہا موصول باد از بندۂ روے خواجہ
ندیدہ و بخوے خواجہ گرویدہ ....."

اور جواب کے لئے اپنا پتہ یہ لکھا تھا،

"در حیدرآباد دکن، بدارالانشاء مہین دستور مختار الملک
بحبیب اللہ ذکا برسد"

اس خط پر اور دوسرے خطوں پر بھی تاریخ ارسال درج نہیں ہے، جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ ذکا اور غالب کی خط و کتابت کا سلسلہ کب سے شروع ہوا۔ ذکا چوں کہ "مہین دستور مختار الملک" کے منشی تھے، اس لئے غالب نے ان کے خط کو نعمت غیر مترقبہ اور ان کی ذات کو خداداد وسیلہ سمجھا ہوگا۔ چناں چہ غالب نے فوراً ان کے خط کا جواب دیا اور ان کے نام کے آگے 'مولوی' اور نام کے پیچھے 'خان' کا اضافہ کیا۔ اس کے جواب میں ذکا نے لکھا کہ "بندہ نہ پایگاہ مولویت دارد نہ خطاب خانی" ذکا کے خط کا جواب دینے کے ساتھ ساتھ غالب نے اپنے اردو دیوان کا ایک نسخہ بھی مختار الملک کے نام غالباً براہ راست روانہ کیا ۔ اور ذکا کے خط میں بھی اس کا تذکرہ کیا۔ اس کے جواب میں ذکا نے لکھا کہ:

"رسیدن دیوان اردو را نہ بالقوۃ اثرے است و
نہ بالفعل خبرے۔ یا رسیدہ باشد و کسش نہ دیدہ باشد...
بندہ را مصرعے از مصنفات جناب بر زبان است ع۔
گرنی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر"

(دیوانِ اردو کے پہنچنے کا نہ تو اب تک کوئی اثر ہی ظاہر ہوا ہے اور نہ اس کی خبر ہی ہے۔ ممکن ہے کہ پہنچا ہو اور کسی نے اس کو نہ دیکھا ہو..... بندے کی زبان پر آپ ہی کا مصرع ہے

گرنی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر)

اس حسنِ طلب کے جواب میں غالب نے ذکاؔ کو بھی دیوانِ ریختہ کا ایک نسخہ بھیجا اور ساتھ ہی "قصیدہ مدحیہ (نواب مختار الملک)" بھی روانہ کیا جو ممدوح تک پہنچ تو گیا مگر اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ ایک دوسرے خط میں ذکا نے، غالباً غالب کی یاد دہانی پر، لکھا کہ "میر دخترِ منشی عبد القادر کو اس پر میں نے آمادہ کیا کہ وہ دوبارہ آپ کا ذکر چھیڑیں اور آپ کے محامد پھر بیان کریں۔ انھوں نے یہی کیا ہے۔ یہ گذارش دل نشین (ممدوح) ہوئی۔" اور اس خوش خبری کے ساتھ یہ بھی مشورہ دیا کہ "اگر منشی نامہ و چیگا مہ بوساطت ایجنٹ دہلی دیا دیگر از اہلِ فرہنگِ فرنگ" بھیج دیا جائے تو " اس فقرے کا 'کہ دبرخوان نوال مختار الملک بہادر یختی دبہرۂ من نیز نہادہ اند) جو آپ نے لکھا ہے، ممکن نہیں ہے کہ بطلان ہو سکے۔"

غالب ہی کے سلسلے میں ذکاؔ نے غالب کے دوستوں سے بھی خط و کتابت شروع کی۔ ایک خط میں غالب ہی کو لکھتے ہیں کہ "منشی غلام غوث بے خبر نے اردو رقعات کے چھپنے کا مژدہ با وعدۂ ارسال سنایا ہے۔" ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں کہ "آپ کے ضعفِ بصارت کا حال سننے کے بعد میں آپ کو اپنے خطوط پڑھنے کی زحمت نہیں دینا چاہتا۔ اسی لئے نواب مصطفےٰ خاں بہادر (شیفتہ) سے میں نے خط و کتابت کا سلسلہ شروع کیا۔"

ذکا کے اس مجموعہ نظم و فارسی میں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ اور غلام غوث بے خبر کے علاوہ منشی نول کشور کے نام بھی دو ایک رقعات ہیں اور ان کا بھی مرزا غالب ہی کی ذات سے تعلق ہے۔

'خاش و خماش' کے حصۂ نظم میں "تاریخ چاپ کلیات فارسی غالب" بھی ملتی ہے جو حسب ذیل ہے:

غالب کہ نفی مطلق اگر معنی کم است — گویم کہ ہمسرش بسخنی کم تر آمدہ
دیوان او از مطبع نول کشور — طومار سعی کارگزاراں بر آمدہ
تاریخ الطباع نولیسد ذکاؔ ہمی — جانِ سخن بقالب طبع اندر آمدہ
صد ہائے ہا ز رشک بر آرند منکراں — یک حرف ہا چہ شد ۱۲۸۵ ہمہ زاید گر آمدہ

ذکا کے اس مجموعے میں ہم کو "تاریخ رحلت حضرت غالب" بھی ملتی ہے جو حسب ذیل ہے:

گذشت از جہاں آں جہانِ سخن — کہ می گفتمش عرفیؔ و طالبؔ است
خرد گفت سالش ریاضِ جناں — کراں تا کراں مسکنِ غالبؔ است

اسی کے نیچے حاشیہ کی حسب ذیل عبارت بھی ہے

" درسنہ ۱۲۸۳ خبر رحلت حضرت غالب کہ دراصل غلط بود، شہرت یافتہ بود۔ واں گاہ ایں قطعہ تاریخ نوشتہ شدہ بود۔"

(یعنی سنہ ۱۲۸۳ ہجری میں حضرت غالب کی رحلت کی خبر مشہور ہو گئی، جو غلط تھی، اس وقت یہ قطعہ تاریخ لکھا گیا تھا)

عمر انصاری

غزل

شکوے کہ ہنسی میں ڈھل گئے ہیں — دریا تھے جو رُخ بدل گئے ہیں
جس سمت بھی ہم نکل گئے ہیں — راہوں میں چراغ جل گئے ہیں
کیا ہم سے خطا ہوئی ہے دُنیا — تیور ترے کیوں بدل گئے ہیں
نکلا نہیں چاند مدّتوں سے — تارے کوئی چال چل گئے ہیں
اللہ رے گردشِ زمانہ — لوگوں کے خدا بدل گئے ہیں
سننے ہی نہیں صدا کسی کی — دیوانے کہاں نکل گئے ہیں
معلوم ہے ہم کو اپنا عالم — کہنے کو تو ہاں سنبھل گئے ہیں
دراصل وہی ہیں دشمنِ جاں — جو حادثے کل پہ ٹل گئے ہیں

بدلا نہیں دل عمرؔ ہمارا
ہر چند کہ ہم بدل گئے ہیں

جبیب اللہ ذکا کے مجموعۂ نظم ونثر فارسی
خاشں وخماش' پر مرزا غالب کا پیش لفظ

۱

ہو اللہ

سواد عبارتی کہ دال الاحباب مستطاب نواب اسد اللہ خان غا
دہلوی در سال ہزار و دو صد و ہشتاد و یک بر نسخۂ مجم
نظم و نثر کہ بغرض اصلاح خدمت والاشان فرستادہ شدہ بود
بخط خویش رقم فرمودہ اند و پایان آن مہر خو

یہ کلام کسی بادشاہ کا نہیں کسی امیر کا نہیں کسی شیخ شہزادہ کا
یہ کلام میرے ایک دوست روحانی کا ہے اور فقیر نے اپنے دوست کے
معرض اصلاح میں بنظر دشمن دیکھا ہے سبب تعلق نہیں مدارا نہیں
مجھکو نظر آیا ہے بے حیث و بیل کہون گا نثر مین نعمت خان عا
طرز کا احیا کیا ہے مگر پیرایہ کچھہ اوس سے بہتر دیا ہے قصاید مین انو
چہرہ اوٹھایا ہے مگر طبیعت نے اعجاز و ردکھایا ہے۔ غزل مین متاخر
عاشقانہ سوز و گداز منشی حبیب اللہ ذکا سخنور ہمہ دان یکتا لفظ
آفرین آفرین صد آفرین صد ہزار آفرین ......

غالب ۱۲۸۲



نواب مختار الملک میر تراب علی خان بہادر سالار جنگ

آپ کے باپ ہیں مالک رام کا
مضمون صفحہ ۳ پر ملاحظہ فرمائیں



امریکی میلہ

دلّی میں

میسور کا پویلین



روسی پویلین



دروازہ

زراعتی میلہ

پنجاب کا پویلین

بجھ گیا ایک چراغ



دلؔ شاہجہانپوری

آج سے پچاس برس پہلے سندیلے کے ایک مشاعرے میں حضرت دلؔ شاہ جہان پوری کے ایک شعر نے سامعین کو زیر و زبر کر دیا تھا ؂

نہ وہ آرام جاں آیا، نہ موت آئی شب وعدہ
اسی دُھن میں ہم اُٹھ اُٹھ کر ہزاروں بار بیٹھے ہیں

انشاءؔ کی زمین میں یہ معرکۃ آلارا شعر نصف صدی سے لوگوں کی زبان پر ہے۔ لیکن شب وعدہ موت کے نہ آنے کا شکوہ کرنے والا موت کی آغوش میں جا چکا۔ ۲۵۔ دسمبر کی شب میں دل پر فالج کا شدید حملہ ہُوا صبح ہوتے ہوتے زبان بند ہو گئی اور ۲۶۔ دسمبر کو امیر مینائیؔ کی یہ یادگار بھی رخصت ہو گئی ؂

آنکھ اپنی نہ جھپکنا تھی نہ جھپکی اے دلؔ
رازداں رنگ بدلتے رہے افسانوں کے

مگر اب کے ایسی آنکھ جھپکی کہ رازداں اور ان کے افسانے دھرے رہ گئے۔ مرحوم قادر الکلام غزل گو تھے۔ انسانی شرافت اور خلق و مروّت کا مجسمہ تھے۔ پُرانے بادہ کش اُٹھتے جا رہے ہیں۔ میخانہ خالی ہوتا نظر آ رہا ہے۔ مرحوم کے انتقالِ پُر ملال سے ریاضؔ اور جلیلؔ کی موت تازہ ہو گئی۔ مرحوم ہی کے اس شعر پر اس تعزیت نامے کو ختم کرتا ہوں ؂

ہر موجِ بحرِ عشق کی طوفانِ بے پناہ
کھیلا ہوں جان پر تو کنارہ ملا مجھے

عرشؔ ملسیانی

اِک چراغ اور بجھا



اسدؔ ملتانی

(۱۹۳۷ء)

اسد خاں اسدؔ ملتانی بڑے نغز گفتار شاعر تھے۔ حال ہی میں پاکستان میں ان کا انتقال ہو گیا۔ لطیف مزاح اور لطفِ قوافی ان کے خاص محاسن تھے۔ قادر الکلام شاعر تھے۔ سوچ سمجھ کر پختہ شعر کہنا ان کا شعار تھا۔ ۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۸ء تک بزمِ اردو شملہ کے مشاعروں کے روحِ رواں رہے۔ ان مشاعروں میں جوشؔ، جگرؔ، احسنؔ مارہروی، بےخودؔ و سائلؔ، مرزا ثاقبؔ قزلباش لکھنوی، جوشؔ ملسیانی پنڈت امرناتھ ساحرؔ دہلوی، فراقؔ گورکھپوری اور ملک کے ممتاز شعراء دادِ سخن دیتے رہے۔ مسٹر غلام محمدؐ مرحوم سابق گورنر جنرل پاکستان کی معیت میں انھوں نے اردو کی بیش بہا خدمات ادا کی تھیں۔ ان کے اُٹھ جانے سے ایک سنجیدہ شاعر، ایک متین ادیب، ایک باوقار مزاح گو اور ایک صاحبِ فن سے اردو کی صفِ اوّل میں خلا پیدا ہو گیا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں وہ پاکستان چلے گئے لیکن ہندوستان کے دوستوں ادیبوں اور شاعروں سے ان کے تعلقات میں ذرا بھی فرق نہ آیا۔ اس نثری نوحے کو غالبؔ کے ایک شعر میں تصرّف سے مرحوم کے حق میں دعائے خیر پر ختم کرتا ہوں ؂

یہ لاشِ درکفن اسدؔ خوش بیاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

عرشؔ ملسیانی

نادم سیتاپوری

غالب کی حریف ـ زہرہ و مشتری

مرزا نوشہ کو 'غالب' بنانے میں جو نمایاں حصّہ مولینا فضل حق خیرآبادی نے لیا تھا اس کی مثال شاید ہی غالب کی زندگی میں کہیں اور نظر آئے ـ ڈاکٹر سیّد محی الدّین صاحب زور کے یہ الفاظ

"اگر مولوی فضل حق (خیرآبادی) سے (غالب کی) ملاقات نہ ہو تو شاید میر تقی میؔر کی پیشین گوئی کی دوسری شق پوری ہوتی جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ یہ لڑکا (غالب) بھٹک جائے گا ـ"

(صفحہ ۱۹ ـ سرگزشت غالب مطبوعہ ابراہیمیہ پریس حیدرآباد دکن ۱۹۳۹ء)

اس حقیقت کے آئینہ دار ہیں جنھیں 'غالبیات' پر ریسرچ کرنے والوں نے نہ جانے کیوں نظر انداز کر رکھا ہے ـ حالانکہ بنیادی طور پر تمام 'غالب پرست' متفق ہیں کہ مولینا خیرآبادی وہ منفرد شخصیت ہیں جنھوں نے غالب کی زندگی کو اس ڈگر پر لگایا تھا جہاں آج غالب اپنی پوری فنکارانہ صلاحیتوں کے ساتھ زندہ ہے ـ

شیخ محمد اکرم صاحب نے 'غالب نامہ' میں لکھا ہے :ـ

"مولوی فضل حق (خیرآبادی) غالب کے سب سے بڑے مُحب اور محسن تھے انھوں نے نہ صرف مرزا کی شعر و سخن کے میدان میں رہنمائی کی جو ان کا اصلی "دائرۂ عمل" تھا بلکہ ان کی مالی مشکلات دُور کرنے کی بھی کوشش کی ـ"

(صفحہ ۴۵ ـ 'غالب نامہ' مطبوعہ سرفراز قومی پریس لکھنؤ)

اور مالک رام صاحب جیسے 'غالب شناس' کی یہ رائے غالب کی زندگی کے ان تمام پہلوؤں کو اس سے زیادہ اجاگر کرتی ہے :ـ

"اگر مولوی فضل حق (خیرآبادی) اور ان کے رفقا کی صحبت کا فقط اتنا ہی اثر ہوتا کہ وہ شاعری میں اپنی غلط روش کو چھوڑ کر ایک معتدل راہ پر آجاتے تو یہ بھی کچھ معمولی بات نہیں تھی ـ مگر اس سے بھی زیادہ قابل قدر کام غالب کی اخلاقی اصلاح کا ہُوا ـ ان کی اس زمانے کی اخلاقی حالت کا ذکر ہو چکا ہے اگر وہ اسی ڈگر پر قائم رہتے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کے دل و دماغ کا کیا حشر ہوتا ـ"

(صفحہ ۴۷ ـ "ذکر غالب" (تیسرا ایڈیشن) مطبوعات مکتبۂ جامعہ دہلی)

لیکن 'آب و گل' کی یہ 'تضاد پسندی' بھی تاریخ ادب کا ایک دلچسپ موڑ ہے کہ 'خیرآباد' کی اس سرزمین کو جہاں 'فضل حق' جیسی 'غالب ساز' شخصیت کے وطن ہونے کا فخر حاصل ہے ـ وہیں "زہرہ اور مشتری" نے بھی جنم لیا جو اپنے زمانے میں غالب کی خاص حریف سمجھی جاتی تھیں ـ

غالب کی زندگی کا آخری دَور اپنی ادبی ہنگامہ آرائیوں کے اعتبار سے ایک اہم زمانہ خیال کیا جاتا ہے ـ 'قاطع برہان' کی اشاعت کے بعد 'قاطع القاطع' 'محرق قاطع' 'ساطع برہان' اور 'مؤید برہان' کا سلسلہ جو شروع ہُوا تو لکھنؤ کی ادبی فضاؤں میں بھی تموّج پیدا ہوگیا ـ اودھ میں آتش و ناسخ کا رنگ پہلے سے اتنا چھایا ہوا تھا کہ غالب کے ماننے والے انگلیوں پر

گئے جاتے تھے۔ مخالفت کا زور اتنا تھا کہ ریاض خیرآبادی جیسے 'مرنج و مرنجاں' قسم کے بزرگ نے 'مشقِ سخن' کی ابتداء ہی 'دیوانِ غالب' کے جوابی دیوان سے کی جس کی ایک غزل کے مقطع کا آخری مصرعہ یہ تھا

میں ہوں ریاض کچھ 'اسد دہلوی' نہیں

ریاض کے اس دیوان کا لطیفہ بھی بہت دلچسپ ہے۔ میرے نانا سید ناظر حسین ناظر (وکیل سیتاپور) ریاض کے بے تکلف دوستوں میں سے تھے۔ ریاض جب غالب کے جواب میں یہ دیوان مکمل کر چکے تو ناظر سے ذکر کیا کہ میں نے غالب کے جواب میں پورا دیوان کہہ دیا ہے کسی دن تمھیں بھی دکھاؤں گا ناظر بڑے ہی پُر مذاق اور بدیہہ گو شاعر تھے۔ بولے! خوب ـــــ آپ اور غالب ؟ سبحان اللہ۔ کیا کہنا ؟

ان کے کلرک منشی چنی لال مرحوم بھی قریب بیٹھے ہوئے مقدمات کی مثلیں ترتیب دے رہے تھے۔ ناظر نے فی البدیہہ کہا

فلک کو دیکھتا ہوں غالب اور ریاض احمد
خدا کی شان ہے ناظر حسین و چنی لال

زہرہ اور مشتری اسی خیرآباد (ضلع سیتاپور) کی دو طوائفیں تھیں جنھوں نے غالب کی زندگی میں ان کے خلاف ایک اچھا خاصا ادبی محاذ قائم کر رکھا تھا۔ ان دونوں بہنوں کے تنقیدی مضامین 'اودھ اخبار' وغیرہ میں شائع ہوا کرتے تھے۔ مالک رام صاحب نے ان کا ضمنی تذکرہ 'ذکرِ غالب' میں کیا ہے ـــــ تحریر فرماتے ہیں :۔

"یوں معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کی دو رنڈیوں قمرن جان مشتری (عرف منجھو) اور امراؤ جان زہرہ (عرف بی چھٹن) نے بھی اس معرکے میں حصہ لیا تھا۔ یہ دونوں اچھی خاصی تعلیم یافتہ اور مذکورالصدر آغا علی شمس کی شاگرد تھیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شمس نے خود اعتراض لکھ کر ان دونوں کے نام سے شائع کر دئے تھے۔ پنڈت کشن لال طالب دہلوی نے ان دونوں سے متعلق بہت سے قطعے لکھے تھے۔ ان میں سے ایک شعر تھا

شارعِ شمس زہرہ مشتری ہے
بڑی تو خیر ہے چھوٹی کھری ہے

(فٹ نوٹ صفحات ۱۸۱/۱۸۲ ذکرِ غالب تیسرا ایڈیشن)

"تذکرۂ خم خانۂ جاوید" نے ان مضامین کا اصل مصنف زہرہ و مشتری کے استاد آغا علی شمس کو قرار دیا ہے اور شمس کے ذکر میں لکھا ہے ـــــ

"انھیں دنوں میں آپ (شمس) نے بھی مرزا (غالب) کے خلاف اخبارات میں زہرہ و مشتری کے نام سے مضامین شائع کرے تھے اور مرزا صاحب کی شاعری پر بھی کچھ اعتراضات کئے تھے مگر چاند پر خاک ڈالنے سے کیا ہوتا ہے۔"

(صفحہ ۲۰۳۔ جلد پنجم)

لیکن 'خمخانۂ جاوید' کا یہ قیاس صحیح نہیں ہے کیونکہ ۲۵ جون ۱۸۶۷ء کے 'اودھ اخبار' (لکھنؤ) میں غالب کے خلاف جو مضمون شائع ہوا تھا وہ آغا علی شمس ہی کے نام سے تھا زہرہ و مشتری کے نام سے شائع کرانے کا سوال تو اس وقت پیدا ہوتا جب خود شمس پس پردہ رہ کر معرکہ آرائی کرتے ـــــ مالک رام صاحب نے لکھا ہے :۔

"اسی دوران میں میر آغا علی شمس لکھنوی نے 'اودھ اخبار' (۲۵ جون ۱۸۶۷ء) میں ایک مضمون لکھا جس میں مرزا کے بعض اشعار پر اعتراض کیے تھے۔ اس کا جواب سخن نے اردو نثر میں اور باقر نے فارسی نثر میں لکھا۔"

(ذکرِ غالب صفحہ ۱۸۱/۱۸۲)

ظاہر ہے کہ آغا علی شمس نے غالب کی مخالفت پس پردہ کی تھی پھر یہ کہنا کہ زہرہ و مشتری کے مضامین شمس کے لکھے ہوئے تھے کسی طرح قرین قیاس نہیں ہے زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ زہرہ اور مشتری نے یہ مضامین شمس کے ایما اور مشورے سے لکھے ہوں گے۔ اس کے علاوہ جہاں تک ان دونوں بہنوں کی علمی و ادبی قابلیت اور شعری صلاحیتوں کا تعلق ہے پورے وثوق کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان دونوں بہنوں نے نظم و نثر میں جو کچھ لکھا ہے وہ ان کی ذاتی قابلیت اور ذہنی صلاحیت کا نمونہ ہیں اور ان میں ان کے استاد شمس کا اتنا ہی حصہ ہے جتنا اس دور کے کسی

ؔ اس زمانے میں ایک دوسرے سید ناظر حسین ناظر سیتاپوری بھی گزرے ہیں جنھیں ریاض خیرآبادی کی حقیقی بھتیجی منسوب تھیں۔ مشہور مصنف سید رئیس احمد جعفری ندوی انھیں کے صاحبزادے ہیں۔

اُستاد سے اس کے لائق شاگرد کو مل سکتا تھا۔

امام باندی (عرف چھوٹی بی) طوائف کی یہ دونوں لڑکیاں اپنی ماں اور خالہ کے ساتھ بچپن ہی میں خیرآباد سے لکھنؤ چلی گئی تھیں۔ وہیں کی شائستہ محفلوں میں پلی بڑھیں اور وہیں پیوندِ خاک ہوگئیں۔ فارسی اور اُردو کے علاوہ فنِ شعر کی تکمیل میر آغا علی شمس (شاگرد ملک الشعراء قاضی محمد صادق خان اختر) سے کی جو اپنے دَور کے ایک باکمال بزرگ گذرے ہیں۔ مولانا حسرت موہانی نے شمس کی مثنوی 'طلعۃ الشمس' کی ابتداء میں ان کے مختصر حالات بھی لکھے ہیں۔

"(۱۲۳۲ھ تا ۱۳۱۲ھ)

سید آغا علی نام، شمس تخلص۔ اصل ان کی خراسان سے ہے۔ ابھی کمسن ہی تھے کہ والدین نے انتقال کیا۔ گیارہ سال کی عمر میں راجہ کندن لال اشکی نے ان کو اپنا پسر خواندہ قرار دیا۔ خوشنویسی کی مشق شمس نے انھیں سے کی تھی۔ انھیں کی وساطت سے نواب محمد علی شاہ بادشاہِ اودھ کی سرکار سے ان کو 'رنگین رقم مشکیں قلم' (اور) 'خان بہادر' کا خطاب عطا ہوا اور وقائع نگاری کی خدمت سپرد کی گئی۔ کچھ روز تک زمرۂ مصاحبینِ شاہی میں بھی شامل رہے نواب فخر الدولہ زخمی بھی ان کی امیرانہ پرورش کرتے تھے۔ راجہ کندن لال کے بعد عرصہ تک نواب محمد تقی خان شاگرد مرزا سلیم کی سرکار سے توسل رہا لیکن آخر حصۂ عمر ان کا انقلابِ زمانہ کے ہاتھوں تنگدستی میں بسر ہوا۔ زہرہ و مشتری مشہور طوائفانِ لکھنؤ کو فارسی پڑھاتے تھے اور انھیں کے مکان میں رہا کرتے تھے۔ بی مشتری کے نکاح کر لینے اور خانہ نشین ہونے کے بعد کانپور چلے گئے اور وہیں انتقال کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ملک الشعراء اختر کے شاگرد تھے۔ تحقیقِ الفاظ و صحتِ زبان میں کمال حاصل تھا۔ کتبِ درسیہ عربی و فارسی کی تکمیل مولوی فضل حق خیرآبادی، مولوی اوحد الدین بلگرامی، مولوی سبحان علی لکھنوی، مولوی سلامت اللہ کشفی، شاہ عبدالعزیز دہلوی، میرزا قتیل اور مفتی میر عباس سے کی تھی۔ دیوان اردو و فارسی کے علاوہ ان کی ہندی چیزوں کا بھی مجموعہ قابلِ دید ہے۔ گلستانِ سعدی کے جواب میں ایک کتاب 'سنبلستان' لکھی تھی۔"

(طلعۃ الشمس مطبوعہ اردوئے معلیٰ پریس علی گڑھ)

امراؤ جان (عرف چھٹن صاحبہ) زہرہ اور بی قمرن جان (عرف منجھو صاحبہ) مشتری لکھنؤ کی ڈیرے دار طوائفیں تھیں۔ ان کی ماں امام باندی میرے بزرگوں کی زمینداری میں بمقام 'سیتاپور' آباد تھی لیکن جب اس کی بہن (غالباً خالہ زاد) الٰہی بخش نے خیرآباد کے چکلہ دار سے نکاح کر لیا تو طوائفوں کا یہ خاندان سیتاپور سے خیرآباد منتقل ہوگیا جو اس زمانے میں نوابینِ اودھ کی نظامت (کمشنری) کا درجہ رکھتا تھا۔ زہرہ و مشتری خیرآباد ہی میں پیدا ہوئیں لیکن بچپن ہی میں انھیں خیرآباد کو خیرباد کہنا پڑا کیونکہ جس چکلہ دار سے ان کی خالہ نے نکاح کر لیا تھا وہ معتوب و معزول کر دیا گیا۔ ان دونوں بہنوں کی مکمل تعلیم و تربیت لکھنؤ کی اس علمی و ادبی فضا میں ہوئی جہاں بڑے بڑے شرفاء اپنے بچوں کو علمِ مجلسی سکھانے کے لئے طوائفوں کے گھر بھیجا کرتے تھے۔ درسی تعلیم اور فنِ شعر تو ان دونوں بہنوں نے میر آغا علی شمس جیسے محققِ دوراں اور فاضلِ اجل سے سیکھا۔ موسیقی اور رقص کی دیکھ دیکھ حیدر علی قوال اور استاد گھسیٹا خاں نے کی۔ جانِ عالم نواب واجد علی شاہ کا دَورِ حکومت تھا۔ لکھنؤ ہی نہیں دونوں بہنوں کی دھوم ہندوستان میں مچ گئی اور وہ بھی اس شان سے کہ زہرہ و مشتری دو جداگانہ ہستیاں ہونے کے باوجود کچھ اس طرح لازم و ملزوم کر دی گئیں کہ آج 'زہرہ و مشتری' کے ذکر میں کوئی تفریق نظر نہیں آتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ کسی ایک ہی منفرد ہستی کا نام ہے حالانکہ شعرائے اردو و فارسی کے تمام تذکروں میں ان دونوں کا ذکر علیحدہ علیحدہ کیا گیا ہے۔ تذکرہ 'بہارستانِ ناز' جو ان دونوں بہنوں کی زندگی میں چھپا تھا اس میں دونوں کا ذکر موجود ہے۔

"زہرہ — تخلص۔ امراؤ جان نام۔ بی چھٹن صاحبہ مشہور شعر گوئی میں مشاق۔ شوخ طبعی میں شہرۂ دور دور۔ میر آغا علی شمس کی شاگرد ہیں اور انھوں نے ہی بنایا ہے 'میرجی' کا شہرہ اظہر من الشمس ہے۔ زہرہ کی زبان کو انھوں نے چمکایا ہے۔ شاگرد اگر اچھا ہو تو فخرِ استاد ہے۔ زہرہ

کی بدولت میاں شمس کی ہردم سب کو یاد ہے - اب بی مشتری کی تحریر سے معلوم ہوا کہ پانچ برس سے اس شاعرہ نے کسی رئیس عالیخاندان سے عقد کر لیا - اپنا دامن تر گوہر ہائے توبہ و استغفار سے بھر لیا - شعر گوئی کو بھی ترک کر دیا - دیکھئے اچھوں کی صحبت نے اچھا ہی اثر دیا - خدا کرے جھجک کی عادت نہ اختیار کرے - ہمیشہ کے لئے پردہ نشینی ہی اپنا شعار کرے ۔"

(صفحہ ۹۴ - تذکرہ بہارستان ناز مطبوعہ
مطبع عثمانی میرٹھ ۱۲۹۱ھ)

اس کے بعد زہرہ کے اردو کلام کا نمونہ بھی دیا گیا ہے۔

دوسری جگہ مشتری کا تذکرہ ان الفاظ میں ملتا ہے :

"مشتری تخلص - موسوم بہ قمرن جان معروف بہ منجھو لکھنؤ کی رہنے والی - شاعری میں خیال بیشالی - طبیعت نہایت تیز - فکر رسا ہے - میاں شمس کی تعلیم یافتہ ہے - ماشاء اللہ جیسے استاد کی مشہور طبیعت ہے ویسی ہی 'زہرہ و مشتری' کو شہرت ہے - اور کیوں نہ ہو جب تعلیم میں استاد صاحب اس قدر خیال سے بتائیں تو شاگرد کیونکر نہ گھر گھر شہرت پائیں واقعی یہ کہ حضرت شمس نے ان دونو پر کالہ آتش کو ایسا چمکایا ہے کہ فلک پر 'زہرہ و مشتری' کا رنگ اڑایا ہے اگر چندے اسی طرح تعلیم پائیں گی تو بی مشتری اپنے تئیں فلک پر پہونچائینگی - سات برس کی عمر سے اس شاعرہ کو شوقِ نوشت و خواند ہے - یہ ستارہ جلوہ ریزی حضرت شمس سے بڑھتے بڑھتے اب چودھویں رات کا پورا چاند ہے - خیر سے سامانِ ظاہری سے درست اور اللہ کی دی ہوئی کچھ جایئداد ہے - مسجد - امام باڑہ - باغ - مکان قدیم الایام بمقام خیرآباد ہے - اردو فارسی نظم و نثر اور تاریخ گوئی انکی سوا مشق خط خفی و جلی سب میں طاق ہے - مگر پندار میں بھی شہرہ آفاق ہے - غرض ایسے استاد شفیق کے سبب سے فن شعر کا کوئی دقیقہ نہیں باقی ہے - وہ کون بزمِ مشاعرہ ہے جہاں شمس و زہرہ و مشتری کی نہیں مشتاقی ہے - یہ شاعرہ ہر فن میں کامل کیوں نہ ہو اس کا استاد بھی تو صاحبِ کمال ہے دیکھیے مشتری عطارد رقم کا ۲۳ برس کی عمر میں ایسا ہو جانا استاد کی صاحب کمالی پر دال ہے - سبحان اللہ کیا ذہن آسمان پیوند ہے کوئی جھوٹ سمجھے یا سچ - ایک کے دل کی دوسرے کو کیا خبر - مگر ہمیں تو جی سے اس کا کلام پسند ہے - ہاں اس قدر افسوس ہے کہ اس لیاقتِ علمی پر اپنے نزدیک بہت دُور ہے - جس آدمی میں جوہر لیاقت بھی ہے اور انکسار بھی ہے وہ تو نوراً اعلیٰ نور ہے شعر

بتوں نے حسن پہ نخوت اگر سیکھی تو کیا سیکھی
نکو رو ہو کے بدخصلت اگر سیکھی تو کیا سیکھی

مگر یہ جو اس کو نخوت ہے کب خالی از حکمت ہے - ہماری رائے میں یہ وہ ٹیکا ہے جس نے نظرِ بد سے اس کو بچا رکھا ہے المختصر جو انداز ہے اچھا ہے اب صفحہ "بہارستان ناز" اس غنچہ دہن کے اشعار سے گل بداماں ہے ۔"

(صفحہ ۸۳ و ۸۴ - تذکرہ "بہارستانِ ناز")

اس کے بعد مشتری کے بھی اردو و فارسی اشعار کا ایک اچھا خاصا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔

یہ اقتباس کچھ کم ایک صدی ادھر کے ایک اردو تذکرے سے کیا گیا ہے جو غالب کی حیات میں چھپ چکا تھا۔ اگر دو تین سال ترتیب و تدوین کے بھی شامل کر لئے جائیں تو یہ اندازِ بیان پورے سو برس ادھر کا ظاہر ہے جس میں جگہ جگہ زہرہ و مشتری ہی پر نہیں ان کے استاد شمس پر بھی چوٹیں کی گئی ہیں -

اُردو اور فارسی کے اکثر و بیشتر تذکروں میں "زہرہ و مشتری" کے مختصر حالات ضرور ملتے ہیں لیکن جتنی بڑی کمی خان بہادر رضا علی وحشت مرحوم نے پوری کی ہے مجھے ابھی تک کہیں دوسری جگہ نظر نہیں آئی وحشت مرحوم نے ان کے مختصر مگر محققانہ حالات ہی نہیں لکھے بلکہ ان کے بہت سے خطوط بھی فراہم کر کے ماہنامہ 'جادو' ڈھاکہ میں شائع کرا دئے - خواجہ احمد فاروقی صاحب نے ماہنامہ 'آج کل' (دہلی) کے

خطوط نمبر ۱۹۵۴ء میں مشتری کا ایک اردو خط شائع کیا ہے جو انھیں محترمی قاضی عبدالودود صاحب (بیرسٹر پٹنہ) کی وساطت سے پہونچا ہے۔ اسی خط کے سلسلہ میں فاروقی صاحب نے وحشت کے حوالے سے مشتری کے مختصر حالات بھی لکھے ہیں:۔

"مشتری کے متعلق خان بہادر رضا علی وحشت نے لکھا ہے۔ مشتری سیتاپور ضلع خیرآباد (خیرآباد ضلع سیتاپور صحیح ہے) کی ایک مشہور رقاصہ تھی مگر ہمیشہ لکھنؤ میں رہی۔ نام قمرن جان تھا عرف بی منجھو۔ علمِ موسیقی میں گھسیٹ خان اور حیدر علی خان قوال کی شاگرد تھی۔ شاعری کا سنِ شعور سے شوق تھا۔ آغا شمس کی شاگرد تھی۔ مشتری کا ایک دیوان فارسی موسوم بہ "خانۂ خیال" طبع ہوگیا ہے۔ یہ شعر بہت جلد کہتی تھی جب مہاراجہ مہندر سنگھ۔۔۔۔ والی پٹیالہ لکھنؤ میں آئے مشتری نے سرِ محفل چند اشعار ــــ مدح میں نظم کئے اور اجازت لے کر ان کو پڑھا۔ مہاراجہ بہت محظوظ ہوئے اور ایک ہزار روپے انعام میں مرحمت کئے۔ آخر میں تائب ہوکر ناچنا گانا چھوڑ دیا تھا اور سید اعجاز حسین اعجاز سے عقدِ شرعی کیا تھا۔ مرنے کے بعد اس کی تمام جائداد کے مالک ہوئے جہاں حسن وجمال نے اس کے کمالات کو چار چاند لگائے تھے۔ صفاتِ حمیدہ نے ــــ عزیزہ خلق کر دیا تھا۔ فنِ شعر سے جیسا اس کو اُنس تھا ویسی ہی وہ اہلِ فن کی قدردان تھی۔ اطرافِ ہند کے مشاہیر سے روشناس تھی۔۔۔۔ لکھنؤ ہی میں نساخ۔۔۔۔۔ سے اس کا تعارف ہوا اور۔۔۔۔۔ دونوں کا تعلق بہ درجہ تعشق پہنچ گیا۔

عبدالغفور نساخ نے سخنِ شعرا میں لکھا ہے (ص ۴۷۹) مشتری تخلص۔ قمرن جان عرف منجھو طوائف۔ ساکنۂ لکھنؤ۔ شاگردِ آغا علی شمس۔ خوش طبع وخوش نویس وخوشگوار ہے۔ راقم الحروف سے اس شوخِ مجسم سے لکھنؤ میں ملاقات ہوئی تھی۔"

(ماہ نامہ آج کل، (خطوط نمبر) اپریل ۱۹۵۴ء صفحہ ۹ و ۱۰)

زہرہ عمر میں مشتری سے بڑی تھی مگر کسی تذکرے سے زہرہ کا سنِ پیدائش معلوم نہیں ہوتا۔ تذکرہ 'بہارستانِ ناز' کی اشاعت (۱۲۸۱ھ) کے وقت مشتری کی عمر ۲۳ سال تھی۔ اس حساب سے مشتری کا سنِ ولادت ۱۲۵۸ھ نکلتا ہے۔ 'مشاہیرِ نسواں' میں مشتری کا سنِ وفات ۱۳۱۵ھ لکھا ہوا ہے۔

"مشتری۔ لکھنؤ کی قمرجان عرف منجھو طوائف کا تخلص ہے یہ شاعرہ آغا علی شمس کی شاگرد تھی۔ بڑی اچھی طبیعت پائی تھی ۱۳۱۵ھ میں نذرِ اجل ہوئی۔"

(صفحہ ۵۱۹۔ مشاہیرِ نسواں مطبوعہ خادم التعلیم پریس لاہور ۱۹۰۲ء)

گویا بوقتِ وفات مشتری کی عمر ۵۷ سال تھی۔

مشتری کی ماں امام باندی (وفات ۱۲۸۵ھ و ۱۸۶۸ء) اگرچہ شاعرہ نہیں تھی لیکن اتنی حاضر جواب، پُرمذاق اور بذلہ سنج عورت تھی کہ بڑی بڑی محفلوں میں اچھے اچھے منھ کی کھا جاتے تھے۔ محترمی قاضی عبدالودود صاحب نے آغا علی شمس کی 'نقلِ محفل' کے حوالے سے امام باندی کا ایک لطیفہ نقل کیا ہے۔

"بحث تھی کہ آج ایک امام کی شہادت کا دن ہے اور دوسرے امام کی ولادت کا۔ خوش رہنا چاہیے یا مغموم؟ امام باندی نے بے ساختہ جواب دیا کہ ہنسنا چاہیے نہ رونا حقِ المقدور 'شادی مرگ' ہونا چاہیے۔"

---

۱ دتاسی کی تاریخ جلد ۲ صفحہ ۰۰۰۰۰ میں مشتری کا ترجمہ درج ہے جو 'بہارستانِ ناز' مصنفہ رتیخ سے ماخوذ ہے۔ دتاسی کا بیان ہے کہ ۶۔ جولائی ۱۸۶۹ء کے 'اودھ اخبار' میں اس کی ایک غزل بھی چھپی تھی اس نے مشتری کو ساکنۂ لکھنؤ شاگرد شمس اور رقیب 'زہرہ' لکھا ہے۔

۲ مشتری کے دیوان کا نام 'خانۂ خیال' نہیں بلکہ 'ترانۂ خیال' ہے میں نے اس کا دوسرا ایڈیشن مطبوعہ "مطبع گلزار محمدی" دیکھا ہے اس پر 'ترانۂ خیال' معروف بہ 'دیوانِ مشتری' ہی لکھا ہوا ہے۔ 'خانۂ خیال' مشتری کے فارسی مجموعۂ نثر کا نام ہے۔ (نادم سیتاپوری)

(صفحہ ۲۳ - ۲۴ " نقل محفل" مطبوعہ گلزار محمدی ۱۳۹۱ھ)

امام باندی، زہرہ اور مشتری کی حاضر جوابی اور بدیہہ گوئی کے اتنے لطیفے مشہور ہیں کہ اگر انھیں قلمبند کیا جائے تو ایک مستقل کتاب تیار ہو سکتی ہے لیکن ان کی شہرت کے ساتھ ساتھ ان کی صداقت بھی مشکوک ہو گئی ہے۔

مشہور تو یہی ہے کہ زہرہ و مشتری اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتی تھیں لیکن مجھے اب تک زہرہ کی کوئی فارسی غزل، نظم، رباعی یا قطعات دستیاب نہیں ہو سکے البتہ زہرہ کی اردو غزلیں جا بجا تذکروں اور گلدستوں میں اب بھی بکھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ مشتری کا فارسی اور اردو کلام تذکروں میں بھی موجود ہے اور کثرت سے شعر و سخن کے گلدستوں میں بھی ہے۔ اس کے علاوہ مشتری کی فارسی غزلیات کا مجموعہ 'ترانۂ خیال' (معروف بہ دیوان مشتری) اور فارسی نثر کا مجموعہ 'خانۂ خیال' بھی ہیں۔ 'ترانۂ خیال' اور 'خانۂ خیال' دونوں مطبع گلزار محمدی (اکبری دروازہ چوک لکھنؤ) میں چھپے تھے۔ ان کے پہلے ایڈیشن میری نظر سے نہیں گذرے لیکن دوسرے ایڈیشن (۱۳۰۲ھ) میرے پیش نظر ہیں۔ مجموعہ نثر فارسی 'خانہ خیال نثر مشتری' کی ضخامت صرف بیس صفحات ہے۔ آخر میں منشی شنکر دیال فرحت شاگرد منشی جواہر سنگھ جوہر کی ایک فارسی تقریظ بھی شامل ہے۔

ترانۂ خیال (دیوان مشتری) ۶۸ صفحات پر مشتمل ہے جس میں ایک سو سے زیادہ غزلیات، قطعات، تضمینیں، اور تاریخیں وغیرہ شامل ہیں اور بیشتر غزلیات وغیرہ مشکل صنعات میں کہی گئی ہیں جو مشتری کے کمال فن کی دلیل ہیں۔ مثلاً

۱- محیط الکل (ہر لفظ کو نوشتہ خواہد شد از بی حساب عدد "محمد" بر خواہد آمد)

۲ " " (اس کے ہر لفظ سے 'علی' کے اعداد نکلتے ہیں)

۳- ترکِ الف (۴) ترک ہائے موحد (۵) ترک خوفانی (۶) ترک مثلثہ (۷) ترک جیم (۸) ترک ہائے بے نقط (۹) ترک ہائے معجمہ (۱۰) ترک تحتانی (۱۱) صنعت فوقانیہ (۱۲) صنعت تحتانیہ (۱۳) صنعت تصحیف (۱۴) صنعت موصل (۱۵) صنعت منشاء (۱۶) صنعت خیفا وغیرہ وغیرہ۔

غرضیکہ فارسی کا یہ مجموعہ مشتری کے ارتفاع کمال کی ایک ایسی منھ بولتی تصویر ہے جس کی مثال شاید اس دور کی خواتین میں مشکل ہی سے کہیں ملے گی۔ اس مجموعہ کا قریب قریب نصف حصہ تقریظوں اور تاریخوں پر مشتمل ہے جس میں زیادہ تر تاریخی مصرعوں سے ۱۲۹۷ھ اور ۱۲۹۸ھ نکلتے ہیں۔ دو ایک مادہ تاریخ ۱۲۸۰ ہجری کے بھی ہیں۔ سب سے آخری قطعہ تاریخ خواجہ عبدالرؤف عشرت مرحوم کا ہے جس سے ۱۳۰۴ھ برآمد ہوتے ہیں۔ تاریخ گو شعراء میں امیر مینائی، داغ دہلوی، مرزا آغا حسن ازل، شیخ انوار حسین تسلیم مرادآبادی، منشی گوبند لال صبا، افضل علی ضو (مالک سحید الاخبار)، عباس حسین فصاحت (خلف میر آغا حسن امانت)، میر غلام حسین قدر بلگرامی (تلمیذ غالب)، میرزا عنایت علی بیگ ماہ (برادر مرزا حاتم علی مہر) کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ قدر بلگرامی کے نام کے ساتھ جو عبارت آرائی کی گئی ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ میرزا غالب کے خلاف جو ادبی ہنگامہ آرائی کی گئی تھی اس پر ذاتیات کی چھاؤں بھی نہیں پڑی تھی۔ قدر کے قطعہ تاریخ کا سرنامہ ہے ـــــ

"شاہ بیت قصیدہ عظمت، و فضیلت، مصراع چہارم رباعی شرافت و نجابت، بدرِ صدر آسمان دیوان بلند مقالی و نیکنامی قدر جناب مولوی غلام حسین صاحب بلگرامی مرید و شاگرد نواب اسد اللہ خان غالب اکبرآبادی۔ ویرانۂ مضامین آفرینی را باعث آبادی"

(صفحہ ۶۲ ترانۂ خیال)

سب سے آخری صفحہ پر مطبع گلزار محمدی کے مالک 'محمد وزیر' کا ایک اعلان ہے جس میں دوسرے لوگوں کو اس کتاب کی طباعت سے منع کیا گیا ہے۔ اس اعلان سے معلوم ہوتا ہے کہ مشتری کا مکان 'قدیم نخاس' (لکھنؤ) میں تھا۔

مشتری کی فارسی 'انشاپردازی' کا نمونہ 'خانۂ خیال' کے علاوہ بہت سے 'خطوط' بھی ہیں جنھیں خان بہادر رضا علی وحشت مرحوم نے جمع کر کے چھپوائے ہیں۔ لیکن ان مطبوعہ خطوط کے علاوہ بھی مشتری اور زہرہ کے بہت سے خطوط گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں جو ابھی تک شائع نہیں ہوئے ہیں۔ حال میں مجھے ان کے دو غیر مطبوعہ فارسی خطوط کی نقلیں برادرم مولوی نجم الحسن خیرآبادی کے توسط سے دستیاب ہوئی ہیں جو

کسی خیرآبادی برنرگ' کو لکھے گئے ہیں۔ ان خطوط پر نہ کوئی تاریخ ہے نہ مکتوب الیہ کا نام۔ صرف سباق عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ "زہرہ و مشتری" کے یہ خطوط ان کے کسی ہم وطن ہی کے نام ہیں۔ پہلے خط میں کسی مقدمہ کا ذکر ہے جو ان کے موروثی باغ کے سلسلے میں چل رہا تھا۔

باسمہ سبحانہ'

دام اقبالہ و اجلالہ۔ خوب شد کہ بہ ترمیم شکست و ریخت غریب خانہ بطوریکہ سردست مناسب بود ہمت عالی گماشتند۔ و مرمت کلی بر فصل زمستان کہ بشرط خیریت زود تر می رسد۔ گزاشتند شکایت بدگمانی من نسبت خود عبث خود از خامہ رفت یا رچکیدہ خدا نخواستہ ایں فعل ہیچ در پوچ بیا بیابان دور نہ دل نزدیک کسے صادر و دارد گردیدہ۔ خلاصہ تحریر سابق ایں بودہ است کہ درستی کار ہائے ما بہ گذارش ما منحصر و موقوف نباشد بلکہ ہرچہ مقتضائے وقت و محل نماز از آں مربی مطلق و مالک برحق۔ رنگ ظہور یابد۔ حال مقدمہ مرجوعہ عدالت مفصل برنگارند و ایں ہم کہ بر باغ مرہونہ قبض و دخل ضابطہ یافتہ بہ تحریر آرند و ارسال مسک مطلوبہ ازیں جہت در التوا افتادہ کہ وارث قرض خواہ از ینجا یا براہ سفر کانپور رستادہ۔ واجب دانستہ عرض نمود۔ زیادہ فرحت بنود۔

سعدین۔ زہرہ مشتری

اختر آسمان ریاست — و فیض رسانی گوہر دریائے امارت و قدردانی دام اقبالہ'

والا نامہ مکرمت مشحون۔ مرحمت مقرون۔ تاج سر ورود۔ شفقت آمود گردید و مضمون آن از اول تا آخر آبرو بخش ذہن ناقص ما بریافت گشت۔ کنیز پروری و پرستار نوازی کہ از غلامان جناب نسبت ایں کمترینان بظہور رسید۔ شایان ولی نعمتان و سزاوار خداوندان بود۔ شکر احسانات بے پایان از حوصلہ تحریر و اندازہ تقریر بیرون و افزونست ایزد بسیار بخش بجلدوی چنیں مراحم و تفضلات جناب والا را حشمت و اقبالے کہ مافوق آن متصور نباشد عطا فرماید۔ بخدائے پاک ہرچند خواستیم کہ آستان فیض نشان بہ لبہائے ارادت و عقیدت ببوسیم۔ لیکن امورے کہ سنگ راہ مقصود شد۔ بیانش دریں پارچہ قرطاس نمی تواند گنجید۔ انشاء اللہ بعد محرم حاضر گشتہ آں قصہ طویل را بہ سمع اقدس خواہیم رسانید آمدیم بر اینکہ اسباب و صرف ضروری بدست میر نجف علی صاحب فرستادیم ایشان حسب معمول قدیم بجا آوردی مراسم عزاداری حتی المقدور خواہد پرداخت لیکن آنجناب براہ عنایات مربیانہ یک آدم ہوشیار بطور مددگار بہ امام باڑہ تعینات نمائند۔ تا وقتیکہ میر صاحب بمجالس دیگر روند۔ آدم مذکور نگہبانی فرش وغیرہ بر عمل آرد۔ و فروخت فصل انبہ وغیرہ باغ و خالی نماندن ہر سہ دکان از کرایہ دادن مرکوز خاطر دریا مقاطر باشد بلکہ تا فروخت شدن فصل یک دو "پاسی" معتبر از طرف جناب عالی محافظ باغ شود۔ و باغ جدید کہ تصدق فرق مبارک است۔ در نیمود یا نشاندہ نشود۔ و سبزہ کنیز کہ بے اجازت و اطلاع ما آنجا رفتہ ہرگز در مسجد و امام باڑہ و غریب خانہ راہ نیابد زیادہ سوائے ایں رباعی چہ گذارش دہم۔

اے آنکہ ترا لطف و عطائے زیبد

مارا گنہ و جرم و خطائے زیبد

زنہار نگویم کہ چناں کن و چنیں

با حسن تو احسان کن کہ ترا می زیبد

بخدمت سراسر عظمت حاشیہ نشینان بساط عزت مناط قبلہ و کعبۂ جہان مخدوم و مسجود زمان حضرت فرشتہ خصلت جناب متولی صاحب مدظلہ آداب و تسلیم قبول باد

"زہرہ و مشتری"

ان دونوں خطوط سے ان کی وطنی وابستگی کا اچھا خاصہ ثبوت ملتا ہے۔ لیکن آج اسی "خیرآباد" میں ان کے مکان کا تو ذکر ہی کیا 'مکین' کا نام لینے والا بھی کوئی نہیں۔

مرزا جعفر حسین

مرزا غالب کا فارسی کلام

تقریباً سو سال کے اندر جتنا مطالعہ غالب کا کیا گیا ہے، کتابیں، مضامین، رسائل، تحقیقاتی مقالے اور عقیدت مندانہ خراج تحسین یا مخالفانہ نقد و تبصرہ سے بھرے ہوئے دفتر تیار کئے گئے ہیں اتنا کسی اور کے بارے میں نہیں لکھا گیا اور نہ کوئی دوسرا شاعر یا ادیب اتنا بڑا مرکز توجہ بن سکا۔ اس کی وجہ بقول پروفیسر احتشام حسین یہ ہے کہ "لوگ دوسروں کی کاوشوں کو اپنے لئے بہ قدر ذوق نہیں پاتے یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ لوگ غالب کو اپنے آئینہ میں اور غالب کے کلام کو آئینہ بنا کر اس میں اپنی شخصیت کو دیکھنا چاہتے ہیں۔"

لیکن جو کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جا رہا ہے اس کا بیشتر حصہ مرزا کے بے حد مختصر اردو دیوان سے متعلق ہے جس کو وہ خود "بیرنگ من ست" کہہ کر سبک کر چکے تھے۔ ان کو اگر اپنے کلام پر ناز تھا تو فارسی کلام پر جس کا اچھا خاصا ضخیم کلیات ہمارے پاس موجود ہے مگر ہم نے اس پر آج تک اتنی توجہ نہیں کی جس کا وہ مستحق ہے۔ مرزا کی اس کلام کے متعلق جو اپنی رائے ہے وہ ان دو شعروں سے واضح ہو جاتی ہے:

فارسی بین تا ببینی نقشہائے رنگ رنگ — بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ من ست
فارسی بین تا بدانی کاندر اقلیم خیال — مانی و ارژنگم و آں نسخۂ ارتنگ من ست

مرزا کے اسی قول سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اپنے فارسی دیوان کو ارتنگ کا مرتبہ دے کر اقلیم خیال میں اپنے کو مانی و ارژنگ کا ہم پلہ قرار دیتے تھے۔ ان کا فارسی کلام ان کے اس قول کو صحیح ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ مرزا کی مادری زبان فارسی نہیں تھی، ان کا ماحول ایرانی نہیں تھا۔ طبیعتاً بھی وہ "کنار آب رکنا باد و گلگشت مصلےٰ" کے شیدائی نہیں تھے۔ شیراز و اصفہان اور سمرقند و بخارا کی یادیں اگر ان کے دل میں موجزن ہوتی بھی تھیں تو صرف اس لئے کہ ہندوستان کے بہشت میں ان کے لئے آدم کا وجود عنقا تھا وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ

سخن نیست در لطف ایں قطعہ غالب
بہشتے بود ہند کآدم ندارد

اپنے معاصرین میں ان کو انسانیت اور انسانی ہمدردی کا اتنا فقدان محسوس ہوتا تھا کہ وہ یک لخت آدمیوں کی صورت سے ڈرنے لگے تھے اور آدمیوں سے دور رہنا چاہتے تھے۔ اس خیال کا اظہار انہوں نے متعدد بار اور طرح طرح سے کیا ہے۔ اس مقام پر صرف ایک اردو اور ایک فارسی شعر پیش کر دینا کافی ہوگا۔

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد
ڈرتا ہوں آئینہ سے کہ مردم گزیدہ ہوں

مرا ز روز قیامت غمے کہ ہست ایں ست
کہ روئے مردم دنیا دوبارہ باید دید

مردم گزیدگی سے تکلیف کا اظہار غالباً ان دو طریقوں سے بہتر کیا ہی نہیں جا سکتا۔ لیکن اپنے بھائی بندوں کے ہاتھوں جو تکلیفیں اٹھائی تھیں ان کے احساس کے باوجود مرزا کے دل میں ہندوستان کے شہروں، ہندوستان کے میووں اور ہندوستان کے پانی سے وہ محبت تھی کہ وہ "کنار آب رکنا باد" کو سوچ ہی نہیں سکتے تھے۔ آم

سے اُن کو عشق تھا اور اس ہندوستانی پھل کو وہ جنت کے میووں پر ترجیح دیتے تھے۔ کہتے ہیں:

ہمہ گر میوۂ فردوس بخوانت باشد
غالب آن انبۂ بنگالہ فراموش مباد

ہندوستان کے پانی میں دریائے سون سے ان کا گہرا تعلق تھا متعدد مقامات پر دریائے سون کا ذکر آیا ہے اور اس کے پانی کی تعریف کی ہے۔ انھوں نے ہر مقام پر لفظ سوہن استعمال کیا ہے مگر سمجھنے والا بھی سمجھنے پر مجبور ہے کہ ان کی مراد دریائے سون ہی ہوگی۔ کہتے ہیں:

مرحبا سوہن و جاں بخشی آبش غالب
خندہ بر گمرہی خضر و سکندر دارم

ہندوستان کے شہروں کا جب وہ ذکر کرتے ہیں تو ان کے انداز کلام ہی سے ان کے دل کی گہرائیوں کا پتہ چل جاتا ہے۔ ایک فارسی قطعہ میں 'محرم سرا سے سرور' سے مکالمہ ہوتا ہے۔ یہ محرم سرا سے سرور' مرزا کی روح ہے۔ اس مکالمہ میں مختلف شہروں کے بارے میں سوالات ہیں اور ان کے جوابات۔ ان جوابات ہی کو دیکھ کر مرزا کے جذبات کا صحیح پتہ چل جاتا ہے۔ فرماتے ہیں:

گفتم اکنوں بگو کہ دہلی چیست — گفت جان ست و ایں جہانش تن
گفتمش چیست ایں بنارس گفت — شاہدے ہست محو گل چیدن
گفتمش چوں بود عظیم آباد — گفت نرگس تر از فضائے چمن
گفتمش سلسبیل خوش باشد — گفت خوشتر نباشد از سوہن
حال کلکتہ باز جستم گفت — بابد اقلیم ہشتمش گفتن
الخ

ان اشعار کا مطالعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ مرزا ہندوستان کے ماحول اور یہاں کے روایات میں اتنا ڈوب چکے تھے کہ ان کو بیرونی ماحول اور کیفیات سے متاثر ہونے کی ضرورت ہی باقی نہ تھی اس لئے ان کے فارسی کلام کے محاسن اور زیادہ توجہ کے مستحق ہیں۔ اسی سلسلہ میں یہ بات بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ فارسی شعراء میں مرزا جن اساتذہ سے متاثر ہوئے وہ وہی شعراء تھے جو ہندوستان میں آکے بس گئے تھے اور جنھوں نے ہندوستان ہی کو اپنا گھر بنا لیا تھا جیسے نظیری، ظہوری، عرفی اور بیدل۔

ان اساتذہ سے لگاؤ اور ایرانی ماحول سے فطری دوری کا یہ اثر ضرور ہوا کہ مرزا کے یہاں حافظ و خیام کی سرمستی و چاشنی، سعدی کی سادگی، فردوسی کی ایسی رفعت خیالی، قاآنی کا شکوہ الفاظ، انوری کا لب و لہجہ اور دوسرے خالص ایرانی شاعروں کے وہ خصوصیات جو ایرانی ماحول و وراثت سے متعلق ہیں بہت کم ملتے ہیں لیکن پھر بھی مرزا ہی کا یہ دم خم تھا کہ انھوں نے ان خصوصیات کو بھی حاصل کر کے چھوڑا اور پھر ان لسانی اور وجدانی خصوصیات میں تفکر و تعقل کی گہرائیوں، حسن عشق کی معاملہ فہمیوں، تصوف کی محو کر دینے والی منزلوں، انسانی کردار کی بلندیوں اور انسانی جذبات کی صحیح ترجمانی کے معیار کو شامل کر کے اپنے فارسی کلام میں وہ چار چاند لگا دیئے جس کی مثال کسی دوسرے شاعر کے یہاں ملنا بہت مشکل ہے۔

مرزا نے اپنے ابتدائی مشق سخن میں بیدل کی تقلید کرنا چاہی تھی۔ چنانچہ اُن کے اردو دیوان میں بہت سے ایسے شعر مل جائیں گے جو بیدل کے رنگ میں کہے تھے۔ فارسی میں بھی اس کے بہت سے نمونے موجود ہیں۔ مثال کے طور پر مرزا اور بیدل کی ایک ہم طرح غزل کے کچھ شعر پیش کئے جاتے ہیں:

ہر طرف تنظر کردیم ہم بخود سفر کردیم
اے محیط حیرانی این چہ بیکرانیہاست
ما ز سیر ایں گلشن عشوۂ طرب خوردیم
ورنہ چشم وا کردن عبرت امتحانیہاست
ساز ما شکست دل یاراں ز ایں تو غافل
بر کہ پیش خود نالیم نالہ بیزبانیہاست
بیدل

در کشاکش ضعفم نگسلد روان از تن
اینکہ من نمی میرم ہم ز ناتوانیہاست
از خمیدن پشتم روے بر قفا باشد
تا چہا درین پیری حسرت جوانیہاست
کشتہ دل خویشم کز ستمگراں یکسر
دیدہ دلفریبیہا گفتہ مہربانیہاست
با عدو عتابستے و ز منش حجابستے
وہ چہ دلربائیہاست چہ جانستانیہاست
غالب

ان اشعار کا موازنہ ثابت کر دے گا کہ بیدل کی تقلید کرنے کے باوجود مرزا کی انفرادیت ثابت ہے اور ان کا وہ طرز جو آگے بڑھ کر خود انھیں کا انداز سخن کہلایا اور بن گیا اس کلام میں بھی موجود ہے۔ ورنہ دلفریبیوں کو مہربانی کہتے، نہ مرجانے کا سبب ناتوانی کو قرار

دے دینے اور پیری میں حسرت جوانی کا نمونہ پیش کرنے کی ترجمانی نہ ہوتی یہی وہ مقامات ہیں جہاں مرزا غالب آپ اپنی مثال ہیں اور کوئی دوسرا ان کا ہم پلّہ یا مدِمقابل نظر نہیں آتا۔

مرزا کی فطری صلاحیتوں میں ان کے مطالعے اور دقیقہ سنجی نے بھی اضافہ کر دیا تھا۔ مرزا نے اگر بیدل کی تقلید کی تو اسی ایک زاویۂ نگاہ کے وہ پابند نہیں رہے۔ انھوں نے ہر اُس شاعر کے کلام کا گہرا مطالعہ کیا جس کو وہ اساتذہ کی صف میں جگہ دینے کے لئے تیار تھے اور ہر ایسے استاد سے کچھ نہ کچھ اکتساب کی جدوجہد بھی کی تھی۔ چنانچہ اپنے فارسی کلیات کی تقریظ میں وہ خود لکھتے ہیں:

"شیخ علی حزیں بخندہ زیرلبی بیراہہ روئی مرا در نظرم جلوہ گر ساخت۔ وزہر نگاہ طالب آملی و برق چشم عرفی شیرازی مادۂ آں ہرزہ جنبش ہائے ناروا در پائے رہ پیمائے من بسوخت۔ ظہوری بسرگرمی گیرائی نفس حرزے بہ بازوے و توشۂ بر کمرم بست و نظیری لاأبالی خرام بہنجار خاصہ خودم بجالش آورد۔ اکنوں بہ یمن فرّہ پرورش آموختگی این گروہ فرشتہ شکوہ کلک رقاص من بخرامش تدروست دبرامش موسیقار بجلوہ طاؤس ست و بہ پرواز عنقا۔"

متذکرہ بالا بیان کا دقیق مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ مرزا کی نگاہ میں شیخ علی حزیں اور طالب آملی کے مقابلہ میں ظہوری اور نظیری کا پلّہ بھاری تھا اور عرفی کا مقام ان دونوں کی منزلوں کے درمیان ہیں۔ اس وضاحت کا ثبوت خود مرزا کے اشعار سے بھی مل جاتا ہے۔ عرفی کے بارے میں کہتے ہیں:

کیفیت عرفی طلب از طینت غالب — جام دگراں بادۂ شیراز ندارد
قافیہ غالب چو نسبت پرس ز عرفی — گر من فرہنگ بودے چہ غم

گشتہ ام غالب طرف با مشرب عرفی کہ گفت

روے دریا سلسبیل و قعرِ دریا آتش ست

ان اشعار سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مرزا اپنی 'طینت' میں 'کیفیت' عرفی کا اکتساب اور الفاظ کی بہتات میں عرفی سے فیض حاصل کر کے 'مشربِ عرفی' کے ہم نوا بننا چاہتے تھے اور اس ہم نوائی کو حاصل کرنے کے بعد بھی ان کا کلام یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ ہر جگہ اپنے مخصوص فرقِ فکر اور طرزِ ادا کو برقرار رکھتے ہوئے عرفی سے ٹکر لیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں کچھ شعر عرفی اور غالب کے دونوں کی علاحدہ علاحدہ "طینت" اور طرزِ خیالی کے ثبوت میں پیش کئے جاتے ہیں:-

صبحدم چوں درد مدول صور شیون زاے من
آسماں صحن قیامت گرد از غوغاے من

(عرفی)

زاں نمی ترسم کہ گردد قعر دوزخ جاے من
واے گر باشد ہمیں امروز من فرداے من

(غالب)

اقبال کرم میگزد ارباب ہمم را
ہمت نخورد نیشتر لا و نعم را

(عرفی)

آوارۂ غربت نتواں دید صنم را
خواہم کہ دگر بتکدہ سازند حرم را

(غالب)

یہ دونوں مطلع قصائد کے ہیں۔ عرفی اور غالب کی ایک ہم طرح غزل کا موازنہ بھی اس مقام پہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا اس لئے کہ دونوں کا مخصوص طرزِ ادا اور دونوں کے سوچنے اور اظہارِ خیال کے رجحانات اسی ایک غزل سے واضح ہو جائیں گے۔

جنگ آتش آشتی آتش مدارا آتش ست
خوش سروکارے از آں بد خو مرا با آتش ست
بادہ خواہی باش تا از غم برُوں آرم کہ من
آنچہ در جام و سبو دارم مہیا آتش ست
آبِ حیواں می کنم در جام و آتش میخورم
باد با شاہد مے ناب ست و تنہا آتش ست
ہم سمندر باش و ہم ماہی کہ در جیحونِ عشق
روے دریا سلسبیل و قعرِ دریا آتش ست
با کہ گویم سرِ ایں معنی کہ نورِ حسنِ دوست
با دماغ من گل و با چشم موسیٰ آتش ست

(عرفی)

سینہ بکشودیم و خلقے دید کاینجا آتش ست
بعد ازیں گویند آتش را کہ گویا آتش ست
انتظارِ جلوۂ ساقی کبابم می کند
مے بہ ساغر آبِ حیوان و بہ مینا آتش ست
بے تکلف در بلا بودن بہ از بیم بلاست
قعرِ دریا سلسبیل و روے دریا آتش ست
گریہ دارم کہ تا تحت الثریٰ آب ست و بس
نالہ دارم کہ تا اوجِ ثریا آتش ست
پاک خور امروز و زنہار از پئے فردا منہ
در شریعت بادہ امروز آب و فردا آتش ست

(غالب)

عرفی سے اکتسابِ فیض اور پھر اس فیض میں جدّت آفرینی مرزا کا طرّۂ امتیاز تھا جو اوپر کی دونوں غزلوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہی حالت اور دوسری غزلوں کی بھی ہے جو مرزا نے عرفی کی طرحوں میں کہی ہیں۔ عرفی کے علاوہ مرزا نے نظیری اور ظہوری سے بھی برابر کی ٹکر لی ہے۔ ہو سکتا ہے

کہ ہر مقام پر مرزا کا پلّہ بھاری نظر آئے لیکن جہاں تک بلندیٔ فکر، جذبات نگاری، حقیقت کی بے نقابی اور ایک اعلیٰ کردار پیش کرنے کا تعلق ہے اس میں مرزا کا مرتبہ کسی طرح بھی ان شعراء سے کم نہیں ہے۔

اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ مرزا نے ان دونوں اساتذہ کے کلام کا بخوبی مطالعہ کیا تھا اور ان دونوں شعراء کے کردار کو بھی اچھی طرح سمجھا اور پرکھ لیا تھا۔ ظہوری کی طبیعت مرزا کی طرح دقیقہ سنج تھی۔ دونوں کے یہاں ندرتِ خیال کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں، انسانی کردار کا معیار دونوں کی نظر میں یکساں طور پر بلند تھا اور خواہشات و جذبات کی ترجمانی میں دونوں ہم آہنگ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مرزا نے ہر مقام پر ظہوری کا احترام ملحوظ رکھا ہے اور بڑے بلند الفاظ میں ان کو یاد کیا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار پیش کئے جاتے ہیں:-

غالب از جوشِ دمِ ما تربیتش گلپوشش باد
پردۂ سازِ ظہوری را گل افشاں کردہ ایم

غالب از اوراق ما نقشِ ظہوری دمید
سرمۂ حیرت کشیم دیدہ بدیدن دہیم

غالب از من شیوۂ نطقِ ظہوری زندہ گشت
از نوا جان در تنِ سازِ بیانش کردہ ایم

زلّہ بردارِ ظہوری باش غالب بحث چیست
در سخن درویشیٔ باید نہ دکان داریٔ

بنظم و نثر مولانا ظہوری زندہ ام غالب
رگِ جاں کردہ ام شیرازہ اوراق کتابش را

یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ مرزا کا طرزِ ادا اور ان کی ندرتِ خیال جس طرح آپ اپنی مثالی ہے وہی حالت ان کی انفرادیت کی بھی ہے جو ظہوری کو قابلِ احترام سمجھنے کے بعد بھی ان کی تاسی میں جھلک رہی ہے۔ مثال کے طور پر لے لیجئے۔ ظہوری نے "آستانش را" اور "پاسبانش را" کی ردیف اور قوافی میں غزل کہی ہے۔ مرزا نے اپنی طبع آزمائی کے لئے قافیہ بدل کے راہ نکالی۔ دونوں کی ہم بحر غزلوں کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں:-

شب از مژگان تر رفتم غبار آستانش را
پشیمانم کہ آخر یاد دادم پاسبانش را
فگندی بے تو نے کاش پیش سخت جان خود
کہ دیدی باوجود ناتوانیہا توانش را
بجاہ عشق با سرمایۂ دارم سر سودا
کہ صد جاں قیمت یک نگاہ رائگانش را

بپردم دوزخ و آں داغہا سینہ نانش را
سرابے بود در رہ تشنۂ برق عنانش را
ندانم تا چہ برق فتنہ خواہد بخت برہم
تصور کردہ ام بگسستن بند نقابش را
سوار توسن نازست و برخاکم گزر دارد
بیابان آرزو چندانکہ دریابی رکابش را

بہنساں چوں رقم بر مسند تعلیم بنشینم
کہ بلبل بگذراند پیش من درس فغانش را

(ظہوری)

خیالش صید دام پیچ و تاب شوق بود اما
من از مستی غلط کردم ز شوخی اضطرابش را

(غالب)

اسی طرح مرزا نے یہ بھی ستم ظریفی کی ہے کہ بعض مقامات پر بحر بدل کے اور کہیں ردیف میں فرق کر کے ظہوری سے ٹکر لی ہے اور اپنی انفرادیت کو پوری طرح ظاہر کر دیا ہے۔ مثال میں دو غزلوں کے چند شعر پیش ہیں۔ پہلی غزل میں صرف ردیف کا فرق ہے۔

از دم تیغ نگاہ تن بہ تپیدن دہیم
سرمۂ حیرت کشم دیدہ بہ دیدن دہیم
از روش جلوۂ آہ براہ افگنم
وز خلش غمزۂ خوں بچکیدن دہیم
بند نقابی کشم تیغ و ترنج آورم
یوسف و یعقوب را کفِ ببریدن دہیم
توبۂ پرہیز را کردہ شکستن درست
محضر ناموس را زیب دریدن دہیم
آمدنت دیک لب حرف کسے دو نیست
کہ بن ہر موئے را گوش شنیدن دہیم

(ظہوری)

سوخت جگر تا کجا رنج چکیدن دہیم
رنگ شو اے خون گرم تا بپریدن دہیم
جلوہ غلط کردہ اند ز رخ بکشا تا ز مہر
ذرہ و پروانہ را مژدۂ دیدن دہیم
سبزۂ ما در عدم تشنۂ برق بلاست
در رہ سیل بہار شرح دمیدن دہیم
شیوۂ تسلیم ما بودہ تو امنع طلب
در خم محراب تیغ تن بخمیدن دہیم
خیز کہ راز درون در جگر نے دہیم
نالۂ خود را ز خویش داد شنیدن دہیم

(غالب)

دوسری غزل میں بحر کا فرق ہے۔ مگر اس فرق کے باوجود مرزا کو ظہوری کی تاسی کا احساس تھا اسی لئے مقطع میں اس کو یاد کر لیا

"زلّہ بردارِ ظہوری باش غالب بحث چیست
در سخن درویشیٔ باید نہ دکاں داریٔ"

اب دونوں کی غزلیں ملاحظہ ہوں:

عزتم شد عزتے از خواریٔ
گشت آساں بود گر دشواریٔ
مژدہ از من بخت خواب آلودہ را
بستہ ام افسانۂ بیداریٔ
در زمینِ سینہ کشتم تخم داغ
دارد ابر دیدہ اخگر کاریٔ

کافرم گر از تو باور باشدم غمخواریٔ
آزمندانتقامم کردہ ذوق خواریٔ
از کنارِ دجلہ آتش خانہ چنداں دور نیست
کشتیٔ ما بر شکستن تو دستاں یاریٔ
شاد باشی اے غم زہیم مرگ ایمنی ساختی
گشت صرف زندگانی بود گر دشواریٔ

از برائے صبر نافرمانِ خویش
می نویسم نامۂ بیزاریے
آرزوے یاریٔ دارم زیار
کاش می آمد زمن اغیاریے
مبتلا ہم در خوشامدہاے غیر
عشق دارد نیز دنیاداریے
(ظہوری)

برق از نزہت کباب بیجا با سوزیے
مرگ از لطمت ہلاک درد منت زاریے
با خرد گفتم چہ باشد مرگ بعد از زندگی
گفت ہے خوابِ گرانے از پس بیداریے
اے دل از مطلب گر بستم دستگاہت را چہ شد
بشنو نے شورے فغانے اضطرابے زاریے
(غالب)

ظہوری کے مقابلے میں نظیری کی ہم طرح غزلیں مرزا کے کلام میں زیادہ تعداد میں ملتی ہیں۔ اس کی غالباً وجہ یہ ہے کہ مرزا اگر ایک طرف ظہوری کے تعمقِ فکر اور ندرتِ خیال سے متاثر تھے تو دوسری طرف نظیری کے لطافتِ بیان اور حسنِ ادا کے بہت زیادہ دلدادہ تھے۔ نظیری نے حسن و عشق کے معاملات جس لطیف پیرایہ میں بیان کئے ہیں اس کی مثال دوسری جگہ کم ملتی ہے۔ مرزا نے اس باب میں نظیری کی تاسی کرنے کی بے حد کوشش کی ہے۔ بعض مقامات پر وہ نظیری کے ہم پلّہ بھی نظر آتے ہیں لیکن ان کی یہ جد و جہد بسا اوقات اس لئے ناکام رہی کہ ان کی دقیقہ سنج اور مشکل پسند طبیعت نظیری کے لطافتِ ادا اسلوبِ سخن کو قبول نہ کرسکی۔ اس کا احساس خود مرزا کو بھی تھا اور وہ کہہ اٹھتے تھے کہ

"جوابِ خواجہ نظیری نوشتہ ام غالب   خطا نمودہ ام و چشمِ آفرین دارم"

اس شعر کا دوسرا مصرع بھی نظیری کا ہے۔ اس مقام پر مرزا غالب اور خواجہ نظیری کی بعض ہم طرح غزلوں کا موازنہ ان دونوں اساتذہ کے علاوہ علاحدہ رجحانات الگ الگ اسلوبِ سخن اور بالخصوص مرزا کی انفرادیت کو ثابت کرنے کے لئے کارآمد ہوگا۔ ایسی تین غزلوں کے کچھ اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

بجا بودی کہ امشب سوختی آزردہ جانے را
بقدرِ روزِ محشر طول دادی ہر زمانے را
سوالے کن زمن امروز تا غوغا بشہر افتد
کہ اعجازِ فلانے کرد گویا بے زبانے را
کتابِ ہفت ملت گر بخواند آدمی عامیست
نخواند تا ز جزو آشنائی داستانے را

بہ پایانِ محبت یاد می آرم زمانے را
کہ دل عہدِ وفا نابستہ دامِ دلستانے را
فسونے کو کہ بر حالِ غریبے دل بدرد آرد
بد اندیشے بازدوہ عزیزان شادمانے را
ندارم تابِ ضبط از دمی ترسم ز رسوائی
مگر جویم نہ بہر ہمزبانی بیزبانے را

بہر جنسے کہ می گیرند اخلاص و وفا خوب ست
پس از عمرے گزر افتاد بر ما کاروانے را
دلا سیلابِ خون را از شگافِ سینہ بیرون کن
کہ امشب سودہ ام بر دیدہ خاکِ آستانے را
نمی دانم نظیری کیست چون می آمدم زان کو
بحالِ مرگ دیدم بر سرِ رہ ناتوانے را
(نظیری)

بیا در گلشن بخشم کہ در ہر گوشہ بنمایم
ز جوشش لالہ و گل در حنا پاے خزانے را
کمالِ دردِ دل اصل ست در ترکیبِ انسانی
بخون آغشتہ اند اندرین ہر موے جانے را
بہ شہر از دوست بعد از روزگارے یافتم غالب
ز عنوانِ خطے کز راہ دور آمد نشانے را
(غالب)

ظاہر ہے کہ نظیری کی غزل بہت بلند ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ملحوظ رکھنے کی ہے کہ نظیری کی یہ غزل اس کی بہترین غزلوں میں سے ہے اور حسن و عشق کی معاملہ بندی جو نظیری کا طرۂ امتیاز ہے اس غزل میں معراجِ کمال پر ملتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں مرزا کی غزل صرف ندرتِ خیال اور دقیقہ سنجی کی بہترین مثال کے طور پر پیش کی گئی ہے۔ اب دوسری غزل ملاحظہ ہو:

کس نہ نمود جرعۂ کز جگرم گزک نخواست
بے نمکی ز گفت کس کز سخنم نمک نخواست
زنگ رخ سخن نشان میدہد از عیار مرد
صاحبِ فہم خوردہ بین ناسرہ را محک نخواست
گفت و شنید دوستاں مایۂ عیش می شود ف
آنکہ شمردہ زد نفس ہمدمیٔ ملک نخواست
من ہمہ عجز و ہمکناں میل نزاع می کنند
ہر کہ حریف یافت شد عاقل از و خسک نخواست
عالم و یک مسیح دم دیر مغاں و یک صنم
ہرچہ نخواستے رامی اخترِ نہ فلک نخواست
مصرعِ نظم بخلط صفر و نثر بے نقط
نسخۂ نظم و نثر من نقطۂ سہو و شک نخواست
(نظیری)

ہرچہ فلک نخواست ست ہیچکس از فلک نخواست
ظرف فقیہ می نخیت بادۂ ما گزک نخواست
جاہ ز علم بیخبر علم ز جاہ بے نیاز
ہم محک تو زر ندید ہم زر من محک نخواست
زاہد و ورزشِ سجود آہ ز دعوئ وجود
تا نہ زداہرمن زہش بدرقۂ ملک نخواست
بحث و جدل بجاے ماں میکدہ جوے کاندراں
کس نفس از جمل نہ زد کس سخن از فدک نخواست
گشتہ دلہ انتظار پود دیدۂ پیر رہ سفید
در رہ شوق ہمرہی دیدۂ مردمک نخواست
ریز ہزار شیوہ را طاعتِ حق گراں نبود
لیک صنم بسجدہ در ناصیہ مشترک نخواست
(غالب)

ان غزلوں کا موازنہ مرزا ہی کو خیال، اسلوبِ سخن اور طرزِ ادا میں نظیری سے بہت بلند بتاتا ہے۔ جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جہاں بھی

ف عیش می بود

مضمون آفرینی، دقیقہ سنجی اور ندرتِ خیال کی منزل آ جائے مرزا بڑے سے بڑے استادانِ فن کے دوش بدوش کھڑے ہو جانے کی پوری پوری صلاحیت رکھتے تھے۔ آئیے اب ایک اور ہم طرح غزل کا موازنہ کر لیا جائے:

ما حالِ خویش بے مژہ پا نوشتہ ایم
روزِ فراق را شبِ یلدا نوشتہ ایم
قاصد بہوش باش کہ بر یک جواب تلخ
عرضِ ہزار گونہ تمنا نوشتہ ایم
دُرِ نکو معالجۂ عمرِ کوتہ است
این نسخہ از علاجِ مسیحا نوشتہ ایم
ہر گہ کہ کردہ ایم رواں کشتیٔ امید
طوفانِ بادِ شور بہ دریا نوشتہ ایم
تحقیقِ حالِ ما زِ نگہ می تواں نمود
حرفے ز حالِ خویش بسیما نوشتہ ایم
(نظیری)

تا فصلے از حقیقتِ اشیا نوشتہ ایم
آفاق را مرادفِ عنقا نوشتہ ایم
عنوانِ رازِ نامۂ اندوہ سادہ بود
سطرِ شکستِ رنگ بسیما نوشتہ ایم
در ہیچ نسخہ معنیِ لفظِ امید نیست
فرہنگِ نامہ ہائے تمنا نوشتہ ایم
آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بخونِ دل
قانونِ باغبانیٔ صحرا نوشتہ ایم
کوبیِ زنقشِ جبہۂ ما یک قلم پرست
لختے سپاس ہمدمیِ پا نوشتہ ایم
(غالب)

ان اشعار سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ مرزا کا پلہ اگر اونچا نہیں تو نظیری سے ہلکا بھی نہیں ہے۔ ایک مختصر مضمون میں اتنی گنجائش کہاں کہ اساتذہ کے کلام کا دل کھول کے موازنہ کیا جا سکے۔ تاہم اربابِ ذوق کی تسلیٔ جستجو کے لئے اتنا لکھ دینا کافی ہوگا کہ مرزا اور نظیری کے موازنہ کے لئے "مکتبہا، مشربہا"۔ "بلا خفتست، کجی خفتست"۔ "عربیت، بے ادبیت"۔ "کام ندارد، انجام ندارد"۔ "مبشر گیرد، نزدو ترگیرد" "چاکش نگر، پاکش نگر"۔ "امتحاں برخیز، امتحاں برخیز" "باز کردن، دراز کردن"۔ "سخن خواہد شدن، برہمن خواہد شدن" کے ردیف و قوافی والی اور اسی قبیل کی دوسری ہم طرح غزلوں کا مطالعہ ادبی شعور کی تشنگی دور کرنے کے لئے کافی ہوگا اور اگر عرفی، ظہوری، نظیری، بیدل اور غالب کے ایسے باکمال اساتذہ کو ایک ہی صف میں دیکھنا مقصود ہو تو "با آتش ست، مدارا آتش ست"۔ "خردمند ست، بند ست" "بسمل افتادست، قاتل افتادست"۔ "وضو کنند، بلو کنند"۔ "تاب شستہ ایم، آب شستہ ایم" کے ردیف و قوافی والی معرکتہ الآرا غزلیات میں تلاش کر لیجئے۔ ایسے موازنہ کے بعد مرزا کے اصلی خد و خال واضح ہو جائیں گے اور ہم یہ کہنے میں بجا طور سے فخر حاصل کر سکیں گے کہ ہم اپنے صرف ایک ہندوستانی شاعر کو بڑے بڑے ایرانی اساتذہ کے مقابلہ میں پیش کر سکتے ہیں جو ان سب کا فرداً فرداً اور اجتماعی طور سے بھی شاعری کے جملہ محاسن میں پوری طرح مدِ مقابل بن سکتا ہے۔

آئیے اب ذرا مرزا غالب کی انفرادیت کا بھی جائزہ لیا جائے۔ مرزا کے سوچنے کا طریقہ اور اپنے مخصوص رجحانات کو اپنے مخصوص انداز بیان میں پیش کرنے کا سلیقہ بھی اُن کی آپ مثال ہے۔ ان کے اردو اشعار زبان زد خلائق ہیں لیکن فارسی میں بھی اچھے اشعار کی کمی نہیں ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ فارسی میں بہتات ہے۔ انھیں میں سے کچھ اشعار بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں۔ ان میں وہ اشعار جن کا رشک کے موضوع سے تعلق ہے خاص توجہ چاہتے ہیں۔ کیونکہ "رشک" مرزا کا خاص موضوع تھا۔ اردو میں بھی اس موضوع پر ان کے اشعار اپنا جواب نہیں رکھتے۔ فارسی میں زورِ قلم اور بھی زیادہ بڑھ گیا ہے۔

جانِ غالب تاب گفتاری نماں داری ہنوز
سخت بیدردے کہ می پرسی ز ما احوالِ ما

خارہا از اثر گرمیٔ رفتارم سوخت   منتے بر قدمِ راہروانست مرا

سخن کوتہ مرا ہم دل بہ تقوےٰ مائل است اما
ز ننگِ زاہد افتادم بکافر ماجرائیہا

بچوں بہ قاصد بسپیرم پیغام را   رشک نگذارد کہ گویم نام را

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد   ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

خوشنودیٔ غالب بنود زیں ہمہ گفتن   یکبار بفرمائے کہ اے ہیچکسِ ما

چناں گرم است بزم از جلوۂ ساقی کہ پنداری
گداز جوہرِ نظارہ در جام ست مینا را

بخلوت مژدۂ نزدیکیٔ یار ست پہلو را
فریبِ امتحان پاکبازی دادہ ام او را

چو بنشیند بہ محفل بگذرا نم در دل تنگش
کہ رنجد غیر از و چوں بے سبب در ہم کشد رو را

بادہ اگر بود حرام بذلہ خلاف شرع نیست   دل نہی بہ خوب ما طعنہ مزن بزشت ما

فرصت از کف مدہ وقت غنیمت پندار   نیست گر صبح بہاری شب ماہے دریاب

از ہر بن موئے چشمۂ خوں باز کشادم   آرائش بستر ز شفق می کنم امشب

بر تنک مایگیم رحم کہ یک عمر گناہ   ہم بتاراج سبکدستی بخشودن رفت

آمدہ از رہ غرور بوسہ بجلوتم نداد   رفت وہ در انجمن ز غیر فرد توانگری گرفت

جادہ شناس کوئے خصم بودم و دوست راہ جوے   منکر ذوق ہمرہی خردہ بر رہبری گرفت

نظر فروز ادا ہا بہ دشمن ارزانی   بہ من سپار اگر داغ سینہ تابے ہست

رشک آیدم بروشنئ دیدہ ہائے خلق   دانستہ ام کہ از اثر گرد راہ کیست

با من بجواب ناز و من از رشک بدگماں   تا عرصۂ خیال عدو جلوہ گاہ کیست

زہر ست تلخ رشک تمنائے خویشتن   شادم کہ دل ز وصل تو نومید بودہ است

بے پردہ شور غصہ و الزام دہ مرا

گفتم کہ گل خوش ست بہ گلشن دریں چہ بحث

ہائے ایں پنجہ کہ با جیب کشاکش دارد   بود با دامن پاکت چہ قدر ہا گستاخ

شباب و زہد چہ ناقدر دانی ہستیست   بلا بجان جوانان پارسا ریزد

می رمی از من و خلقے بگمانست ز تو   بیجا باش و بنشیں کہ گماں برخیزد

چہ عیش از وعدہ چوں باور ز عنوانم نمی آید   بنوعے گفت می آیم کہ می دانم نمی آید

خیز و در ماتم ما ہمرہ فروشوئے ز چشم   وقت مشاطگی حسن خدا داد آمد

پیمانہ بریں رند حرام ست کہ غالب   در بیخودی اندازۂ گفتار ندارد

ہست تفاوت بسے ہم ز طلب تا بہ نبید   لذت دیگر دہد بوسہ چو دشنام شد

مے بہ دہاں مکن عرض کہ ایں جوہر ناب   پیش ایں قوم بہ شورابۂ زمزم نرسد

بوسم لب دلدار و گزیدن نتوانم   نرم ست دلم حوصلۂ کام ندارد

اندراں روز کہ پرسش رود از ہر چہ گذشت   کاش با ما سخن از حسرت ما نیز کنند

بخشم ناسزا می گوید و از لطف گفت رشک

گماں دارم کہ حرف دلنشینے بعد ازیں گوید

بدیں قدر کہ بے ترکنی و من بسکم   ترا ز بادۂ نوشیں چہ مایہ کم گردد

نخوت نگر کہ می خلد اندر دلش ز رشک   حرفے کہ در پرستش معبود می رود

ز رشکست اینکہ در عشق آرزوئے مردنم باشد   تو جان عالمے حیفست گر جان در تنم باشد

کم درد ز رشکست اینکہ غمخواری نمی خواہم   کہ ترسم یا بد او راہر کہ از حالم خبر گیرد

بیروں میا ز خانہ بہ ہنگام نیمروز   رشک آمدم کہ سایہ بپا بوس می رود

چو رہ بقصد نشان بر کماں بجنباند   تپید ز رشک دلم تا نشاں بجنباند

خارہا در رہ سودا ز دگان خواہد ریخت   ورنہ در کوہ و بیاباں بچہ کارست بہار

جاں می دہم از رشک بہ شمشیر چہ حاجت   سر تجربہ را من زن و دامن بہ کمر بر

از ذوق میان تو شدن سر بسر آغوش   بیمہر فن ماست بزنار میا موز

لحے از معشوق ہر جا در کتابے بنگری   بر کنار آں ورق جانہا فدایش می نویس

نیست معبودش حریف تاب ناز آوردنش

پیش آتش دیدہ ام روزے نیاز آوردنش

تا خود از بہر شمار کیست می میرم ز رشک

خضر و چندیں کوشش و عمر دراز آوردنش

سعی در مرگ رقیبان گران جان کردی   می شناسم کہ چہ از ناز و ادا گشت تلف

رنگ و بو بود ترا برگ نوا بود مرا   رنگ و بو گشت ہمیں برگ نوا گشت تلف

دیرنم از وصف رخت گل را شرر در پیرہن   آتش رشکم بجان تو بہار افتادہ ام

چہ پرسی کز لیت وقت قدح نوشی چہ میخواہم

ہمیں بوسیدنی چوں مست تر گردی مکیدن ہم

خوے سر گرمم داری عجز رشک نپسندم   سینۂ من از گرمی تابہ سمندر کن

جنون رشک را نازم کہ چوں قاصد دلم گردد   دوم بخویشتن و گیرم نامہ اندر راہ از وے

رشک نبود گر حذنگت جانب دشمن گرفت   دردم ساطور پنہانیست زخم کاریے

دلم میجوید از رشک می میرم کہ در مستی   چرا زاں گوشۂ ابرو اشارت کامیابستے

جیسا کہ کہا گیا یہ صحیح ہے کہ مرزا ایرانی نہ تھے، فارسی ان کی مادری زبان نہ تھی، انھیں شیراز و اصفہان جانے کا موقع نہیں ملا تھا لیکن ان کا یہ دعویٰ بھی غلط نہیں تھا کہ مبداء فیاض نے انھیں فارسی کا ذوق ازل میں بخشا تھا کیونکہ اس کے بغیر زبان و بیان کی لطافتوں کی ان منزلوں سے گزرنا آسان نہ تھا جن سے غالب گزرنے میں کامیاب ہوئے۔ ذوق کے اختلاف اور اندازِ نظر کے فرق کی وجہ سے ان کا مقابلہ شاید خالص ایرانی غزل گویوں مثلاً سعدی، حافظ، خواجو کرمانی، عراقی، جامی وغیرہ سے نہ کیا جا سکے لیکن ہندوستان کے اہم ترین فارسی شعراء مثلاً خسرو، ظہوری، نظیری، عرفی اور بیدل کے ساتھ ان کا نام نہ لینا ناممکن ہے۔ یہی ان کی عظمت کی دلیل ہے۔

شمس نغازی آبادی

تاج محل

اے تاج محل یادِ گہہِ عشق و امارت
ہرگہ کہ تو شہپارۂ اربابِ دوَل ہے
لیکن ترے آغوشِ مناظر میں بہر نوع
تدریسِ محبّت کا ہر اک باب اٹل ہے

ہر دل ہے یہاں ولولۂ شوق سے معمور
ہر آنکھ مکافاتِ محبّت کی طلبگار
صورت گرِ آئینِ وفا نخوتِ خود بیں
اظہارِ تمنّا پہ نہیں عشق گنہگار

تقدیسِ محبّت کا لئے پرچم نوری
پاکیزگیٔ حسن کے انداز سموئے
تو ایسے کھڑا ہے کہ برہ گن کوئی جیسے
دریا کے کنارے ہو سفینے کو ڈبوئے

یا پھر کوئی جوگن کہ لئے بربطِ صد تار
ہر تار کی جھنکار پہ پی بول رہی ہو
یا کوئی پری سوئے فلک مائلِ پرواز
یا پھول پہ تتلی ہے کہ پر تول رہی ہو

یا برسرِ نیلام کوئی جانِ تماشہ
اپنے ہی تماشے کی جھلک دیکھ نہ پائے
دنیائے ہوسناک سے سہمی کسی جانب
تکتی ہو کچھ ایسے کہ خریدار نہ آئے

یا شمعِ فروزاں ہے کہ فانوس سے باہر
یا پھر شبِ مہتاب ہے پتھرائی ہوئی سی
یا پھر کسی دولھا کا درخشندہ مکٹ ہے
یا پھر کوئی میّت ہے کہ کفنائی ہوئی سی

یا پھر کوئی فانوس فضاؤں میں معلّق
یا قوسِ قزح میں کوئی لٹکا ہوا جھولا
یا پھر کہیں انوار کی سمٹی سی ضیائیں
یا اوجِ سماوات سے تاروں کا بگولا

یا پھر کوئی زاہد ہے کہ باندھے ہوئے احرام
یا پھر بتِ سیمیں کا ابھرتا ہوا جوبن
یا نقرئی کرنوں میں دمکتا ہوا ہیرا
یا چاند ستاروں کا نکھرتا ہوا جوبن

یا چشمِ حیادار سے ڈھلکا ہوا آنسو
یا کاہکشاں سے کوئی ٹوٹا ہوا تارا
یا برگِ گُلِ تر پہ کوئی قطرۂ شبنم
یا ساغرِ بلّور میں ٹھہرا ہوا پارا

تبلیغِ محبت کا عمامہ ہے ترے سر
تو پیکرِ تسلیم و رضا روحِ وفا ہے
بھر دیتا ہے ہر دل میں محبت کے شرارے
خاموشی سے تو نے بھی عجب کام لیا ہے

حیرت ہے کہ کچھ لوگ تجھے دیتے ہیں الزام
یہ ان کے نئے طرزِ تخیّل کی عطا ہے
حالانکہ حقیقت میں امارت کا یہ مصرف
تہذیب کے چہرے کے لئے نورِ خدا ہے

ہے مستیٔ صد شوق تری دید سے حاصل
انوار کی لہروں پہ سبو دوڑ رہا ہے
کیا جانیے وہ کون سے دل دفن ہیں تجھ میں
پتھر کی رگوں میں بھی لہو دوڑ رہا ہے

عرفانِ محبت میں ہے تفریق دوئی کفر
آوازۂ لیلیٰ پہ بھی مجنوں کا گماں ہے
تانیث ہے تذکیر کے پہلو سے نمایاں
ممتاز محل ہو کے بھی تو شاہ جہاں ہے

کس چیز سے تشبیہ دوں کیا کیا تجھے کہہ دوں
جتنا بھی ترے حُسن کی تعریف ہو کم ہے
اے موسیٔ عمرانِ وطن کے یدِ بیضا
تو واقعی دنیائے محبت کا حرم ہے

ماجد سلمان

غزل

کیفیتِ الم بھی ہے ذوقِ نشاط کار بھی
زیست بقدرِ ظرف ہے جبر بھی اختیار بھی

ساقیٔ مہربانِ من! پھر کوئی بادۂ کہن!
عشق کو راس آ گئی تلخیٔ روزگار بھی

اب میری بے نیازیاں پہونچی ہیں دیکھئے کہاں
خاطرِ دل پہ ہے گراں نکہتِ زلفِ یار بھی

شاہدِ بزمِ دلبراں پھر اُٹھے نازکی کماں
ملنے لگا ہے کچھ سکوں عشق کو زیرِ دار بھی

کش مکشِ حیات میں نشۂ مے کا ذکر کیا
دل کو سکوں نہ دے سکا لطفِ نگاہِ یار بھی

پوچھ رہے ہو اس سے کیا لالہ و گل کی داستاں
بھولا نہیں جو آج تک لذّتِ نوکِ خار بھی

شام ہے شامِ بے سحر نالہ ہے وہ بھی بے اثر
آہ! ٹھہر گئی ہے کیا گردشِ روزگار بھی

پہلے اک آسرا بھی تھا اب کوئی آسرا نہیں
تم تو بجھا کے چل دئیے شعلۂ انتظار بھی

اس دلِ غم پرست کا کوئی مزاج داں ہو کیا
وجۂ ملال بن گئی پرسشِ چشمِ یار بھی

فرخ جلالی

ہوش بدایونی کے نام غالب کا ایک غیر معروف خط

غالب کے خطوط اُن کی زندگی کی سچی تصویریں ہیں ان کے تفکّر آمیز شعروں میں جو اشکال اور حسن ہے وہ مکاتیب میں شوخی اور سادگی سے بدل جاتا ہے۔ یہاں پُر پیچ راہیں نہیں ہیں سیدھے راستے ہیں۔ اس لئے غالب کے خطوط کی دستیابی اُن کے ذہن کے گوشوں کو سمجھنے میں بہت مدد دیتی ہے۔ محققینِ غالب کی کوششوں کے باوجود خطوط کی بڑی تعداد ابھی بکھری ہوئی ہے۔ غالب کے ایک شاگرد خان بہادر منشی محمد سخاوت حسین مدہوش انصاری بدایونی کے نام ایک خط ملا ہے۔ جو عودِ ہندی اور اردوئے معلیٰ میں شامل نہیں ہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یہ رقعہ خطوطِ غالب مرتبہ مولانا مہر میں بھی شامل نہیں ہے۔ کچھ وجوہ کی بناء پر مکرمی مالک رام صاحب کی تالیف 'تلامذۂ غالب' میں جناب مدہوش کے حالات درج نہ ہو سکے۔ مگر ان کا نام 'تلامذۂ غالب' میں صفحہ ۲۰۸ پر لکھا ہے۔ یہاں ہم ان کے مختصر حالات پیش کرتے ہیں۔

جناب محمد سخاوت حسین انصاری بدایوں کے رہنے والے تھے۔ مدہوش تخلص تھا۔ آپ کے دادا حضرت میاں جی عبدالملک انصاری تیرھویں صدی ہجری کے مشہور بزرگوں میں سے تھے۔ ۱۲۵۸ھ میں انتقال ہوا۔ آپ حضرت شمس الدین ابوالفضل سید شاہ آل احمد صاحب اچھے میاں[1] مارہروی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ بڑے صاحب نسبت بزرگ تھے۔ اکثر طلباء کو درس بھی دیتے تھے۔ شیخ محمد رضی الدین بسمل نے اپنی تالیف تذکرۃ الواصلین میں صفحہ ۲۴۳ پر لکھا ہے:-

" آپ کے تین صاحبزادے تھے۔ ایک امان اللہ حسین عرف خلیفہ تلو اور میاں امداد حسین و شیخ محمد عنایت حسین مرحوم اُن کے پوتے میرے دوست خان بہادر محمد سخاوت حسین صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ بفضلہ تعالیٰ موجود ہیں۔"

مولوی محمد سخاوت حسین انصاری کے ایک لڑکا تھا۔ اس کا انتقال چھوٹی عمر میں ہو گیا تھا۔ ایک بیٹی تھیں جنھیں وہ بہت عزیز رکھتے تھے۔ جناب مدہوش کے نواسے مختلف ممالک میں ممتاز عہدوں پر ملازم ہیں بڑے نواسے الحاج حامد سعید خاں لودی بی۔ اے (علیگ) یو۔ این۔ او کی طرف سے ایران میں ماہرِ خوراک وزراعت کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ دو نواسے پاکستان میں ممتاز عہدوں پر فائز ہیں ان کے ایک نواسے جناب عابد سعید خاں فنا لودی بی۔ اے (علیگ) ہندوستان میں سب رجسٹرار ہیں۔ فانی بدایونی اور دوسرے شعراء سے سلسلۂ تلمذ ہے اہلِ سخن کے قدردان ہیں اور بہت خوب شعر کہتے ہیں۔ احباب کے اصرار پر ایک مختصر مجموعہ کلام " رنگا رنگ " نظامی پریس بدایوں سے طبع ہو چکا ہے۔ مکرمی فنا صاحب فرماتے ہیں کہ اپنی چہیتی بیٹی کو غالب کا ایک شعر یاد کرنے پر ایک اشرفی انعام میں دیا کرتے تھے تقریباً اسّی برس کی عمر میں ۱۹۰۲ء میں انتقال ہوا۔

تعلیم کے سلسلے میں اساتذہ کا حال کچھ زیادہ معلوم نہیں ہوا۔ تذکرۃ الواصلین کی تقریظ لکھتے ہوئے جناب مدہوش فرماتے ہیں۔

" اس کتاب کے مؤلف میرے شفیق مولوی محمد رضی الدین المتخلص بہ بسمل بدایوں میں پیدا ہوئے وہیں تعلیم و تربیت[1] پائی

[1] حضرت اچھے میاں ۲۸ رمضان ۱۱۶۰ھ کو مارہرہ میں پیدا ہوئے۔ آپ سلسلہ عالیہ قادریہ کے بہت بڑے بزرگ تھے۔ آپ کے خلفاء میں بڑے بڑے مشاہیر شامل تھے۔ حضرت شاہ عین الحق بدایونی اور شاہ سلامت اللہ کشفی شاگرد رشید آپ کے نامور خلیفہ گذرے ہیں۔ ۱۲۳۵ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔

[1] جناب بسمل نے ابتدائی تعلیم اپنے دادا مولوی اساس الدین (اُن کو غالب نے ایک خط میں سلام لکھا ہے) اور چچا عزیز الدین عزیز و صادق کے پاس دہلی میں پائی۔ جناب عزیز غالب کے مقدمہ میں وکیل تھے اور غالب کے شاگرد تھے۔

"چوں کہ قدرتی طور پر ذہانت و قابلیت تھی اپنے ہم چشموں میں ہمیشہ باوقار رہے ان کا طرزِ عمل شریفانہ اور عادات مقبولِ عام ہیں زہد و اتقا اُن کا حصہ ہے مگر یہ سب کچھ میرے معظم و مکرم اُستاد اُن کے والد ماجد حکیم مولوی محمد سعید الدین[1] صاحب مرحوم و مغفور کا فیض و برکت ہے۔"

مدہوش بدایونی کی عمر کا بڑا حصہ شاہجہان پور میں گذرا وہیں وکیل عدالت دیوانی تھے۔ شاہجہانپور کی پبلک زندگی میں بڑا نام پایا۔ وہاں آنریری مجسٹریٹ اور میونسپلٹی کے وائس چیئرمین بھی رہے۔ اپنے زمانے کی قومی تحریکات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ سرسید کو جب جدید تعلیم پھیلانے کا خیال پیدا ہوا اور انھوں نے قوم کے اکابر سے مشورے طلب کئے تو مشاہیر نے اس موضوع پر رسائل لکھے۔ سرسید نے ان رسالوں کے خلاصے ۱۲ مئی ۱۸۷۲ء میں میڈیکل ہال پریس بنارس سے مجلس خازن البضاعۃ لتاسیس مدرسۃ العلوم المسلمین کی طرف سے چھاپے اس طرح علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا بیج بنارس میں پڑا اور علی گڑھ میں بار آور ہوا یوں کعبہ سے بتوں کو دور کی نسبت ہوئی۔ اس کتاب میں سرسید لکھتے ہیں کہ وہ (محمد سخاوت حسین مدہوش) نہایت تعلیم اس طرح پر چاہتے ہیں۔

"اولاً لکھنا پڑھنا سیکھنا پھر علم حفظ صحت بدنی اور نفع نقصان اشیاء خوردنی و نوشیدنی اور تہذیب اخلاق دینی اور خدمت ماں باپ بھائی بند محبت عزیز و بیگانہ اور صحبت ساتھ دوست و آشنا برتاؤ ساتھ حاکمان حقیقی و مجازی کے احکام و اوامر بادشاہ حقیقی و مجازی کے اور تحریر و تقریر ما فی الضمیر کے دوسرے کے اور آپ کو بخوبی آجاوے۔"

تعلیم کا یہ نظریہ زندگی کے اہم شعبوں پر بڑی حد تک حاوی ہے اور اپنے زمانہ کے رجحانات کا عکس بھی ہے۔ اس کے علاوہ وہ دیگر ملکی تحریکات میں بھی حصہ لیتے رہے۔ انڈین نیشنل کانگریس کے پہلے اجلاس میں شرکت کی۔ اس اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے بار بار "ہم" فرماتے تھے۔ اس پر ایک صاحب نے فرمایا لفظ "ہم" سے آپ کی مراد 'ہ' سے ہندو اور 'م' سے مسلمان ہے۔ اس نکتہ کو بہت سراہا گیا۔

تصانیف اور تالیفات میں رسالہ تعلیم مسلمانان اور رقعات مدہوش کا پتہ چلا ہے۔ تذکرہ الواصلین کی تقریظ سے معلوم ہوتا ہے کہ شگفتہ نثر لکھتے تھے اور اشعار کا استعمال برمحل کرتے تھے۔ کلام دستیاب نہیں ہوا۔ مکرمی جناب مولوی محمد سلیمان صاحب بدایونی فرماتے ہیں کہ بہت وجیہہ اور خوبصورت تھے طبیعت میں ظرافت بہت تھی۔

غالب کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کو بہت عزیز رکھتے تھے اور خط کا جواب برابر دیتے تھے۔ اسلامیہ کالج میگزین بدایوں، جدید شعرائے بدایوں نمبر مرتبہ فرخ جلالی و قمر قرشودی، "تلامذۂ غالب" از مالک رام "رنگا رنگ" از فنا لودی بدایونی میں غالب سے تلمذ کا ذکر موجود ہے۔ اس کے علاوہ مولوی بہشتی پرشاد کے کاغذات میں بھی بحیثیت تلمیذ غالب ذکر موجود ہے۔ رسالہ ہردل عزیز منشولہ سراج سخن شاہجہان پور کے فروری ۱۸۹۴ء کے پرچہ میں لکھا گیا ہے۔

"چوں کہ افتخار نامہ عالی حضرت غالب دہلوی مرحوم و مغفور کا اندراج کتب عود ہندی اور اردوئے معلیٰ میں رہ گیا تھا لہذا بطور یادگار درج ہے۔"

غالب کا خط جناب محمد سخاوت حسین مدہوش کے نام

"مشفقی مکرمی منشی سخاوت حسین صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ

سبحان اللہ آپ کے خط کا جواب نہ لکھوں اپنے کو تقصیر کروں اگر شتاب نہ لکھوں اس وقت ڈاک کے ہرکارے نے تمہارا خط دیا۔ اِدھر پڑھا اُدھر جواب لکھنے کا قصد کیا۔ میں ایک شخص گوشہ نشیں فلک زدہ اندوہگیں نہ اہل دُنیا نہ اہل دین مجھ سے نکمے آدمی کا جو کوئی مشتاق ہو اس کے خط کا لکھنا کیوں مجھ پر شاق ہو۔ ظاہرا تم خود مجمع حسن اخلاق ہو ورنہ کیوں تم کو میرا اس قدر اشتیاق ہو یاں ایک بری بھلی شاعری اُس کا حال یہ ہے کہ آگے جو کچھ کہا سو کہا اب شاعر بھی رہا بہر حال تمہاری فقیر نوازی کا شکر گزار اور طالب دیدار ہوں۔

نجات کا طالب

غالب

چاشتگاہ دوشنبہ ۴ فروری

[غالب کا یہ غیر معروف خط عزیز گرامی دیریندر پرشاد سکسینہ کی عنایت سے دستیاب ہوا اور اُن کے شکریہ سے شائع کیا جاتا ہے]

---

[1] حکیم محمد سعید الدین کامل زین العابدین خاں عارف کے شاگرد تھے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں حصہ لیا۔ ۱۳۱۶ھ میں انتقال کیا۔



Edited and Published by the Director, Publications Division, Old Secretariat, Delhi-8
and Printed by the Model Press Private Ltd., Delhi.

آجکل



پھالگن شک سمت ۱۸۸۱

مارچ سنہ ۱۹۶۰ء

۵۰ نئے پیسے

ترتیب

سرورق:- فصلِ گل

رسالے کی پشت پر:- نوجوانوں کے میلے میں
کیرالہ یونیورسٹی کی طالبات کا رقص

پھاگن شک سمت ۱۸۸۱
مارچ ۱۹۶۰ء
جلد ۱۸، نمبر ۸

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر آج کل (اردو) اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

اردو کا مقبول عوام مصور ماہنامہ

آج کل

دہلی

سالانہ چندہ:- ہندوستان میں۔ چھ روپے
پاکستان میں- چھ روپے (پاک)
غیر ممالک سے:- نو شلنگ یا سوا ڈالر
فی پرچہ:- ہندوستان میں-۵۰ نئے پیسے
پاکستان میں- آٹھ آنے (پاک)

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومت ہند

ملاحظات

۲۶ جنوری کو ہندوستانی جمہوریہ کی دسویں سال گرہ ملک بھر میں بڑے
ش وخروش کے ساتھ منائی گئی۔ سب سے بڑی تقریب راجدھانی میں
ئی جہاں صدر جمہوریہ نے بری، بحری اور فضائی فوج کے دستوں کی مشترکہ
یڈ کی سلامی لی۔ صدر ڈاکٹر راجندر پرساد نے اس موقع پر قوم کے نام
نے پیغام میں ملک کے باشندوں کو چوکس اور متحد رہنے کی ہدایت کی،
لکہ اس بات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ کسی قوم کے لئے اپنی آزادی
تحفظ کی خاطر مستقل طور پر ہوشیار رہنا ضروری ہے۔ سرحد کے حالیہ
اقعات اور ہندوستان کی پُرامن بقائے باہمی کی پالیسی کا ذکر کرتے ہوئے
ں نے بتایا کہ اشتعال انگیزی اور لوگوں میں ناراضگی کے بڑھتے ہوئے
بے کے باوجود ہم نے جھگڑے کو پُرامن اور دوستانہ طریقے سے حل کرنے
لئے گفت وشنید پر اپنا اعتماد قائم رکھا ہے۔

پچھلے دنوں روس کے صدر مارشل ورو شلوف ہندوستان کے دورے پر
یف لائے۔ ملک میں جہاں جہاں وہ گئے ان کا پُرتپاک استقبال کیا
س سے وہ بہت متاثر ہوئے۔ دہلی کے شہریوں کی طرف سے دی گئی
قبالیہ دعوت میں صدر ورو شلوف نے کہا کہ اگر دوسرے ملک عام
مل تخفیفِ اسلحہ کی تجویز پر رضامند ہو جائیں تو روس اپنے تمام اسلحہ
ں راکٹ اور ایٹمی ہتھیار وغیرہ سب شامل ہیں پھینک دینے کو تیار
ان کا یہ اعلان عالم انسانیت کے لئے امن کا پیغام ہے اور بقول
اعظم پنڈت نہرو ہندوستان جس نے اپنی جنگِ آزادی پُرامن ذرائع
ی، وہ اس امن کے پیغام اور تخفیفِ اسلحہ کی تجویز کا خیر مقدم کرتا ہے۔

ہمارے پڑوسی دیش نیپال کے وزیر اعظم مسٹر بی، پی کوئرالا ابھی انہیں دنوں ہندوستان تشریف لائے۔ ہندوستانی عوام کی طرف سے جس جوش وخروش کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا گیا وہ ہند و نیپال کی مستحکم دوستی اور مخلصانہ تعاون کا مظہر تھا۔ وزیر اعظم نیپال اور ہندوستانی وزیر اعظم کے مشترکہ اعلانیہ میں بھی اس بات کا اعادہ کیا گیا کہ ایک دوسرے کی آزادی، تحفظ وسلامتی اور ترقی سے دونوں ملکوں کا مفاد وابستہ ہے۔ اور اسی لئے دونوں ملکوں کو چاہیئے کہ وہ مشترکہ مفادات سے متعلق امور پر ایک دوسرے سے قریبی صلاح ومشورہ کرتے رہیں۔

امسال یومِ جمہوریہ کے موقعہ پر صدر جمہوریہ نے جن حضرات کو 'پدم بھوشن' کا اعزاز عطا کیا ہے، ان میں ہندی کے ممتاز شاعر پنڈت بال کرشن شرما نوین اور بنگالی کے شہرہ آفاق شاعر قاضی نذرالاسلام شامل ہیں۔ 'ادارہ آج کل' ان دونوں حضرات کو ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہے۔

حال ہی میں ہندوستان اور آسٹریلیا کی کرکٹ ٹیموں کے مابین جو پانچ ٹیسٹ میچ ہوئے۔ ان میں سے آسٹریلیا کی ٹیم نے دو میچ جیتے اور ہندوستانی ٹیم نے ایک میچ جیتا اور دو میچ برابر رہے۔ اس نتیجے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں کرکٹ کے کھیل نے کافی ترقی کی ہے۔ بعض نئے کھلاڑی بھی منظر عام پر آئے ہیں جن میں جے سمہا، نڈکارنی، بیگ، کندرم اور کینی شامل ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں کرکٹ کے کھیل کا مستقبل شاندار ہے۔

جوش ملسیانی

اِصلاحِ شعر

اصلاحاتِ شعری کے موضوع پر تین چار کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں مگر مبتدی اور مشق شعراء ان میں یہ کمی محسوس کرتے ہیں کہ وجہ اصلاح (توجیہہ) یا تو بتائی ہی نہیں کی گئی اور کہیں بتائی گئی ہے تو مختصر اشارات ہی سے کام لیا گیا ہے۔ اس اختصار کی ایک وجہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ کوئی استاد اصلاح کے وقت زیادہ زحمتِ تحریر گوارا نہیں کرسکتا اشارات ہی سے کام لینا کافی خیال کرتا ہے یا وجہ اصلاح کو سمجھنا شاگرد ہی کے ذوقِ سلیم اور اس کی ذہانت پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ ایسی کتابوں کے مؤلف کتاب کی ضخامت بڑھ جانے کے خیال سے محتاط ہو جانے اور اشارات ہی سے کام لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔

دونوں وجوہ اپنی اپنی جگہ پر قابلِ رخصت تو ہیں مگر اس کے باوجود توجیہہ بالتفصیل نہ سہی مجمل طور پر اتنی تو ہو جسے کسی نہ کسی حد تک توضیح کہا جاسکے۔

اصلاح کنندہ کو شعر کے حسنِ ظاہر اور حسنِ باطن دونوں کو گہری نظر سے دیکھنا پڑتا ہے۔ بعض وقت تو حسنِ ظاہر ہی کو درست کر دینے سے کام چل جاتا ہے۔ لیکن حسنِ باطن یعنی معنویت میں بھی خلل ہو تو یہ صورت اصلاح کنندہ کے لئے دہری مصیبت ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں یہ مقولہ درست ماننا پڑتا ہے کہ شعر کہنے سے شعر کی اصلاح زیادہ مشکل کام ہے۔

معنوی خلل عموماً دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ شاعر نے مضمون تو تلاش کیا مگر اس میں کوئی لطافت یا شعریت پیدا نہیں کرسکا۔ اس قسم کا شعر نظری قرار دئے جانے کے قابل ہوتا ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جس میں ضعفِ بیان کی وجہ سے مضمون اُلجھ کر رہ گیا ہو اور وضاحت و سلاست دونوں اس کوتاہی کی شکوہ سنج ہوں۔ اس قسم کے سقم کا نتیجہ یا تو ابہام ہوتا ہے یا اہمال۔ یہ خرابی مصرعوں میں بہت سا ردّ و بدل کرنے کی متقاضی ہوتی ہے اور بسا اوقات اصلاح کنندہ ایسے شعر کو بھی نظری قرار دے دیتا ہے۔ اس قسم کے فیصلہ میں بھی اسے حق بجانب ہی کہا جا سکتا ہے۔ وجہ یہ کہ اس کا کام شعر کی اصلاح کرنا ہے معمّہ حل کرنا نہیں ہے۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اچھے شعر میں دونوں وصف ہوتے ہیں۔ حسنِ ظاہر بھی اور معنویت بھی۔ معنویت کے لئے یہ شرط بھی ضروری ہے کہ اس میں لطافت بھی ہو اور شعریت بھی۔ اگر یہ وصف شعر میں نہیں ہے تو اکیلا حسنِ ظاہر کسی مصرف کا نہیں۔ اور اگر معنویت تو ہے مگر حسنِ ظاہر کی پروا نہیں کی گئی تو یہ صورت کبھی جاذبِ دل نہیں ہوسکتی۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ زبان اور تخیل کو دوش بدوش رکھنا چاہیئے تو اس قول کی تشریح بھی یہی ہے کہ حسنِ ظاہر اور لطیف قسم کی معنویت کو ایک دوسرے سے الگ نہ ہونے دیا جائے ؎

تمہیں چاہو تمہیں چاہو تمہیں چاہو رقیبوں کو
کبھی ہم نے نہ چاہا تھا نہ چاہیں گے نہ چاہا ہے

اس شعر میں صرف زبان ہی زبان ہے۔ معنویت کی کوئی لطافت یا شعریت اس میں نہیں ہے۔ اس قسم کے اشعار قافیہ پیمائی ہی کہے جاسکتے ہیں ؎

حضرتِ دل آپ ہیں جس دھیان میں
مر گئے لاکھوں اسی ارمان میں

حضرت داغ کے اس مطلع میں زبان کی صفائی بھی ہے بیان کی سادگی اور سلاست بھی ہے۔ حسنِ ظاہر کے تمام اوصاف موجود ہیں مگر ان خوبیوں سے بھی کچھ بڑھ کر وہ معنویت وہ شعریت اور مفہوم کی وہ وسعت ہے کہ شعر بجائے خود ایک دیوان ہے۔ کوئی بات نہیں بتائی گئی مگر پھر بھی سب کچھ بتا دیا ہے۔ ایسے ہی شعر کو مکمل شعر کہا جا سکتا ہے۔ زبان کی حلاوت اور بیان کی سلاست نے حسنِ معنی کو پَرِ پرواز لگا دئے ہیں۔ کنائے اور صراحت میں فرق کرنا مشکل نظر آتا ہے۔

معنویت میں تو یہ نکتہ قابلِ غور ہوتا ہے کہ کہنے والے نے کیا کہا۔ حسنِ ظاہر سے یہ مراد ہے کہ کیسا کہا۔ افسوس کا مقام ہے کہ عصرِ حاضر میں زیادہ تر کیا کہا ہی کی پروا کی جاتی ہے اور کیسا کہا کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا۔ دیکھا دیکھی دورِ جدید کے نقّاد بھی تنقید نگاری میں کیا کہا ہی کی جانچ پرکھ میں زورِ قلم دکھاتے ہیں اور کیسا کہا کی وہ بھی پروا نہیں کرتے۔ حال آں کہ کیسا کہا کا تعلق نظم ہی سے نہیں نثر سے بھی ہے۔

حسنِ ظاہر کی پروا نہ کرنے کے تین بڑے بڑے سبب ہیں۔ ایک تو یہ کہ نوجوان اور نومشق شعراء کی بیشتر تعداد استاد کی ضرورت سے بے نیاز رہتی ہے اور وہ پیرِ شو بیاموز کا مفہوم نہ سمجھ کر ہمہ دانی کے زعم میں ٹامک ٹوئیے مارتے پھرتے ہیں۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ فصیح اور ٹکسالی زبان کا ریاض کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ فصحا کی زبان اور بازاری زبان میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھتے۔ بھاری بھرکم اور رکیک الفاظ بھی ان کی نظر میں ویسے ہی فصیح ہیں جیسے سلیس، سبک اور مہذب زبان کے الفاظ۔ ایسی ترکیبیں تراشی جاتی ہیں جن میں کوئی معنوی ربط نہیں ہوتا اور جن کی شانِ نزول سوائے ایجادِ بندہ کے اور کچھ نہیں ہوتی۔ مثلاً سہم گوں خاموشیاں، سہمے ہوئے سائے، پیتی ہوئی راہیں، سوز و وحشت، شعلۂ شبنم، خوں زار، درد زار، حسرت زار، ترنم ریز، کیف ریز، بادہ خانہ، جنوں کدہ وغیرہ۔

تیسرا بڑا سبب یہ ہے کہ نوجوانوں کی طبیعت فنی پابندیوں سے بے زار اور برگشتہ خاطر ہے۔ حال آں کہ ان فنی پابندیوں میں کوئی بھی ایسی نہیں جسے چشم انداز کیا جا سکے۔ شعر میں ایک لفظ بھی سوقیانہ قسم کا آ جائے تو شعر مضحکہ خیز ہو جاتا ہے۔ قافیہ اور ردیف دست و گریباں نہ ہوں تو اچھے سے اچھا مضمون بے لطف ہو جاتا ہے۔ بھاری بھرکم الفاظ مثلاً تجسّس، تفحّص، تفکّر، تکلّف وغیرہ کو بھی غزل کی نزاکت برداشت نہیں کر سکتی ع

اک منجّم نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

اس کی جگہ اک نجومی کہا جائے تو مصرع ثقالت سے پاک رہتا ہے۔ اس قسم کے بیسیوں فنی نکتے ہیں جنھیں اصلاح کنندہ نظر میں رکھتا ہے اور جب تک ایسا ایک بھی سقم شعر میں باقی رہتا ہے شعر کی اصلاح مکمل اصلاح نہیں کہی جا سکتی۔ یہی فنی نکات ہیں جنھیں اس مضمون میں بیان کرنا مقصود ہے تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ اصلاح کنندہ کو اس ادبی خدمت گزاری میں کن کن مشکلات سے واسطہ پڑتا ہے اور وہ کس طرح ان مشکلات کو حل کرتا یا حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

حسنِ بیان کا پہلا وصف صحتِ زبان ہے۔ اس سے مراد فصحا اور صرف فصحا کی زبان ہے جیسا کہ حضرت امیر مینائی فرماتے ہیں ؎

ہم سند کے لئے لُغت میں امیر
فصحا کی زبان لیتے ہیں

اس زرّیں قول کی تعمیل میں یہ احتیاط بھی ضروری ہے کہ متروکاتِ زبان کا پورا خیال رکھا جائے۔ متروکات کا سلسلہ ہر دور میں جاری رہتا ہے۔ نئے نئے الفاظ زبان میں داخل ہوتے رہتے اور کئی پرانے الفاظ بول چال سے خارج ہوتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ متروک الفاظ کے لئے اساتذۂ ماضی کے کلام کی سند نا قابلِ تسلیم ہوتی ہے۔ آج کوئی یاں، واں لکھ جائے یا اگر کی جگہ گر نظم کر دے اور اس کی تائید میں مشاہیرِ ماضی کا کلام بطور سند پیش کرے تو یہ کوشش بے کار ہے۔ ہندی، انگریزی یا کسی اور زبان کے لفظ جو اردو میں داخل ہو رہے ہیں۔ ان کے متعلق بھی یہ احتیاط لازم ہے کہ وہی الفاظ تسلیم کئے جائیں جن کا بدل اردو میں نہیں ہے۔ مثلاً ڈاکٹر، ٹکٹ، ڈرائیور، ماسٹر، ڈپٹی کمشنر، ہیڈ کلرک، پوسٹ کارڈ، منی آرڈر، پیکٹ وغیرہ۔

متروکات کے علاوہ جن کی فہرست راقم کے دوسرے مجموعۂ کلام (جنون و ہوش) میں موجود ہے اور جس کو ابھی مکمل نہیں کہا جا سکتا اور بھی متعدد نکات ایسے ہیں جو مبتدی شعراء کے کلام میں بیشتر قابلِ اصلاح نظر آتے ہیں۔ مثلاً کبھی کے بعد بھی، ہرگز کے ساتھ کبھی، نہ حرفِ نفی کے بعد ہی۔ ہی کے استعمال میں ایک اور خرابی بھی دیکھی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ

حرفِ جار کے بعد ہی لکھ دیتے ہیں ۔ مثلاً نوکری سے ہی جواب ملا ۔ یہ "ہی" حرفِ جار سے پہلے آنا چاہیئے ۔ یعنی نوکری ہی سے جواب ملا ۔ "نہ" حرفِ نفی کے استعمال میں بھی بعض دفعہ یہ غلطی پائی جاتی ہے کہ اس کی تکرار کے محل پر توجہ نہیں کی جاتی ۔ مثلاً

نہ میرا حال پوچھا تم نے اب تک

ظاہر ہے کہ یہ حرفِ نفی جو شروع میں آیا ہے تکرار کا متقاضی ہے ۔ مثلاً نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے ۔ اس قسم کے سقم سے بچنے کے لئے نہ کے ساتھ پوچھا کا لفظ لایا جاتا، یعنی ۔ نہ پوچھا تم نے اب تک حال میرا تو تکرار کی ضرورت محسوس نہ ہوتی ۔ اسی طرح اُن سے کہو کی جگہ اُنھیں کہو ۔ مجھ سے کہا تھا کی جگہ مجھے کہا تھا لکھ دیا جاتا ہے ۔ یہ لہجہ پرانی زبان کا ہے اب تو ان پڑھ اہلِ زبان بھی "اُن سے کہو" بولتے ہیں ۔ انھیں کہو نہیں بولتے ۔ بعض ہرگز کی جگہ ہرگز ہرگز لکھ دیتے ہیں ۔ بعض زمانے بھر کی جگہ جہاں بھر (وہ بھی نونِ غنہ سے) لکھ جاتے ہیں ۔ کیا جانے یا نہ جانے کی جگہ صرف جانے لکھ دیتے ہیں ۔ مثلاً جانے کیا ہوا ع

جانے کیا راز ہے وہ اب بھی خفا ہیں مجھ سے

متروکات کی جس فہرست کا ابھی ابھی مذکور ہوا میرے خیال کے مطابق اس میں ابھی کچھ اور اضافے کی گنجائش ہے مثلاً برہمن درے ساکن، فارسی میں رائے مفتوح اور رائے ساکن سے دونوں طرح مستعمل ہے، مگر اردو میں یہ لفظ رائے ساکن ہی سے بولا جاتا ہے اس لئے رائے متحرک سے یہ لفظ بلاشبہ قابلِ ترک ہے ۔ اسی طرح شیدا کی جگہ شیدائی ۔ یعنی جب دونوں کے ایک ہی معنی ہیں تو پھر آخری اضافہ زوائد ہی میں شمار ہونا چاہیئے ۔

صحتِ زبان میں ضعفِ تالیف کا سقم بھی قابلِ لحاظ ہے ۔ مثلاً قریب اگر چراغ الدین یا ع

چشم بادل بھی اشکبار ہے آج

فارسیت بھی صحتِ زبان کے منافی ہوتی ہے مثلاً بس کہ، اسے کہ، از بس کہ، وگرنہ، بعد از مرگ، پس از مردن ع

ذکر میرا بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں

فارسی مصدر کا اردو میں استعمال بھی فارسیت ہی ہے ۔ پہنچنے کا ہنگام آگیا یہ فارسی لفظ بول چال میں شامل نہیں ہے اس لئے نہ کسی صورت ہی میں اس کا استعمال درست ہو سکتا ہے مثلاً ہنگامِ شب، ہنگامِ صبح ۔

توالی عطف اور توالی اضافت سے بھی فارسیت کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے ۔ اساتذہ نے ان کی تعداد چار تک روا رکھی ہے ۔ مگر راقم کے خیال میں یہ تعداد بھی زیادہ ہے بہ مسلسل دو اضافتیں کافی ہیں ۔

صحتِ الفاظ کی بحث بھی صحتِ زبان ہی سے متعلق ہے ۔ تلفظ کی غلطی تو چھوڑیئے یہ صورت تو سخت مضحکہ خیز ہے ۔ شاعر کو زبان کے ایک ایک لفظ پر جھونپڑا بنانا پڑتا ہے ۔ یہاں صرف وہ الفاظ قابلِ ذکر ہیں جن کے تلفظ ایک سے زیادہ ہیں ۔ مثلاً خضر ضاد ساکن سے بھی درست ہے اور ضاد متحرک سے بھی ۔ کافر کے تلفظ بھی مختلف ہیں ۔ سخن بھی اسی قبیل سے ہے ۔ ایسے الفاظ کا کوئی ایک تلفظ جو زیادہ مقبول ہو منتخب کر لینا مناسب ہے ۔ مثلاً خضر کو عام بول چال میں ضاد ساکن ہی سے بولتے ہیں ۔ کافر کو فائے مفتوح سے، سخن کو حائے مہملہ کے زبر سے عموماً بولتے ہیں اس لئے یہی مقبول تلفظ انتخاب کے لئے قابلِ ترجیح ہیں ۔ یہ روش مضحکہ خیز اور خلافِ اصول ہے کہ جہاں ضاد ساکن آسکے وہاں خضر کو ضاد ساکن سے لکھ دیا اور جہاں ضاد متحرک کی گنجائش نظر آئی وہاں اسے سحر، اثر کے قوافی میں لے آئے ۔

تذکیر و تانیث کے سلسلے میں بھی شاعر کی روش کسی اصول پر مبنی ہونی چاہیئے ۔ متعدد الفاظ ایسے ہیں جو تذکیر و تانیث کے لحاظ سے مختلف فیہ مانے جاتے ہیں مثلاً طرز، غور، فکر، آغوش، بلبل وغیرہ ۔ ان کے لئے بھی بول چال کی عمومی صورت ہی قابلِ لحاظ ہے ۔ طرز کو کہیں مذکر لکھ جانا اور کہیں مؤنث یہ کسی اصول پر مبنی نہیں ۔ شاعر کو چاہیئے کہ اگر وہ اس لفظ کو مؤنث مانتا ہے تو اسے ہمیشہ مؤنث ہی لکھے ۔ طرز کو زیادہ تر مؤنث اور غور کو زیادہ تر مذکر بولتے ہیں مثلاً کافی غور کیا گیا ۔ بہت سے غور کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں ۔ اسی طرح بلبل کو بھی عموماً مؤنث بولتے ہیں ۔ پس کوئی ایک قبول صورت انتخاب میں آسکتی ہے اور وہی انتخاب مستقل طور پر اپنا دستور العمل بنایا جا سکتا ہے ۔ راقم تو اپنے کلام میں بھی اور شاگردوں کے کلام میں بھی طرز، فکر، آغوش کی تانیث ہی کو ہمیشہ ترجیح دیتا ہے ۔ ایسے الفاظ میں بے اصولی کبھی گوارا نہیں کی ۔

صحتِ زبان کے بعد شعر کی دوسری خوبی حسنِ بندش ہے ۔ مضمون میں

لطافت بھی ہو، شعریت بھی ہو، زبان بھی فصیح اور ٹکسالی ہو۔ پھر بھی حسن بندش کے بغیر شعر بے لطف رہتا ہے۔ ع

چست جب بندش نہ ہو لطف بیاں آتا نہیں

شعر کی زبان بول چال سے پوری مطابقت رکھتی ہو یا بول چال کے قریب قریب ہو اور شعر حشو و زوائد سے اس حد تک پاک ہو کہ کوئی لفظ نثر بناتے وقت کم نہ کیا جا سکے اور ان کی ترتیب و تناسب بھی ترنم یا موسیقیت کے معیار پر ہو۔ ایسی ٹھوس اور مضبوط بندش ہی کو حسن بندش کہا جا سکتا ہے۔ سہل ممتنع سے بھی یہی مراد ہے کہ شعر کی نثر نہ بن سکے۔ مثلاً ؎

رخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

یہ شعر مکمل قسم کے سہل ممتنع کی مثال ہے۔ اساتذہ کے کلام میں ایسی مثالیں قدم قدم پر ملتی ہیں۔ جن زمینوں میں فعل بطور ردیف نہیں آتا ان میں عموماً تقدیم و تاخیر کا امکان ہوا کرتا ہے۔ مگر پھر بھی یہ کوشش شرط ہے کہ زبان عام بول چال کے قریب قریب ہی رہے۔ فعل کا درمیان آنا اس خاص وصف کے منافی نہ ہو۔ بے ضرورت تقدیم و تاخیر سے ہمیشہ اجتناب لازم ہے۔ تقدیم و تاخیر کی قبیح مثالیں سنئے ؎

صبح گزری شام ہونے آئی میر
تو نہ یاں جیتا بہت دن کم رہا

دوسرے مصرع کا مفہوم یہ ہے کہ تو بہت کم مدت تو جیتا نہیں رہا۔ کافی عمر بسر کر چکا ہے۔ مگر بہت دن کم رہا یہ الفاظ تقدیم و تاخیر کے لحاظ سے بہت ہی الجھن پیدا کر رہے ہیں ؎

ذبح وہ کرتا تو ہے پر چاہیئے اے مرغِ دل
دم پھڑک جائے تڑپنا دیکھ کر صیاد کا

مغالطہ یہ ہوتا ہے کہ صیاد تڑپ رہا ہے۔ اس مغالطہ کی وجہ یہ ہے کہ لفظ صیاد مضاف الیہ ہے اور دم مضاف ہے جو صیاد سے بہت دور واقع ہوا ہے۔ دم صیاد کا۔ اس طرح کہا جاتا تو یہ مغالطہ پیدا نہ ہوتا اور صیاد کے تڑپنے پر توجہ مبذول نہ ہو سکتی۔ ذیل کا مصرع بھی تقدیم و تاخیر کی قبیح مثالوں میں سے ہے ع

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ

ڈالی یہاں بہ معنی شاخ ہے۔ مگر مغالطہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ڈالنا مصدر کا فعل مجہول ہے۔ اس مغالطہ کی وجہ یہ ہے کہ ٹوٹ گئی کو گئی ٹوٹ کہا اور پھر ان دونوں ٹکڑوں کے درمیان چھ لفظ حائل کر دئے۔ ایسی ہی خرابیوں کی بنا پر فصحائے حال اجزائے فعل کی تقدیم و تاخیر بارِ سماعت خیال کرتے ہیں اور ٹوٹ گئی کی جگہ گئی ٹوٹ، آتا ہے کی جگہ ہے آتا، فرمانے لگے تھے کی جگہ لگے تھے فرمانے نہیں کہتے۔ مطلب یہ کہ ہر فعل کے اجزا کو ہمیشہ بول چال کے مطابق رکھنا پسند کرتے ہیں اور ع

وہ خرگوش کچھووں سے ہیں زک اُٹھاتے

زک اُٹھاتے ہیں کی جگہ 'ہیں زک اُٹھاتے' نہیں کہتے۔ بعض وقت اجزائے فعل کی تقدیم و تاخیر یا بے ترتیبی تو نہیں ہوتی۔ مگر دو اجزا دُور دُور واقع ہونے سے بھی مصرع مخلِ نظر ہو جاتا ہے۔ مثلاً

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد

یہاں مت اور آجائیو کے درمیان دو لفظ حائل ہو گئے ہیں۔ نیز مت اور فریب کے اتصال نے ایک اور بے لطفی پیدا کر دی ہے۔

یہاں یہ نکتہ بیان کر دینا بہت دلچسپ ہوگا کہ تقدیم و تاخیر بعض جگہ حسنِ کلام بھی ہوتی ہے۔ بعض دفعہ روزمرہ میں بھی یہ ضروری ہو جاتی ہے۔ مثلاً آؤ گے کب، لاؤ گے کیا، دیکھ لیا مزا ان شرارتوں کا۔ ع

ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا

گویا مقصودِ بیان یہ ہے کہ ذوقِ صحیح بعض دفعہ شعر میں بھی تقدیم و تاخیر پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس کی تشریح کے لئے مرزا غالب کے ایک فارسی خط کا حوالہ دے دینا کافی ہوگا۔

مرزا سے ان کے ایک شاگرد نے اپنی غزل جو اصلاح کے لئے بھیجی تھی واپس طلب کی۔ مرزا جواب میں لکھتے ہیں کہ غزل دیکھ لی تھی مگر تلاش پر بھی نہیں ملی۔ اتنا یاد ہے کہ اس کے ایک شعر میں زحاف بے مزہ واقع ہوا تھا اس میں ترمیم کر دی گئی تھی۔ وہ شعر یہ ہے ؎

نہ خریدار کا حصہ ہوں نہ حق بائع کا
میں وہ دانہ ہوں کہ گر جائے کفِ میزاں سے

شاگرد نے 'بائع کا حق' لکھا تھا اور مرزا نے 'حق بائع کا' تحریر فرمایا۔ اس ترمیم کی تائید تشریح سے نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک وجدانی کیفیت ہے

جسے ذوقِ صحیح ہی سمجھ سکتا اور وہی اس حسنِ سخن کی داد دے سکتا ہے۔

ناروا قسم کی تقدیم و تاخیر کا ایک نتیجہ تو یہ ہوتا ہے کہ ہمارا بیان بول چال کے مطابق نہیں رہتا، اور دوسری خرابی یہ ہے کہ تعقید لفظی کا سقم پیدا ہو جاتا ہے اور یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ شاعر کا مقصودِ نظر کیا ہے۔ تیسرے یہ کہ بعض وقت شعر میں ذم کا پہلو پیدا ہو جاتا ہے۔

تعقید صرف لفظی ہی نہیں ہوتی معنوی بھی ہوتی ہے۔ جب شاعر نپے تلے اور برمحل الفاظ میں مفہوم واضح کرنے سے قاصر رہ جاتا ہے اور شعر ایک معمہ یا لفظوں کا گورکھ دھندا بن جاتا ہے یا کنایہ قریب کو چھوڑ کر کنایاتِ بعیدہ سے کام لیتا ہے یا عجیب و غریب اور غیر متعارف الفاظ استعمال کرنے سے بیان میں غرابت پیدا کر دیتا ہے یا محذوفات میں ان کی ناطق صورت پیدا نہیں کرتا یا پیچ دار ترکیبوں سے مفہوم کو الجھا دیتا ہے تو ان تمام فروگزاشتوں سے تعقید معنوی پیدا ہو جاتی ہے اور مقصودِ بیان تک پہنچنا دشوار ہو جاتا ہے۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ دونوں قسم کی تعقیدیں مل کر سامع کے فہم پر مصیبت نازل کر دیتی ہیں اس لئے شعر میں دونوں قسم کی تعقیدیں خواہ وہ لفظی ہوں یا معنوی، خواہ وہ انفرادی شکل میں ہوں خواہ مخلوط صورت میں شعر کو سقیم الحال بنا دیتی ہیں۔

غزل کی زبان میں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بازاری پھبتیاں، بازاری محاورے اور بہت سے بازاری الفاظ تو نظم کی ہر ایک صنف میں مضحکہ خیز ہوتے ہیں خواہ وہ نظم طنز و تعریض کی حامل ہو یا مزاحیہ۔ بہت سے الفاظ او بھی ہیں جو اپنی جگہ فصیح سمجھے جاتے ہیں مگر غزل کی زبان میں شامل نہیں کئے جا سکتے۔ مثلاً لفظ نادانی تو آپ غزل میں استعمال کر سکتے ہیں مگر اس کی جگہ حماقت کہیں تو شعر قابلِ تضحیک ہو جاتا ہے۔

متروکاتِ زبان کے علاوہ متروکاتِ شعری بھی ہوتے ہیں مثلاً عیوبِ قافیہ، عیوبِ ردیف، تقابلِ ردیفین، شکستِ ناروا۔ تقطیع میں قواعد و ضوابط کے خلاف چلنا، کسی زحاف کا ایسی بحر میں استعمال کرنا جو اس کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ تنافر یعنی ہم مخرج یا قریب المخارج کو بالاتصال لکھنا، مثلاً

زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت

اسی طرح اب بھی، جب بھی، خاک کی، اس سے، اب پھر وغیرہ۔

قافیہ معمولہ کا اعادہ جس کا وجود چھ سات شعر میں صرف ایک دفعہ روا ہے۔ مثلاً آشیانہ ملا، خزانہ ملا کی زمین میں خدا نہ ملا، کمیا نہ ملا، مدعا نہ ملا کے قوافی کا اعادہ۔ اس میں یہ سقم ہے کہ جب آشیانہ، خزانہ، زمانہ کے قوافی مصرع مطروحہ میں تجویز کئے گئے ہیں تو نون حرفِ روی ہے، نون حرفِ روی کو چھوڑ کر خدا، مدعا کے قوافی لانا یعنی الف کو حرفِ روی بنا لینا کس طرح روا ہے۔ ردیف کا حرفِ نفی (نہ) قافیہ میں جا ملانا صاف طور پر قافیہ معمولہ ہے جو عیوبِ قافیہ میں شامل ہے۔ اسی طرح انساں کا، رضواں کا، گریباں کا، ان قوافی کے ساتھ جھانکا، ڈھانکا کے قوافی۔ ایسے قوافی کی تکرار معیوب ہوتی ہے۔ شکستِ ناروا اور ایطا بھی متروکاتِ شعری کہلاتے ہیں۔

نئی روشنی کے شعراء ردیف و قافیہ سے بے نیاز ہو رہے ہیں اور یہ تلقین کر رہے ہیں کہ اس پابندی سے قوتِ بیانیہ اکثر جگہ سپر انداز ہو جاتی ہے۔ وہ ایک مصرع چھوٹا اور ایک مصرع بڑا لکھ دینا بھی روا سمجھتے ہیں مگر وہ نہیں سوچتے کہ پابندیاں کہاں نہیں ہیں۔ آزاد سے آزاد ملکوں کے باشندوں پر بھی بہت سی قانونی پابندیاں عائد ہوتی ہیں۔ ہمارے تعلقاتِ خانہ داری بھی قیود سے مستثنیٰ نہیں ہیں انسانی اخلاق بھی ہم سب کے لئے بے شمار پابندیاں تجویز کرتے ہیں۔ خدائی احکام اور مذہبی قوانین نے بھی ہم سب کے افعال و اعمال پر بہت بٹھا رکھے ہیں۔ جب یہ پابندیاں گوارا ہوتی یا گوارا کرنی پڑتی ہیں تو نظم میں فنی پابندیاں کیوں گوارا نہیں ہو سکتیں اور شعر پر محنت کرنے سے طبیعت کیوں گریز کرتی ہے۔ یہ گریز تو صاف طور پر عجزِ طبیعت کا ثبوت ہے۔ پختہ مشق شعراء کا تجربہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ مشق و مزاولت سے یہ پابندیاں ان کی عادتِ ثانیہ بن جاتی ہیں اور فکرِ شعر میں کبھی سدِّ راہ نہیں ہوتیں۔ جب تک شعر فنی پابندیوں کے مطابق نہیں ہوتا وہ اپنی فکرِ شعر سے مطمئن بھی نہیں ہوتے۔ یہ اثر بھی ان کی عادتِ ثانیہ ہی کا کہا جا سکتا ہے۔ انیسؔ و دبیرؔ کے مرثیے دیکھئے شوقؔ، نسیمؔ اور حسنؔ کی مثنویاں دیکھئے، داغؔ کا شہر آشوب دیکھئے اُردو قصائد کا حصۂ تشبیب ملاحظہ کیجئے، کون سا ایسا مضمون ہے،

جو فنی پابندیوں کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے ان نظموں میں کامیابی سے بیان نہیں کیا گیا۔ جب حقیقتِ حال یہ ہے تو پھر کس طرح مان لیا جائے کہ ردیف و قافیہ بے ضرورت ہیں۔ حق یہ ہے کہ ردیف و قافیہ کے بغیر شعر میں خوب صورتی اور کشش پیدا ہی نہیں ہوتی۔ تجویز کردہ مضامین، یا تخیل کے نتائج اگر غزل کے شعر میں نہیں سما سکتے تو یہ ضروری نہیں کہ آپ وہ مضامین غزل کے لئے وقف کریں۔ ان مشکلات کو حل کرنے کے لئے نظم کی اور قسمیں بھی تو موجود ہیں۔ قطعہ ہے، رباعی ہے، مخمس ہے، مسدس ہے، ترجیع بند ہے، ترکیب بند ہے۔ جس صنف میں خیالات آسانی سے سما سکیں وہی صنف جولانیٔ فکر کے لئے منتخب ہو سکتی ہے۔ قطعہ اور رباعی میں تو دو تین قافیوں ہی سے کام چل جاتا ہے۔ ان اصنافِ نظم میں نفسیات کا مضمون ہو یا جمالیات کا، علم و حکمت کا موضوع ہو یا فلسفۂ اخلاق کا، جذبات ہوں یا احساسات، حمد ہو یا مناجات، واقعہ نگاری ہو یا قومی خیالات، تمام فنی پابندیوں کے باوجود مجبور نگاری کے ایسے نمونے موجود ہیں کہ حسنِ سخن خود ان کی داد دینے پر مجبور ہے۔

متروکاتِ شعری میں تقابلِ ردیفین کا سقم بھی شامل ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ اس سقم سے یہ مراد ہے کہ دوسرا مصرع اگر "ہے" پر ختم کیا ہے تو مطلع کے سوا کسی اور شعر کا مصرع اول "ہے" پر ختم نہ کیا جائے۔ صوتی اعتبار سے مصرع اول کی یہ شکل ناگوار سی ہوتی ہے اور حسنِ ردیف کے منافی سمجھی جاتی ہے۔ راقم تو یہاں تک محتاط ہے کہ مصرع اول کے آخر میں "ہیں"، "ہے" تو درکنار، ردیف کا کوئی ہم قافیہ لفظ بھی نہ آنے پائے۔ مثلاً "نئے"، "مے" وغیرہ۔ اسی طرح "نہیں آتی" ردیف ہو تو مصرع اول نہ تو "آتی" پر ختم ہو نہ "ایسی"، "اچھی"، "دیکھی" وغیرہ پر۔ پہلی صورت کو تقابلِ ردیفین اور دوسری صورت کو شبہ تقابلِ ردیفین کہیں گے۔

انھیں متروکاتِ شعری میں شتر گربہ ہے۔ حضرت داغ اپنے منظوم ہدایت نامہ میں فرماتے ہیں ؎

ایک مصرع میں ہو "تو" دوسرے مصرع میں ہو "تم"
یہ شتر گربہ ہوا میں نے اسے ترک کیا

اسی طرح ایک مصرع میں "تم" اور دوسرے میں "آپ" آ جائے یا ایک مصرع میں "میرا" اور دوسرے میں "ہمارا" آ جائے تو یہ بھی اسی قبیل سے ہے۔

بعض اصحاب شعرِ ذیل میں ؎

چھوڑا ہے ساتھیوں نے پسِ کارواں مجھے
لے جائے دیکھئے مری قسمت کہاں مجھے

نافہمی سے شتر گربہ کا سقم ظاہر کرتے ہیں مگر "دیکھئے" کا استعمال بے تکلفانہ بول چال میں شامل ہے اس لئے اسے شتر گربہ نہیں کہا جا سکتا۔ حضرت داغ کے یہ دو شعر بھی ملاحظہ ہوں ؎

لے چلے کوچۂ دلدار سے میت میری
دیکھئے لوگ اسے جا کے کہاں رکھتے ہیں

پڑی ہے جان عجب کشمکش میں کیا کیجے
نہ دل سے عشق نہ دل مجھ سے دور ہوتا ہے

یہاں بھی "دیکھئے" اور "کیا کیجے" دونوں بے تکلف زبان کا نمونہ ہیں۔ واحد شخص کی زبان پر بھی ایسے الفاظ آ سکتے اور آ جاتے ہیں اس لئے انھیں بھی شتر گربہ کہنا درست نہیں۔

رکاکت، ابتذال اور ذم کے پہلو بھی شعر میں بہت قابلِ اعتراض ہوتے ہیں۔ بازاری زبان، بازاری محاورے اور بازاری الفاظ کے استعمال سے بھی یہ تینوں خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بعض دفعہ تقدیم و تاخیر بھی ایسی ہی کسی خرابی کی موجب ہوتی ہے۔ تیری اور تمھاری کے استعمال میں احتیاط نہ کرنے سے ذم کا پہلو نکل آتا ہے۔ بعض الفاظ کے قرب سے کراہت آمیز مفہوم صوتی اعتبار سے پیدا ہو جاتا ہے مثلاً اس اور حال کا قرب اسہال کی آواز پیدا کرتا ہے۔ جا اور دامن کا قرب بھی اسی قبیل سے ہے۔ ع

میں نے پردہ جو اٹھایا تو قیامت دیکھی

یہ مصرع ایک مشہور شاعر کا ہے۔ زبان اچھی، بندش اچھی، الفاظ کی ترتیب و نشست سب درست، مگر پھر بھی معنویت کی مبہم صورت نے ذم کا پہلو پیدا کر دیا اور مصرع مضحکہ خیز ہو گیا۔ رکھنا، رکھوانا، کرنا، کرانا، دھرنا، دھروانا مصادر اور ان کے فعلوں میں ذم کا پہلو بڑی آسانی سے پیدا ہوتا ہے۔ اس خرابی کا علاج یہ ہے کہ ایسے فعلوں میں مفعول پہلے آنا چاہیئے اور فعل بعد میں نیز مفعول کا محلِ وقوع فعل کے ساتھ ملحق رہے دوری پر نہ ہو تو شعر ایسے قبیح سقم سے بچ جاتا ہے۔ تیری اور تمھاری کے

استعمال میں بھی یہی کوشش ہونی چاہیئے کہ مؤنث مضاف ان کے بعد آئے اور وہ مضاف الیہ کی ضمیر سے ملحق رہے۔

متروکاتِ شعری میں کچھ اور باتیں بھی شامل ہیں مثلاً ایطا کا عیب۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایطائے خفی اور ایطائے جلی۔ ایطائے جلی تو قبیح عیب ہے مثلاً دردمند اور حاجت مند، تاجور اور راہبرور، چارہ گر اور دادگر، باغبانی اور پاسبانی، باریکیاں اور رعنائیاں وغیرہ کے قافیے۔ ایطائے خفی کی مثالیں۔ دانا و بینا، خنداں و گریاں، لگا اور بجھا، دوستی اور دشمنی وغیرہ۔ ان کی شناخت کا عام اصول ہے کہ مشترکہ علامت دُور کرنے کے بعد باقی لفظ اگر بامعنی ہیں اور ہم قافیہ نہیں ہیں تو یہ ایطا ہے۔ مثلاً دوستی اور دشمنی میں یائے مصدری مشترک ہے۔ اسے الگ کر دینے کے بعد دوست اور دشمن دو بامعنی لفظ باقی رہتے ہیں جو ہم قافیہ نہیں ہیں، پس یہ ایطا ہے اور عیوب قافیہ میں شامل ہے۔ یہاں یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ایسے الفاظ میں اگر یائے مصدری مشترک نہیں یعنی ایک یائے مصدری ہے اور ایک نسبتی یا فاعلی، تو اسے ایطا نہیں کہہ سکتے۔ مثلاً شاعری اور دہلوی، زندگی اور آدمی، بےکسی اور مشتری وغیرہ۔ یہی صورت لگایا اور بجھایا میں ہے، یہی عیب دانا اور بینا یا خنداں اور گریاں میں ہے۔ اس عیب سے بچنے کا طریق یہ ہے کہ مشترکہ علامت دُور کرنے کے بعد باقی حصوں میں یا تو دونوں بےمعنی رہ جائیں یا کوئی ایک بےمعنی ہو۔ مثلاً لگا کے ساتھ پلا، بتا، دکھا، مسکرا وغیرہ قافیے۔ یا دوستی کے ساتھ زندگی، بندگی کا قافیہ۔ مثال ؎

یہ بلا میرے سر چڑھی ہی نہیں
میں نے کچے گھڑے کی پی ہی نہیں

یہ شعر ایطائے خفی سے بچ کر کہا گیا ہے۔ ایک جگہ صرف چڑھ باقی رہتا ہے دوسری جگہ پے۔ یاد رہے کہ ایطا کا عیب صرف مطلع ہی میں ہوتا ہے۔

آج سے پچیس تیس سال پہلے مولانا فرؔ بدایونی نے رسالہ علی گڑھ میگزین میں بحث قافیہ کے عنوان پر ایک جامع مضمون شائع کیا تھا۔ اس میں اس بنا پر کہ نوجوان شعرا زیادہ پابندیوں سے گھبراتے ہیں۔ ایطائے خفی کی پابندی اڑا دینے اور ایطائے جلی کی پابندی بحال رکھنے کا مشورہ پیش کیا تھا۔ یہ مشورہ نامناسب نہ تھا مگر مشاہیر نے اس پر کوئی توجہ نہیں کی تھی۔ راقم سے بھی بعض عزیزوں نے یہ مطالبہ کیا ہے کہ ایطائے خفی کو جائز سمجھنے کی اجازت دے دی جائے۔ اس سلسلے میں تین چار مشاہیرِ فن سے بھی میں نے خط وکتابت کی اور اس اجازت نامے کے حق میں تائید بھی کی خاص کر اس بنا پر کہ تمام مشاہیر کے کلام میں کہیں نہ کہیں لگانا، بجھانا کی قسم کے قوافی مل جاتے ہیں۔ ان خطوط کے جواب میں ان اصحاب نے اجازت نامے کی تائید کی ہے۔ یہ قوافی غلط نہیں ہیں۔ اس لئے آپ کے عزیز اگر یہ اجازت چاہتے ہیں تو اجازت دے دی جائے مگر خود یہ پابندی نہ چھوڑیں تاکہ فنی تمایندگی ہوتی رہے۔ مشاہیر کے اس اتفاق رائے پر میں اپنے عزیزوں کو یہ مشورہ دیتا ہوں کہ اگر وہ لگا، بجھا کے قوافی لکھ کر ایطا کی پابندی چھوڑنا چاہتے ہیں تو چھوڑ دیں، اور اگر اسے حسب سابق گوارا کر سکتے ہیں تو یہ بھی ان کی پسند اور مرضی پر منحصر ہے البتہ ایطائے جلی سے بچنا نہایت ضروری ہے۔

تخفیف الفاظ کی بحث میں یہ بات تو مسلّم ہے کہ فارسی عربی الفاظ میں حروفِ علت (الف، واو، ی) کا سقوط معیوب ہوتا ہے سوائے اس صورت کے کہ ان کے بعد الف وصل موجود ہو، مگر ہندی الفاظ کے ساتھ یہ پابندی لازم نہیں۔ اس رعایت کے باوجود فصحا کا قول ہے کہ جہاں تک ممکن ہو تخفیف سے بچنا چاہیئے۔ چنانچہ حضرت داغ فرماتے ہیں ؏

وہ فصاحت سے گرا شعر میں جو حرف دیا

حروفِ علت کی تخفیف کے علاوہ تخفیف کی بعض اور صورتیں بھی محلِ نظر ہوتی ہیں۔ فارسی الفاظ کی اردو جمع میں تخفیف بھی مصرع کی روانی اور حسنِ بندش میں خلل انداز ہوا کرتی ہے۔ مثلاً یہ مصرع

سرگوشیاں ہو رہی تھیں باہم

مصرع کے شروع میں بھی الفاظ کی تخفیف بارِ سماعت ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ راقم نے مصرع کے شروع میں ہو، ہوں، ہے، ہیں نیز میں (ضمیر متکلم) کی تخفیف ترک کر دی ہے۔ سوائے اس صورت کے جب ان کے بعد الف وصل آتا ہو۔ وہ اور یہ کی تخفیف شروع مصرع میں البتہ ناگزیر ہے۔

ہندی الفاظ نیا، بھلا، بڑا، بھلے، بڑے، بھلی، بڑی، بھرا، بھرے

بھری، کہاں، جہاں، وہاں، یہاں، لئے، پئے، سئے، پئے کی تخفیف بھی مصرع کو سست کر دیتی ہے، مثلاً

۱۔ جو بات ہے دل میں بھری محفل میں کہوں گا (بھری کی تخفیف)
۲۔ اے عندلیب کس لئے ہے بے قرار آج (لئے کی تخفیف)

الفاظ کی تقدیم و تاخیر کے متعلق شکایت ہیں ان کی، محبت میں ان کی، جفاؤں میں تمہاری، اداؤں سے تمہاری، ہر زخم میں دل کے، ہر بات میں اس کی۔

۱۔ کیوں تم کو توجہ نہیں روداد پہ میری
۲۔ آنکھوں سے میرے جاری ہے کیوں آب شار آج

اس قسم کی تمام صورتیں اگرچہ راقم نے سو فی صدی تو ابھی ترک نہیں کیں مگر مقدور بھر ان سے بچنے ہی کی کوشش کرتا ہوں۔ حرفِ جار کے آجانے پر اس کے بعد ضمیر مضاف الیہ یا مضاف الیہ کے آنے سے پرہیز کرنا ہی مناسب سمجھتا ہوں۔ یعنی محبت ہماری، محبت تمہاری، یہ تقدیم و تاخیر تو بارِ گوش نہیں۔ شعر میں اتنی تقدیم و تاخیر ناگزیر بھی ہے۔ مگر محبت میں ہماری، محبت میں تمہاری، محبت میں اس کی وغیرہ وغیرہ بلا شبہ قابلِ ترک یعنی متروکات شعری ہی میں شمار کئے جانے کے قابل ہیں۔

حسنِ بندش کی بحث میں شکستِ ناروا کا سقم بھی قابلِ لحاظ ہوتا ہے۔ بعض بحریں ایسی ہیں کہ ان میں ہر مصرع دو برابر حصوں میں تقسیم کرنا پڑتا ہے۔ ترنم اور موسیقی یا مصرع کی روانی کا تقاضا یہ ہے کہ ہر نصف مفہوم کے لحاظ سے مکمل یا قریب قریب مکمل ہو۔ اس عنوان پر راقم کا ایک مفصل مضمون 'آج کل' کی کسی گزشتہ اشاعت میں شائع ہو چکا ہے۔ یہاں صرف مجمل طور پر اتنا بیان کر دینا کافی ہے کہ اگر کسی فنی کتاب میں اس بات کا کہیں ذکر نہیں ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک سقم کو سقم نہ سمجھا جائے۔ کئی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو صرف ذوقِ صحیح ہی سے تعلق رکھتی ہیں اور اپنی وجدانی کیفیت یا تقاضائے موسیقیت کی وجہ سے لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتیں مگر ذوقِ صحیح اسے بخوبی جانتا، بخوبی سمجھتا اور بخوبی محسوس کرتا ہے اور خود بتا دیتا ہے کہ یہاں مصرع کی دانی شکست خوردہ ہے۔ اس شکست کی کئی صورتیں ہیں۔ اجزائے فعل کا ایک جزو پہلے نصف میں اور دوسرا جزو دوسرے نصف میں ہو مثلاً ؎

کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

جار مجرور میں مجرور کا ایک نصف میں رہ جانا اور حرفِ جار کا دوسرے نصف کے شروع میں آجانا، مضاف مضاف الیہ میں سے مضاف الیہ اور حرفِ اضافت کا ایک نصف میں اور مضاف کا دوسرے نصف میں۔ اس کی قبیح صورت یہ ہے کہ حرفِ اضافت بھی دوسرے نصف کے شروع میں جا رہے۔ ایک ہی لفظ کا کچھ حصہ پہلے نصف میں اور باقی لفظ دوسرے نصف کے شروع میں۔ مرکب عطفی میں معطوف علیہ پہلے نصف کے آخر میں اور معطوف دوسرے نصف کے شروع میں۔ ندا منادے میں حرفِ ندا پہلے نصف کے آخر میں اور منادےٰ دوسرے نصف کے شروع میں آجائے۔ فارسی اضافت میں مضاف کے بعد مضاف الیہ دوسرے نصف کے شروع میں، یعنی پہلا نصف مضاف پر ختم کر دینا۔ اسی طرح فارسی عطف میں پہلا نصف حرفِ عطف پر ختم کرنا، ایک محاورے کے کچھ لفظ پہلے مصرع میں اور کچھ دوسرے نصف کے شروع میں لانا۔ یہ سب شکستِ ناروا ہی کی مختلف صورتیں ہیں۔

تمام اساتذۂ اردو فارسی کا کلام ان خاص بحروں میں جو اس سقم سے تعلق رکھتی ہیں، اس شکست سے پاک نظر آتا ہے۔ کہیں کہیں اِکّا دُکّا مثالیں ان کے کلام میں ہوں تو انہیں النادر کالمعدوم کہنا چاہیئے۔ اساتذہ کی اس نمایاں احتیاط کو دیکھ کر بھی اگر یہ کہا جائے کہ

یہ کس حدیث میں آیا ہے کس کتاب میں ہے

تو اس حجت کو کس طرح بجا کہا جا سکتا ہے

ان خاص بحروں کی مثالیں یہ ہیں:۔

۱۔ آوارہ کے ہم نے دن عمر کے گزارے
دو چار دن سفر میں، دو چار دن وطن میں
۲۔ کوئی مستِ سے کدہ آگیا اسے پی کے خود ہی وہ چلا گیا
نہ صدائے نعرہ دیر اٹھی، نہ حرم سے شورِ اذاں اٹھا
۳۔ یہ مزا تھا دل لگی کا، کہ برابر آگ لگتی
نہ تجھے قرار ہوتا، نہ مجھے قرار ہوتا

۴- نہ وہ آس رہی نہ اُمنگ رہی، نہ وہ رندی و زہد کی جنگ رہی
سوئے قبلہ نگاہوں کے رُخ نہ رہے، درِ دَیر پہ نقشِ جبیں نہ رہے

۵- واعظ نے کہا یہ منبر پر، اللہ نہیں تو کچھ بھی نہیں
یاروں نے کہا یہ قول غلط، تنخواہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

۶- اُلٹی ہوگئیں سب تدبیریں، کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریِ دل نے، آخر کام تمام کیا

۷- چرخ کا چور مٹ گیا، چرخ کا دَور مٹ گیا
چرخ تو اور مٹ گیا، پڑ کے مرے غبار میں

۸- کیا ابتدا کیا انتہا، جو آئے گا وہ جائے گا
دنیا ہے فانی کچھ نہیں اللہ بس باقی ہوس

۹- اب اپنے حسن پہ نَدا، سنجر بھی ہے جگر بھی ہے
کمالِ شانِ دلبری، اِدھر بھی ہے اُدھر بھی ہے

۱۰- آئی گھٹا جب ساون کی، اک افسردہ بول اُٹھا
جس میں دل کھل جاتے ہیں، وہ برکھا کب ہوتی ہے

۱۱- وہ بھی نہ تُو کوئی دم، دیکھ سکا اے فلک
اور تو یاں کچھ نہ تھا، ایک مگر دیکھنا

۱۲- سوزنگ کی تصویریں، حاضر بھی ہیں غائب بھی
پردہ مری آنکھوں کا، فانوسِ خیالی ہے

۱۳- تشبیہہ تِرا منظر ہے کس کی، کہ کوئی پوری نہیں اُترتی
مٹا دئے صانعِ ازل نے، ہزاروں نقشے بنا بنا کر

۱۴- ذکر اس پری وش کا، اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر، تھا جو رازداں اپنا

اور بھی دو تین صورتیں ایسی ہوں گی۔ ذوقِ صحیح خود بتا دیا کرتا ہے کہ کہاں اس سقم سے بچنے کی ضرورت ہے اور کہاں نہیں۔ ترصیع کا تقاضا بھی ذوقِ صحیح کے تقاضے کی پوری تائید کرتا ہے۔

تشبیہات اور تمثیلات میں یہ اعتنا طلازم ہوتی ہے کہ تشبیہہ اپنے مشبہ بہ کو اور تمثیل اپنے ممثّل لہٗ کو اس طرح واضح کرے کہ توقیر کی جگہ تحقیر کا پہلو پیدا نہ ہو۔ اگر یہ صورت ہو تو وہ تشبیہہ یا تمثیل کسی مصرف کی نہیں۔ تمثیل کی خرابی کے لئے یہ مثال کافی ہوگی۔

شاعر ایک قطعہ میں کہتا ہے کہ یاس کی ظلمتوں میں امید کی روشنی اس طرح اپنی جھلک دکھاتی ہے جیسے کوئی دوشیزہ اپنے ہی سائے سے ڈرتی ہو۔ اس قسم کی بے ربط تمثیل سے مفہوم میں جو اُلجھن پیدا ہوتی ہے یا وضاحت میں ضعفِ بیان کا جو سقم ہے وہ ظاہر ہے ؎

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

یہ تمثیل ممثّل لہٗ کو یا فلسفی کی ناکام کوشش کو جس وضاحت سے بیان کرتی ہے اس کی داد نہیں دی جا سکتی۔ مشکلات میں اُلجھنے کی بالکل صحیح اور روشن تصویر اس سے بہتر اور کیا ہوگی۔ ظاہر ہے کہ بیان میں یہ حسن اسی تمثیل ہی کی خوبی نے پیدا کیا ہے۔

مضمون کافی طویل ہوگیا ہے۔ ابھی متعدد نکات یا سخن ہائے گفتنی اور ہیں۔ مگر کاغذ کی تنگ دامانی اور زحمتِ تحریر زیادہ طوالت کی اجازت نہیں دیتے۔ پھر بھی جو کچھ لکھا جا چکا ہے وہ مبتدی اور نومشق اصحاب کے لئے کافی مفید ہو سکتا ہے بہ شرطیکہ وہ اس خامہ فرسائی کو کسی قدر و قیمت کے قابل سمجھیں۔

تصحیح :- فروری ۱۹۶۰ء کے شمارے میں صفحہ ۴۴ پر غلطی سے فرخ جلالی کے مقالے کے عنوان میں 'مدہوش' کی جگہ 'ہوش' چھپ گیا ہے۔ ناظرین تصحیح فرمائیں۔

'آج کل' ۱۹۶۰ء کا سالنامہ ہندوستانی مصوری نمبر ہوگا

جعفر حسینی جعفر

گُلِ نرگس

(شاعرِ فطرت Wordsworth کی مشہور نظم The Daffodils کا آزاد منظوم ترجمہ)

میں مثلِ ابرِ نیساں محوِ سیرِ کوہساراں تھا
سمندر اک گلِ نرگس کا موجیں مارتا دیکھا
فضاؤں میں ہواؤں کی مسرت باریاں دیکھیں
قطار اندر قطار استادہ لاکھوں پھول نرگس کے
سنہرے پھول نرگس کے ہزاروں لہلہاتے ہیں
ادھر پانی خوشی کے سرمدی دریا بہاتا ہے
کہاں پانی کہاں نرگس کی آب و تابِ لاثانی
ہر اک ذرّہ جہاں کا عالمِ حیرت میں ساکن تھا
میں محوِ دیدِ گل تھا اور نہ تھی مجھ کو خبر اتنی
بعزمِ استراحت جب کبھی بستر پہ جاتا ہوں
کبھی خالی کبھی احساسِ غم سے نالہ فرسا ہے
تو ایسے میں اچانک وادیٔ گلزار کا منظر
مسرّت کا خزانہ تحفۂ خلوت جسے کہئے
مُرادوں کی نکل آئی ہے صورت نامرادی میں

فضا میں وادیوں کی لُطفِ گلگشتِ بہاراں تھا
نسیمِ صبح میں پھولوں کا رقصِ جانفزا دیکھا
کنارے جھیل کے قدرت کی صنعت کاریاں دیکھیں
مسلسل دُور تک لاانتہا پھیلے ہوئے دیکھے
فلک پر کہکشاں میں جیسے تارے جگمگاتے ہیں
مگر گلزار نرگس اور ہی کچھ گل کھلاتا ہے
کہ جس کو دیکھ کر تھا پانی پانی جھیل کا پانی
نہ ہولے تابِ شاعر تابِ گل سے کب یہ ممکن تھا
کہ یہ منظر مجھے بخشے گا اک دولت مسرّت کی
دلِ راحت طلب کو وقفِ صد افکار پاتا ہوں
تماشا ہے دلِ ناداں دلِ ناداں تماشا ہے
چمک اُٹھتا ہے مثلِ برق میری چشمِ باطن پہ
وہ میری چشمِ باطن چشمۂ جنّت جسے کہئے
خوشی کا ایک ساگر بہ رہا ہے دل کی وادی میں

دلِ دیوانہ دارم با گُلِ گلزار می رقصم
بیا در نرگسِ شہلا سے آں دلدار می رقصم

اظہر راہی

ہجو صنفِ سخن کی حیثیت سے

ہجو مشتق ہے لفظ ہجا سے جس کے لغوی معنی برائی یا ملامت کرنے کے ہیں۔ شاعری کی اصطلاح میں ہجو اس مسلسل نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی شخص، واقعہ یا کیفیت کی مذمت کی جائے۔ یہ مذمت چونکہ عموماً طنزیہ یا مزاحیہ انداز میں کی جاتی ہے اس لئے ہجو کا طنز و مزاح سے گہرا تعلق ہے لیکن اس کے باوجود ان تینوں میں فرق ہے۔ ہجو میں طنز و مزاح کا شائبہ تو ہو سکتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ طنز و مزاح کا ہر نمونہ ہجو کا آئینہ دار ہو۔ ہجو کا تصور زیادہ تر اشخاص یا اشیاء کی مذمت سے وابستہ ہے یا پھر اس میں کسی عہد کی بدحالی کا مضحکہ اڑایا جاتا ہے جس کا تعلق بھی مذمت سے ہوتا ہے۔

شعر الہند میں عبدالسلام ندوی نے ہجو کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:-

"جن فضائل و مناقب پر قصیدہ کی بنیاد قائم ہے انہیں کے سلب کرنے کا نام ہجو ہے[1]"

اول تو یہ تعریف منفی پہلو کو پیش نظر رکھ کر کی گئی ہے جو تعریف کا صحیح طریقہ نہیں ہے، دوسرے اس میں صرف اشخاص کی ہجو کو سامنے رکھا گیا ہے جبکہ ہجو کا دائرہ اشیاء، واقعات اور تاریخی حالات تک پھیلا ہوا ہے۔

جہاں تک متفرق اشعار کا تعلق ہے ہجو کے نمونے اردو کی سبھی اصناف سخن خصوصاً غزل، مرثیہ اور واسوخت وغیرہ میں مل جاتے ہیں غزل میں شیخ، واعظ، زاہد، محتسب وغیرہ کو لتاڑنا یا ہم عصروں کی مذمت کرنا، مرثیہ میں دشمنانِ اہلبیت پر لعن و ملامت کرنا، واسوخت میں معشوق کی بدچلنی کا پردہ چاک کرنا اور اسی قسم کے دوسرے مضامین بخوبی ہجو کے زمرے میں آ جاتے ہیں۔ اس طرح ہجو کا دائرہ اتنا وسیع ہو جاتا ہے کہ اس کے حدود کا تعین کرنا محال ہے۔ لیکن کسی صنف کا تصور متفرق اشعار پر قائم نہیں ہوتا اس کے لئے ایک سے زیادہ مسلسل اشعار اور کسی مقررہ موضوع یا ہیئت کا ہونا لازمی ہے۔ اردو میں بعض اصنافِ سخن ایسی ہیں جن کی بنیاد موضوع پر ہے اور بعض ایسی ہیں جن کی بنیاد ہیئت پر ہے۔ غزل میں بالعموم حسن و عشق کے مضامین نظم کئے جاتے ہیں لیکن ہر اس نظم کو غزل کی فہرست میں شامل نہیں کیا جا سکتا جس میں حسن و عشق کے مضامین نظم کئے گئے ہوں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اشعار اسی خارجی شکل میں ہوں جو غزل کے لئے لازمی سمجھی جاتی ہے۔ اس کے برعکس ہر اس نظم کو مرثیہ کے تحت میں رکھا جائے گا جس میں کسی کی موت پر اظہارِ افسوس کیا گیا ہو۔ خواہ وہ کسی بھی ہیئت میں لکھی گئی ہو۔ صنفِ ہجو کی بناء موضوع پر قائم ہے اس کے لئے کسی خاص ہیئت کی قید نہیں ہے۔ ہم ان تمام مسلسل اشعار کو ہجو کہہ سکتے ہیں جن کا موضوع اور مقصد ہجو ہو۔

ہجو میں کئی چیزیں شامل ہیں مثلاً غصہ، ملامت، طنز، طعن، پھبتی، استہزاء اور دل آزار ظرافت، کیونکہ ہر پہلو سے اس کا مقصد

---

[1] شعر الہند حصہ دوم صفحہ ۳۷۳

اپنے مخالف کی مذمت کرنا ہوتا ہے اس لئے کسی قسم کا بھی پیرایۂ بیان اختیار کیا جا سکتا ہے اور عیب جوئی یا تمسخر کے لئے اچھائی میں بھی برائی کا پہلو نکل آتا ہے۔

ہجو کے محرکات

جہاں شاعر کو کوئی ایسی بات شخصیت یا حادثہ نظر آتا ہے جسے وہ برا سمجھتا ہے یا جس سے اس کی انا کو ٹھیس پہنچتی ہے وہیں وہ ہجو کا موضوع نکال لیتا ہے۔ دراصل ہجو کا تعلق شاعری کی دوسری اصناف کی طرح جذبات ہی سے ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے ہجو میں کسی شخص کے معائب یا کسی عام انسانی نقص کا طنزیہ اظہار ہوتا ہے اور اس اظہار کے لئے مخصوص قسم کے جذبات کی ضرورت ہوتی ہے۔ جذبات کا ذکر آتے ہی ہمارا خیال ان مخصوص روایتی جذبات کی طرف جاتا ہے جن سے غزلیں بھری پڑی ہیں اور ایک عرصہ تک ہماری شاعری میں ان ہی جذبات و احساسات کا دخل رہا ہے جو دنیا کے فانی ہونے، انسان کی بے پایاں خواہشات اور محدود ذرائع کا ذکر یا زیادہ سے زیادہ وطن کی محبت کے ترانوں تک محدود رہتے ہیں۔ کلیم الدین احمد کے الفاظ ہیں:—

> "اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہجو منظم جذبات کے بغیر ممکن ہی نہیں ہجو گو شاعر ناانصافی، بے رحمی، ظلم اور اسی قسم کے انسانی نقائص کے مشاہدے سے متاثر ہو کر اس کا جذبہ نفرت، غضب، حقارت جوش میں آتا ہے۔ ان ہی جذبات کا اظہار وہ اپنی نظم میں کرتا ہے اگر جذبۂ عشق ایک پرزور طاقت ہے تو جذبۂ نفرت بھی ایک طاقت ور زور ہے[1]"

شخصی اور سماجی ہجویات میں اس جذبہ کی کارفرمائی بہت نمایاں ہے۔ مزاح اور ہجو میں یہی بنیادی فرق ہے کہ ایک زندگی کی ناہمواری کے احساس کا صرف اظہار کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس دوسرا اس نقص کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کے خلاف جذبۂ نفرت ابھارتا ہے۔ نقص کو دور کرنے کے لئے احساس کے اظہار کی ضرورت ہوتی ہے لیکن صرف احساس کے اظہار کے لئے جذبۂ نفرت کی کوئی ضرورت نہیں اور یہیں سے مزاح اور ہجو کی راہیں جدا ہوتی ہیں۔

ہجو کے شخصی محرکات میں ذاتی عناد، شاعرانہ چشمک شخصی کمزوریوں کا بیان شامل ہے۔ ہجو گو چونکہ انسان ہے اور ایک ایسے ماحول میں پرورش پاتا ہے جہاں محبت کے جذبہ کے ساتھ نفرت کا جذبہ بھی موجود ہوتا ہے اس لئے وہ شخصی محرکات سے پہلو تہی نہیں کر سکتا اس لئے ہجو کی ابتداء عموماً کسی ذاتی جذبہ سے ہوتی ہے۔

ذاتی عناد ہجو کا بنیادی پتھر ہے اور جب یہ جذبہ پرورش پانے لگتا ہے تو پھر شاعرانہ چشمک اور شخصی کمزوریوں کے بیان میں ذاتیات کو بھی دخل ہو جاتا ہے اور ان بیانات میں عداوت، نفرت اور تضحیک کے پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔ لیکن اچھا ہجو نگار وہ ہے جو اس ذاتی عناصر کو صرف کسی مخصوص فرد کی عیب جوئی یا تمسخر تک محدود نہ رکھے بلکہ اس میں ایسی عمومیت پیدا کر دے کہ وہ تمام اشخاص اس کے دائرہ میں آ جائیں جن میں وہ خامیاں موجود ہیں۔ مثال کے لئے سودا کی ہجو "شیدی کوتوال" کو لیجئے جو صرف ایک فرد تک محدود نہیں ہے بلکہ اس میں شاعر نے اپنی صناعی سے پورے سماجی ڈھانچہ پر بھرپور وار کیا ہے اور صرف شیدی کوتوال کے لئے جذبۂ نفرت نہیں ابھارا ہے بلکہ پورے اس نظام کے خلاف منافرت کا جذبہ پیدا کیا ہے۔

اس قسم کی شخصی ہجویات اس فن کی اعلیٰ مثالیں ہیں لیکن وہ ہجویات جن سے شاعر کا مطلب صرف اپنے دل کی بھڑاس نکال کر جذبۂ نفرت کو ٹھنڈا کرنا ہے کسی صورت میں اعلیٰ اور ارفع نہیں کہی جا سکتیں۔

سماجی محرکات کے ذیل میں ہم ان تمام ہجویات کو لا سکتے ہیں جن کا بالواسطہ یا بلاواسطہ مقصد سیاسی اور معاشی بدحالی یا اخلاقی کمزوریوں کی نشاندہی کرنا ہے۔ اس قسم کی ہجویات کا آرٹ بلند پایہ ہے کیونکہ اس سے شاعر کی وسعتِ نظر اور مشاہدہ کا اندازہ ہوتا ہے اس کے سیاسی اور سماجی شعور کا پتہ چلتا ہے۔ جو شاعر زندگی سے جس قدر قریبی رابطہ رکھے گا اس کی ہجویات میں اتنی ہی تاثیر اور ہمہ گیری ملے گی اور چونکہ ان میں ہم عصر تہذیب کے بیانات ہیں اس لئے ہر دور میں ان کی ادبی

[1] سخن ہائے گفتنی صفحہ ۱۹۵

اہمیت مسلّم رہے گی۔ یہی نہیں بلکہ اس قسم کی ہجویات سماج کی ایک ایسی تنقید ہوتی ہیں جس سے اس کی خامیاں نمایاں ہو جاتی ہیں۔ شاعر کی شعوری کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان خامیوں کو دُور کیا جائے۔

ہجو کی قسمیں

موضوع کے لحاظ سے ہجو کی دو بڑی قسمیں کی جا سکتی ہیں۔ ایک شخصی اور دوسری سماجی۔ شخصی ہجو سے مراد وہ ہجو ہے جس میں اشخاص کو ہجو کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جس میں شاعر محض ذاتی عناد یا چشمک کی بنا پر کسی کی مذمّت کرتا ہے اس کی مثالیں ہمیں تقریباً ہر دَور کے ہم عصر شعراء کی نوک جھونک میں ملتی ہیں۔ اس قسم کی چھیڑ چھاڑ چونکہ درباری مذاق کو پورا کرتی ہے اس لیے اس کی سرپرستی بھی کی جاتی ہے۔ انشاء کی صلاحیتوں کا درباری سرپرستی کی وجہ سے غلط استعمال اور درباروں میں مسخروں کی موجودگی اس بات کا ثبوت ہے کہ راجہ اور نواب اس قسم کی نوک جھونک سے ذائقہ بدلنے کا کام لیتے تھے۔ دوسری قسم وہ ہے جس میں سماجی کمزوریوں کو شاعر ایک اصلاحی نقطۂ نظر سے پیش کرتا ہے جیسے ضاحک کی ہجو میں سودا اُن کی لسیار نوشی پر طنز کرتے ہیں اور نئے نئے مضحک پہلو نکالتے ہیں۔

سماجی ہجو کے تحت میں وہ ہجویات آتی ہیں جن میں سماجی کمزوریوں کو نمایاں کیا جاتا ہے اسی وجہ سے "شہر آشوب" کو موضوع کے اعتبار سے ہجو نگاری میں سب سے بلند درجہ دیا جاتا ہے۔ اس عنوان کے تحت ہمیں قدماء کے یہاں کئی مسدّس، مخمّس اور قصائد ملتے ہیں جو اس دور کے سیاسی، معاشرتی اور مجلسی حالات کی ہجو پر مبنی ہیں۔ یہ ہجویات اس دور کے حالات کا پتہ دیتی ہیں۔ سماجی ناہمواریوں، دشواریوں اور مصائب کا ذکر طنزیہ انداز میں کیا جاتا ہے کیونکہ ان میں شخصی موضوعات اور ذاتی عناد کی کارفرمائی نہیں ہوتی اور صالح جذبات ہوتے ہیں جس پر حرف گیری نہیں کی جا سکتی۔ اس قسم کی ہجویات موضوع کے لحاظ سے بھی نیز شاعرانہ خصوصیات کے لحاظ سے بھی اہم ہیں۔ صنفِ ہجو میں ایسی ہجویات کو برتری اس وجہ سے حاصل ہے کہ ان میں دلی جذبات اور تاثّرات کی مکمل ہم آہنگی ہوتی ہے کوئی تصنّع یا تکلّف نہیں ہوتا اور نہ کسی قسم کا ڈر یا خوف پایا جاتا ہے۔

نفسِ مضمون کے اعتبار سے ہجو کی تقسیم کرتے ہوئے ہزل اور ہرزہ گوئی کا خیال آتا ہے۔ لیکن ہزل ایک علاحدہ صنف ہے اور اپنی نوعیت میں ہجو سے مختلف ہے۔ ہزل کو مزاحیہ یا ظریفانہ کلام کے تحت رکھا جا سکتا ہے جو ہجو کے مقابلہ میں بلند پایہ آرٹ نہیں ہے۔ کلیم الدین نے اس فرق کو واضح کرنے کی غرض سے ظرافت، طنز اور ہجو کے لیے ترتیب وار Humour، Irony اور Satire کی اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ ظرافت نگاری اور ہجو گوئی کے فرق کی وضاحت وہ یوں کرتے ہیں :-

> "خالص ظرافت نگار کسی بے ڈھنگی شئے کو دیکھ کر ہنستا ہے وہ اس نقص، خامی، بدصورتی کو دور کرنے کا خواہش مند نہیں ہوتا۔ ہجو گو اس سے ایک قدم آگے بڑھتا ہے۔ اس ناقص، ناتمام منظر سے اس کا جذبۂ تکمیلِ حسن اور ذہنیت انصاف، جوش میں آتا ہے اور وہ اس جذبہ سے مجبور ہو کر اس مخصوص مذموم منظر کو اپنی ظرافت اور طنز کا نشانہ بناتا ہے۔[1]"

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہزل اور ہجو میں بنیادی فرق ہے۔ ہزل کی نشان دہی ہجو میں تو کی جا سکتی ہے لیکن خالص ہزل کو ہجو کا نام نہیں دیا جا سکتا کیونکہ ہجو گو ظرافت اور طنز دونوں سے استفادہ حاصل کرتا ہے۔

ہرزہ گوئی کی بنیاد ضرور ہجو یہ عنصر پر قائم ہے لیکن اسے کوئی ادبی حیثیت نہیں دی جا سکتی کیونکہ یہ کوئی صناعی نہیں ہے جبکہ ہجو کا آرٹ اس سے بہت بلند ہے اس لئے ہرزہ گوئی اور ہزل گوئی دونوں کو خارج از بحث سمجھنا چاہیئے۔

ہجو کا اسلوب

ہجو میں نہ تو قصیدہ کی طرح اشعار کی تعداد مقرر ہے اور نہ اس کی کوئی مخصوص ہیئت ہے اور نہ قصیدہ کی طرح پُرشکوہ زبان کی ضرورت ہے بلکہ اس کے برخلاف ہجو کی زبان جس قدر عام فہم ہوگی اسی قدر وہ زیادہ

---

[1] سخن ہائے گفتنی صفحہ ۱۹۲

مقبول ہو گی کیونکہ اس کا مقصد اپنی زبان دانی کا لوہا منوانا نہیں بلکہ عوام و خواص تک اپنی بات پہنچانا ہے اسی وجہ سے ہجو کے مضامین نہ تو فلسفیانہ خیالات پر مشتمل ہوتے ہیں اور نہ ان کے مفہوم گنجلک ہوتے ہیں۔

اسلوب کے اعتبار سے ہم ہجو کی تقسیم سادہ ہجو، ہجو ملیح، ہجو قبیح اور سب وشتم کے عنوانات سے کر سکتے ہیں۔ یہ ہجو کی درجہ بدرجہ سیڑھیاں ہیں۔ سادہ ہجو میں لہجہ نرم اور اندازِ بیان میں حلاوت اور مٹھاس ہوتی ہے۔ ہجو ملیح میں یہی نرمی کسی قدر سختی میں بدل جاتی ہے لیکن اس سختی کی نمایاں طور پر نشان دہی نہیں کی جا سکتی اور اسی سے ہجو کا لطیف پہلو پیدا ہوتا ہے۔ ہجو قبیح میں یہی سختی تندی اور کرختگی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ لہجہ میں متانت اور مٹھاس کے بجائے درشتی اور جھلاہٹ کا احساس ہوتا ہے اور سب وشتم میں اس جھلاہٹ اور تندی کی جگہ گالی گلوچ، عریانی اور فحاشی لے لیتی ہے۔ زبان کے جس قدر حربے ہو سکتے ہیں استعمال کیے جاتے ہیں۔ فحش الفاظ محاورات اور دشنام طرازی کی بھرمار ہوتی ہے۔ جعفر زٹلی کی ہجویات اسی اسلوب کی نمایاں مثالیں ہیں۔ ہجو کی بدنامی زیادہ تر اسی اسلوب کی وجہ سے ہے۔

ہجو اور نقاد

صنفِ ہجو ابتدائی دور میں کبھی سنجیدگی کی نظر سے نہیں دیکھی گئی اور ہمیشہ قابلِ نفرت سمجھی گئی۔ جعفر زٹلی ہمیشہ اپنی ہجویات کی وجہ سے موردِ عتاب رہے اور آخر میں فرخ سیر نے انھیں قتل کرا دیا[1]۔ لیکن صنفِ ہجو کے لیے سودا کا دم غنیمت ثابت ہوا۔ انھوں نے اس کی ادبی حیثیت کو نمایاں کیا اور سماجی موضوعات سے متعلق ہجویات لکھ کر اس صنف کو ادب میں ایک نمایاں جگہ دی۔ تذکرہ نویسوں نے بھی ہجو نگار شعراء کا ذکر مناسب نہیں سمجھا۔ جعفر زٹلی کے بیان میں آزاد نے 'آبِ حیات' میں "زٹلی کا اعتبار کیا؟" لکھ کر اس کے ذکر سے پہلو تہی کی۔ ابتداءً ہجو دراصل اس کی مستحق بھی تھی کیونکہ قدماء کی ہجویات میں کوئی ایسی بات یا خوبی نظر نہیں آتی جس کی وجہ سے انھیں کوئی مخصوص ادبی اہمیت دی جاسکے سوائے اس کے کہ وہ اردو کے ابتدائی نمونے ہیں۔

سودا کے ذکر میں البتہ مختلف تذکرہ نویسوں نے پہلی بار ہجو کی ادبی حیثیت کو تسلیم کیا ہے لیکن پھر بھی سودا ان کے طنز و تشنیع کے نشانہ بنے رہے۔ شیخ چاند نے 'سودا' میں سودا کی ہجویات سے متعلق ایک باب قائم کر کے ہجو کی اہمیت اور اس کی ادبی خوبیوں کی بخوبی نشان دہی کی۔ ان کے علاوہ مولانا عبدالسلام ندوی نے "شعر الہند" حصہ دوم میں اردو کی انواعِ شاعری پر ادبی حیثیت سے ریویو کرنے کی غرض سے ہجو کا ایک مستقل باب قائم کیا لیکن انھوں نے ہجو کو ایک جداگانہ صنف کی حیثیت سے سامنے نہیں رکھا البتہ عربی شاعری اور تنقید کی روشنی میں مندرجہ ذیل اصولوں کا تعین کیا۔

"(۱) ہجو میں کسی کے جسمانی عیوب کا ذکر نہیں کرنا چاہیئے

(۲) ہجو میں اصلی اور سچے عیوب کا ذکر کرنا چاہیئے

(۳) شریف اور بلند مرتبہ اشخاص کی ہجو میں تصریح کے بجائے تعریض سے کام لینا چاہیئے۔

(۴) ہجو میں ہمیشہ اختلافِ مراتب کا خیال رکھنا چاہیئے

(۵) ہجو میں اشعار کی تعداد بھی محدود ہونی چاہیئے۔"

اگر مولانا کے وضع کردہ اصولوں کی روشنی میں ہجو گوئی کی بنیاد ڈالی جائے تو ایسی ہجویات جذبات سے عاری پھیکی اور اخلاقی وعظ سے زیادہ نہ ہوں گی۔ مولانا ہجو سے صرف ذاتی یا شخصی ہجویات مراد لیتے ہیں اور ان ہجویات کو فراموش کر دیتے ہیں جو سماجی موضوعات پر ہیں اور دراصل ہجو کے بلند پایہ نمونے ہیں چناں چہ ہجویات پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ان بزرگوں کی (یعنی شاکر ناجی، میر ضاحک، سودا، بقاء اور انشاء) ہجویات صرف موزوں گالی گلوچ ہیں جو ہجو گوئی کے تمام محاسن سے خالی ہیں۔"

اپنے نظریہ کی روشنی میں ان کا خیال ہے کہ

"مرثیوں میں بعض موقعوں پر جستہ جستہ جو ظریفانہ اشعار آ گئے ہیں ان کو صحیح ہجو کی مثال میں پیش کیا جا سکتا ہے۔"

---

[1] کلیاتِ جعفر زٹلی مطبوعہ لکھنؤ صہ ۴۸

ان کی نظر میں حالی کے یہاں ہجو گوئی کے جملہ عناصر ملتے ہیں۔ سودا کی معاشرتی اور سماجی ہجویات سے مولانا کی پہلو تہی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ہجو کے سرمایہ کو صرف گالی گلوچ سمجھتے ہیں۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اپنی کتاب 'طنزیات و مضحکات' میں ہجو کی ادبی اہمیت کو تسلیم کیا ہے لیکن وہ بھی ہجو اور طنز میں بنیادی فرق محسوس نہ کرسکے جیسا کہ ان کی رائے سے ظاہر ہے۔

" بہترین طنز کی اساسی شرط یہ ہے کہ وہ ذاتی عناد و تعصب سے پاک اور ذہن و فکر کی بے لوث برہمی یا شگفتگی کا نتیجہ ہو اس معیار پر سودا کی ہجویں تمام و کمال پوری نہیں اترتیں۔"

ہجو کی صنفی اہمیت تسلیم کرنے میں کلیم الدین جیسے کٹر مغرب پسند پیش پیش ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب 'سخن ہائے گفتنی' میں ہجو کے مرتبہ سے بڑی اچھی بحث کی ہے اور ظرافت، طنز اور ہجو کا فرق نمایاں کیا ہے اور ہجو کو ان سب پر فوقیت دی ہے۔

عہد حاضر کے بعض دوسرے نقادوں نے بھی ہجو کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اُسے صنف کی حیثیت دی ہے۔ پہلے نقادوں کی بے نیازی بڑی حد تک ہجو کی سماجی حیثیت، افادیت اور ہمہ گیری سے ناواقفیت کی بنا پر تھی۔ آج جب سماجی پس منظر کی روشنی میں ہجویات کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو اس کی قدر و قیمت، افادیت اور ہمہ گیری کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

کرشن موہن

آس اور یاس

تیرا غم ہے، کیسے کم ہو
پائندہ ہے یہ گنجینہ
اشکوں کی برسات لگی ہے
آپہنچا ساون کا مہینہ
ارمانوں کے بارِ گراں سے
ڈوب نہ جائے دل کا سفینہ
اپنے دل میں میل نہیں ہے
اپنا سینہ ہے آئینہ
سازِ تمنّا محفل محفل
سوزِ تمنّا سینہ سینہ

دیں ہو کہ دنیا راس نہیں ہے
دل کو سکوں کی آس نہیں ہے
اپنے پاس نہیں ہیں ہم بھی
تو جو ہمارے پاس نہیں ہے
کیسی ہیں یہ آس کی کلیاں
رنگ نہیں، بو باس نہیں ہے
پاسِ وفا کا دعویٰ اُن کو
جن کو وفا کا پاس نہیں ہے
اپنی زیست ہے غم کی محفل
خوشیوں کا اجلاس نہیں ہے

تمکین کاظمی

ترکی نورمحلی

ترکی کا سلسلۂ نسب چند واسطوں سے فردوسی طوسی تک پہنچتا تھا، ان کے دادا نادر شاہ کے عہد میں ہرات سے آکر لاہور میں مقیم ہو گئے تھے، ان کے والد سکھوں کے عہدِ حکومت میں شہر نورمحل مضافات لاہور میں جاکر رہ گئے اور سردار نور محمد ہراتی کی لڑکی سے شادی کرلی، ان کی والدہ چونکہ ایرانی النسل اور ہرات کی تھیں اس لئے فارسی ان کی مادری زبان تھی، یوں تھوڑی بہت پنجابی بھی بول لیتی تھیں، اسی لئے ترکی کو اپنی مادری زبان فارسی ہونے کا فخر تھا۔

ترکی کے والد نے سو سال سے زیادہ عمر پائی۔ اگرچہ وہ شعر کہنا پسند نہ کرتے تھے مگر حلِ معنیٔ اشعار میں انھیں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ سات زبانیں جانتے تھے اور سات قلم لکھتے تھے۔ چونکہ ترکی بچپن سے شاعری سے دلچسپی رکھتے تھے اس لئے ان کے والد منع کرتے تھے کہ شاعری نہ کیا کرو۔ ایک روز ایک لاہوری شاعر جو اپنے تئیں شاہ آفرین کی اولاد بتاتے تھے آئے اور ان سے کہنے لگے کہ میں نے ایک مصرع کہا ہے مگر دوسرا مصرع نہ پہنچا سکا۔ تم مصرع کہہ دو۔ انھوں نے کہا کہ میں تو شعر نہیں کہتا البتہ میرا لڑکا شعر گوئی سے دلچسپی رکھتا ہے شاید وہ مصرع لگا دے چنانچہ ترکی کو بلاکر انھوں نے کہا کہ اگر اس مصرع پہ مصرع لگا سکو تو میں تمھیں شعر کہنے کی اجازت دے دوں گا۔ ترکی نے مصرع پوچھا تو شاعر نے سنایا ع

شبم منظرِ خم زلف مشکفام تو بود

ترکی نے فوراً مصرع پہنچایا ع

اسیر طائرِ نظارہ ام بدام تو بود

اس مصرع کو سبھوں نے پسند کیا اور ترکی کے والد نے نہ صرف انھیں شعر کہنے کی اجازت ہی دی بلکہ ناطق مکرانی کا شاگرد بھی کرا دیا۔

ترکی کا نام غلام احمد تھا مگر جب وہ غوث علی شاہ قلندر پانی پتی کے مرید اور فقیر ہو گئے تو غوث علی شاہ نے غلامی شاہ نام دیا انھوں نے غلامی تخلص اختیار کیا اور شہاب الدین واثق ہراتی اور پھر مولوی امام بخش صہبائی سے نہ صرف اصلاح لینی شروع کی بلکہ کتب درس اور عروض و قافیہ کی تکمیل بھی کی۔

ترکی جب کبھی صہبائی کا ذکر کرتے تو ان کا یہ شعر پڑھ کر جھومنے لگتے تھے ؎

دیدم سحر صہبائیٔ آشفتہ در میخانہ
شعری بلب ساغر بکف اوراق دیوان در بغل

ترکی نے مولوی رکن الدین مکلی سے بھی استفادہ کیا تھا اور ان سبھوں سے فارسی ہی کی اصلاح لی تھی مگر اردو زبان پر بھی انھوں نے تاخت کی تھی اور اردو شعر کہہ کر میر علی اوسط رشک لکھنوی کو دکھایا کرتے تھے۔

تیس سال تک ترکی نے تحصیلِ علم کی پھر سیر و سیاحت کے شوق میں گھر سے نکل پڑے۔ اسی سفر میں ایک دیوان موسوم بہ 'گلشنِ معنی' مکمل کیا اور 'فرخ نامہ' نام سے چار ہزار اشعار میں راماین والیٔ نابھہ کے حکم سے نظم کی جس کے صلے میں ریاست نابھہ سے

منصب جاری ہوا جو انھیں تا حیات ملتا رہا۔ اس طرح بائیس سال تک سیاحت کی اور دنیا بھر کا سفر کیا، بڑے بڑے لوگوں سے ملاقاتیں کیں۔ اس سفر کے حالات ان کے ایک شاگرد سید نواب جان تمنا نے رسالہ 'مخزن ترکی' میں شائع کئے ہیں۔ اسی سفر کے عجائبات میں مولوی اسمٰعیل جنتی سے ترکی کی ملاقات شامل ہے جو مسجد جامع منگرول میں ہوئی۔ چالیس سال کی عمر میں لارڈ میو اور راجگان کی طرف سے امیر الشعرا خطاب ملا۔

ترکی نے حسب ذیل تصانیف یادگار چھوڑی ہیں:۔

(۱) فرخ نامہ (رامائن) منظوم (۲) دیوان فارسی موسوم بہ گلشن معنی (۳) ساقی نامہ (۴) مثنوی گلزار محبت (۵) رسالہ بدر حسین (منظم) (۶) مثنوی صوت سرمد (۷) سرور الناظرین (نثر) (۸) نگبانگ ترکی (نثر) (۹) دیوان سرمایۂ پیری (۱۰) مثنوی طول امل (۱۱) مثنوی شکراب (۱۲) مثنوی ناز و نیاز (۱۳) تذکرۂ سخنوران چشم دیدہ (۱۴) مثنوی گلزار شہادت (۱۵) مثنوی جلال اختر (۱۶) مثنوی سعد و جمیلہ۔ (۱۷) تبسم کدہ (۱۸) دیوان سرمایۂ حیات (۱۹) دیوان شباب اردو۔

ان میں نمبر ۱ تا ۱۳ فارسی میں اور نمبر ۱۴ تا ۱۹ اردو میں ہیں۔ جو طبع ہو چکی ہیں سوائے دو کتب گلزار محبت اور گلزار شہادت کے، جن کے مسودے بے جدی ہو گئے تھے۔

ترکی نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ مختلف ریاستوں میں گزارا۔ آخر عمر میں ۱۳۱۳ھ میں حیدر آباد پہنچے اور یہاں پہنچ کر پاؤں توڑ کر بیٹھ رہے صرف دربار دہلی کے موقع پر مہاراجہ کشن پرشاد بہادر کے ہمراہ دہلی گئے اور پھر واپس آ کر حیدر آباد ہی میں رہے۔

یہ حالات جو اوپر بیان کئے گئے ہیں میں نے ان کے تذکرۂ سخنوران چشم دیدہ مطبوعہ ۱۳۳۳ھ سے لئے ہیں جو خود ان کے لکھے ہوئے ہیں۔ ان حالات کے اختتام پر خود ترکی نے لکھا ہے:

" سال عمر من بہ نود رسیدہ لیکن ہزار ہزار بلکہ بے شمار
شکر پروردگار عالمیان است کہ ہنوز تاب و تنم و دندان مستحکم
چون جوانان سی سالہ است و این ہمہ فیض صحبت حضرت
مولوی محمد اسمٰعیل است۔"

ترکی نے گلے زئی خاندان میں شیخ سکندر بخش کی بیٹی سے شادی کی تھی یہ خاندان جالندھر کا مشہور خاندان تھا۔ چنانچہ شیخ غلام قادر گرامی اسی خاندان کے فرد اور ترکی کے حقیقی سالے تھے۔ چونکہ گرامی بچپن ہی میں یتیم ہو گئے تھے اس لئے ترکی ہی نے ان کی تعلیم و تربیت کی اور انھیں لکھایا پڑھایا بلکہ رموز شاعری سے بھی واقف کرایا اور اپنے بال بچوں کی طرح پال پوس کر بڑا کیا۔ ترکی جہاں جہاں رہے گرامی بھی ساتھ ساتھ رہتے تھے مگر کپورتھلہ کے قیام کے زمانے میں گرامی سے کوئی بے اعتدالی ہو گئی اور ترکی بگڑ گئے۔ چنانچہ گرامی کی ہجو تک کہہ دی۔ ترکی کا پہلا دیوان موسوم بہ گلزار صدیقی، جو قیام مانگرول کے زمانے میں مکمل اور طبع ہوا ہے ان کانٹوں سے بھرا ہوا ہے۔ گرامی کا قصور یہ تھا کہ ابتداً انھوں نے ترکی کی شاگردی سے انکار کیا اور پھر شاید ترکی سے برابری بھی کی یا مقابلہ کیا اور ممکن ہے کہ ترکی کا کچھ کلام بھی جو ترکی نے گرامی کی ابتدائی شاعری کے زمانے میں دیا تھا اپنے نام سے مشہور کیا ہو۔ بس یہی فرد جرم گرامی پر عائد ہوئی اور ترکی نے کہنا شروع کیا ؎

زادۂ سگ گویم آں ناپاک مادر زاد را
آنکہ بعد از کسب فن عق عقت کند استاد را
ہندی و ترکی بود یکساں بچشم ناشناس
روز و شب ہم رنگ باشد کور مادر زاد را

گر گرامی ز بیاضم دُرِ مضمون برداشت
چیست غم تشنہ لبے قطرہ ز جیحون برداشت
وارث حضرت نیداست گرامی امروز
از بیاضم ہمہ تا معنی موزوں برداشت

ترکی کے غصے کا پارہ اتنا چڑھا ہوا تھا کہ والیٔ مانگرول کی مدح میں قصیدہ کہتے کہتے

" این شش شعر در شکایت گرامی شاگرد خود نوشتہ کہ
اکثر بعض مضامین و بعض اشعار بغارت بردہ "

ہجو شروع کر دی۔ مگر یہ غصہ چند ہی روز کے بعد کم ہو گیا اور جب گرامی ۱۸۸۸ء میں حیدر آباد گئے تو ترکی کا دل صاف تھا۔ چنانچہ اسی زمانے میں یہ شعر کہا تھا ؎

اوتی از داغ وگرامی پرسشش تہ آکی خبر
چوں نسیم آں کس کہ از باغ دکن آید بردل

اس کے بعد خود ترکی بھی ۱۳۱۳ھ میں حیدرآباد آگئے۔ ترکی نے اپنی آمد حیدرآباد کی تاریخ کہیں نہیں لکھی ہے اور نہ کسی اور ذریعہ سے یہ معلوم ہو سکتی ہے البتہ ترکی کی تنخواہ کی اجرائی کی مسل (فائل) میں ان کی ایک درخواست موجود ہے جو بڑی ہی دلچسپ ہے، ملاحظہ کیجیے

یا معطی السائلین

اے سر برا امیر ملک دکن　　　تو رہے شاد تیرا دشمن رنج
بیرا ہو جائے کچھ مقرر آج　　　بہر ہا وا فرید شکر گنج

بہ مسافر دور رو درانہ غریب الدیار با مید روزگار از عرصۂ یک سال و چار ماہ در دولت پر حاضر ہے۔ تنگ اس قدر ہوں کہ زیست سے تنگ ہوں

نے در روز خورشش و نے در شب خواب
آفتاب دولت و اقبال درخشاں باد

عرضـــــــ
کمترین ترک علی شاہ ترکی امیدوار
یکم ماہ رجب ۱۳۱۴ھ

یہ بے ڈھنگی عرضی مدار المہام دکن کے ملاحظہ میں پیش کی گئی تھی۔ اس سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ ترکی ماہ ربیع الاول ۱۳۱۳ھ میں حیدرآباد آئے ہیں، دوسری خصوصیت ان کا بے ڈھنگا پن تو عرضی کے لفظ لفظ سے نمایاں ہے۔

ترکی کی کرامت دیکھیے کہ اسی بے ڈھنگی عرضی پہ مدار المہام نے ۱۷۔رجب ۱۳۱۴ھ کو تجویز فرمائی کہ ایک سو پچاس روپیہ تنخواہ جاری کی جائے۔ چنانچہ اسی تاریخ سے ڈیڑھ سو روپے ترکی کو ملنے لگے۔ ترکی کی یہ عرضی منسرحۂ مدار المہام مثل (فائل) نشان (۱۲۷) ۱۳۰۶ف میں موجود ہے۔

ترکی کثیر العیال تھے دو لڑکیاں اور کئی لڑکے تھے۔ خاندان کے کچھ اور افراد بھی ساتھ رہتے تھے اس لئے تنخواہ کافی نہ ہوتی تھی۔ ان حالات میں انھوں نے مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر شادؔ کے دربار میں رسائی پیدا کی اور مہاراجہ بہادر نے اپنا فارسی کلام انھیں دکھانا شروع کیا اور سو روپیے ماہوار تنخواہ اپنی اسٹیٹ سے مقرر کر دی۔ عید بقرعید، ہولی، دیوالی پہ سرفرازیاں الگ ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ علاّمہ طوبیٰ شوستری، نواب صفت اَنگی جنگ (نواب ناڑبن)، نواب ضیاء یار جنگ، نواب وزیر الدولہ، نواب سیف الملک رحمٰن علی پاشا طلسمی وکیل، نواب صولت جنگ، سیّد منتجب الدین تجلّی، محمد علی خاں ناظم بھی مالی امداد و اعانت کرتے رہتے تھے۔

والد مرحوم (تجلّی) اپنا فارسی کلام طوبیٰ شوستری کو دکھایا کرتے تھے۔ مگر جب ترکی سے دوستی ہو گئی تو انھیں سے مشورہ کرنے لگے۔ اس طرح دونوں میں پُرخلوص مراسم پیدا ہو گئے تھے۔ ترکی ہمیشہ بلکہ تقریباً روزانہ غریب خانہ پر قدم رنجہ فرمایا کرتے تھے۔ میری والدہ اور نانی بھی ترکی کی بڑی معتقد تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میری ولادت سے پہلے ایک لڑکا تولد ہوا تھا اور ترکی نے اس کی تاریخ ولادت کہہ کر اپنے ہاتھ سے لکھ کر دی تھی۔ والدہ نے اس قطعۂ تاریخ کو خوش نویس سے لکھوا کر فریم کر کے مکان میں رکھنا چاہا۔ جب یہ قطعہ خوش نویس کو دیا جانے لگا تو ترکی نے منع کیا کہ اس قطعہ کو نہ لکھواؤ۔ اب جو بچّہ ہوگا تو میں دوسری تاریخ کہہ کر خوش نویس سے لکھوا کر دوں گا اُسے گھر میں لگانا۔ اس وقت یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آئی مگر چند مہینوں کے بعد ہی اس لڑکے کا انتقال ہو گیا اور اس کے بعد میری ولادت ہوئی تو ترکی نے یہ قطعۂ تاریخ کہا:

مشکوئے تجلّی چوں پسر شد　　　فلک گفتہ کہ آمد بر زمیں ماہ
سر اعدا بریدہ گفت ترکی　　　تجلّی را مبارک باشد ایں ماہ
ا　　　۱۳۲۰ھ

اور اس قطعہ کو بڑے ہی نفیس زرافشاں کاغذ پر خوش نویس سے لکھوا کر اطراف سنہرے بیل بوٹے بنوا کر ایک عمدہ فریم میں لگا کر دیا کہ اسے گھر میں لگاؤ۔ میری نانی اسے ترکی کی کرامت پہ محمول کرتی تھیں اور ان کی بڑی معتقد تھیں، اس کے علاوہ ایک واقعہ اور ہوا کہ میرے والد ایک دفعہ سخت بیمار ہو گئے۔ اطبّا نے ناامیدی ظاہر کر دی اس وقت ترکی نے ایک پورا کفن منگوا کر نہایت نفیس کھانا پکوایا اور ایک فقیر کو یہ کھانا پیٹ بھر کھلا کر کفن اور میّت کا پورا سامان دے کر رخصت کر دیا اور

ایک بکرا منگوا کر اس کو ذبح کر کے اتنے ہی ٹکڑے کرائے جتنے سال کی والدہ کی عمر تھی اور ہر ایک ٹکڑے کے ساتھ ایک روپیہ پانچ پیسے رکھ کر فقیروں میں تقسیم کرا دئیے۔ اتفاق سے دوسرے روز سے والدہ کو صحت ہونے لگی اور وہ دس پندرہ روز میں صحت یاب ہو گئیں۔

یہ دونوں کرامتیں ترکی کی قلندری پر دال تھیں والدہ تو صرف ان کا احترام کرتی تھیں مگر نانی تو بس انھیں زندہ ولی سمجھتی تھیں۔ جب کبھی گھر میں فاتحہ نذر نیاز ہوتی سب سے پہلے ترکی کے گھر حصہ جاتا اور جو میٹھا گھر میں تیار ہوتا ترکی کے گھر بھجوایا جاتا کیونکہ میٹھا ترکی کو بہت پسند تھا۔ جب بھی ترکی غریب خانہ پر آتے کڑک کر صدا لگاتے "دودھ ملیدہ اللہ ہی دے گا" ترکی ابھی دیوان خانہ میں بیٹھنے بھی نہ پاتے کہ ان کے لئے کوئی نہ کوئی میٹھا اندر سے آجاتا اور اگر کوئی میٹھا موجود نہ ہوتا بالائی اور چائے تو ضرور آجاتی اور وہ پیالی بھر بالائی میں تھوڑی سی چائے اور بہت سی شکر ڈال کر ایک لب بند لبریز پیالی بنا لیتے جس کا نام انھوں نے "لب دہر" رکھا تھا۔

ترکی کو اپنے قلندرپن پر ناز تھا اور حقیقت میں وہ تھے قلندر، سب کے دوست اور سب پر مہربان۔ سب کو ایک ہی لکڑی سے ہانکتے اور کسی کی رورعایت نہ کرتے تھے۔ داد دینے میں بخیل اور اعتراض کرنے میں سخی واقع ہوئے تھے صرف ان میں خرابی یہ تھی کہ وضعداری مطلق نہ تھی کسی کی رورعایت مطلق نہ کرتے اور نہ لگی لپٹی رکھتے۔ طبیعت میں اکھڑپن اور جلد بازی بہت تھی صلاحیت اور بردباری مطلق نہ تھی۔ جلدی ہر بات میں تھی۔ خفا جلد ہو جاتے پھر جلد ہی خوش بھی ہو جاتے، شعر بھی جلد کہتے، اصلاح بھی جلد دیتے، کھانے پینے چلنے پھرنے میں بھی جلدی کرتے۔

سفید پنجابی شلوار اور سفید کرتا (ایس، او کا) گھٹنوں سے نیچے تک لمبا پہنتے تھے اس پر صدری (واسکٹ) ہوتی جو رنگین اور عموماً شوخ رنگ کی ہوتی تھی۔ کبھی کبھی شیروانی اور لمبا کوٹ بھی پہن لیتے تھے۔ سر پر اکثر پٹو باندھتے یا کبھی ترکی ٹوپی پہنتے۔ شملہ (صافہ) بہت کم باندھتے تھے۔ صدری کے جیب میں ایک بڑی سی جیبی گھڑی (ریلوے راسکوپ) رہتی تھی جس کی ٹک ٹک دور تک سنائی دیتی تھی اور چاندی کا موٹا سا توڑا (زنجیر) لٹکتا رہتا تھا۔ ماشاء اللہ پورے قد کے آدمی تھے۔ ہڈی چوڑی، ہاڑ مضبوط، غذا بھی خوب تھی، خوش خوراک اور پُر خور بھی تھے۔ آخر میں افیون بھی کھانے لگے تھے اور بمبو کا شوق بھی فرماتے تھے۔

مشاعروں میں پڑھنے کا انداز بھی نہایت اچھا تھا نیم ترنم سے پڑھتے تھے۔ آواز بڑی گرج دار تھی۔ لہجہ نہایت مردانہ اور سپاہیانہ تھا۔ فارسی بالکل ایرانی لہجے میں بولتے تھے۔ غزل اس دھوم سے پڑھتے کہ محفلِ مشاعرہ چہک اٹھتی۔ کبھی دُہرے ہو جاتے۔ کبھی صف سے آگے نکل جاتے کبھی ہاتھ چلا کر سمع گرا دیتے کبھی کھڑے ہو جاتے، غرض ان کی غزل خوانی ایک تماشا ہوتی تھی۔

ایک روز مشاعرے میں ایک رباعی سنائی ؎

دیکھو برتر کو جو غالب کو نہیں دیکھا ہے
ذوق کی گر ہے تمنا تو رسا کو دیکھو

نادر علی برتر شاگرد ظہیر دہلوی اور غلام مصطفیٰ رسا شاگرد داغ کی طرف اشارے کئے پھر مصرع سنایا

اور ناسخ کی جو صورت کی ہے خواہش دل میں

مصرع پڑھتے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے آگے بڑھ کر بیچوں بیچ پہنچے اور بائیں پاؤں کے انگوٹھے کے بل ٹھہر کر سیدھا پاؤں اُٹھا دیا اور ایک گول چکر لگایا اور اس طرح کہ کرتے کا دامن پیشوازکی طرح پھیل گیا پھر مصرع سنایا

ترکی مست کے انداز و ادا کو دیکھو

سارا مشاعرہ دنگ رہ گیا اور آپ اپنی مستی کا اظہار فرماتے رہے۔ ایسی حرکتیں مشاعروں میں ہمیشہ کرتے تھے۔

ہزل سے بھی طبیعت کو خاصی مناسبت تھی۔ گالیاں ڈپٹی ہوئی دیتے کہ الامان۔ ہزل خوب کہتے تھے۔ ہر جمعرات کی رات ایک مخصوص مجمع ہزل کہنے والوں کا آپ کے گھر پر ہوتا۔ والد مرحوم اس جمعرات پارٹی کے بہت خلاف تھے۔ وہ کبھی نہ جاتے تھے اور نہ کوئی سنجیدہ ملنے والا ہی شریک ہوتا۔ مجھے بھی والد ہمیشہ منع کرتے رہتے کہ جمعرات کی شام کو ترکی کے گھر نہ جانا۔ مگر ایک روز اتفاق سے میں

جا پہنچی۔ دیکھتا کیا ہوں کہ دس بارہ حضرات بیٹھے ہوئے ہیں اور ہزل خوانی ہو رہی ہے۔ اس وقت ترکی اپنی ہزل سنا رہے تھے۔ کوئی شعر اس قابل نہ تھا جو نقل کیا جا سکے۔

ہجو گوئی میں بھی کمال تھا۔ ہجو خوب اور بہت کہتے تھے۔ جہاں کسی پر خفا ہوتے ہجو کہنے لگتے۔ اعتراض کرنا ان کی فطرت تھی۔ اپنا پرایا دوست دشمن سب پر اعتراض کرتے۔ بعض دفعہ خود اعتراض کرتے اور خود ہی جواب دیتے ورنہ لتاڑ ڈالتے۔ مشاعروں میں تو لوگوں کا ناک میں دم کر دیتے۔ خود اعتراض کرتے، دوسروں سے اعتراض کراتے۔ خود بحث کرنے لگتے۔ لطف خاص یہ کہ آج جو اعتراض آپ کرتے کل وہی اعتراض کوئی اور کرتا تو آپ معترض کے خلاف بحث کرنے لگتے۔ اور اعتراض کو غلط ثابت کر دیتے۔ سند کے لاکھوں شعر یاد تھے۔ ایک ایک بات کے لئے سو سو شعر سند میں سنا دیتے۔ اور اگر کسی استاد کا شعر یاد نہ آتا یا نہ ملتا تو خود کہہ کر فی البدیہہ سناتے اور کسی نہ کسی استاد کا نام لے دیتے۔ کس میں اتنی ہمت تھی جو ان کی ہٹ دھرمی کا مقابلہ کرتا۔ آخر میدان انہیں کے ہاتھ رہتا۔

ان کے اپنے شاگردوں کے مشاعرے میں داد دی جاتی تو خود تن کر بیٹھ جاتے اور قریب بیٹھنے والوں سے کہتے "کیوں کیسی غزل بنا دی ہے میں نے، سارا مشاعرہ داد دے رہا ہے"۔ اگر بدقسمتی سے کوئی شخص ان سے غزل کہلوا کر مشاعرے میں سناتا اور داد ملتی تو لوگوں سے کہہ دیتے کہ "میں نے غزل کہہ دی ہے ورنہ یہ کیا کہہ سکتا"۔

غرض عجیب و غریب بزرگ تھے۔ اس وقت میرے سامنے ان کا کوئی دیوان بھی نہیں ہے۔ چند شعر تذکرۂ سخنوران چشم دیدہ سے لے کر اور مجھے جو یاد ہیں ان میں سے چند "تبرکاً" نقل کرتا ہوں ؎

دل را بہ نیمِ نرگسِ مستانہ شکستم
این شیشۂ گلرنگ بہ پیمانہ شکستم

دل را خدنگِ غمزۂ آفت پسند برد — گرگ از میانِ گلۂ من گوسپند برد
گر بکوئے تو شبے دود فغانم گزرد — بگزرد بر دلِ تو آنچہ بجانم گزرد
نورِ قمر ز عکس چراغم گرفتہ اند — آتش برائے طور ز داغم گرفتہ اند

گر نیاید یار امشب جامِ مل خواہم شکست
گردنِ مینا برنگِ شاخِ گل خواہم شکست
اعتبارِ توبہ ام ہرگز مکن اے پارسا
در خزاں گر نشکنم در فصلِ گل خواہم شکست

بہ بزمم لختِ دل دزدیدہ جاناں می رود بیروں
بہ اندازیکہ گلچیں از گلستاں می رود بیروں
نخواہم بر ہمیٔ بزمِ عیش دوستاں دیدن
بآں چشمے کہ دیدم فصلِ گل نتواں خزاں دیدن
بہ مشکیں طرہ اش تابِ رُخِ پُر نور می جویم
کلیمم در شبِ تار آتشے از طور می جویم

صد پارہ دل بہ محفلِ جانانہ بردہ ایم — پیمانۂ شکستہ بہ مے خانہ بردہ ایم
رُخ تو می نگرم نگہ بے نقاب منم — کسیکہ چشم نپوشد ز آفتاب منم
بیاموز از طریقِ سایہ آئینِ ادب ترکی
کہ بنشیند چو بنشینی و برخیزد چو برخیزی
مفگن نگہ مست بہ دلہائے شکستہ — ریزد نہ کسے بادہ بہ مینائے شکستہ
از دل خیزد صدا در کوفتن — می خورد بے مغز بر سر چوب ہا
در سرائے ما زہر راہے کہ میخواہی بیا — کلبۂ ما را نشانے از در و دیوار نیست
لکنت اندر دہنِ یار تماشا دارد — در صدف ایں درِ شہوار تماشا دارد

ترکی فارسی کے استاد اور زبان فارسی کے بڑے ماہر تھے مگر انہیں اردو شاعری کا جنون بھی تھا اور خواہ مخواہ اردو پر بھی کرم فرماتے تھے چنانچہ "سرمایۂ حیات" کے نام سے تین سو صفحات کا ایک دیوان ۱۳۳۲ھ میں شائع کر چکے تھے۔

حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ فارسی کا ایک استاد اردو کے پست اشعار پر ناز بھی کرتا تھا۔ بہرحال یہ معجون مرکب اور متضاد قابلیتوں کا مظہر جس کے ہزاروں کارنامے سینکڑوں لطیفے، بیسیوں قصے سامنے آجاتے ہیں ۲۵ جمادی الثانی ۱۳۳۷ھ مطابق ۲۸ مارچ ۱۹۱۹ء کو حیدرآباد میں اللہ کو پیارا ہو گیا۔

حق مغفرت کرے عجیب آزاد مرد تھا

رُوس کے صدر مارشل وروشلوف
کی دِلّی میں تشریف آوری



صدرِ جمہوریۂ ہند ڈاکٹر راجندر پرساد
صدر وروشلوف کا خیر مقدم کر رہے ہیں

صدر وروشلوف کا جلوس نئی دلّی کے بازار سے گزر رہا ہے

نوجوانوں کے پہلے سالانہ میلے میں
علاقائی رقص کے مظاہرے

پنجاب کا بھنگڑا ناچ

آندھرا کا ماتھری رقص





گجرات کا پھول گربا ناچ



کیرالہ یونیورسٹی کے طلباء کا رقص



کیرالہ کی شری کماری
بھرت ناٹیم کے انداز میں



راجستھان کا آدی واسی شکاری ناچ

صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرساد کے ہاتھوں دُرگاپور
میں فولاد کے کارخانے کی پہلی بھٹی کا افتتاح



ـسپالی پارلیمنٹ کے ممبر
ـیرِ اعظم پنڈت نہرو کے ساتھ

یار جامی

اختر شیرانی کی چند مشہور نظمیں

دورِ جدید کی شاعری میں جن شاعروں کا نام فہرستِ اوّل میں آتا ہے ان میں راجستھان کی سابقہ ریاست ٹونک کے شاعر اختر شیرانی کا نمایاں مقام ہے۔

اختر شیرانی کو ادبیت ورثے میں ملی تھی۔ ان کے والدِ ماجد حافظ محمود خاں شیرانی اردو کے بہت بڑے عالم اور محقّق تھے اور لاہور کے اورینٹل کالج میں پروفیسر تھے۔

اختر نے اپنی ابتدائی تعلیم کے بعد مزید تعلیم کے لئے اپنے والد کے قدم بہ قدم لاہور کی علمی اور ادبی فضا میں اپنی زندگی کے قیمتی لمحے گزارے اور یہیں سے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا کی اور لاہور ہی سے 'خیالستان' 'بہارستان' اور 'رومان' جیسے ادبی پرچے نکالے۔ ان کی زندگی ہی میں ان کے کلام کے کئی مجموعے بھی شائع ہو چکے تھے۔ ادبی خدمات کے جذبے کے تحت ۱۹۳۷ء میں انھوں نے اردو کی مشہور 'جامع اللغات' کی ادارت کی۔ لیکن اس ہونہار شاعر کی عمر نے وفا نہ کی اور ۴۳ سال کی عمر میں (۱۹۴۸ء میں) ان کا انتقال ہو گیا اور اردو زبان ایک مخلص خدمت گزار سے محروم ہو گئی۔

اختر شیرانی کو ان کی زندگی ہی میں ان کی خدمت کا کما حقہ صلہ مل گیا اور وہ بہت جلد عوام میں شہرت پا گئے۔ کیونکہ اختر شیرانی فطرتاً رومانی شاعر تھے اور عوام کی اکثریت شاعری کے اہم موضوع رومان ہی کو زیادہ پسند کرتی ہے۔ رومان سے ہٹ کر بھی انھوں نے کئی نظمیں مختلف موضوعات پر لکھیں اور کئی ایک نیچرل نظمیں بھی کہیں۔ ان کی کئی نظمیں مختلف جامعات کے اردو کورس میں شامل ہیں۔

جیسا کہ آلِ احمد سرور نے جدید شاعری کے بارے میں کہا ہے کہ جدید اردو شاعری میں اردو کی قدیم روایات کے احساس کے ساتھ فکر و فن کے نئے رنگ و آہنگ کی بھی جلوہ گری ہے حقیقتاً اور کلیتاً یہ ساری باتیں اختر شیرانی کے یہاں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔

اختر دراصل نظم گو شاعر تھے۔ گو انھوں نے کئی غزلیں بھی کہی ہیں لیکن فطری میلان نظم کی طرف تھا اور اسی لئے غزلوں سے زیادہ ان کی نظموں کو شہرت حاصل ہوئی۔ اور ان میں بھی چند نظمیں تو اتنی مشہور ہوئیں کہ زبان زدِ عوام ہو گئیں اور لوگ ان نظموں کو اس طرح گنگنانے لگے جیسے بعض دلکش غزلیں گنگنائی جاتی ہیں۔

اختر نے اپنی نظموں میں اکثر جگہ دو ناموں کا تذکرہ بڑی شد و مد سے اور بہت ہی والہانہ انداز میں کیا ہے۔ ایک 'سلمیٰ' ہے جس کو اختر کی شاعری کی ہیروئن کہنا چاہیئے اور دوسرے 'ریحانہ' جو سلمیٰ کے بعد متاثر کرنے والا کردار ہے۔

بعض نقّادوں کا خیال ہے کہ سلمیٰ کوئی وجودی شخصیت نہیں ہے بلکہ اختر کا ایک خیالی پیکر ہے جس کی ایک قیاسی کردار سے زیادہ اہمیت نہیں۔ لیکن بعض کے نزدیک سلمیٰ ایک حقیقی روپ، ایک متاثر کن وجود ہے جس سے اختر اتنا متاثر ہوئے اور اتنے والہانہ انداز میں اس کا تذکرہ انھوں نے اپنی شاعری میں جگہ جگہ کیا کہ پڑھنے والے بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان کا والہانہ پن اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ سلمیٰ کا وجود تھا اور یقیناً تھا اور ریحانہ کے بارے میں بھی کچھ اسی طرح کے خیالات کا اظہار کیا جاتا

ہے اور یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ اختر نے سلمیٰ ہی کو مختلف ناموں سے یاد کیا ہے۔

چنانچہ اختر اس نظم میں جو سلمیٰ سے معنون ہے یوں رطب اللسان ہیں۔

بہارِ حسن کا تو غنچۂ شاداب ہے سلمیٰ
تجھے فطرت نے اپنے دستِ رنگیں سے سنوارا ہے
بہشتِ رنگ و بو کا تو سراپا اک نظارا ہے
تری صورت سراسر پیکرِ مہتاب ہے سلمیٰ
ترا جسم اک ہجومِ ریشم و کمخواب ہے سلمیٰ

اس بند میں صورت کو چاند سے تشبیہہ کوئی نئی نہیں ہے لیکن جسم کے تعلق سے ہجومِ ریشم و کمخواب کی تشبیہہ محبوب کی تعریفی تشبیہات میں ایک نیا اضافہ ہے۔

پھر آگے کہتے ہیں ؎

شبستانِ جوانی کا تو اک زندہ ستارا ہے
تو اس دنیا میں بحرِ حسنِ فطرت کا کنارا ہے
تو اس سنسار میں اک آسمانی خواب ہے سلمیٰ

اس بند میں اختر نے سلمیٰ کو اپنی جوانی کے شبستان کا ایک جیتا جاگتا اور جگمگاتا ستارہ کہا ہے گویا جس سے ان کی تاریک زندگی میں روشنی ہوئی ہے اور سلمیٰ کو حسن کے سمندر کے کنارے سے تشبیہہ دی ہے یعنی اس کے بعد حسن کی تلاش بے کار ہے کیونکہ سلمیٰ ہی حسن کی آخری حد ہے۔

اور آگے کہا ہے ؎

جہانِ قدس کا تو ایک نورانی فسانہ ہے
تجھے سلمیٰ دیارِ ناز کی اک ساحرہ کہئے
صنم آبادِ عفت کی مقدس کافرہ کہئے
ربابِ حسن کا تو ایک الہامی ترانہ ہے

سلمیٰ گویا جہانِ قدس کا ایک نور بھرا افسانہ ہے (جس کے پڑھنے سے عرفان حاصل ہوتا ہے) اور شہرِ ناز و ادا و عشوہ کے مکینوں میں سے ہے جو اپنے حسن کے سحر سے دوسروں میں امتیاز رکھتی ہے اور ایک ایسی ہستی ہے جو کافر ہونے کے باوجود اہلِ ایمان سے اپنی عفتِ کافرانہ کی پرستش کروانے پر قادر ہے۔

آخری بند میں کہتے ہیں ؎

پرستانِ لطافت کی تو اک رنگیں کہانی ہے
جواں فطرت کا تو اک گمشدہ خوابِ جوانی ہے

الغرض سلمیٰ کی تعریف میں اتنا کچھ کہہ دیا ہے کہ کچھ اور کہنے کی گنجائش ہی نہیں رہی۔

دوسری مشہور نظم ریحانہ کے تعلق سے ہے۔ اختر نے اس نظم میں ایک وادی کا تذکرہ کیا ہے جو ریحانہ کے وجود سے آباد تھی۔ کہتے ہیں ؎

یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی
وہ اس وادی کی شہزادی تھی اور شاہانہ رہتی تھی
کنول کا پھول تھی سنسار سے بیگانہ رہتی تھی
نظر سے دور مثلِ نکہتِ مستانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی

ایک جگہ اختر نے ریحانہ اور اس کی وادی کی محبت کی یاد میں قسم کھا کر کہا ہے ؎

بربِّ کعبہ اس کی یاد میں عمریں گنوا دوں گا
میں اس وادی کے ذرّے ذرّے پر سجدے بچھا دوں گا
جہاں وہ جانِ کعبہ عظمتِ بت خانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی

اس بند میں اختر نے ریحانہ کو 'جانِ کعبہ' اور 'عظمتِ بت خانہ' کہہ کر دیر و حرم کو خوب یکجا کیا ہے۔

اگلے بند میں کیفیاتِ عشق و جذباتِ محبت کا ذکر کرتے ہوئے اس کے اوصافِ والہانہ کے بارے میں لکھتے ہیں ؎

وہ اس ٹیلے پہ اکثر عاشقانہ گیت گاتی تھی
پرانے سورماؤں کے فسانے گنگناتی تھی
یہیں پر منتظر میری وہ بے تابانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی

ریحانہ کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار یوں کرتے ہیں ؎

یہیں بستی تھی اے ہمدم مرے رومان کی بستی
مرے افسانوں کی دنیا مرے وجدان کی بستی
یہیں ریحانہ بستی تھی یہیں ریحانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے اے ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی

اختر نے ریحانہ کو اپنے افسانۂ حیات کی دنیا اور رومان و محبت کی بستی کے 'اجنبا عی' ناموں سے یاد کیا ہے اور اس کے وجود سے اپنے وجدان کا اکمال ظاہر کیا ہے۔

نظم کے آخری بند میں ریحانہ کی توصیف یوں کی ہے ؎

گدازِ عشق سے لبریز تھا قلبِ حزیں اس کا
مگر آئینہ دارِ شرم تھا روئے حسیں اس کا
خموشی میں چھپائے نغمۂ مستانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی

اور آخر میں ایک شعر پر نظم اس طرح ختم کی ہے ؎

پیامِ دردِ دل اختر دئے جاتا ہوں وادی کو
سلامِ رخصتِ غمگیں کئے جاتا ہوں وادی کو

اختر کی ایک اور طویل رومانی نظم 'بستی کی لڑکیوں میں' بہت مشہور ہے جس کو انھوں نے ایک دیہاتی گیت کے نام سے موسوم کیا ہے اس میں بھی سلمیٰ کا ذکر اسی والہانہ انداز میں کیا ہے اور خاص طور سے اپنی رسوائی کا ذکر کیا ہے کہ ان کی رسوائی ہو رہی ہے محض سلمیٰ سے دل لگانے کی بنا پر، اور وہ بھی بستی کی حسین و شوخ لڑکیوں میں ۔ یہی ساری تفصیل اس نظم میں بیان کی ہے اور بہت ہی دل کش انداز میں بیان کی ہے۔

نظم کا پہلا بند ہے ؎

فریادیٔ جفائے ایام ہو رہا ہوں
پامالِ جورِ بختِ ناکام ہو رہا ہوں
سرگشتۂ خیالِ انجام ہو رہا ہوں
بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں

بدنام ہو رہا ہوں
سلمیٰ سے دل لگا کر

اپنے بارے میں بستی کی لڑکیوں کی چہ میگوئیوں کا ذکر اس طرح کیا ہے ؎

کہتی ہیں سب "یہ کس کی ترپا گئی ہے صورت
سلمیٰ کی شاید اس کے من بھا گئی ہے صورت
اور اس کے غم میں اتنی مرجھا گئی ہے صورت
مرجھا گئی ہے صورت کمھلا گئی ہے صورت
سنولا گئی ہے صورت
سلمیٰ سے دل لگا کر"

بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں

نیچے کے بند میں اختر شیرانی کی منظر نگاری بہت خوب ہے ۔ دیہاتی لڑکیوں کی شوخیوں اور چنچل پن اور ان کی چھیڑ چھاڑ کو (اپنے اور سلمیٰ کے تعلق سے) یوں پیش کیا ہے ؎

پنگھٹ پہ جبکہ ساری ہوتی ہیں جمع آکر
گاگر کو اپنی رکھ کر گھونگھٹ اُٹھا اُٹھا کر
یہ قصہ چھیڑتی ہیں مجھ کو بتا بتا کر
"سلمیٰ سے باتیں کرتے دیکھا ہے اس کو جاکر
ہم نے نظر بچا کر"
سلمیٰ سے دل لگا کر

بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں

سلمیٰ سے ان کے عشق کا چرچا روز بروز بڑھتا جاتا ہے ۔ جب لڑکیاں راتوں کو کام کاج سے فرصت پا کر کھیل کود اور رقص و نغمہ کا پروگرام بناتی ہیں تو موضوعِ سخن سلمیٰ اور "شہری نوجوان" ہی ہوتا ہے چناں چہ اس کے متعلق کہتے ہیں ؎

راتوں کو گیت گانے جب مل کر آتی ہیں سب
تالاب کے کنارے دھومیں مچاتی ہیں سب
جنگل کی چاندنی میں منگل مناتی ہیں سب
تو میرے اور سلمیٰ کے گیت گاتی ہیں سب
اور ہنستی جاتی ہیں سب
سلمیٰ سے دل لگا کر

بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں!

اور پھر بستی کی لڑکیوں کی سلمیٰ سے چھیڑ چھاڑ کا ذکر یوں کرتے ہیں ؎

کھیتوں سے لوٹتی ہیں جب دن چھپے مکاں کو
تب راستے میں باہم وہ میری داستاں کو
دُہرا کے چھیڑتی ہیں سلمیٰ کو میری جاں کو
اور وہ حیا کی ماری سی لیتی ہے زباں کو

کیا چھیڑے اس بیاں کو
سلمیٰ سے دل لگا کر
بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں!

اس کے بعد جذبۂ ترحم جو ان کے تعلق سے گاؤں کی لڑکیوں کے دلوں میں پیدا ہوا اس کو اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

کہتی ہے رحم کھا کر یوں ایک ماہ طلعت
"یہ شہری نوجواں تھا کس درجہ خوبصورت
آنکھوں میں بس رہی ہے اب بھی وہ بھولی رنگت
دو دن میں آہ کیا سے کیا ہو گئی ہے حالت
اللہ تیری قدرت!"
سلمیٰ سے دل لگا کر
بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں

اور اس پر ہی بس نہیں کرتیں۔ ان لڑکیوں میں سے ایک چنچل لڑکی آ کر یہ کہتی ہے ؎

اک شوخ چھیڑتی ہے اس طرح پاس آ کر
"دیکھو وہ جا رہی ہے سلمیٰ نظر بچا کر
شرمائے مسکرا کر آنچل سے منہ چھپا کر
جاؤ تا پیچھے پیچھے دو باتیں کر لو جا کر
کھیتوں میں چھپ چھپا کر"
سلمیٰ سے دل لگا کر
بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں

نظم کا آخری بند اسی چھیڑ چھاڑ کی ایک کڑی ہے۔ لیکن اس کے اختتام کا انداز بہت خوب ہے ؎

اک شوخ تازہ وارد سسرال سے گھر آ کر
سکھیوں سے پوچھتی ہے جس دم مجھے بتا کر
"یہ کون ہے؟" تو ظالم کہتی ہیں مسکرا کر
"تم اس کا حال پوچھو سلمیٰ کے دل سے جا کر
یہ گیت اسے سنا کر"
سلمیٰ سے دل لگا کر
بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں

ان تینوں نظموں کا ذکر میں نے تفصیل سے اس لئے کیا ہے کہ ان کا اختر شیرانی کی ذات سے بہت زیادہ تعلق ہے۔

ان کی ایک نظم "آج کی رات" ہے جو رومانی ہونے کے علاوہ نیچرل بھی ہے۔ اس میں انھوں نے وصال کی رات کے سارے جذبوں کو اسی بے ساختگی کے ساتھ قلمبند کیا ہے اور پہلے بند میں اس رات کی منظر نگاری کرنے کے بعد ایک جگہ یوں گویا ہیں ؎

غائبانہ جو ہمیں نامے لکھا کرتی تھی
دور سے ہم پہ دل اپنا جو فدا کرتی تھی
داد اشعار جو 'گمنام' دیا کرتی تھی
ہو کے بے پردہ جو پردے میں رہا کرتی تھی
سامنے ہوگی وہی شوخ ادا آج کی رات

اور آگے جذبات سے بھرپور ایک بند میں کہتے ہیں ؎

داستانِ دلِ بیتاب سنائیں گے انھیں
آپ ڈھیں گے گلے مل کے رلائیں گے انھیں
خود ہی پھر روٹھنے پہ ہنس دیں گے ہنسائیں گے انھیں
اور جرأت کی تو سینے سے لگائیں گے انھیں
نت نئے جذبوں کی ہے نشو و نما آج کی رات

لیکن آخری بند میں غالب کی طرح اس اندیشہ کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ آج کی رات تو ان سے بہت کچھ کہنے سننے کے بارے میں سوچ رکھا ہے۔ لیکن جب سامنا ہوگا یہ سب کچھ ہو بھی سکے گا کہ نہیں چنانچہ اسی اندیشے کے بارے میں کہتے ہیں ؎

ہم میں کچھ جرأت گویائی بھی ہوگی کہ نہیں
ہمتِ ناصیہ فرسائی بھی ہوگی کہ نہیں
شرم سے دور شکیبائی بھی ہوگی کہ نہیں
یوسفِ دل سے 'زلیخائی' بھی ہوگی کہ نہیں
آج کی رات اُف اے میرے خدا آج کی رات!

ایک نظم 'اعترافِ محبت' میں اپنی محبت کے اظہار کی جرأت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مسلسل غم سے تنگ آ کر اپنی محبت کی حقیقت کا افشا آج مجبور ہو کر رہا ہوں۔ پہلے بند میں اظہارِ محبت یوں کرتے ہیں ؎

لو آؤ کہ رازِ پنہاں کو رسوائے حکایت کرتا ہوں
دامانِ زبانِ خامشی کو لبریز شکایت کرتا ہوں
گھبرا کے ہجومِ غم سے آج افشائے حقیقت کرتا ہوں
اظہار کی جرأت کرتا ہوں
میں تم سے محبت کرتا ہوں

اور اب تک کی خاموشی اور مصلحتِ پوشیدگی کو یوں فاش کرتے ہیں ؎

مدت سے محبت کرتا تھا، سو جان سے تم پر مرتا تھا
راتوں کو میں روتا رہتا تھا، راتوں کو میں آہیں بھرتا تھا
ہاں راتوں کو آہیں بھرتا تھا پر تم سے کہتے ڈرتا تھا
آج اس کی جسارت کرتا ہوں
میں تم سے محبت کرتا ہوں

اس نظم کے دوسرے بندوں میں بھی یہی باتیں کہی گئی ہیں کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اتنی کہ اگر تم کہو تو چاند ستارے بھی توڑ کر تمہارے قدموں میں بچھا دوں۔ گو کہ مجھ میں اتنی 'طاقت' نہیں ہے لیکن تم چاہو تو میں اس کی بھی 'ہمت' کر سکتا ہوں۔ بہر حال اپنی محبت کی سچائی کا ہر طرح یقین دلانے کی کوشش کی گئی ہے۔

نظم 'اے عشق کہیں لے چل' میں انھوں نے عشق سے خطاب کیا ہے اور دنیا سے اپنی بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ دنیا پاپ کی بستی ہے اور ہمارا مقدس پیار یہاں پنپ نہیں سکتا اس لئے کسی ایسی جگہ لے چل جہاں یہ نفس پرست، کینہ توز اور لعنت گاہ کے باسی نہ بستے ہوں۔
اس لئے اس دنیا میں لے چل جو ؎

آنکھوں میں سمائی ہے اک خواب نما دنیا
تاروں کی طرح روشن، مہتاب نما دنیا
جنت کی طرح رنگیں، شاداب نما دنیا
للہ وہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

اور پھر آگے کہتے ہیں کہ ایسی جگہ لے چل جہاں ؎

قدرت ہو حمایت پر ہمدرد ہو قسمت بھی
سلمیٰ بھی ہو پہلو میں سلمیٰ کی محبت بھی
ہر شے سے فراغت ہو اور تیری عنایت بھی
اے طفلِ حسیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے بھی دنیا سے فرار چاہا تھا اور اپنی نظم 'ایک آرزو' میں اس فرار کی بات کہی تھی۔ ڈاکٹر اقبال ایک فلسفی شاعر تھے اور اختر ایک رومانی شاعر، دونوں کے خیالات اور کہنے میں بہت بڑا فرق ہے۔ میں نے یہ بات محض اس لئے کہی ہے کہ اختر کی یہ نظم پڑھتے ہوئے ڈاکٹر اقبال کی نظم 'ایک آرزو' کی طرف بھی دھیان جاتا ہے۔ اختر شیرانی کی یہ نظم بھی کافی مقبول ہوئی اور حیدر آباد کے جامعہ عثمانیہ کے اردو کورس میں شامل رہ چکی ہے۔

اختر کی ایک نیچرل نظم 'وادیٔ گنگا میں ایک رات" ہے۔ یہ نیچرل نظموں میں بہت اچھی نظم شمار کی جاتی ہے۔ یہ نظم حیدر آباد کے جامعہ عثمانیہ کے انٹرمیڈیٹ کے اردو کورس میں شامل رہ چکی ہے۔
نظم کا پہلا بند ہے ؎

کرتے ہیں مسافر کو محبت سے اشارے
اے وادیٔ گنگا ترے شاداب نظارے
یہ نکھرے ہوئے پھول یہ نکھرے ہوئے تارے
خوشبو سے مہکتے ہوئے دریا کے کنارے

اور اس وادی کے مناظر کے بارے میں فرماتے ہیں ؎

یہ تارے ہیں یا نور کے میخانے ہیں آباد
معصوم و حسیں حوروں کے کاشانے ہیں آباد
مستانہ ہواؤں پہ پری خانے ہیں آباد
یا دامنِ افلاک میں بے تاب شرارے

اور پھر اسی انداز سے کہا ہے ؎

مہتاب ہے یا نور کی خوابیدہ پری ہے
الماس کی مورت ہے کہ مندر میں دھری ہے
مرمر کی صراحی ہے کہ سیمیں سے بھری ہے
اور تیرتی ہے نیل کی موجوں کے سہارے

اور آخری بند میں کہا ہے ؎

صحرا ہیں کہ خوابیدہ نظاروں کے شبستاں
دامن میں لئے چاند ستاروں کے شبستاں
فردوس کی پُرکیف بہاروں کے شبستاں
شاعر کو تمنّا ہے یہیں رات گذارے

نیچرل نظموں کے سلسلے میں ایک اور نظم " دنیا کی بہاریں " کے عنوان سے ہے اس میں اختر نے نیچر کی خوبصورتی اور دلکشی سے متاثر ہوکر کہا ہے کہ یہ دنیا اور اس کے حسین نظارے، فضاؤں کی رنگینی، چاند سورج کے جلوے، ستاروں کی تابندگی، لالہ زاروں کی نزہت، کوہساروں کی رفعت، ہواؤں میں بھینی بھینی خوشبو، دریاؤں کی روانی اور آبشاروں کی تیزی، ہجومِ گُل و سبزہ اور اس کی لطافت اور طائرانِ چمن و صحرا کے رقص آفریدہ موسیقی ریز ترانے - اور قدرت کی بے مثال تخلیقِ عین، وجہ تخمیر کائنات یعنی انسان کے مشاغلِ رندانہ، نشاط و طرب، محفلِ شعر و شراب و ساقی اور آرائشِ مکان و زیبائشِ مکیں، رعنائی حسین، صحبتِ نازنیں اور ان کفر مآب صحبتوں کے ہمراہ یہ جوانی، یہ بہاریں یہ جام و سبو، یہ رقص و نغمہ اس قدر دل فریب واقع ہوئے ہیں کہ جنّت کی آرزو نہیں -

نہ لے جا خلد میں یارب یہیں رہنے دے تو مجھ کو
یہ دُنیا ہے تو جنّت کی نہیں ہے آرزو مجھ کو

اختر نے ایک نظم ایک ' شاعرہ ' کی شادی سے متاثر ہو کر کہی ہے جس کا عنوان ہے ' ایک شاعرہ کی شادی پر ' ان کے متاثر ہونے کی وجہ یہ تھی کہ موصوفہ نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ دنیا میں محض شاعرانہ زندگی گذارنے آئی ہیں اور انھیں شادی کے مخمصوں سے نفرت ہے لیکن جب کفر ٹوٹا تو انجام شادی ہی ٹھہرا - اختر نے اسی بات کو پیشِ نظر رکھ کر شاعرہ موصوفہ سے خطاب کیا ہے اور اس کی تعریف و توصیف کے ساتھ اس کے حسنِ تحریر اور مختلف اوصاف کو گِن کر آخر میں بس یہی شعر کہنے پر اکتفاء کی ہے ؎

سوگوار اپنی جواں موت کا ہونے دے مجھے
مسکرا تو، مگر اس حال پہ رونے دے مجھے

یعنی شاعرۂ موصوفہ کی شکست اختر کے نزدیک اس کی جواں موت سے کم نہ تھی -

اختر شیرانی کے یہاں کلاسیکی ماحول بھی ملتا ہے - انھوں نے ہندوستانِ قدیم کی موسیقی سے بھری ہوئی ایک رات کا تخیل بھی ایک نظم ' جوگن ' میں باندھا ہے - نظم قصیدے کی ترکیب میں کل دس بندوں پر مشتمل ہے -

نظم چونکہ کافی طویل ہے اس لئے یہاں مختلف بندوں سے چند ضروری شعر درج کرنے پر اکتفا کرتا ہوں ؎

دیکھو وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے
موسیقیٔ حزیں کے دریا بہا رہی ہے
سوئی ہوئی فضا کا شانہ ہلا رہی ہے
ہر جنبشِ زباں سے مُردے جلا رہی ہے

دوسرے بند میں کہتے ہیں ؎

اٹھکھیلیوں کا سن ہے ہنس بولنے کے دن ہیں
لیکن نہ جانے کیوں وہ آنسو بہا رہی ہے
آئینہ رنگ سینہ کچھ کھل رہا ہے جس میں
دوشیزگی کی گنگا طوفاں اُٹھا رہی ہے
ہے اک ستار اس کی آغوشِ نازنیں میں
وہ نازک انگلیوں سے جس کو بجا رہی ہے

پانچویں بند میں ؎

جنگل کے جانور کچھ بیٹھے ہیں اس کے آگے
رو رو کے جن کو اپنی بپتا سُنا رہی ہے
خونخوار شیر بھی ہیں، وحشی غزال بھی ہیں
لیکن وہ سب کے دل پر سکّہ جما رہی ہے

چھٹے بند میں ؎

یہ موہنی بنی ہے کس کی لگن میں جوگن
یہ سیلِ درد کس کے غم میں بہا رہی ہے
ہاں شاید اس کی ننھی معصوم آتما میں
ہر کی پریم[1] اگنی لو سے لگا رہی ہے

[1] پریم بروزن 'پیم' ہونا چاہیئے ع - م

یا ہر کی جستجو میں پیتم کی آرزو میں
کاشی سے آ رہی ہے متھرا کو جا رہی ہے
یا جگ کی آفتوں سے تنگ آ کے بن میں جا کر
پرماتما کو اپنا دُکھڑا سنا رہی ہے

تیرے بند میں ؎

اب نغمے سو چکے ہیں یا جا بھی تھک چلا ہے
محشر اُٹھا چکی ہے، فتنے جگا رہی ہے
لو وہ ستار کو بھی نیند آ گئی بغل میں
لو وہ ستار اُٹھا کر جنگل سے جا رہی ہے

اور آخری بند میں خود پر بیتی ہوئی کیفیت کا اظہار یوں کرتے ہیں ؎

میں تو مگر کچھ ایسا محسوس کر رہا ہوں
جیسے وہ ظالم اب تک ویسے ہی گا رہی ہے
اب تک ہیں سر جھکائے حیرت زدہ کھڑا ہوں
اب تک وہی تجلّی آنکھوں پہ چھا رہی ہے
دیکھو وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے

آخر میں ایک اور مشہور رومانی نظم کا تذکرہ ضروری سمجھتا ہوں جس کو اخترؔ نے "ایک دیہاتی لڑکی کا گیت" سے معنون کیا ہے۔ اس نظم کی وجہ تخلیق یہ بتلائی جاتی ہے کہ اخترؔ کسی سلسلے میں راجپوتانہ کے ایک گاؤں میں جو 'بھانجی' کے نام سے موسوم ہے قیام پذیر تھے، وہاں کسی حادثہ میں ان کا ہاتھ زخمی ہو گیا (غالباً بایاں ہاتھ) اس لئے وہ اس رات بالکل سو نہ سکے۔ اور جب صبح ہوئی تو یہ نظم تخلیق ہو چکی تھی۔

اس نظم میں اخترؔ نے گاؤں کی زندگی اور گاؤں کی ایک بیاہتا لڑکی کے جذبات و کیفیات کا ذکر نہایت ہی دل کش انداز میں کیا ہے۔

یہ نظم بھی کافی طویل ہے۔ اس لئے اس کے بھی چیدہ چیدہ ضروری اور مثالی شعر پیش کئے جاتے ہیں۔

پہلے بند میں کہا ہے ؎

سنو یہ کیسی آواز آ رہی ہے — کوئی گاؤں کی لڑکی گا رہی ہے
سحر کے دھندلے دھندلے منظروں کو — شراب نغمہ سے نہلا رہی ہے
اُٹھی ہے شاید آٹا پیسنے کو — کہ چکّی کی صدا بھی آ رہی ہے

اس نظم کا پس منظر یہ ہے کہ ایک گاؤں کی لڑکی جو اپنے سسرال میں ہے پچھلی شب کو تڑکے ہی آٹا پیسنے کو اُٹھی ہے اور چکّی پر آٹا پیستے ہوئے اپنے میکے کی یاد میں ایک گیت گا رہی ہے مشہور ہے کہ سسرال کتنا ہی تونگر کیوں نہ ہو میکے کی یاد آ ہی جاتی ہے اور پھر گاؤں کی لڑکیوں کا میکہ ان کی اپنی جنّت سے کم نہیں ہوتا کیونکہ سارا بچپن اور شروع جوانی کا حصّہ میکہ کا ہی ہوتا ہے اور اس سے کئی حسین یادیں وابستہ ہوتی ہیں۔

اسی بات کو اخترؔ آگے توضیحی انداز میں کہتے ہیں ؎

یہ گھر سسرال ہو گا شاید اس کا — جبھی ماں باپ کی یاد آ رہی ہے
جبھی مصروف ہے آہ و فغاں میں — جبھی غمگین لے میں گا رہی ہے

لڑکی جو گیت چکّی پر گا رہی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ موسم برسات کا آخری زمانہ ہے (اور صبح کا وقت ہے ابھی پو نہیں پھٹی ہے) چنانچہ اخترؔ نے لڑکی کے گیت کو اس طرح پیش کیا ہے ؎

یہ برکھا رُت بھی بیتی جا رہی ہے

ہوا جو گاؤں کو مہکا رہی ہے — مرے میکے سے شاید آ رہی ہے
یہ برکھا رُت بھی بیتی جا رہی ہے

گھٹا کی اودی اودی چنریوں سے — مری سکھیوں کی بو باس آ رہی ہے
یہ برکھا رُت بھی بیتی جا رہی ہے

مجھے لینے نہ آئے اچھے بابل — تمھاری یاد آفت ڈھا رہی ہے
یہ برکھا رُت بھی بیتی جا رہی ہے

مری امّاں کو ہو اس کی خبر کیا — کہ چھپا اس جگہ گھبرا رہی ہے
یہ برکھا رُت بھی بیتی جا رہی ہے

نہ لی بھیّا نے بھی سدھ بدھ ہماری — جہاں سے چاہ اُٹھتی جا رہی ہے
یہ برکھا رُت بھی بیتی جا رہی ہے

ہوا کی پنکھیا جھل جھل کے بجلی — مرے من کی لگن بھڑکا رہی ہے
یہ برکھا رُت بھی بیتی جا رہی ہے

بھلا کیونکر تھمیں آنسو کہ جی پر — اُداسی کی بدریا چھا رہی ہے
یہ برکھا رُت بھی بیتی جا رہی ہے

گیا پینگیں بڑھانے کا زمانہ — وہ امریوں پہ کوئل گا رہی ہے
یہ برکھا رُت بھی بیتی جا رہی ہے

اس گیت کے ساتھ اختر نے آگے کہا ہے ؎

سیاہی اڑتی جاتی ہے اُفق کی عروسِ صبح بڑھتی آ رہی ہے
کوئی بجری کہیں کرتی ہے ئیں ئیں کوئی بچھیا کہیں چلاّ رہی ہے
مگر ان سب سے بے پرواہ لڑکی برابر گیت گائے جا رہی ہے
اُسے سُن سُن کے کب تک سر دُھنو گے
بس اختر سوئے دو نیند آ رہی ہے

اختر شیرانی نے جتنی بھی نظمیں کہی ہیں ان سب میں ایک پُرکاری لئے ہوئے سادگی اور بے ساختگی ہوتی ہے۔ اکثر نظموں میں اختر نے وہی موضوعات چُنے ہیں جو عوامی احساسات کے قریب ہوتے ہیں اور جن سے عوام کے جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ اس لئے اُن کی شاعری نے عوام سے بہت جلد خراجِ تحسین حاصل کر لیا۔ ان کی عزت اور شہرت کا باعث ان کا خلوص اور سادگی کا فنکارانہ استعمال ہی ہے۔

اختر شیرانی کا فن، ان کا لب و لہجہ اردو ادب میں اپنا ایک الگ مقام اور ایک الگ حیثیت رکھتا ہے۔ کئی نقادوں نے ان کو ایک منفرد شاعر کہا ہے۔ بہر حال اردو ادب میں ان کی اہمیت مُسلّم ہے۔

بمل کرشن اشک

قطعات

(ایک شاعر دوست کے نام)

اشکؔ مجھ ایسے پاسدارِ حیات راہِ مستی کے ذرّے ذرّے میں
ترکِ مے بے سبب نہیں کرتے ضو فشاں کائنات ملتی ہے
آج کل مے کدے کے باشندے منحصر کچھ یہ مے کدے پہ نہیں
زندگی کا ادب نہیں کرتے ہر قدم پر حیات ملتی ہے

دات ایسی نہ مے کدے کی ہو غمِ ہستی کا نام لے کر
ہر حقیقت کو خواب پی جائے جام پر جام بھر رہا ہے دوست
پی مگر اس قدر نہ پی اے دوست کہیں ایسے ہوا ہے غم کا علاج
شاعری کو شراب پی جائے غم کی توہین کر رہا ہے دوست

غزل

خصوصی لطف فرمائی نہ چھوڑی
اُن آنکھوں نے مسیحائی نہ چھوڑی

رہیں پابندیاں جب تک زباں پر
خموشی نے بھی گویائی نہ چھوڑی

ہوئے پیراہنِ گُل چاک در چاک
صبا نے ناز فرمائی نہ چھوڑی

ہمیں تھی آرزوئے نیک نامی
ہوائے کوئے رسوائی نہ چھوڑی

اسی سے چشم و دل کی زندگی تھی
متاعِ ناشکیبائی نہ چھوڑی

ہزاروں رنج و غم دکھ کر بھی دل نے
ترے غم کی پذیرائی نہ چھوڑی

خرد نے لاکھ سمجھایا، ڈرایا
جنوں نے حشر آرائی نہ چھوڑی

حوادث سے گذرنے پر بھی منشاء
غزل نے شانِ رعنائی نہ چھوڑی

غزل

پیامِ عیش ملا ہے غمِ حیات کے بعد
نگاہ پھیر لی کس نے نوازشات کے بعد

چمن میں پھول کھلے آسمان پر تارے
وہ مسکرائے بھی کتنے تکلّفات کے بعد

مجھے سمجھنے لگے اجنبی نہ جانے کیوں
تمام اہلِ نظر تیرے التفات کے بعد

خدا گواہ ہم اپنی نظر کو ڈھونڈتے ہیں
ترے حضور و فورِ تجلّیات کے بعد

جہاں پہ حسن خود آتا ہے رہبری کے لئے
ایک ایسی راہ بھی ہے منزلِ حیات کے بعد

گناہ گاروں کو جیسے مجھی سے نسبت تھی
کھلا یہ راز مرے دعویٔ نجات کے بعد

مرے یقین کی گنجائشیں کہاں جائیں
حیات و موت کے مبہم تعلّقات کے بعد

یقین کیجئے عرفانِ زندگی کی قسم
سنور گیا ہے وصی تازہ حادثات کے بعد

۵ سے ۵۰ من

شیخ عبدالغفار، آدراس کے پانچ بھائیوں کی کوششیں پھل لائیں اور ان کی زمین کی فی ایکڑ پیداوار دس گنا بڑھ گئی۔ ان کی اس نمایاں کامیابی کی وجہ بہتر کاشت اور ساجھی کھیتی ہے۔

بہار کے موضع وٹ گنج کے ان کاشتکاروں کے دل میں ایک اُمنگ اُٹھی۔ انھوں نے ایک نیا عزم باندھا۔ اپنی ۵۴ ایکڑ زمین پر قطاروں میں بیجائی کی، بہتر بیج استعمال کئے، وافر کھاد ڈالی۔ نئے اوزار اور کھیتی باڑی کے جدید طریقے اختیار کئے۔ یہ سب کچھ انھوں نے اپنی کوششوں سے کیا۔

نتیجہ بڑا خوشگوار نکلا۔ کاشت کے روائتی طریقوں سے وہ کُل چار سے پانچ من فی ایکڑ دھان اُگاتے تھے۔ اب کاشت کے بہتر طریقوں سے دھان کی فی ایکڑ پیداوار ۴۰ سے ۵۰ من ہوگئی۔

آپ بھی اپنی زمین سے زیادہ پیداوار حاصل کرسکتے ہیں۔ کھیتی باڑی کے بہتر طریقے اپنایئے اور بھرپور فصل حاصل کیجئے۔ آپ کی پیداوار بڑھے گی، ملک کو زیادہ اناج حاصل ہوگا۔

پلان کی مدد اپنی مدد ہے
اپنی مدد آپ کیجئے



نذیر رحمانی

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی سے معاف

تم نے اپنے خط میں تو اُن کی بڑی تعریف و توصیف لکھ بھیجی ہے لیکن سعیدہ! جو چولھے کے پاس بیٹھتی ہے جلتی ہوئی لکڑیوں کی تپش اور آگ کی جلن سوزش سے وہی خوب واقف ہوتی ہے۔ میرے اُوپر جو کچھ بیت رہی ہے اسے میں ہی جانتی ہوں، بیگی! بظاہر تو شادی کا تصور بہت سنہرا دلکش اور فردوس آفریں ہوتا ہے لیکن جب یہ تحفہ مل جاتا ہے اس کی زندگی ایک وادیٔ پُر خار میں پھینس کر رہ جاتی ہے اور دات کے تارے دن میں نظر آنے لگتے ہیں۔ ازدواجی زندگی کی اُلجھنوں اور بندشوں سے تو میں اس نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ اگر سرزمینِ سندھ کی حسینہ سسّی کی بھی شادی پنوں سے ہو جاتی تو سوا مہینے کے بعد ہی وہ بھی سر پکڑ کر بیٹھ جاتی اور قسمت کا رونا روتی۔ ایک زمانہ تھا جب بھائی جان کے نام کسی کی شادی کا اِذن نامہ آتا تھا تو میں حسرت دیاس کے ساتھ بڑی دیر تک اسے پڑھا کرتی تھی۔ اس کے ایک ایک لفظ پر میری نظریں اس طرح جم جاتی تھیں جیسے بھوکے آدمی کی نظریں اس کھانے پر جم جاتی ہیں جو اس کے سامنے تو رکھا ہو لیکن وہ اُسے کھا نہ سکتا ہو۔ میرا حلق خشک ہو جاتا تھا اور عجیب تشنگی محسوس ہوتی تھی جب کسی کی بارات میرے مکان کے قریب سے بینڈ، باجہ اور شہنائی بجاتی ہوئی گزرتی تھی تو میرا دل دھڑکنے لگتا تھا اور میں بے چینی و بدحواسی کے عالم میں اپنی چاندنی پر چڑھ کر بارات کا منظر دیکھا کرتی تھی اور پھر اس رات کی نیند کافور کی طرح اڑ جاتی تھی۔ اپنی ایک سہیلی کی شادی میں تین چار روز پہلے جانے کا اتفاق ہوا۔ میں نے بڑی لگن اور حوصلہ سے شادی کا کام کاج کیا۔ نکاح کے دن اپنی سہیلی کو دُلہن بنانے میں میری ہی دستکاری و نقش گری کا بڑا حصہ رہا۔ سارا دن خوشی خوشی میں اس کے آگے پیچھے چکری کی طرح ناچتی رہی جب رات ہوئی اور دولھا سلام کرنے گھر میں آیا اور اپنی متاعِ دل و جان کو اٹھا کر لے جانے لگا تو میری آنکھوں سے آنسو گرنے لگے یہ آنسو وداعی صدمے کے نہیں تھے، خوشی کے بھی نہیں! میں خود ہی نہ سمجھ سکی کہ یہ بادل کون سے سمندر سے اُٹھے تھے اور میری آنکھوں سے کیوں برس پڑے۔ تُم تو میری بہت مخلص سہیلی ہو اب میں تم سے کیا چھپاؤں، سچ کہتی ہوں جب ان کا پیغام میرے لئے آیا اور گھر والوں نے رضامندی کا اظہار کیا تو بس دل میں لڈّو پھوٹنے لگے، آنکھوں سے پھُل جھڑیاں چھوٹنے لگیں پھر جو کچھ ہوا تم کو معلوم ہی ہے۔ میں سُرخ ریشمی کپڑوں کی گٹھری بنی شوہر نامدار والا تبار کے گھر آ گئی انھوں نے اپنی تعارفی گفتگو میں پہلی مرتبہ جس قسم کے وعدے وعید مجھ سے کئے اور جن جن خطابوں سے مجھے مخاطب کیا وہ سب اگر میں اس وقت تم کو لکھ دوں تو تم دانتوں تلے اُنگلی دبا لو، مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو جاؤ۔ مہینے دو مہینے تو واقعی ہم لوگ جیسے زمین پر نہیں بلکہ اس دُنیا سے دُور آسمان پر چاند ستاروں کے قریب کسی نئی اور فرحت بخش آبادی میں رہتے ہوں لیکن جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا عیش و مسرّت کے نقرئی ورق ایک ایک کر کے اُترتے رہے۔ خانگی پریشانیوں نے تو خیر مقدم کیا ہی، انھوں نے بھی مجھ سے دُوری اور بیزاری شروع کر دی۔ اب میری آنکھیں کھلیں اور شادی کی خوشی کا نشہ ہرن ہوا اور تجربہ ہوا کہ سعدی نے ٹھیک ہی کہا تھا

ہفتۂ عیش غمۂ سالے چند

میرے میاں بڑے چھپے رستم نکلے، کہیں تم یہ نہ سمجھ لینا کہ وہ کوئی

لٹھ مار اور ترنم باز ہیں اور میری بڑی پسلی کو سُرمہ بنانے پر ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ تو مکھیوں اور چیونٹیوں کو بھی مارنے میں پس و پیش کرتے ہیں۔ ایک روز میں نے مُنّے کو مار دیا تھا تو کئی دن تک مجھ سے ناراض رہے۔ وہ ہمیشہ سے گاندھی جی کے فلسفۂ عدم تشدّد کے قائل ہیں اور اس پر سختی سے عمل بھی کرتے ہیں۔ مہاتما جی کی ایک بڑی اور خوبصورت تصویر اپنے کمرے میں آویزاں کر رکھی ہے۔ ذات پات بھید بھاؤ اور کسی قسم کے فرق و امتیاز کے سخت مخالف ہیں۔ ہر کسی کی خدمت کو ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ ایک پڑوسی کو پولیس پکڑے لئے جا رہی تھی آپ نے اپنی ضمانت دے کر اسے چھڑا لیا پھر وہ آدمی فرار ہو گیا کئی دن تک آپ کو کچہری کے چکر کاٹنے پڑے، بارہا منع کیا کہ دوسروں کے پھٹے میں تم اپنا پیر کیوں اڑاتے ہو۔ مگر مانتے نہیں وعظ شروع کر دیتے ہیں "گوشت پوست کے اس ڈھانچے کا نام انسان تھوڑا ہی ہے۔ انسان نام ہے عزّتِ نفس، عظمتِ کردار اور خدمتِ خلق کے امتزاج کا جس میں یہ خصوصیات نہ ہوں وہ انسان نہیں کچھ اور ہے۔ اپنی ذات کے لئے انسان جیا تو کیا جیا دوسروں کے لئے زندہ رہنا کارِ مردانہ ہے۔" خرابی اور بُرائی ان میں جو ہے وہ میں کیا بتاؤں بس عجیب و غریب شخصیت ہیں وہ۔ ایک روز ماچس کی تلاش میں میں نے ان کی اٹیچی کھول لی۔ دیکھتی کیا ہوں کہ تین چار خط کسی لڑکی کے لکھے ہوئے رکھے ہیں۔ میں نے جب ان سے پوچھا تو کہنے لگے "واہ! تم بھی خوب سمجھیں وہ تو فرضی خط ہیں جو میں نے ہی لڑکی کے نام سے لکھے ہیں۔" مجھے بالکل یقین نہیں آیا اور میں کئی دن ان سے کھنچی کھنچی رہی پھر جب وہ خط ایک رسالہ میں شائع ہوئے تب میرا غصّہ ختم ہوا پھر بھی یہ خلش آج تک دل میں موجود ہے کہ کون جانے وہ کسی نورِ نظر کے لکھے ہوئے تھے یا واقعی فرضی تھے۔

ان کے طور طریق، عادت و فطرت اور طرزِ بود و ماند کچھ ایسے ہیں کہ مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ اب بھلا تم ہی بتاؤ یہ کون سی ہمدردی اور دوست نوازی ہے کہ کوئی جان پہچان والا آ کر کہے کہ مجھے کچھ روپیوں کی ضرورت ہے۔ بس آپ مجھ سے بھی نہ پوچھیں گے اور فوراً اٹھا کر اسے روپیہ دے دیں گے۔ گئے سال کا ذکر ہے۔ برسات کا موسم تھا کوئی دوست ملنے کے لیے آیا آپ نے اسے کھانا کھلایا اپنے کمرے میں بڑی دیر تک اسے ٹھہرایا جب وہ جانے لگا تو اپنی برساتی بھی اسے دے دی۔ میں نے اعتراض کیا تو فرمانے لگے۔ "پانی برس رہا تھا، غریب بھیگتا ہوا جاتا اس لئے برساتی دے دی تم فکر کیوں کرتی ہو، واپس آ جائے گی۔" ایک مہینہ ہو گیا۔ برساتی آئی نہ اُس نے درشن دئے۔ میرا کیا بگڑا خود ہی نے تکلیف اٹھائی اور پُرانی چھتری لگائے پھرے۔ ایک سال سردیاں پورے شباب پر تھیں۔ ایک ملاقاتی آئے کہنے لگے ذرا باہر جا رہا ہوں اپنا سوئٹر دے دیجئے جلد ہی واپس لا دوں گا۔ انھوں نے جھٹ اپنا نیا سوئٹر دے دیا۔ لکڑیوں کی گاڑی آئی۔ مزدور نے کاٹ کر پٹک دی۔ گھر کا ملازم کٹی ہوئی لکڑیاں اٹھا اٹھا کر صحن سے کوٹھری میں بھر رہا تھا آپ باہر سے آ گئے اور اس کے ساتھ خود بھی لکڑیاں اٹھانے لگے۔ میں نے کہا تو کہنے لگے "بے چارہ پسینہ میں شرابور ہو رہا تھا۔ کافی تھک چکا تھا اگر میں نے ذرا اس کا ساتھ دے دیا تو کیا میری ذات کو بٹہ لگ گیا۔" اب انھیں کون سمجھائے کہ اس قسم کی باتوں سے گھر کے نوکر سر پر چڑھ جاتے ہیں۔ ان کا چھوٹا بھائی بی اے پاس ہے آپ نے اس کی تعلیم پر خوب روپیہ صرف کیا ہے وہ اپنی ملازمت سے جب علیحدہ ہو گیا تو پندرہ روپئے ماہوار اس کے خرچ کے لئے دیتے رہے۔ پھر جب اسے ملازمت مل گئی اور وہ تحصیل دار ہو گیا تو ایک روز میں نے کہا اب بیٹھے کیا سوچ رہے ہو گھر میں آٹا دال لکڑی کچھ بھی نہیں اپنے برادرِ عزیز سے ہی کچھ روپیہ منگوا لو۔ بس خفا ہو گئے کہنے لگے "تم نے مجھ کو اتنا نیچ اور ذلیل سمجھ لیا ہے کہ میں اپنے چھوٹے بھائی کے سامنے دستِ سوال دراز کروں گا، دامن پھیلاؤں گا۔ اس سے کچھ مانگنا میری خودداری کے خلاف ہے۔" میں بھی جل گئی۔ میں نے کہا اچھا تو تم اپنی خودداری کے لحاف میں لپٹے پڑے رہو اور ہم اپنے معصوم بچّوں پر فاتحہ پڑھ کر بھوکا سلائے دیتے ہیں۔ میرے اس انکشن سے ان کے جسم میں حرارت اور رگ رگ میں گرمی آئی اُٹھ کر کھڑے ہو گئے میں سمجھی کہ شاید غیرتِ مردانہ کو ضرب لگی اور اب یہ روپیوں کا انتظام کرنے کہیں جا رہے ہیں۔ جلدی جلدی شیروانی پہنی اور میرے پاس آ کر کہنے لگے۔ "لاؤ وہ ایک سونے کے بُندے دے دو تو میں انھیں گروی رکھ کر آتشِ شکم بجھانے کا بندوبست کر دوں۔" میں نے کہہ دیا نہیں صاحب! یہ نہیں ہو سکتا میں اپنے زیورات کا سیٹ آپ کے بچّوں کی وجہ سے نہیں بگاڑ سکتی۔ فرمانے لگے "بیگم تم تو ذرا سی بات پہ خفا ہو جاتی ہو۔ میرے افسانوں کا معاوضہ آنے والا ہے

رقم ملتے ہی میں تمہارے مُنہ سے تم کو لا دوں گا۔" بات بڑھ جاتی۔ بچّے تماشہ دیکھتے اور باہر جا کر کہتے کہ آج ہمارے پاپا اور امّی میں خوب لڑائی ہوئی۔ اس لئے میں نے نا نہیں کی۔ چُپ چاپ مُنہ سے انھیں دے دیئے۔ ان کے افسانوں کا معاوضہ آ گیا اور ختم بھی ہو گیا۔ دوسرے مضامین کے معاوضے بھی آتے رہے اور پیٹ کے ایندھن بنتے رہے لیکن میرے جو کان مُندروں سے خالی ہوئے وہ پھر کبھی نہ بھر سکے۔ سوچتے ہوں گے کہ میں نے ہی تو بنائے تھے۔ میری چیز ہے واپس لاؤں یا نہ لاؤں۔ ایک سال کتاب لکھی اس پر ایک ہزار روپیہ حکومت کی طرف سے انعام ملا۔ کیا پوچھتی ہو حاتمی و دریا دلی کا عالم! بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہفت اقلیم کی بادشاہت انھیں کو مل گئی ہے مہینہ ڈیڑھ مہینہ میں یہ ایک ہزار روپیہ چٹکی کی طرح پیس ڈالا۔ ان کی سوجھ بُوجھ اچھی ہے مگر مصلحت بینی اور دُور اندیشی نام کو نہیں۔ زمانے کا سیاہ سفید اور خود اپنا اچھا بُرا دیکھے ہوئے ہیں۔ مگر آنکھیں نہیں کھلتیں۔ خود ہی بتاتے تھے کہ جب ان کی دو ڈھائی سو روپے کی ملازمت ختم ہو گئی اور وہ بے کاری و بے روزگاری کے کٹھن اور صبر آزما دن گزارنے لگے تو اُن کے عزیز رشتہ دار اور دوست احباب، سب نے ان کی طرف سے منہ موڑ لیا اور آنکھیں پھیر لیں۔ حقیقی چچا اور ماموں نے بھی لعن طعن شروع کر دی تھی۔ بڑے بھائی سے دو روپے منگائے تھے تو انھوں نے نہیں دئے اور صاف کہہ دیا کہ تمہارا تو ہمیشہ سے یہی رونا ہے۔ جن لوگوں کی کبھی یہ امداد کر دیا کرتے تھے وہ لوگ انھیں دیکھ کر اپنا راستہ بدل دیتے تھے۔ آنکھیں چار ہونے کی نوبت نہ آنے دیتے تھے ان سے اس طرح دُور دُور رہتے تھے جیسے خارش کے مریض سے سب دُور رہتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اس دُنیا میں ایک ناقابلِ برداشت بوجھ بن کر رہ گئے ہوں۔ اسی زمانہ میں ان کی بہن کی شادی ہوئی، منگنی سے لگا کر رخصتی تک ان سے کسی نے بات نہ پوچھی۔ کسی قسم کا صلاح مشورہ نہ لیا۔ یہ روٹھے پھولے رہے تب بھی کسی نے انھیں نہ منایا۔ ان کے نزدیک وہ وقت بہت قیمتی تھا۔ بڑے بڑے تجربات اور نئی نئی آزمائشیں ہوئیں۔ اپنے پرائے سب اصلی روپ میں نظر آگئے۔ ان کا ایک دوست تھا۔ اچھا کھاتا پیتا خوش حال، انھوں نے زیادہ نہیں صرف پچاس روپے کے لئے اس سے کہا، روپیہ دینے کا اس نے وعدہ کر لیا اور کہا میں بنک سے رقم نکال رہا ہوں آپ کا روپیہ گھر آ کر لیتا آؤں گا۔ آپ ٹھیرے سیدھے سادے نیک منش اس کی باتوں پر یقین کر لیا۔ تین دن تک گھر میں بیٹھے ہوئے اس کا انتظار کرتے رہے پر وہ نہیں آیا۔ نظیر کے اس شعر کی صحیح تفسیر و تشریح اسی زمانہ میں اُن کی سمجھ میں آئی۔

مفلسی سب بہار کھوتی ہے
مرد کا اعتبار کھوتی ہے

ان کا عقیدہ ہے کہ انسان تکلیفوں، دشواریوں اور سختیوں کی بھٹّی میں تپ کر ہی کندن بنتا ہے۔ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں کندن اگر بنے ہوتے تو اس کی چمک دمک آج نظر آتی پچھلے اُن دنوں کا عشر عشیر اثر بھی ان میں نہیں۔ ہزاروں روپے اگر مل جائیں تو پانی کی طرح بہا دیں۔ پھر تنہا دو میاں بیوی ہوتے تو مضائقہ نہیں۔ ایک لڑکی ایک لڑکا دو جانوں کا ساتھ ہے۔ ان کے مستقبل کا ذرا بھی خیال نہیں بچہ کو تعلیم حاصل کرنا ہے بچّی کا بیاہ کرنا ہے مگر انھیں مطلق پروا اور فکر نہیں۔ بچہ کہتا ہے کہ کلاس کی موجودہ کتابوں کے علاوہ چھٹے درجے کی کتابیں منگوا دو تو میں ڈبل امتحان دے کر ساتویں میں چلا جاؤں۔ آپ جواب دیتے ہیں۔ "اس طرح پاس ہونے سے فائدہ ——؟ بنیادی کمزوریاں رہتی ہیں تو آگے کے امتحانوں اور درجوں میں مشکلات پیش آتی ہیں۔ رفتہ رفتہ ہی آگے کے درجات میں پہنچنا ٹھیک ہے۔" لڑکی کے بارے میں جب کچھ کہتی ہوں تو کہتے ہیں کہ "شادی بیاہ کا ڈھیروں سامان دوکانوں میں بھرا ہے۔ جیب میں پیسہ ہونا چاہیئے۔ جس دن چاہیئیں گے خرید لائیں گے۔ سب کچھ پیسے کی لیلا ہے بیگم۔ جنگل میں منگل ہو جاتا ہے اس سے۔" ایک طرف اس طرح مجھے سمجھاتے ہیں۔ دوسری طرف پیسہ جیب میں رکھتے ہیں نہ بنک میں نہ میرے پاس ہی رہنے دیتے ابھی دو دن کی بات ہے اچھے خاصے بیٹھے افسانے لکھ رہے تھے بارش جو شروع ہوئی تو کہنے لگے "کتنا اچھا موسم ہے اس وقت تو تلن ہونا چاہیئے۔" گھر میں تیل شکر میدہ نہیں تھا آپ نے جھٹ بنیئے کو پرچہ لکھ دیا۔ منا تلن پکوان کا سامان لے آیا۔ اس طرح قرضہ میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ تقاضوں کے تصوّر سے میرے رونگٹے کھڑے ہوئے جاتے ہیں آدمی بھوکا بیٹھا رہے مگر کسی کا مقروض نہ ہو۔ کبھی جب قرضے کا ذکر کروں تو بگڑ جاتے ہیں اور کہتے ہیں۔ "دوکان دار اپنا روپیہ لے گا کسی کی جان لے گا جب روپیہ آئے گا قرضہ ادا

کر دیں گے۔ آدمی کو مایوس کبھی اور کسی حالت میں نہ ہونا چاہیئے۔" انھیں تو بس ہتھیلی پر سرسوں جمانا خوب آتا ہے۔ مجھ سے کہیں گے نہ پوچھیں گے جتنے آدمی چاہیں گے لے آئیں گے اور مجھ سے کہیں گے ذرا جلدی سے کھانا تیار کر دو یہ میرے بے تکلف دوست ہیں۔ تمہارے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا انھیں بہت مرغوب ہے۔ میری جان جل جل جاتی ہے مگر کیا کروں ہاتھ جلاتی ہوں، کھانا پکا کر دیتی ہوں اور کھانے والے مزے لے لے کر کھاتے ہیں۔ ایک کہتا ہے بھئی واللہ! کئی دن کے بعد آج دل خواہی اور شکم سیری کے ساتھ کھانا کھایا۔ دوسرا کہتا ہے فیرنی تو واقعی تمہاری بیوی صاحبہ خوب پکاتی ہیں۔ تیسرے صاحب فرماتے ہیں ایک ہماری بیوی ہے جسے معمولی روٹی ترکاری پکانے کا بھی ڈھنگ سلیقہ نہیں۔ ایک صاحب ہیں روزانہ ٹھیک چار بجے آتے ہیں اور چائے پی کر چلے جاتے ہیں۔ اب مجھے یہ ڈر رہنے لگا ہے کہ کہیں یہ حکم اور نہ دے دیا جائے کہ "صرف چائے کیا بھجواتی ہو ناشتہ کے طور پر کچھ تھوڑا سا کھانے کو بھی دے دیا کرو۔" گرانی ہے کہ بڑھتی جا رہی ہے۔ قیمتیں چڑھ رہی ہیں۔ قرضے کی فہرست لمبی ہوتی جا رہی ہے مگر شاہ دلی وسیع چشمی میں کمی نہیں کرتے۔ ان کے والد کی کچھ زمینداری تھی وہ ختم ہو گئی سرکار نے اس کا معاوضہ دیا اس معاوضے میں ان کا حصہ بھی انھیں ملا۔ اس میں سے کچھ روپیہ تو گھر کے خرچے کے لئے مجھے دیا بقیہ سب روپیہ اپنے پاس رکھا۔ نواب بے ملک بنے تانگوں اور ٹیکسیوں میں گھومتے پھرتے، خوب تفریحیں کیں، ہوٹلوں میں گُل چھرّے اڑائے۔ میں نے کہا سلائی کی ایک مشین مجھے لے دو۔ مجھ سے خفا ہو گئے۔ گھر میں نہ آنے کا بہانہ ہاتھ آ گیا۔ دو دن تک صورت نہ دکھلائی رات کو نہ جانے کب آ جاتے تھے اور صبح تڑکے ہی چل دیتے تھے۔ کچھ قرضہ ضرور بیباق کیا اور سب روپیہ فضولیات میں برباد کر دیا بعض اوقات ایک ایک سگریٹ کے لئے محتاج بنے بیٹھے رہتے ہیں مگر کیا مجال جو خرچ اخراجات میں احتیاط و اعتدال برتیں۔ ہوئے ہوئے اتنے ہیں کہ کبھی کوئی کام وقت پر نہیں کرتے۔ تحریری مقابلے کے لئے ایک انعامی مضمون لکھنا تھا۔ آج لکھتا ہوں، کل لکھتا ہوں کرتے رہے اور آخری تاریخ بھی گزر گئی، جب کچھ منگوانے کے لئے روپیہ دو تو بازار سے آ کر یہی کہتے ہیں کہ ارے میں تو بھول گیا بالکل یاد نہ آئی زیادہ کچھ کہو تو روپیہ دے دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایسی ہی جلدی ہے تو کسی سے منگا لو۔ نہ جانے کوئی تہوار تھا یا تقریب، میں زردہ پکا رہی تھی۔ شکر کم تھی میں نے دام دئے کہ کچھ شکر بازار سے ابھی لا دو۔ آنجناب چلے چلے ڈوبتے سورج کے ساتھ تشریف لائے۔ اُدھر مغرب میں سورج غروب ہو رہا تھا اور اِدھر آپ گھر میں داخل ہو رہے تھے۔ میں باورچی خانے میں بیٹھے بیٹھے تھک گئی، انتظار کرتے کرتے آنکھیں پتھرا گئیں، کمر دُکھنے لگی مگر آپ کی بلا سے۔ آپ تو جو مصروفِ گفتگو ہوئے تو سب کچھ بھول بھال گئے۔ میں جب بِگڑ جاتی ہوں تو بکنے لگتی ہوں۔ "اب بازار سے سودا سلف بھی میں خود ہی لے آیا کروں گی۔" یہ سُن کر ذرا نادم و شرمندہ نہیں ہوتے بلکہ اور کہتے ہیں کہ "ہاں ہاں! ٹھیک تو کہہ رہی ہو، زمانے کے قدم آگے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ زندگی کے ہر شعبے میں نت نئی ترقیاں ہو رہی ہیں۔ یہ برقعہ اور پردہ بھی آخر کب تک بچے گا۔"

ایم۔ اے پاس ہیں اچھی خاصی نوکری مل سکتی ہے۔ دیش میں جگہ جگہ کالج اور یونی ورسٹیاں کھل رہی ہیں۔ بڑے بڑے افسروں سے دوستی اور تعلقات ہیں کہیں بھی پروفیسری مل سکتی ہے۔ دو ایک بار کہا بھی کہ ملازمت کر لو تو فکرِ معاش کی طرف سے ذہنی یکسوئی حاصل رہے۔ مگر نہیں سُنتے: "نوکری میری توہین ہے، غلامی میرے بس کا روگ نہیں، دفتری پابندی مجھ سے نہیں ہو سکتی۔ جب حالات ٹھیک ہوں گے تب میں تو کوئی بڑا اور معیاری اخبار نکالوں گا۔" یہ اُن کا جواب ہوتا ہے۔ میں نے بھی انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ یہ ادیب و شاعر کسی کی سُنتے نہیں اور سُنتے بھی ہیں تو کرتے من کی ہیں۔ اُن کی ان سب باتوں کے باوجود تم یہ خیال نہ کرنا کہ میں اب ان سے اکتا گئی ہوں۔ وہ مجھے عزیز ہیں، میرے سر کا تاج اور زندگی کے دمساز ہیں۔ اپنی ناآسودگی کے ہوتے ہوئے بھی اگر کوئی ان کی بُرائی میرے سامنے کر دیتا ہے تو مجھے سخت ناگوار گزرتا ہے۔ ان کے بارے میں اگر کوئی بُرے خیالات و جذبات کا اظہار کرتا ہے تو تم یقین کرو کہ ایک ناقابلِ بیان اذیت و تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ اگر کسی کانفرنس یا مشاعرے سے واپس لوٹنے میں وہ دیر کر دیتے ہیں۔ یا دو تین دن نہیں آتے تو مجھے اختلاج سا ہونے لگتا ہے میں اُن کی خیریت کے لئے بے قرار رہنے لگتی ہوں تاوقتیکہ وہ آ نہ جائیں میری حالت دگرگوں رہتی ہے۔ جب وہ آ جاتے ہیں

تب مجھے سکون میسّر آتا ہے۔ ان کے وزن کے برابر سونا تول کر بھی اگر کوئی مجھے دے تو میں اس سونے کے بدلہ انھیں نہیں چھوڑ سکتی ان سے قطع تعلق نہیں کر سکتی جس طرح ماں باپ کے گھر سے شادی کا ریشمی جوڑا پہن کر میں آئی تھی۔ اسی طرح کفن کی چادر میں لپیٹ کر شوہر کے گھر سے نکلوں گی وہ جس حال میں رکھیں گے میں رہوں گی۔ جیسے ایک باپ اپنے بچّے کے بارے میں بالکل نہیں جانتا کہ یہ جوان ہو کر اس کے بڑھاپے میں کیا سلوک کرے گا۔ وہ برابر اس کی خدمت، دیکھ ریکھ اور ناز برداری کرتا رہتا ہے بالکل اسی جذبہ سے میں ان کا ساتھ دے رہی ہوں اور دیتی رہوں گی۔ پتہ نہیں کون سی ایسی کشش ہے جو مجھے ان سے علٰحدہ ہونے میں مانع رہتی ہے۔ میں ایک لمحہ کے لئے بھی انھیں چھوڑ کر ان سے دُور نہیں رہ سکتی۔ وہ رُقّن آپا کو تو تم جانتی ہی ہو، طلاق دلانے اور شادی کرانے میں کمال درجہ مہارت رکھتی ہیں۔ ایک دن میرے پاس بھی آئی تھیں۔ مجھ سے کہنے لگیں، بٹیا! تیرا یہ آدمی بڑا خراب ہے میں نے تیرے لئے ایک کماؤ اور خوبصورت بر تلاش کر لیا ہے۔ اتنا سُنتے ہی میرا خون کھولنے لگا میں نے اُسی وقت اُن سے کہہ دیا کہ اب آج کے بعد کبھی اِدھر نہ آنا میرا دروازہ تمھارے لئے بند ہو چکا پھر اس دن کے بعد سے وہ میرے یہاں کبھی نہیں آئیں۔" وہ اپنی عادتوں کے کتنے ہی کم زور، بے فکرے اور لاابالی مست قلندر سہی لیکن میں جس رشتہ کے ساتھ اُن سے باندھی گئی ہوں وہ بہت مضبوط ہے جو کبھی نہیں ٹوٹ سکتا، کسی طرح نہیں ٹوٹ سکتا۔ معلوم نہیں کیوں ــــــ؟

کلیم اطہر

پریم چند کے متعلق کچھ نئی معلومات

شری رام رتن لیسٹنک بھون (کتب خانہ) وارانسی (بنارس) میں ہندی سنسکرت، اردو، انگریزی اور بعض دیگر زبانوں کی بہت سی نایاب کتب و دستاویزات کا ذخیرہ ہے۔ اس کتب خانہ کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا وہ ذخیرہ ہے جس میں ہندوستانی ادیبوں کی تحریریں، ان کے دستخط، خطوط، تصویریں اور ذاتی استعمال کی چیزیں شامل ہیں۔ یہی ذخیرہ اس کتب خانہ کی اہمیت میں کافی اضافہ کرتا ہے۔ ان میں بیشتر چیزیں ہندی ادیبوں کی ہیں۔ اس کے علاوہ سنسکرت، بنگالی، اردو اور پنجابی زبان کے ادیبوں کی بھی ایسی ہی نایاب چیزیں اس کتب خانے میں موجود ہیں۔ جن سے تحقیقات کے سلسلے میں کافی فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔ یہاں منشی پریم چند کی بھی کئی کتابیں موجود ہیں جو اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

کتب خانہ میں منشی پریم چند کے دستخط، ان کی تعلیم، امتحانات سے متعلق سرٹیفکیٹ، اسناد، ان کی اکثر کتابوں کے مسودے، ان کا لباس جس میں کرتا، پائجامہ شامل ہے، چشمہ و دیگر کئی چیزیں موجود ہیں۔ یہ سب چیزیں آنجہانی پریم چند کی بیوہ شریمتی شیورانی کا عطیہ ہیں۔ کتب خانہ میں پریم چند کے دھنپت رائے نام سے بھی دستخط موجود ہیں۔

کتب خانہ میں محفوظ اسناد سے معلوم ہوتا ہے کہ پریم چند نے پرمانینٹ جونیئر انگلش ٹیچرس کا امتحان ۱۹۰۴ء میں گورنمنٹ سنٹرل ٹریننگ کالج الٰہ آباد سے دیا اور فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوئے۔ اس سند میں ان کا ریاضی میں کمزور ہونا ان لفظوں میں تحریر ہے۔

Not qualified to teach Math. (ریاضی پڑھانے کے قابل نہیں) اور پرنسپل نے جنرل ریمارکس کے کالم میں لکھا ہے:

He worked honestly and well (انھوں نے محنت اور ایمان داری سے کام کیا) اس سند پر ان کا نام دھنپت رائے لکھا ہوا ہے۔

۱۹۰۴ء ہی میں انھوں نے الٰہ آباد یونیورسٹی سے سپیشل ورنیکلر امتحان پاس کیا۔ اس میں ان کے مضامین ہندی اور اردو تھے۔ امتحان کی سند پر ان کا پورا نام دھنپت رائے سریواستو لکھا ہوا ہے لیکن انٹرمیڈیٹ کی سند پر جس کا امتحان منشی پریم چند نے ۱۹۱۴ء میں دیا تھا صرف دھنپت رائے لکھا ہوا ہے۔ اس وقت وہ بستی میں مدرس تھے۔ اس امتحان میں ان کے مضامین انگریزی ادب، منطق، فارسی اور تاریخ تھے۔

ان اسناد کے علاوہ پریم چند کا کرتا، پائجامہ، کوٹ، ٹوپی اور پیتر دانی وغیرہ بھی کتب خانہ میں موجود ہیں۔ یہ کپڑے کھدر کے ہیں۔ اور ان سے پریم چند کی سادہ معاشرت، معاشی حالت اور وضع قطع کا پتہ چلتا ہے۔ روس کی لینن گراڈ یونیورسٹی کے ہندی کے پروفیسر ڈاکٹر بالن تو ان کپڑوں کے ناپ تک لکھ کر لے گئے ہیں۔ وہ پریم چند پر ریسرچ کر رہے ہیں اور جلد ہی وہ پریم چند پر ایک کتاب بھی شائع کرنے والے ہیں۔

پریم چند کی اسناد اور کپڑوں کے علاوہ ایک خاص اور بہت ہی اہم چیز اس کتب خانہ میں موجود ہے یعنی ان کی تصانیف کے مسودات۔ یہ مسودے اردو اور ہندی دونوں میں لکھے ہوئے ہیں اور اکثر مسودوں میں ان کتابوں کا مرکزی خیال یا مرکزی کردار کی سیرت کے بارے میں مختصر طور

پر انگریزی میں بھی لکھا ہوا ہے۔ یہ مسودے کچھ پورے ہیں اور کچھ ادھورے۔ بعض میں خود منشی پریم چند کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور کچھ پریس کی پروف کاپی، جس پر منشی جی کے قلم سے اصلاح ہوئی ہے۔ یہ عبارت باریک قلم سے لکھی ہوئی ہے۔ بعض جگہ تو پڑھنے میں بہت دقت ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پریم چند خوش نویس نہ تھے۔ ان مسودوں کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ پریم چند اپنی ہر کہانی کے آغاز میں اس کہانی کا Synopsis (خاکہ) لکھ لیا کرتے تھے اور وہ بھی انگلش میں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اردو اور ہندی کے اس عظیم مصنف نے اپنی عظیم کہانیوں کا پلاٹ یا خاکہ انگریزی میں بنایا تھا۔ 'میدانِ عمل' کے ہندی مسودہ کے آخر میں ایک ناول کا خاکہ ہے۔ لیکن یہ ادھورا ہے۔ اس خاکے میں آٹھواں باب پوری طرح انگریزی میں لکھا ہوا ہے مگر نویں باب کا صرف نمبر دے کر رہ گئے ہیں۔ یہ ناول پریم چند لکھ نہ سکے۔ اسی کے آخر میں ایک کہانی ہے جس کا کوئی عنوان نہیں لکھا گیا ہے۔ یہ کہانی کافی ردوبدل کے بعد "کالا پانی کا قیدی" کے عنوان سے چھپی۔ اس مسودہ اور مطبوعہ کہانی میں بہت فرق ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ منشی پریم چند کبھی کبھی کہانی کے پلاٹ کو اتنا بدل دیتے تھے کہ پوری کہانی ہی بدل کر رہ جاتی تھی۔

'چوگانِ ہستی' کا پورا مسودہ اس کتب خانے میں موجود ہے۔ اس کے پہلے صفحہ کے بائیں حاشیے پر انگریزی میں 'یکم اکتوبر ۱۹۲۲ء سے شروع' لکھا ہوا ہے۔ آخر میں بھی انگریزی میں '۱۲ اگست ۱۹۲۶ء کو ختم ہوئی' تحریر ہے۔ اس ناول کو انھوں نے 'اوم' لکھ کر شروع کیا ہے اس سے ان کے آریہ سماجی ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ اس ناول کے آخر میں ان کی مشہور کہانی 'شطرنج کے کھلاڑی' کا مسودہ شامل ہے۔

'پریم آشرم' کا مسودہ بھی اس کتب خانے میں موجود ہے۔ مگر یہ ادھورا ہے اس مسودے کے پندرھویں باب کے صفحہ ۴ اور انتیسویں باب کے آخری حصہ سے اڑتیسویں باب تک کے صفحات موجود ہیں۔ اصل مسودہ نیلی روشنائی سے لکھا ہوا ہے۔ مگر کالی روشنائی سے چونتیسویں باب کے آخر میں ۸-۱-۲۵ اور اڑتیسویں باب کے آخر میں ۱۴-۱۰-۲۵ کی تاریخیں لکھی ہوئی ہیں۔ ان تاریخوں کے متعلق دو باتیں کہی جا سکتی ہیں، ایک تو یہ کہ یہ تاریخیں ہندی ترجمہ کی ہیں یا دہرانے کی۔ لیکن اس میں پہلی بات اس لئے ممکن نہیں کہ یہ ناول ہندی میں ۱۹۲۲ء میں ہی شائع ہو چکا تھا۔ دوسری بات بھی اس لئے ٹھیک نہیں معلوم ہوتی کہ اس میں کہیں بھی اصلاح نہیں دکھائی پڑتی جو دہرانے کے سلسلہ میں ضروری ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تاریخیں پریس کی کاپیاں تیار ہونے کی ہیں۔

مذکورہ بالا مسودوں کے علاوہ کئی کہانیوں کے مسودے بھی ہیں لیکن ان میں بیشتر کہانیاں ادھوری ہیں۔ ان کہانیوں میں سے جن کے مسودے ادھورے ہیں کچھ مطبوعہ ہیں اور کچھ غیر مطبوعہ۔ مطبوعہ کہانیاں مکمل ہیں حالانکہ ان کے مسودے ادھورے ہیں۔ ان اردو مسودوں کے علاوہ 'نرملا'، 'میدانِ عمل'، 'کایا پلٹ' اور کئی دوسری ہندی کہانیوں کے بھی مسودے موجود ہیں جن میں کچھ تو خود منشی پریم چند کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں اور کچھ پریس کی پروف کاپیاں ہیں۔ ان ہندی مسودوں میں ان کا ایک ترجمہ 'دنیا کی ابتدا' (ہندی) بھی شامل ہے جسے منشی جی نے کسی دوسرے سے لکھوایا ہے کیونکہ اس کی تحریر اور دوسرے مسودوں کی تحریر میں کافی فرق نظر آتا ہے۔

ان اردو اور ہندی کے مسودوں سے اس عظیم مصنف کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ 'کایا کلپ' کے مسودے سے اس اہم بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ پریم چند اپنی کہانیوں کے کرداروں کو اپنے ہی ماحول سے چنتے تھے اور یہ حقیقی کردار ہوتے تھے۔ 'کایا کلپ' کے شروع میں جس کا مسودہ ہندی میں ہے انھوں نے بطور یادداشت تحریر کیا ہے:

(۱) Vishal Singh is Bachchan Lal, (وشال سنگھ بچن لال ہے، سیدھا اور
simple, honest ایماندار)

(۲) Kalyan Singh is Chandrika (کلیان سنگھ چندریکا ہے)

(۳) Chakra Dher is J. Prssad (چکردھر۔ جے پرساد ہے
Very shy بہت شرمیلا)

(۴) Bibudha is Yagya Narain Singh, (بودھا یگیہ نرائن سنگھ
selfish but serviceful, tactful ہے مگر مطلبی ہوشیار و محنتی)

پریم چند ناول لکھنے کے بعد اس کو دہراتے بھی تھے اور خامیوں کو دور کرنے کے علاوہ اس میں تبدیلی بھی کیا کرتے تھے۔ ان کے مسودوں پر جگہ جگہ 'کاپیڈ آؤٹ' کے ساتھ تاریخ بھی لکھی ہوئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پریس کے لئے دوسری کاپی تیار کرتے تھے۔ کبھی کبھی پریس کی کاپی دوسروں سے بھی لکھوا لیتے تھے۔ 'چوگان ہستی' کے مسودہ پر لکھی ہوئی تاریخوں سے اس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

چھوٹی بچتیں

بلا شبہ چھوٹی بچتوں میں روپیہ لگانا ضروری ہے۔ یہ بہت آسان کام ہے۔ کسی بنک میں روپیہ رکھنے یا کمپنی کا حصہ خریدنے سے بہت آسان ہے۔ آپ کو صرف یہ کرنا ہے کہ نزدیکی ڈاک خانے تک چلے جایئے۔ بہت سے دیہاتوں میں بنک نہیں ہوتا لیکن تقریباً ہر دیہات کے آس پاس ڈاک خانہ ضرور ہوتا ہے۔ آپ کو صرف ڈاک خانے کے لوگوں کو یہ بتانا ہے کہ آپ چھوٹی بچت کرنا چاہتے ہیں اور وہاں کے لوگ اس کے بارے میں ساری تفصیل بتا دیں گے۔

روپیہ لگانے کے چار خاص طریقے ہیں:۔ نیشنل پلان سیونگ سرٹیفکیٹ دس سالہ ٹریژری سیونگ ڈیپازٹ سرٹیفکیٹ۔ پندرہ سالہ سالیانہ Annuity سرٹیفکیٹ اور پوسٹ آفس سیونگ بنک۔

(۱) نیشنل پلان سیونگ سرٹیفکیٹ:۔ نیشنل پلان سیونگ سرٹیفکیٹ خریدنے پر ۱۲ سال کے بعد زر اصل مع سود واپس ملتا ہے۔ یہ سرٹیفکیٹ ۵ سے لیکر ۵۰۰۰ روپے تک کے ہیں۔ آپ اسے کسی ڈاک خانے یا اختیار پائے ہوئے ایجنٹ سے خرید سکتے ہیں۔ مان لیجئے کہ آپ سو روپے کے یہ سرٹیفکیٹ خریدتے ہیں۔ ۵ سال کے ختم کے بعد یہ روپیہ ۱۱۶، ۷ سال کے بعد ۱۲۷، ۱۰ سال کے بعد ۱۴۸ اور ۱۲ سال کے بعد ۱۶۵ ہو جائے گا۔ آپ دیکھیں گے کس طرح سال گذرنے کے ساتھ سود کی شرح بڑھتی جاتی ہے ۱۲ برس کے بعد جب آپ اس سرٹیفکیٹ کے روپے پائیں گے تو سود کی شرح ۴٫۲۶ فی صدی ہوگی جو کسی بھی بنک کی شرح سے بہت زیادہ ہے۔

مان لیجئے کہ آپ کو روپے کی جلدی ضرورت ہے۔ یعنی ۱۲ سال سے پہلے تو آپ کو اپنے روپے یقیناً واپس مل جائیں گے۔ روپے واپس پانے میں آپ کو کوئی دقت نہ ہوگی۔ آپ صرف ڈاک خانے چلے جایئے۔ سرٹیفکیٹ کی پشت پر دستخط کر دیجئے۔ آپ کا دستخط خریداری کے وقت کے دستخط سے ملنا چاہیئے اور آپ کو روپیہ فوراً مل جائے گا۔ لیکن اپنی ضرورت کے وقت آپ کو ان سرٹیفکیٹوں کو بیچنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ یہ سرٹیفکیٹ قابلِ بھروسہ دستاویز ہیں۔ ان کو آپ بنک یا کوآپریٹو سوسائٹی میں گروی رکھ کر روپیہ حاصل کر سکتے ہیں۔ سود کے علاوہ ایک دوسرا فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سود پر انکم ٹیکس نہیں لگتا۔

(۲) دس سالہ ٹریژری سیونگ ڈیپازٹ سرٹیفکیٹ:۔ بعض لوگ کہہ سکتے ہیں کہ ہم کچھ روپیہ چھوٹی بچتوں میں لگا سکتے ہیں لیکن ہمیں ہر سال باقاعدہ سود ملنا چاہیئے ہم ۱۲ سال تک انتظار نہیں کر سکتے۔ اس صورت میں یہ سرٹیفکیٹ آپ کے لئے موزوں ہوں گے۔ ان پر ۴ فی صدی سالانہ سود ہر سال ادا کر دیا جاتا ہے۔ سود پر انکم ٹیکس معاف ہے۔ یہ سرٹیفکیٹ ۵۰ سے لے کر ۱۰۰۰۰ روپیہ تک کے ہیں۔ یوں کہ ان سرٹیفکیٹوں کے جاری کرنے کا مقصد یہ بھی ہے کہ آپ اپنے سارے کنبے کی آمدنی یا اپنی ساری زندگی کی کمائی اس میں لگا دیں اس لئے اس کی اجازت دی گئی ہے کہ ایک آدمی ۲۵۰۰۰ تک اس میں لگا سکتا ہے۔ اس سرٹیفکیٹ کا روپیہ آپ دس سال کے بعد واپس لے سکتے ہیں۔ لیکن اگر آپ چاہیں تو ایک سال کے بعد بھی اس کو بھنا سکتے ہیں۔ صرف ایک بات یہ ہے کہ اگر میعاد سے پہلے انھیں بھنا لیا گیا تو آپ کو ایک معمولی رقم ادا کرنی ہوگی۔ لیکن یہ رقم ملنے والے سود کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ اگر آپ انھیں بھنانا نہیں چاہتے اور قرض پر روپیہ چاہتے ہیں تو آپ انھیں بنک، کوآپریٹو بنک اور سوسائٹیوں میں گروی رکھ سکتے ہیں۔

(۳) پندرہ سالہ سالیانہ سرٹیفکیٹ:۔ مان لیجئے کہ آپ نے کافی دنوں میں بہت روپیہ جمع کر لیا ہے۔ آپ اس روپے کو لگانا چاہتے ہیں اور باقاعدہ ماہانہ آمدنی بھی چاہتے ہیں۔ اس کا ذریعہ یہ ۱۵ سالہ سرٹیفکیٹس ہیں۔ آپ اپنے بچوں کی تعلیم کا بہترین انتظام ان سرٹیفکیٹوں کو خرید کر کر سکتے ہیں۔ یہ سرٹیفکیٹ ۳۳۲۵ روپے سے لے کر ۶۶۵۰۰ روپے تک کے ہوتے ہیں۔ اگر آپ ۳۳۲۵ روپے لگائیں گے تو آپ کو ۱۵ برس تک ۲۵ روپیہ مہینہ ملتا رہے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ۱۵ برس میں آپ کو ساڑھے چار ہزار روپیہ ملا۔ حالانکہ آپ نے ۳۳۲۵ روپے لگائے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کو ۴٫۲۵ فی صدی شرح سے مرکب سود ملا۔

پہلے ماہ کی ادائیگی روپیہ لگانے کے ٹھیک ایک مہینے کے بعد سے شروع ہو جائے گی۔

(۴) پوسٹ آفس سیونگ بینک :- بہت سے لوگوں کا خیال ہوگا کہ ان کے پاس اتنی بڑی رقم نہیں ہے بعضوں کے پاس ایک وقت میں پانچ روپے بھی نہیں ہوتے وہ ڈاک خانے کے سیونگ بنک میں روپیہ جمع کر سکیں۔ آپ ڈاک خانے میں دو روپے سے اپنا حساب کھول سکتے ہیں۔ کوئی بھی فرد ۱۵۰۰۰ روپے تک جمع کرا سکتا ہے۔ ہفتے میں ایک بار آپ روپیہ نکال سکتے ہیں۔ لیکن بہت سے ایسے لوگ ہیں جو یہ بھی نہیں کر سکتے۔ وہ زیادہ سے زیادہ ایک وقت میں چند آنے بچا سکتے ہیں۔ ان کے فائدے کے لئے ڈاک خانے بچت ٹکٹ دیتے ہیں۔ یہ ۴ آنے، ۸ آنے اور ایک روپیہ کا ہوتا ہے جو تمام ڈاک خانوں میں ملتا ہے۔ اس کے ساتھ ایک کارڈ مفت دیا جاتا ہے جس پر ان ٹکٹوں کو چپکانا ہوتا ہے۔ جب ان ٹکٹوں کی قیمت ۵ روپے ہو جائے تو آپ انھیں نیشنل پلان سرٹیفکیٹ سے بدل سکتے ہیں۔

بچّوں کو بچت کی عادت ڈالنے کے لئے یہ طریقہ بہت اچھا ہے۔

گورنمنٹ نے پلان کی مدد کے لئے ایک دوسری چیز بھی نکالی ہے اور وہ ہے نیشنل سیونگ کوپن۔ اسے آپ اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کو تحفے کی شکل میں دے سکتے ہیں۔ اس کوپن کو آپ شادی، سالگرہ اور اسی طرح کے دوسرے موقعوں پر دے سکتے ہیں یہ کوپن ۵ سے ۱۰۰۰ روپے تک کے ہوتے ہیں اور ڈاک خانوں سے ملتے ہیں۔ تحفہ پانے والے اسے بارہ سالہ نیشنل پلان سرٹیفکیٹ سے بدل سکتے ہیں۔

ان تفصیلات سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ حکومت نے بچت کے ایسے طریقے نکالے ہیں جو ہر طرح کی آمدنی والوں کے لئے موزوں ہیں۔ کسان، فیکٹری میں کام کرنے والا مزدور، گھر والیاں، اسکول میں پڑھنے والے بچے ہر کوئی ملک کی بھلائی میں حصّہ لے سکتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی مالی بھلائی میں بھی۔ اس کے لئے ایک بڑا ادارہ قائم کیا گیا ہے تاکہ چھوٹی بچت کا پیغام ہر جگہ لوگوں تک پہنچ جائے۔ بعض دفعہ تو آپ کو ڈاک خانے تک جانے کی زحمت بھی نہ اٹھانی ہوگی۔ چھوٹی بچت کے بااختیار ایجنٹ آپ کے پاس آئیں گے۔ کمیونٹی پروجیکٹ کے کارکن بھی چھوٹی بچت کی اسکیم کے متعلق آپ کو مشورہ دیں گے۔ اس کے ماسوا شہروں اور قصبوں میں عورتوں کے بہت سے ادارے بن گئے ہیں جو بڑی سرگرمی سے یہ کام کر رہے ہیں کیونکہ عورتوں کے ادارے جانتے ہیں کہ ان اسکیموں سے خاص طور پر گھر والیوں کو فائدہ ہوگا۔

اس طرح آپ دیکھیں گے کہ چھوٹی بچت کی اسکیم عوام کے لئے اور ان کے فائدے کے لئے ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ چھوٹی بچت کی اسکیم ہے لیکن اس سے بڑے بڑے فائدے ہوں گے۔ آپ ایک وقت میں پلان کی مدد اور ساتھ ساتھ اپنی مدد بھی کریں گے۔ آپ کا ہر روپیہ ہندوستان کو خوش حال اور مضبوط بنائے گا۔



Edited and Published by the Director, Publications Division, Old Secretariat, Delhi-8
and Printed by the Model Press Private Ltd., Delhi.

Regd. No. D-509.

آجکل

چیتر شک سمت ۱۸۸۲
اپریل سنہ ۱۹۶۰ء

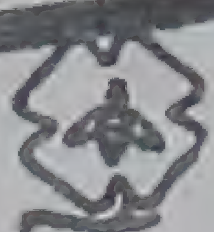


خوشحالی کی راہ پر بڑھتے ہوئے
ایک گاؤں کی کہانی

پچھلی گرمیوں میں سمرگوپال پور* کے باشندوں نے قومی بچتوں کے لئے روپیہ فراہم کرنے میں کمال ہی تو کر دیا۔ ان کا یہ کارنامہ قومی بچتوں کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ وہ اپنی بہترین کوششوں کو کام میں لائے، ان کے دلوں میں حب الوطنی کا بڑا مستحسن جذبہ موجزن تھا، مقامی لیڈروں کی رہنمائی انھیں حاصل تھی، اپنی مدد آپ کرنے اور مل جل کر کام کرنے کے معجزوں سے وہ آگاہ تھے۔ اس سے پیشتر بھی ان کے یہ جذبات اور اقدام ترقیاتی کاموں میں ان کے بڑے کام آئے تھے۔ انھوں نے قومی بچتوں کے لئے ۹۴۰۰۰ روپے اکٹھے کئے، پنجاب کے کسی بھی گاؤں نے اس وقت تک اتنی رقم فراہم نہیں کی تھی۔ یہاں کے ۴۵۱ کنبوں میں سے ۳۹۷ کنبوں نے قومی بچتوں میں روپیہ لگایا۔ ہر مرد، ہر عورت اور ہر بچہ اس کام میں برابر کا شریک تھا۔ اس تحریک آفریں کہانی کا قابل ذکر کردار نمبردار کی بیوی ہے۔ اس نے اپنے چھ ہزار روپے کی مالیت کے زیورات کو سرمایہ بنایا — اس رقم سے اس نے نیشنل پلان سیونگز سرٹیفکیٹ خریدے۔

ایک قابلِ تقلید مثال





قومی بچت آرگنائزیشن

DA 59/531

ترتیب

سرورق:- دربار صاحب، امرت سر

رسالے کی پشت پر:- یومِ جمہوریہ کی پریڈ میں نقیبوں کا جلوس

سالانہ چندہ:- ——— ہندوستان میں:- چھ روپے / پاکستان میں:- چھ روپے (پاک)

غیر ممالک سے:- ——— نو شلنگ یا سوا ڈالر

فی پرچہ:- ——— ہندوستان میں:- ۵۰ نئے پیسے / پاکستان میں:- آٹھ آنے (پاک)

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ

بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر "آج کل" اردو، اولڈ سیکرٹریٹ، دہلی ۸

اُردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

مجلسِ ادارت

محمد مجیب — جامعہ ملّیہ دہلی

محی الدین قادری زور — حیدرآباد

گوپی ناتھ امن — دہلی

خواجہ احمد فاروقی — دہلی

رحمان راہی — سری نگر

یو، ایس موہن راؤ ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن

جی، این، ایس راگھون ڈپٹی ڈائرکٹر (ایڈیٹوریل)

جی تنجا ناتھ ڈپٹی ڈائرکٹر (پروڈکشن)

بال مکند عرش ایڈیٹر شعبۂ اردو (سیکرٹری)

اسسٹنٹ ایڈیٹر:- مظفّر شاہ

جلد ۱۸ - نمبر ۹

چیتر شک سمت ۱۸۸۲

اپریل ۱۹۶۰ء

مرتّبہ و شائع کردہ

ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومت ہند

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

مُلاحظات

وزیراعظم پنڈت نہرو نے چین کے وزیراعظم مسٹر چو این لائی کو سرحدی مسئلے پر گفت وشنید کرنے کے لئے دہلی آنے کی جو دعوت دی تھی اُسے مسٹر چو این لائی نے قبول کر لیا ہے۔ وہ مارچ کے بجائے اپریل میں آئیں گے۔ انھوں نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ دونوں ملکوں کے سرحدی تنازعہ کو پُرامن طریقے سے حل کرنا ضروری ہے۔ چین اور ہندوستان کی دوستی دائمی ہے۔ ہندوستان نے شروع سے ہی اس معاملے میں دُوراندیشی اور صبر کا مظاہرہ کیا ہے، اور تنازعہ کے پُرامن تصفیہ کا خواہاں ہے۔ ہمیں امید کرنا چاہیئے کہ دونوں وزرائے اعظم کی ملاقات کامیاب ثابت ہوگی اور متنازعہ مسائل کا حل نکل آئے گا۔

وزیر مالیات شری مرارجی ڈیسائی نے پارلیمنٹ میں نئے مالی سال کا بجٹ پیش کیا۔ اس میں ۵۳ کروڑ کا خسارہ دکھایا گیا ہے، دفاعی اخراجات میں اضافہ کیا گیا ہے۔ ۲۳ کروڑ ۵۰ لاکھ رُوپے کے نئے ٹیکس لگائے گئے ہیں۔ پانچ سالہ انعامی بانڈ کی اسکیم پیش کی گئی ہے۔ دوسرے پنجسالہ منصوبے کا یہ آخری بجٹ ہے چنانچہ اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ سال کے آخر میں ملک کی معاشی حالت مضبوط ہے جیسا کہ وزیر مالیات نے بتایا خاص طور سے نئے ٹیکس تیسرے پنجسالہ منصوبے کو پیش نظر رکھ کر لگائے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ملک کی معاشیات کو مضبوط کرنے اور ترقیاتی کاموں کی رفتار تیز کرنے کے لئے یہ اقدامات ناگزیر ہیں۔

دلّی میں مرزا غالب کی برسی کے موقعہ پر غالب سوسائٹی اور انجمن ترقیٔ اردو (دہلی شاخ) کی طرف سے تقریبات ہوئیں، اس سلسلے میں دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی طرف سے بھی ایک خصوصی تقریب ہوئی، جس میں دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر وی، کے، آر، وی راؤ نے گورنر بہار ڈاکٹر ذاکر حسین کو شعبۂ اردو کی طرف سے شائع کردہ "اردوئے معلیٰ" کا غالب نمبر پیش کیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے اپنی تقریر میں مرزا غالب کی زندگی کے ان پہلوؤں پر تحقیقی کام کرنے پر زور دیا جن کے متعلق ابھی تک توجہ نہیں کی گئی۔

صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے شعبہ کی کارگزاری کی رپورٹ پیش کی۔ پاکستان، افغانستان، ایران اور دیگر ممالک کے ثقافتی نمائندوں نے غالب کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ حاضرین میں ہندوستان بھر کے ممتاز ادیب اور شاعر شامل تھے۔

افریقہ کے ملک مراکش میں ۲۹ فروری اور یکم مارچ کی درمیانی شب میں جو زلزلہ آیا اس سے بندرگاہ اغادیر کے ۷۰ فی صدی مکانات منہدم ہوگئے اور ہزاروں جانیں ضائع ہوگئیں۔ اس تباہی نے قیامتِ صغریٰ کا نمونہ پیش کیا۔ دنیا بھر میں اغادیر کی تباہی پر انسانی ہمدردی کے جذبات امڈ آئے ہیں اور مصیبت زدگان کے لئے ہر طرف سے امداد بہم پہنچائی جا رہی ہے۔

ہندوستان میں برطانیہ کے آخری وائسرائے کی اہلیہ لیڈی ماؤنٹ بیٹن کا ۲ فروری کو شمالی بورنیو میں اچانک انتقال ہوگیا۔ وہ انسانیت دوست، رحمدل اور جرأت مند خاتون تھیں۔ انھوں نے ہندوستان کی تقسیم کے بعد پناہ گزینوں کو جو امداد پہونچائی اور ان کی بحالی کے لئے جو کوششیں کیں، اس سے ملک کے عام باشندے متاثر ہوئے۔ ہندوستان سے جانے کے بعد بھی ہندوستان سے ان کی دلچسپی برقرار رہی۔ اس سال جشنِ جمہوریہ کے موقع پر وہ دلّی میں موجود تھیں۔

حال ہی میں احمدآباد میں انجمن ترقیٔ اردو کے زیرِ اہتمام ایک جلسہ ہوا جس میں یہ طے کیا گیا کہ اردو شاعری کے باوا آدم ولی گجراتی کی یادگار قائم کرنے اور اُن کے ادبی کارناموں سے گجرات کو روشناس کرانے کے لئے ضروری اقدامات کئے جائیں۔ اس مقصد کے لئے احمدآباد کے معزز شہریوں پر مشتمل ایک کمیٹی بھی بنائی گئی ہے۔ یہ نہایت مستحسن اقدام ہے جس سے نہ صرف ولی کے شایانِ شان کوئی یادگار قائم ہوگی بلکہ اردو زبان وادب کی ترویج وترقی میں بھی امداد حاصل ہوگی۔

صباح الدین عبدالرحمٰن

شاہانِ دہلی کی بزمِ شاعری

دہلی میں غلاموں کی بادشاہت قائم ہوئی تو ان کے لوازم شاہی میں علم دوستی، ادب نوازی اور علم پروری بھی داخل ہوئی۔ ان کا زیادہ وقت سلطنت کے سنوارنے میں گزرا، لیکن انھوں نے غزنین اور غور کی روایات کے مطابق شعراء، فضلاء اور علماء کو سایۂ عاطفت میں لیا اور اُن کی برابر سرپرستی کرتے رہے۔ وہ جب دربار میں کوئی جشن مناتے تو شعراء کو ضرور طلب کرتے اور ان سے ان کا کلام سن کر اپنے ذوقِ شعری کی تسکین بھی کرتے اور ان کو انعام واکرام سے بھی نوازتے۔ ایسے موقع پر شعراء زیادہ تر قصائد کہتے کیونکہ غزل اس وقت تک شاعری میں صنفِ سخن کی حیثیت سے داخل نہیں ہوئی تھی۔ آج کل کے نقطۂ نظر سے اس زمانہ کے قصائد میں محض غلو اور لفاظی ہوتی، لیکن مبالغہ آمیز مدّاحی کسی خوشامد یا چاپلوسی کی دلیل نہ تھی۔ اس زمانے میں عام طور سے شعراء کے سامنے قصیدے ہی کا میدان تھا اور اسی سرزمین میں وہ اپنے جوشِ طبیعت کی جولانیاں دکھاتے تھے، اور ان جولانیوں کے دکھانے میں آسمان وزمین کے قلابے ملایا کرتے تھے۔ ان سے مراد ممدوح کی بے جا اور ناروا خوشامد نہیں ہوتی تھی بلکہ زورِ طبع اور شاعرانہ کمال دکھانا مقصود ہوتا تھا جس سے شاعر کی عزت و توقیر بڑھتی تھی، اس لئے اس زمانے کے قصیدہ نگاروں کی مبالغہ آرائی کوئی عیب نہیں بلکہ ان کے لئے مایۂ ناز ہے۔ بعض شعراء نے تو مبالغے کو اس قدر ترقی دی کہ اس سے زیادہ وہم وخیال میں نہیں آسکتا ہے۔ اس طرح یہ ایک مستقل فن بن گیا اور بادشاہوں یا امراء کی ایسی مدح کی جاتی جس کے وہ مطلق مستحق نہ ہوتے لیکن ان کے اوصاف بیان کرنے میں قصیدہ نگار اپنا پورا زور صرف کر دیتے۔ مادح اور ممدوح سمجھتے کہ مدح میں جو خیالات ادا کئے جاتے ہیں ان کا تعلق حقیقت سے نہیں بلکہ محض فنِ شاعری سے ہے اور یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اردو[1] شاعری میں جولانیٔ طبع، زورِ بیان، خیال آرائی، مضمون آفرینی، جدّت طرازی، ترکیبوں کی دل آویزی، بندش کی چُستی، استعارات وتشبیہات کی دلفریبی، الفاظ کی شان وشوکت اور قوتِ ایجاد فارسی قصیدہ گوئی ہی کے ذریعہ آئی۔

قصیدہ گو شعراء کا اجتماع برابر درباروں میں رہا۔ قطب الدین ایبک کے دربار میں مولانا بہاء الدین اوشی اپنی خوش گوئی اور فصیح البیانی کی داد لیتے اور ایبک کے فیض وکرم سے سیراب ہوتے۔ اس کے دربار کا ایک دوسرا شاعر جمال الدین محمد جب اپنے قصائد سناتا تو اپنی بلاغت کی داد پاتا۔ ایک تیسرے شاعر قاضی مولانا حمید الدین اپنے شاعرانہ کمال کی وجہ سے "افتخار الافاضل" سمجھے جاتے۔ تاج المآثر کے مصنّف حسن نظامی نیشاپوری کو وصف نگاری میں کمال حاصل تھا جس میں صنائع لفظی ومعنوی کا پورا لحاظ ہوتا تھا۔

تاتاریوں کے فتنے سے ماوراء النہر اور ایران پر جو قیامت گزری اس کی بنا پر علماء کی طرح بہت سے شعراء نے بھی ہندوستان میں آکر پناہ لی اور جس کی رسائی سلطان شمس الدین التمش کے دربار تک ہوئی۔

---

[1] جب اردو شاعری کا جنم ہوا تو فارسی غزل اپنے پورے عروج پر تھی۔ اس لئے یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ اردو شاعری کو بیان کردہ جملہ محاسن فارسی قصیدے ہی سے ملے (ادارہ)

وہ اس کے جود وکرم سے اچھی طرح سیراب ہوا۔ یہ شعراء وقتاً فوقتاً اپنا کلام سنانے کے لئے دربار میں طلب کئے جاتے۔ ان ہی میں سے ایک شاعر خواجہ ابو نصر ناصری تھا۔ جب وہ اپنا قصیدہ سنانے لگا اور اس نے مطلع پڑھا تو سلطان التمش مطلع سن کر دوسری طرف متوجہ ہو گیا۔ ناصری بد دل ہوا۔ لیکن سلطان نے فوراً متوجہ ہو کر کہا ناصری پڑھو اور اس کا مطلع دہرایا۔ ناصری کو سلطان کے حافظے پر تعجب ہوا۔ اس نے قصیدے کے اور اشعار پڑھنے شروع کئے۔ جب وہ ختم کر چکا تو سلطان نے قصیدے کو دوبارہ پڑھنے کو کہا۔ جب وہ پڑھ چکا تو سلطان نے پوچھا کہ اس میں کتنے اشعار ہیں؟ ناصری نے کہا کہ ترپن! سلطان نے اسی وقت حکم دیا کہ اس کو ترپن ہزار چاندی کے سکّے انعام میں دئے جائیں۔ ناصری اس غیر متوقع انعام سے بے حد خوش ہوا۔ اسی طرح سلطان نے منڈور اور رن تھنبور فتح کئے تو اس موقع پر شاہی جشن منایا گیا۔ شعراء نے بھی تہنیت میں اپنا اپنا کلام پیش کیا لیکن سلطان کو سب سے زیادہ امیر روحانی کا کلام پسند آیا جس کے صلے میں اس کو بڑے انعام و اکرام سے سرفراز کیا۔ شاعروں میں التمش تاج الدین ریزہ کو اس کی خداداد ذہانت اور شاعرانہ کمال کی بنا پر بہت محبوب رکھتا۔ تاج الدین ریزہ بھی اپنی ممنونیت کا اظہار سلطان کی شان میں قصائد لکھ کر کرتا رہا۔ اس شاعر کو بڑا عروج سلطان رکن الدین فیروز شاہ کے عہد میں ہوا۔ وہ اس کا دبیر یعنی سیکرٹری ہو گیا۔ وہ بات بات پر اس کی خدمت میں قصیدے پیش کرتا۔ اس سلطان کی تاج پوشی کے موقع پر جب اور شعراء نے قصائد پیش کئے تو شہاب الدین مہمرہ نے بھی ایک قصیدہ گزرانا جس میں اہم اشعار تھے۔ ہر شعر میں کرگ (گینڈا)، گرگ (بھیڑیا)، پیل (ہاتھی)، اور شیر کے الفاظ لائے گئے۔ ان ہی چاروں الفاظ کی رعایت سے پورے قصیدے میں لزوم ما لا یلزم کی صنعت گری کی گئی ہے۔ وہ مشکل صنعتوں میں قصائد کہنے میں کمال رکھتے تھے۔

اوپر کہا جا چکا ہے کہ دربار میں جب کوئی اہم تقریب ہوتی تو شعراء اپنا کلام سنانے کے لئے ضرور مدعو کئے جاتے۔ سلطان ناصر الدین محمود کے زمانہ میں ہلاکو خاں کا ایلچی دہلی آیا تو سلطان کے نائب الغ خان نے سیاسی مصلحت کی بنا پر اس کا شاندار خیر مقدم کیا۔ اس کے استقبال کے لئے دہلی کے باہر دو لاکھ پیادے اور پچاس ہزار سوار زرق برق لباس کے ساتھ کھڑے کئے گئے۔ دربار نقرئی و طلائی فرش فروش سے مرصّع و مکلّف کیا گیا۔ تخت کی زینت و آرائش پورے کروفر سے کی گئی۔ اس کے ہر طرف لعل و جواہرات آویزاں تھے۔ اس کے ارد گرد ملوک، امراء، مشائخ، شہزادے، قوی ہیکل پہلوان، راجا اور رانا بہترین لباس میں کھڑے تھے۔ پورا دربار بہشت کا نمونہ معلوم ہو رہا تھا۔ اس وقت اس بزم نشاط میں شعراء بلائے گئے جن میں مولانا منہاج الدین کا قصیدہ بڑے غور سے سنا گیا۔

سلطان غیاث الدین بلبن کو شعراء سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں رہی لیکن اسی کے عہد میں شعراء کو بلبن کے شہزادوں اور امراء کے درباروں میں ایسا ملجا و ماویٰ مل گیا تھا کہ ان کو بلبن کے عدم التفات کا احساس مطلق نہ ہوا۔ شمس دبیر، قاضی اثیر، امیر خسرو اور حسن سنجری نے ان شہزادوں اور امراء کی زرپاشی اور سرپرستی میں فارسی شاعری میں جو چار چاند لگائے وہ ہندوستان میں فارسی ادب کی تاریخ کا ایک اہم اور شاندار باب ہے۔ سلطان بلبن کے بڑے لڑکے شہزادہ محمد سلطان کا علمی دربار ملتان میں لگتا اور اس کی مجلس فضلاء و شعراء سے بھری رہتی۔ اس میں برابر شاہنامہ، دیوان سنائی، دیوان خاقانی اور خمسۂ نظامی پڑھے جاتے۔ ان پر بحث و تمحیص ہوتی۔ ارباب ذوق شہزادہ کی شعر فہمی کے بے حد معترف تھے۔ خسرو کہا کرتے تھے کہ سخن فہمی، باریک بینی، ذوق صحیح اور متقدمین اور متاخرین کے اشعار کو محفوظ رکھنے میں محمد سلطان جیسا کسی کو نہ پایا۔ اس کے دربار میں ہر جگہ کے شعراء جمع ہو گئے تھے۔ اور جب خسرو اور حسن سنجری اس کی بزم میں آکر شریک ہوئے، تو مؤرخوں کا بیان ہے کہ شہزادے کی مجلس ادب میں پانچ سال تک بڑی رنگینی اور کیفیت رہی، شعراء اپنا اپنا کلام سناتے اور انعام و اکرام سے مالا مال ہوتے رہتے اور جب یہ شہزادہ چنگیز خان کے ہاتھوں شہید ہوا تو اس دور کے تمام شعراء اس کے ماتم میں خون کے آنسو بہاتے رہے۔ امیر خسرو اور حسن سنجری دونوں نے اس "مجلس یاران" کے درہم برہم ہونے پر اپنے قلق اور اضطراب کا اظہار کیا ہے۔ اور بڑی حسرت سے کہتے ہیں کہ مجلس کے بچھڑے ہوئے دوست بنات النعش ہو کر رہ گئے ہیں پھر یہ بنات النعش کیسے پروین بن سکتی ہیں۔ یعنی اب بچھڑوں کا جمع ہونا

ممکن نہیں۔

سلطان غیاث الدّین بلبن کا دوسرا لڑکا بغرا خان بھی شعراء کو اپنی زرپاشیوں سے سیراب کرتا رہا۔ ایک بار سلطان غیاث الدّین بلبن کے بھتیجے اور اس کے دربار کے ممتاز ترین خان کشلی خاں کی قیام گاہ پر شعراء کا اجتماع ہوا۔ اس میں بغرا خان بھی شریک تھا۔ شعراء نے اپنا اپنا کلام کشلی خان اور بغرا خان کو مخاطب کرکے سنایا۔ شعراء میں شمس دبیر اور قاضی اثیر کے علاوہ خسرو بھی تھے۔ خسرو کی زمزمہ سنجی سے بغرا خان اتنا متاثر ہوا کہ صلے کے طور پر ان کو ایک لگن بھر کر روپے دے۔ یہ بات کشلی خان کو ناگوار ہوئی۔ خسرو اسی کے دربار سے وابستہ تھے۔ اس لئے اس کو یہ پسند نہ آیا کہ اس کا وابستۂ دولت دوسرے کا ممنون ہو۔ یہ ناگواری اس حد تک بڑھ گئی کہ خسرو اس کے دربار سے علیحدہ ہو گئے اور بغرا خان کے یہاں سامانہ چلے گئے۔ جہاں شمس دبیر کے ساتھ خسرو نے شعر و شاعری کی مجلس گرم رکھی۔ شعراء کے ساتھ کشلی خاں کی فیاضی کی کوئی حد نہ تھی۔ ایک بار جشنِ نوروز کے موقع پر ایک شاعر خواجہ شمس الدّین کی غزل مطربوں نے گائی۔ کشلی خاں بھی اس جشن میں موجود تھا۔ مطربوں نے غزل ختم کی تو اس نے پوچھا کہ یہ کس کی غزل ہے؟ انھوں نے بتایا کہ خواجہ شمس الدّین کی۔ کشلی خاں گھر آیا اور خواجہ شمس الدّین کو بُلا کر اپنی مجلس نوروزی کا تمام پُرتکلف اور قیمتی سامان خواجہ کو عنایت کر دیا۔ یہ عالی ہمّت امیر اکثر ایسی بخشش کرتا کہ اپنے تمام مال و متاع اور خزانے دے دیتا۔ اور اس کے پاس جسم کے کپڑے کے علاوہ اور کچھ باقی نہ رہتا۔

سلطان جلال الدّین خلجی خود شاعر تھا۔ اس لئے اس کے ارد گرد برابر شعراء کا اجتماع رہتا۔ جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں: امیر خسرو، خواجہ حسن، موید جرجانی، موید دیوانہ، امیر ارسلان کلامی، اختیار الدّین باغی اور باقی خطیب۔ ان میں سے امیر خسرو روزانہ تازہ غزلیں تصنیف کر کے لاتے اور سلطان کی ادبی مجلس میں سُنا کر انعام و اکرام سے مالا مال کئے جاتے رفتہ رفتہ سلطان نے جامہ اور سفید کمربند عطا کر کے ان کو امراء کے گروہ میں داخل کر لیا۔ امیر خسرو کو علاء الدّین خلجی کے زمانہ میں ایک ہزار تنکے ماہانہ ملتے تھے۔ اور سلطان قطب الدّین مبارک خلجی کے سامنے جب انھوں نے اپنی مشہور مثنوی نہ سپہر پڑھی تو سلطان نے خوش ہو کر ان کو ایک ہاتھی کے برابر تول کر انعام میں روپے دئے۔ امیر خسرو جب تک زندہ رہے ان ہی کا طوطی بولتا رہا۔ گو اس زمانہ کی شاہانہ ادبی مجلسوں میں صدر الدین عالی فخر الدین قواس، حمید الدین راجہ، مولانا عارف، عبد الحکیم اور شہاب الدّین صدر نشین جیسے شیوا بیان شعراء بھی شریک ہوتے اور سلاطین کی بخششوں سے فیضیاب ہوتے لیکن ان کی شہرت امیر خسرو کے سامنے ماند پڑی رہی۔

مسالک الابصار کے مصنّف نے لکھا ہے کہ سلطان محمد تغلق کے دربار میں عربی، فارسی اور ہندی کے ایک ہزار باکمال شعراء تھے اور ان کی سرپرستی سلطان کرتا رہا۔ ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ فقیہہ شمس الدّین اندگانی نے ایک فارسی قصیدہ سلطان کی مدح میں پڑھا جس میں ۲۷ اشعار تھے۔ سلطان نے اس کو ہر ایک شعر کے بدلے ہزار دینار دئے۔ پہلے کے فرمانرواؤں میں سے بعض نے ہر شعر پر ہزار درہم تو دئے تھے لیکن کسی نے ہزار دینار نہیں دیا تھا۔ اسی طرح عبید زاکانی نے ایک مجلس میں سلطان کی شان میں ایک قصیدہ پڑھا تو مطلع سُنتے ہی وہ چیخ اٹھا کہ عبید! تمھارا ہر شعر سُننے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ کیونکہ تمام اشعار کے لئے میرے خزانے میں روپے نہیں ہیں۔ اس کے بعد اس نے حکم دیا کہ تھیلیوں میں سونے بھر بھر کر عبید کو پاؤں سے سر تک ڈھانک دیا جائے۔ اور یہی تھیلیاں اس کو انعام میں دے دی جائیں۔

لودی سلاطین نے اتنی فیاضی تو نہیں کی۔ لیکن ان کے دربار میں بھی شعراء کا اجتماع رہا۔ سکندر لودی خود بھی شاعر تھا۔ اس لئے وہ شعراء کو جاگیریں دے کر آگرہ اور اس کے نواح میں آباد ہونے کی ترغیب دیتا رہا۔ اور جب بابر اور اس کی اولاد کی سلطنت قائم ہوئی تو ہندوستان میں ادب نوازی، سخن فہمی، سخن وری، سخن شناسی اور سخن سنجی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اور قدرت کی طرف سے شعر و شاعری کا جو پاکیزہ شوق بابر کو عطا ہوا تھا۔ وہ اس کی نسل میں برابر منتقل ہوتا رہا۔

بابر ایک بے مثل ادیب، بلند پایہ نقّاد اور قابلِ قدر شاعر بھی تھا۔ اس نے تزکِ بابری میں علی شیر نوائی، سہیلی، آصفی، صفی بخاری، ہاتفی، ہمائی بدخشی، کامی، اور ہلالی وغیرہ کی شاعری پر جو تبصرہ کیا ہے وہ آج بھی پڑھنے کے لائق ہے۔ اس کی معیت میں برابر شعراء رہتے۔ چناں چہ وہ اپنی ایک ادبی مجلس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "جالہ میں اکثر وہ لوگ تھے جو شعر کہتے تھے مثلاً شیخ ابوالوجد، شیخ زین، ملا علی خان، تردی بیگ وغیرہ اثنائے صحبت میں محمد صالح کا یہ شعر پڑھا گیا۔

محبوبیٔ ہر عشوہ گرے راچہ کند کس   جائیکہ تو باشی دگرے راچہ کند کس

اور فرمائش کی گئی کہ اس زمین میں کچھ کہا جائے۔ شاعر اور موزوں طبع لوگ فکر کرنے لگے۔ ملا علی خان سے میں بے حد بے تکلف تھا۔ ہنسی سے میں نے فی البدیہہ یہ شعر کہا ؎

مانند تو مدہوش گُھے راچہ کند کس ۔ نرگاؤ کے مادہ خرے راچہ کند کس

اس سے پہلے جو کچھ اچھا برا کہتے یا ہزل نظم کرنے کا اتفاق ہوتا تھا تو لکھ لیا جاتا تھا۔ جب سے مثنوی مُبیّن کو نظم کرنے لگا تو دل میں آیا کہ جس زبان سے یہ پاک الفاظ نکلیں حیف ہے کہ اس سے بیہودہ لفظ بھی نکلیں۔ اور جس دل میں ایسے مقدس مضامین کھلیں، اس میں ایسے ناپاک خیال بھی پیدا ہوں۔ اسی دن سے ہزل کہنا ترک کر دیا تھا۔ مذکورہ بالا شعر کہتے وقت خیال نہ رہا۔ دو ایک روز کے بعد بگرام میں آکر مجھے جاڑے سے بخار چڑھا، کھانسی بھی ہوگئی۔ اور کھنکار میں خون آنے لگا۔ اب میں سمجھا کہ یہ تنبیہہ کس طرف سے ہے اور یہ تکلیف کیوں ہے۔ میں نے بار دگر توبہ کی اور اس نالائق طرز سے دل ہٹا لیا۔"

بابر نے کابل کے ایک مرغزار میں پتھر کا ایک حوض کھدوایا تھا یہاں اپنے خوش طبع دوستوں اور شاعروں کے ساتھ عیش و عشرت کی بزم منعقد کرتا تھا۔ اسی مناسبت سے ایک شعر کہہ کر حوض پر کندہ کرایا تھا۔ وہ شعر یہ ہے ؎

نوروز و نو بہار مے و دلبرے خوش است
بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

یہ شعر آج بھی لوگوں کی زبان پر ہے۔ بابر صاحب دیوان بھی تھا۔ جو شعراء اس کے ساتھ برابر رہے ان کے نام یہ ہیں:۔ شیخ ابو الوجد فارغی، سلطان محمد کوسہ، شُرخ و داعی، شیخ جمالی، شیخ زین، ملا علی خان، تردی بیگ وغیرہ۔ ۹۳۹ھ میں گوالیار کی مہم میں وہ سخت بیمار ہو گیا تھا۔ بیماری سے شفا پائی تو ایک جشن منعقد کیا۔ اس میں تمام ایلچی، قزلباش، اوزبک اور ہندو امراء بھی شریک ہوئے۔ بابر نے ان سب کو ترازو کے پلڑے بھر بھر کر چاندی اور سونا دیا۔ ان میں بعض شعراء مثلاً شہاب الدین معمائی بھی تھے۔

بابر ہی کی طرح ہمایوں کی زندگی بھی جنگ و جدل میں گذری، پھر بھی فرصت کے اوقات میں وہ شعر و سخن کا مشغلہ جاری رکھتا۔ اسی لئے شعراء کا ایک گروہ برابر اس کے ساتھ رہتا۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے لکھا ہے کہ بہت سے نادرہ روزگار شعراء اس کے دامن میں پلے۔ ان ہی میں مولانا جنونی بدخشانی، ملا جیرتی، مولانا نادری سمرقندی، مولانا فارغی ہراتی، طاہر دکنی خواجہ ایوب اور کاہی کابلی تھے۔ ہمایوں ان شعراء کو اپنی علم پرور صحبتوں میں ہمیشہ شریک رکھتا جس سے شعر و شاعری کی مجلسیں برابر گرم رہتیں اور ان کی نکتہ سنجی اور معانی آفرینی ان صحبتوں میں خوب پروان چڑھی۔ اسی لئے وہ اکثر اساتذہ کے کلام میں بلا تکلف اصلاحیں دیتا تھا۔ ایک بار ملا جیرتی نے اس کے سامنے یہ شعر پڑھا ؎

ہم چو پروانہ بہ شمعے سر و کار است مرا   پس اگر پیش روم بال و پرم می سوزد

ہمایوں نے دوسرے مصرعہ میں یہ اصلاح دی ؎ گر روم پیش اگر بال و پرم می سوزد
ملا جیرتی اس اصلاح سے بہت محظوظ ہوئے۔ اسی طرح ایک موقع پر جاہی یتمان نے شاہ محمد خان شاہ پوروائی کابل سے ناراض ہو کر اس کی ہجو کہی اور جب ہمایوں کے سامنے یہ پڑھی گئی تو اس کا آخری شعر یہ تھا۔

واے آں کس کہ بہ تخیل شعرا بستیزد   ہر کہ با ما بستیزد بہ بلا بستیزد

آخری مصرعہ سن کر ہمایوں نے فی البدیہہ کہا کہ اس کو اس طرح پڑھو

ہر کہ با ما بستیزد بخدا بستیزد

اکبر زیادہ پڑھا لکھا نہ تھا۔ لیکن اس کے ذاتی شوق کا یہ عالم تھا کہ فارسی کی مشہور کتابوں میں سے شاید ہی کوئی کتاب ہو جو اس کے سامنے پڑھی نہ گئی ہو اخلاقِ ناصری، کیمیائے سعادت، قابوس نامہ، مکتوبات شرف الدین منیری، گلستان، حدیقہ، مثنوی معنوی، جامِ جم، بوستاں، شاہنامہ، خمسۂ نظامی، خسرو اور مولانا جامی کے کلیات، خاقانی، اور انوری کے دیوان اس کے سامنے برابر پڑھے جاتے۔ اور وہ پڑھنے والے کو جیب خاص سے انعام دیتا اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس کو دیوان حافظ اور مثنوی مولانا روم کے بہت سے اشعار یاد تھے۔ کبھی کبھی فارسی اور ہندی میں اشعار بھی کہہ لیتا تھا اور بارہا اساتذہ کے اشعار پر نکتہ چینیاں بھی کیا کرتا تھا۔ ایک بار اس کے سامنے فغانی کا یہ شعر پڑھا گیا

مسیحا یار و خضرش ہم رکاب و ہم عنان عیسےٰ   فغانی آفتاب من بدیں اعزاز می آید

اکبر نے دوسرے مصرع میں برجستہ اصلاح دی۔

فغانی شہسوارِ من بدیں اعزاز می آید

ایک موقع پر طالب صفاہانی کی حسب ذیل رُباعی اس کے سامنے پڑھی گئی۔ اس میں حکیم ابوالفتح گیلانی کی موت پر افسوس اور اس کے بھائی حکیم ہمام کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا گیا تھا۔

مہرو برادرم کہ دمساز آمد   او شد بہ سفر وین زسفر باز آمد
او رفت بدنبالہ او عمر برفت   وین آمد و عمر رفتہ ام باز آمد

اکبر نے اس رُباعی کو سُنا تو کہا کہ دنبالہ کے لفظ سے شعر میں گرانی پیدا ہوگئی ہے۔ اس لئے یہ مصرع اس طرح پڑھا جائے تو بہتر ہے۔

او رفت و زرفتنش مرا عمر برفت

اکبر کی فیاضیاں اور زرپاشیاں سُن کر ہر جگہ سے شعراء اس کے دربار میں اُمنڈ آئے تھے۔ خواجہ نظام الدّین احمد نے طبقاتِ اکبری میں اکیاسی[۸۱] ایسے شعراء کا ذکر کیا ہے جنھوں نے دربار میں پہنچ کر تقرب حاصل کیا۔ اکبر نہ صرف ان پر سیم و زر کی بارش کرتا، بلکہ ان کے ذوقِ سخن کو بلند کرنے کی خاطر ملک الشعراء کا خاص عہدہ مقرر کیا جس پر سب سے پہلے غزالی مشہدی، اور اس کے بعد فیضی مامور ہوا، فیضی اکبر کا محبوب ترین دوست رہا۔ اس کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ اور اس کی ہمہ گیر قابلیت سے برابر فیض یاب ہوتا رہا۔ فیضی بھی اکبر کو بہت محبوب رکھتا تھا۔ اس کو بڑے بڑے عہدے دئے گئے۔ لیکن وہ اکبر کے قریب ہی رہ کر علمی و ادبی مشاغل میں زندگی بسر کرنا زیادہ پسند کرتا تھا۔ ایک بار ایران سے شاہ عباس صفوی نے اکبر کے پاس قیمتی تحائف لے کر اپنے ایک ایلچی کو بھیجا۔ مؤخر الذکر نے دربار میں آتے ہی ایک مکتوب پڑھا جس کے سرورق پر یہ رُباعی تھی۔

زنگی بہ سپاہ و خیل و لشکر نازد   رومی بہ سنان و تیغ و خنجر نازد
اکبر بہ خزینۂ پُر از زر نازد   عباس بہ ذوالفقار حیدر نازد

جب یہ رُباعی پڑھی گئی تو دربار کا ہر شخص چونک اٹھا۔ اکبر نے فیضی کی طرف دیکھا۔ فیضی اپنے محبوب کی سبکی برداشت نہ کر سکا اور فی البدیہہ یہ رباعی کہہ کر سرِ دربار پڑھی

فردوس بہ سلسبیل و کوثر نازد   دریا بہ گہر فلک بہ اختر نازد
عباس بہ ذوالفقار حیدر نازد   کونین بہ ذاتِ پاک اکبر نازد

اس کو سُن کر دربار میں مسرت و افتخار کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اکبر کی محبت فیضی سے آخر وقت تک قائم رہی اور جب فیضی کا انتقال ہوا تو اکبر نے غایت اضطراب اور صدمہ میں سر سے دستار اُتار کر زمین پر پھینک دی۔ شعراء کے ساتھ اس کی زرپاشی کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں خواجہ حسین مروی نے شہزادہ سلیم کی ولادت کے موقع پر ایک قصیدہ پیش کیا تو اکبر نے اس قصیدہ پر دو لاکھ ٹنکے انعام میں دئے۔ گھوڑا، ہاتھی، خلعت اور جاگیر دینا تو معمولی بات تھی۔

اکبر کے دربار کی روایت اس کے امراء نے بھی اپنے اپنے دربار میں قائم کی۔ غزالی مشہدی عراق سے ہندوستان آیا تو اکبر کے درباری امیر خان زمان حاکم جونپور نے ایک ہزار روپے زادِ راہ بھیج کر اس کو اپنے دربار میں بُلایا۔ یہاں ایک مثنوی نقش بدیع لکھ کر خان زماں کی خدمت میں پیش کی۔ جس میں ایک ہزار شعر تھے۔ سخن فہم اور سخن سنج خان زماں کو یہ مثنوی اس قدر پسند آئی کہ فی شعر ایک اشرفی انعام میں دی۔ خانخانان بیرم خان کو ہاشمی قندھاری کی ایک غزل بہت پسند آگئی تھی۔ اس نے ہاشمی کو ایک لاکھ ٹنکے دے کر یہ غزل اپنی طرف منسوب کر لی۔ بیرم خان کے لڑکے خانخاناں عبدالرحیم کی سخن سنجی اس کمال کو پہنچی ہوئی تھی کہ وہ اپنے مشہور ہم عصر شعراء نظیری، عرفی، شکیبی اور انیسی کے مقابلہ میں غزلیں کہتا اور بعض اوقات سب میں ممتاز رہتا۔ اس کے دربار میں برابر مشاعرے منعقد ہوا کرتے تھے۔ ایک بار طرح تھی چند است، پند است فرزند است، تمام شعرائے اکبری نے اس زمین میں طبع آزمائی کی۔ مگر میدان خانخاناں کے ہاتھ رہا۔ حتیٰ کہ نظیری بھی اس کے کلام کی صفائی اور دل آویزی میں اس سے بازی نہ لے جا سکا۔ اس زمانہ کے اکثر شعراء اس کی زرپاشی سے سیراب ہوئے۔ اس کی فیاضی کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ نوعی شیرازی کو سونے میں تُلوا دیا۔ نظیری نے ایک بار کہا کہ اس نے ایک لاکھ روپے کا ڈھیر نہیں دیکھا ہے۔ خانخاناں نے یہ ڈھیر دکھا کر اس کے گھر بھجوا دیا۔ ایک ہندی شاعر گنگ کوی کو اس نے ایک بار چھتیس ۳۶ لاکھ روپے انعام میں دئے۔ خانخاناں عبدالرحیم ہی کی طرح اکبری دربار کے ایک دوسرے عظیم المرتبت امیر حکیم ابوالفتح گیلانی نے اپنے یہاں شاعری کی ایک اکیڈمی قائم کر رکھی تھی۔ جہاں اس زمانے کے اکثر شعراء مثلاً خواجہ حسین ثنائی، مرزا قلی میلی، فیضی، عرفی شیرازی، حیاتی گیلانی اور مرزا نورالدین قراری وغیرہ فنِ شعر و شاعری پر بحث و تمحیص کرتے رہتے اور اسی محاکمہ و محاسبہ کی بدولت ان شعراء نے واقعہ گوئی، معاملہ بندی، خیال بندی، مضمون آفرینی، صنعتِ ایہام، استعارات و تشبیہات، فلسفیانہ خیالات

اور نئی نئی ترکیبوں میں طرح طرح کی جدّت پیدا کی، جو اس زمانہ کی شاعری کی امتیازی خصوصیات ہیں۔

جہانگیر تخت پر جلوہ افروز ہوا تو شاہی دربار باکمال شعراء سے بھرا ہوا تھا لیکن اس نے جوہر شناسی سے کام لے کر طالب آملی کو ملک الشعراء بنایا۔ وہ طالب کی تشبیہات کی ندرت اور استعارات کی لطافت سے برابر متاثر رہا، اس نے طالب آملی کے دیوان سے کچھ اشعار منتخب کئے۔ جن کے متعلق مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ خود طالب اس سے اچھا انتخاب نہیں کر سکتا تھا۔ جہانگیر کے پاکیزۂ ذوق کی یہ دلیل تھی کہ وہ کبھی یہ گوارا نہیں کرتا تھا کہ اس کے سامنے شاعری میں کسی قسم کی بدمذاقی کی جائے۔ ایک دفعہ ایک شاعر نے جہانگیر کی مدح میں ایک قصیدہ لکھ کر پیش کیا۔ مطلع کا پہلا مصرع یہ تھا

لے تاج دولت بر سرت از ابتدا تا انتہا

جہانگیر نے کہا عروض بھی جانتے ہو؟ شاعر نے کہا حضور نہیں۔ جہانگیر نے کہا اچھا ہوا۔ ورنہ تمھارے قتل کا حکم ہوتا، پھر مصرع کی تقطیع کر کے بتایا کہ دوسرا رکن یوں آتا ہے۔ "لت بر سرت" اور یہ سخت بے ادبی ہے۔

اسی زمانے میں مٹے تخلص کا ایک شاعر تھا جو قوم کا کلال تھا۔ کلال کی قوم شاہی درباروں میں دربانی اور چاؤشی کے لئے مخصوص تھی۔ مٹے نے نورجہاں بیگم کے توسل سے جہانگیر کے دربار میں شاعری کی تقریب سے رسائی پیدا کرنی چاہی۔ جہانگیر نے کہا کہ ان لوگوں کا کام چاؤشی اور سواری کا اہتمام ہے۔ ان کو شاعری سے کیا مناسبت، لیکن نورجہاں کی خاطر عزیز تھی۔ اجازت دی، مٹے نے یہ شعر پڑھا ؎

مٹے بہ گریہ مستے اندرائے نصیحت گر کنارہ گیر کہ امروز روزِ طوفان است

جہانگیر نے کہا۔ دیکھا رہی اپنے پیشہ کی رعایت۔ دوسرے موقع پر پھر نورجہاں بیگم نے تقریب کی۔ مٹے نے مطلع پڑھا

من می روم و برق زنان شعلۂ آہم اے ہم نفساں دور شوید از سرِ راہم

جہانگیر نے ہنس کر کہا وہ اثر کہاں جا سکتا ہے۔

ایک بار ایک ہندو شاعر نے ہندی میں جہانگیر کے سامنے ایک اچھوتے مضمون کی نظم پڑھی، جس کا حاصل یہ تھا کہ اگر آفتاب کے کوئی بیٹا ہوتا تو کبھی رات نہ ہوتی۔ کیوں کہ جب آفتاب چھپ جاتا تو اُس کا بیٹا اُس کے بجائے عالم افروزی کرتا۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ کے والد کو خدا نے ایسا بیٹا دیا کہ لوگوں نے ان کے انتقال کا غم نہ کیا۔ آفتاب کو رشک ہے کہ آپ کے طالع کی روشنی اور عدالت کے نور سلطنت میں کہیں رات نہیں۔ جہانگیر اس اچھوتے خیال کو سُن کر بہت محظوظ ہوا۔ اور ایک ہاتھی انعام دیا۔ پھر اس کے حکم سے ان اشعار کا فارسی میں بھی ترجمہ کیا گیا۔

جہانگیر کی شہزادگی کے زمانہ ہی سے شعراء اس کے یہاں ملازم تھے۔ اور اس کی مجلس شعر و شاعری سے ہمیشہ گرم رہی۔ ایک بہت ہی کمسن شاعر جس کی عمر تیرہ سال سے زیادہ نہ تھی، شہزادہ سلیم کے دربار میں اپنی سخن گستری کی داد لیتا تھا۔ سلیم ہی نے اس کا تخلص طفلی رکھا تھا۔ عرفی جب ہندوستان پہنچا تو شہزادہ سلیم نے بھی اس کے کلام کی شان و شوکت، استعارات کی طرفگی بندش کی چُستی، مضامین کی نازک خیالی اور خیالات کی رفعت کی بڑی شہرت سُنی۔ چناں چہ اس نے عرفی کو اپنے دربار میں بُلا کر قصیدہ لکھنے کی فرمائش کی، اس دعوت پر وہ بڑا نازاں رہا۔ جہانگیر تخت پر بیٹھا تو طالب آملی اس کے دربار میں حاضر ہوا۔ مگر جب وہ جہانگیر کے حضور میں پہنچا تو ایسا مخمور اور مسحور ہو گیا کہ اس کی کسی بات کا جواب نہ دے سکا۔ لیکن رفتہ رفتہ جہانگیر اس کے شاعرانہ کمالات سے خود بخود متاثر ہوتا گیا۔ نظیری نیشاپوری نے جہانگیر کی شان میں ایک قصیدہ کہا تو اس کے صلے میں ہزار روپیہ، گھوڑا اور خلعت عطا کیا۔ حیاتی گیلانی تو اس قدر محبوب تھا کہ وہ اس کو ہمیشہ سفر و حضر میں ساتھ رکھتا۔ اور اس کی شاعری سے لُطف اندوز ہوتا رہتا۔ اس نے خسرو شیریں کی بحر میں قصۂ سلیمان و بلقیس لکھ کر جہانگیر کی خدمت میں پیش کیا تو جہانگیر نے خوش ہو کر اس کو سونے میں تُلوا کر سونا انعام میں دے دیا۔

جہانگیر کے فوجی کیمپ میں بھی شعراء ساتھ رہتے۔ سنہ ۱۰۲۴ھ میں وہ اجمیر گیا تو لشکر کے ساتھ شاہی جلو میں شعراء بھی تھے۔ ایک روز شیخ فیروز کی قیام گاہ پر تمام اصحابِ سخن مثلاً طالب آملی، ملّا عطائی جونپوری، الوالہوری، طفیلی فتح پوری وغیرہ جمع ہوئے۔ شیخ فیروز کو مقبولیت اس لئے حاصل تھی کہ اس کو اساتذہ کے ہزاروں اشعار زبانی یاد تھے۔ یہ مجلس جاری تھی کہ اس دور کا مشہور شاعر شیدا بھی آ پہنچا۔ وہ بہت ہی ذہین، ہجوگو اور ذی علم شاعر تھا۔ مگر تمام شعراء اس کی خردہ گیری، عیب جوئی اور ہجوگوئی سے عاجز تھے وہ فتح پور آگرہ میں پیدا ہوا تھا۔ اس لئے ایرانی شعراء اس کو ہندوستانی سمجھتے تھے۔ لیکن اس نے تمام ایرانی شعراء حتیٰ کہ طالب آملی کو بھی اپنے طنز و استہزاء سے

نچیر کیا۔ مذکورہ بالا مجلس میں شیدا پہنچا تو تمام شعراء نے گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا اور نمایاں جگہ پر بٹھا کر اس سے تازہ کلام سنانے کی فرمائش کی۔ شیدا نے یہ شعر پڑھا۔

چیست دانی بادۂ گلگوں مصفا جوہرے   حسن را پروردگار و عشق را پیغمبرے

شیخ فیروز نے کہا یہ تو رودکی کے شعر سے سرقہ ہے۔

عشق را نی پیمبر و لیکن   حسن را آفریدگار توئی

شیدا کچھ برہم ہوا، لیکن اس نے ایک دوسرا شعر سنایا۔

زبسکہ کرد غمت تند بر جگر ناخن   چو پشت ماہیم از پائے تا بسر ناخن

شیخ فیروز نے اعتراض کیا کہ یہ غیاثائی حلوائی کا چربہ ہے۔

از بسکہ سینہ کندم و ناخن درو نشست   چو پشت ماہیست سراپائے سینہ ام

شیدا اور بھی زیادہ چیں بجبیں ہوا مگر ایک اور شعر پڑھ کر داد چاہی

گر بہ صحرا موفشانی دشت پر سنبل شود   در بدریا رو بشوئی خار ماہی گل شود

مگر شیخ فیروز بولا کہ یہ تو ملا کاہی کے شعر سے توارد ہے

گر بدریا افتد از عکس جمال او فروغ   خار ماہی آورد در قعر دریا بار گل

شیدا نے چڑ کر کہا کہ اگر یہی ستم ظریفی ہے تو اس کے مقابلہ کا شعر سناؤ

ذات تو بود صحیفہ کون کہ کرد   از روی ادب مہر خدا بر پشت

حاضرین نے قہقہہ لگایا، شیدا نے زچ ہو کر بدکلامی شروع کر دی لیکن اصحاب مجلس پھر مصر ہوئے تو اس نے یہ شعر پڑھا

زلف او را رشتۂ جان گفتم و گشتم خجل   زانکہ این معنی چو نقش پیش پا افتادہ است

شیخ فیروز نے کہا کہ مہمان کی دل آزاری مراد نہیں لیکن اس مضمون کا ایک شعر پہلے بھی کہا جا چکا ہے

کس نیابد مصرعۂ پیچیدۂ زلف کجت   گرچہ این مضمون ترا در پیش پا افتادہ است

بالآخر شیدا پر مہر سکوت لگ گئی۔ اور باوجود اصرار کے اس نے کوئی اور شعر پڑھنے کی ہمت نہ کی۔ اور پھر کبھی ایسی مجلس میں شریک نہ ہوا جس میں شیخ فیروز بھی ہوتا۔

اکبر اور جہانگیر نے شعراء کی سرپرستی میں جو شاہانہ فیاضیاں کیں۔ ان کے غلغلہ سے ہندوستان اور ایران گونج رہا تھا۔ ایران سے شعراء ہندوستان امڈے چلے آ رہے تھے۔ اور بقول مولانا شبلی ایران اور ہندوستان ایک مکان کے دو صحن بن گئے تھے۔ چناں چہ شاہجہان کے دربار میں بھی شعراء کی تعداد بکثرت رہی۔ بلکہ وہ اپنی فیاضی و قدردانی میں اکبر اور جہانگیر دونوں سے بازی لے گیا

حاجی محمد جان قدسی اس کے دربار کا ملک الشعراء تھا۔ وہ مکہ معظمہ سے تعلیم پا کر ہندوستان آیا تو پہلے شاہجہانی دربار کے ایک امیر خواجہ عبداللہ خان زخمی کی مدح میں ایک قصیدہ کہا۔ اس وقت خواجہ عبداللہ ایک فوجی کیمپ میں تھا۔ وہ قصیدہ سن کر اس قدر متاثر ہوا کہ اپنی مسند سے اٹھ گیا اور قدسی کو اپنی جگہ پر بٹھایا پھر باہر نکل کر اپنا خیمہ، اس کے تمام متعلقات اور لشکر کی تمام چیزیں قدسی کو انعام دے دیں۔ قدسی نے شاہجہان کی خدمت میں حاضر ہو کر ایک قصیدہ کہا۔ بادشاہ عبداللہ خان کی بخشش کا حال سن چکا تھا۔ اس نے کہا "حاجی! عبداللہ خان نے تم کو جو انعام دیا ہے وہ کوئی اور نہیں دے سکتا ہے۔" لیکن اس نے جواہرات کی مختلف قسمیں طلب کیں اور حکم دیا کہ قدسی کا منہ ساتوں بار ان موتیوں سے پر کیا جائے۔ سامنے سونے کا طشت رکھا گیا۔ قدسی کا منہ بھر جاتا تو اس طشت میں موتیوں کو گرا دیتا تھا۔ ۱۰۴۵ھ میں قدسی نے جشن نوروز کے موقع پر ایک قصیدہ لکھا تو شاہجہان نے انعام میں اس کو روپے میں تلوایا جو وزن میں پانچ ہزار پانچ سو تھے۔ ۱۰۴۴ھ میں جب شاہجہان نے ایک کروڑ روپے کی لاگت سے تخت طاؤس تیار کرایا اور آگرہ میں جشن نوروز کے موقع پر اس پر جلوس کی رسم ادا کی تو دربار کے شعراء نے اس تقریب میں قصائد کہہ کر اپنی لیاقت و ذہانت کا ثبوت دیا۔ ملک الشعراء ابوطالب کلیم نے بھی ایک قصیدہ کہا جو شاہ جہان کو سب سے زیادہ پسند آیا۔ اس کے صلہ میں کلیم کو روپے کے برابر تلوایا جو ۵۵۰۰ وزن میں آئے اور اس کو عطا کیے۔ شاہجہان نے کلیم کو اس کے پسندیدہ اشعار پر خدا جانے کتنی اشرفیاں دی تھیں۔ ایک موقع پر قیصر روم نے شاہجہان کو خط لکھ کر یہ اعتراض کیا کہ صرف ہندوستان کا بادشاہ ہو کر شاہجہان کا لقب اختیار کرنا صحیح نہیں۔ اس اعتراض پر شاہجہان کچھ پریشان ہوا۔ اور اپنا لقب بدلنے کے لئے تیار بھی ہو گیا۔ لیکن کلیم نے ایک قصیدہ لکھ کر پیش کیا جس میں لقب کی یہ توجیہہ کی۔

ہند و جہاں ز روئے عدد ہر دو چوں یکے است
شہ را خطاب شاہ جہانی مبرہن است

شاہجہان نے خوش ہو کر کلیم کو روپے میں تلوایا۔ شاہ جہان جب تخت پر بیٹھا تھا تو صائب نے ایک تاریخی قطعہ کہا جس کے صلہ میں شاہجہان نے اس کو بارہ ہزار روپے دیئے۔ کچھ دنوں کے بعد منصب اور خطاب بھی عطا کیا۔ اور جب صائب ایران چلا گیا تو شاہ عباس ثانی نے بھی اس کی بڑی قدردانی

کی لیکن صائب کو ہندوستان کی فیاضیاں رہ رہ کر یاد آتی تھیں۔

کچھ شعراء شاہجہان جیسے باوقار اور متین بادشاہ کی خدمت میں گستاخ بھی تھے۔ ان ہی میں شیدا بھی تھا۔ ایک بار شاہجہان نے اس سے پوچھا کہ تم شعر اچھا کہتے ہو یا حکیم حاذق گیلانی، شیدا نے بادشاہ کے اس سوال کو ناپسند کیا کیوں کہ وہ حکیم حاذق گیلانی کو اپنا مدمقابل نہیں سمجھتا تھا اور اس کی ہجو کہہ چکا تھا۔ اس لئے جل کر بولا: "ہم دونوں سے راسٹے پاسٹے واس بہتر کہتا ہے" راسٹے پاسٹے واس شاہی دربار کا ادنیٰ ملازم تھا۔ جو مضحک اشعار کہتا تھا۔ شاہجہان اس جواب سے بہت کبیدہ خاطر ہوا، اور شیدا کو دربار سے نکل جانے کا حکم دیا ایک موقع پر شیدا کا یہ مشہور شعر شاہجہان کو سنایا گیا

پیریت وانی بادۂ گلگوں مصفا جوہرے   حسن را پروردگار و عشق را پیغمبرے

شاہجہان نے ام الخبائث شراب کی یہ توقیر اپنے قلمرو میں پسند نہیں کی لیکن شیدا نے اپنی برأت میں جامی کا مندرجہ ذیل شعر پیش کیا۔

از مراحی دو بار قلقل مے   پیش جامی بہ از چہار قل است

عالمگیر کو شعراء سے کم دلچسپی رہی۔ لیکن دربار میں جو ادبی روایت بن گئی تھی۔ وہ آخر وقت تک قائم رہی۔ کچھ ایسے شعراء بھی ہوئے جو دربار سے وابستہ ہونا پسند نہیں کرتے تھے۔ مثلاً مرزا عبدالقادر بیدل دربار میں جاکر قصیدہ خوانی کرنا ننگ وعار سمجھتے تھے۔ اور جب عالمگیر کے جانشین شاہ عالم بہادر شاہ نے ان سے قصیدہ کہنے کی فرمائش کی تو وہ اس کی ملازمت سے کنارہ کش ہوگئے اور بقیہ عمر توکل میں گذار دی۔

جب مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہوا تو محمد شاہ، شاہ عالم اور بہادر شاہ میں اسلاف کی علم پروری اور ادب نوازی کا خمیر ضرور موجود تھا مگر اس وقت شمع سحر میں ان کے اسلاف کے آفتاب نصف النہار کی ضوفشانی کہاں سے آتی۔ دربار میں شعراء تو ضرور ہوتے لیکن ان کی اگلی سی قدر دانی نہیں رہی۔ شاہ عالم ثانی سید انشاء اللہ خاں کو خاص طور سے بہت محبوب رکھتا تھا۔ ان کی ایک لمحہ کی جدائی اس کو گوارا نہ ہوتی۔ مگر بقول محمد حسین آزاد عبرت کا مقام یہ تھا کہ جس کے اسلاف ایک ایک شعر کے صلہ میں شعراء کا منہ زر و جواہر سے بھر دیتے تھے اور ان کو سونے چاندی میں تلواتے تھے۔ آج ان کے وارث کے پاس اتنا بھی نہ تھا کہ اپنے محبوب شاعر کے بچوں کے لئے دو دو کھجوروں کے لئے کچھ رقم دیتا۔ اسی زمانے میں دھوم دھام سے مشاعرے ہوتے۔

شاہ عالم بھی اپنی غزل ان مشاعروں میں بھیجا کرتا تھا۔ ایک بار شاہ عالم سے سید انشاء نے کہا کہ فلاں فلاں اشخاص حضور کی غزل پر تمسخر اور مضحکہ کرتے ہیں یہ سن کر شاہ عالم کو دکھ ہوا اور اس نے مشاعروں میں اپنی غزل بھیجنی بند کر دی۔ سید انشاء کی یہ حرکت اور شعراء کو ناگوار گذری، ایک مشاعرہ میں ولی اللہ محب نے یہ قطعہ پڑھا۔

مجلس میں چھکے چھوٹے جھگڑا شعراء کا   ایسے ہی کسی صاحب توقیر کے آگے
یہ بھی کوئی دانش ہے کہ پہنچے یہ قضایا   اکبر تئیں یا شاہ جہانگیر کے آگے

انشا کب چوکنے والے تھے۔ اسی مشاعرہ میں انھوں نے اپنے معترضین کو مخاطب کرتے ہوئے فخر، تعلی اور پندار سے بھری ہوئی ایک غزل پڑھی جس کے دو شعر یہ ہیں۔

ہوں وہ جبروتی کہ گروہ حکما سب   چڑیوں کی طرح کہتے ہیں چوں چوں مرے آگے
لپٹے ہے یہی خامہ کہ کس کس کو میں باندھوں   بادل سے چلے آتے ہیں مضموں مرے آگے

شاہ عالم کے لڑکوں میں مرزا جہاندار شاہ، مرزا احسن بخت، مرزا سلیمان شکوہ، مرزا فرخندہ بخت اور مرزا فخر الدین کو شعر وشاعری سے بڑا لگاؤ رہا، یہ سب شاعر بھی تھے۔ اس لئے ان کے یہاں برابر شاعروں کا جمگھٹا رہتا۔ گلزار ابراہیم کے مصنف نے لکھا ہے کہ مرزا جہاندار اپنے یہاں ہفتے میں دو بار مشاعرہ کرتا اور شعراء کو چوبدار بھیج کر بلواتا اور نہایت التفات و عنایت سے پیش آتا۔ لیکن اس زمانہ میں شعر وشاعری کا سب سے بڑا مرکز مرزا سلیمان شکوہ کا دربار ہوگیا تھا۔ اس کے یہاں تمام ممتاز شعراء کا اجتماع برابر رہتا۔ محمد حسین آزاد کی روایت ہے کہ ایک روز مرزا سلیمان شکوہ کے پائیں باغ میں تخت بچھے تھے۔ شرفا اور شعراء کا حسب معمول مجمع تھا۔ مرزا رفیع اور میاں سکندر مرثیہ گو بھی موجود تھے۔ کہ میر ضاحک تشریف لائے۔ ان کی پرانی وضع اور لباس کو دیکھ کر مرزا شکوہ مسکرایا، مزاج پرسی کی حقہ پیش کیا۔ مرزا شکوہ نے سودا کو مخاطب کر کے کہا کہ کچھ ارشاد فرمائیے۔ سودا نے کہا کہ میں نے تو ان دنوں کچھ کہا نہیں۔ میاں سکندر کی طرف اشارہ کیا کہ انھوں نے مخمس کہا ہے۔ سلیمان شکوہ نے کہا وہ کیا ہے؟ سودا نے میر ضاحک پر اپنی ہی کہی ہوئی، ہجو کا پہلا بند پڑھا کہ میر ضاحک اٹھ کر میاں سکندر سے دست وگریباں ہوگئے۔ سکندر بے چارے پریشان تھے کہ کیا آفت آگئی سب اٹھ کھڑے ہوئے اور دونوں کو الگ کیا۔ سودا کنارے کھڑے مسکرا رہے تھے۔ مرزا سلیمان شکوہ

نے دہلی چھوڑ کر لکھنؤ میں اپنی بزم سجائی، تو لکھنؤ کی سرزمین پر چھوٹی دہلی بسا دی انشاء، جرأت، سوز اور مصحفی ان کے دربار میں ملازم رہے ان سب میں بڑے بڑے شاعرانہ معرکے رہے۔ پہلے تو یہ شاعرانہ چشمک رہی۔ پھر نوبت جنگ و جدل اور فحش اور پھکڑ تک پہنچ گئی، انشاء اور مصحفی کی مشہور چوٹیں مرزا سلیمان شکوہ کے دربار ہی میں ہوا کرتی تھیں۔ مرزا سلیمان شکوہ پہلے مصحفی سے اصلاح لیا کرتا تھا۔ لیکن جب سیّد انشاء بھی اس کے دربار سے منسلک ہوئے تو مصحفی کا چراغ گل ہو گیا اور ان کی تنخواہ میں بھی تخفیف ہو گئی جس پر مصحفی نے آزردہ خاطر ہو کر کہا۔

استاد کا کرتے ہیں امیراب کے مقرر   ہوتا ہے جو درماہہ کہ سائیس کے لائق

اسی کے بعد مصحفی اور انشاء میں برابر چھیڑ چھاڑ رہی۔ سلیمان شکوہ کے یہاں ایک مشاعرہ ہوا تو مصحفی نے بھی اپنی غزل پڑھی جس کا مطلع یہ تھا۔

زہرہ کی جو آئی کف ہاروت میں انگلی   کی رشک نے جا دیدۂ ماروت میں انگلی

اور جب انشاء نے اپنی غزل پڑھی تو مصحفی ہی کے مطلع کو سامنے رکھ کر اپنا مطلع کہا۔

دیکھ اس کی بڑی خاتم یاقوت میں انگلی   ہاروت نے کی دیدۂ ماروت میں انگلی

مصحفی کی غزل کا مقطع یہ تھا

تھا مصحفی پہ مائل گریہ کہ پس از مرگ   تھی اس کی دھری چشم پہ تابوت میں انگلی

جب مصحفی مشاعرہ سے جا چکے تو غالباً انشاء ہی کے اشارہ پر مصحفی کے اشعار کو اُلٹ پلٹ کر اس کی مٹی پلید کی گئی اور مقطع کو اس طرح کر دیا گیا۔

تھا مصحفی کا ناجو چھپانے کو پس از مرگ   رکھے ہوئے تھا آنکھ پہ تابوت میں انگلی

اس کی خبر مصحفی کو پہنچی تو انھوں نے ایک فخریہ غزل پڑھی اور انشاء اور دوسرے شاعروں پر چوٹ کی۔

پھبتا نہیں ہے بزم امیران دہر میں   شاعر کو مرے سامنے غوغائے شاعری
ایک طرفہ خر سے کام پڑا ہے مجھے کہ ہائے   سمجھے ہے آپ کو وہ مسیحائے شاعری

بات بڑھی، سیّد انشا نے ایک بحر طویل میں مصحفی کی ہجو کہی۔ اور پھر نوبت یہ پہنچی کہ مشاعرہ میں جیسی بھی طرح ہوتی، دونوں ایک دوسرے پر چوٹیں کرتے۔ چنانچہ انشاء نے مصحفی پر اپنی غزل میں ایک شعر یہ بھی کہا

آئینہ کی گر سیر کرے شیخ تو دیکھے   سر خرس کا، منہ خوک کا، لنگور کی گردن

مصحفی کے شاگرد بھی میدان میں اُتر پڑے۔ انشاء دو پٹھے لگے ہیں ڈالے رہتے تھے۔ اس طرح کہ ایک سرا آگے اور دوسرا پیچھے پڑا رہتا اسی کو سامنے رکھ کر مصحفی کے شاگردوں نے جو اشعار کہے اس کا ایک مصرع یہ تھا

باندھی دُم لنگور میں لنگور کی گردن

لیکن سیّد انشا کب دب کر رہنے والے تھے انھوں نے یہ سن کر اُسی وقت کہا

سفرہ پہ ظرافت کے ذرا شیخ کو دیکھو   سر لون کا سر، منہ بیانہ کا، اچور کی گردن

پھر اس جھگڑے کی نوعیت اس طرح بدل گئی کہ دونوں طرف سے سوانگ بھر بھر کر ایک دوسرے کے مکان پر دھاوا بولنے لگے مصحفی کے شاگرد شہدوں کا سوانگ بھر کر ہجو پڑھتے ہوئے ان کے گھر پہ پہنچے۔ اس کا جواب سیّد انشا نے اس طرح دیا کہ ایک نقلی بارات سجائی، لوگوں کو ہاتھیوں پر بٹھایا جو ایک ہاتھ میں گڈا اور ایک میں گڑیا پکڑے دونوں کو لڑاتے اور زبانی ہجو پڑھتے جاتے، جس کا ایک شعر یہ ہے

سوانگ نیا لایا ہے دیکھنا چرخ کہن   لڑتے ہوئے آتے ہیں مصحفی و مصحفن

ان معرکوں میں مرزا سلیمان اور اُس کے درباری امراء سیّد انشا کا ساتھ دیتے رہے۔ اس سے رنجیدہ ہو کر مرزا سلیمان شکوہ کی خدمت میں مصحفی نے ایک غزل گذرانی جس کا مطلع یہ تھا

جاتا ہوں ترے در سے کہ توقیر نہیں یاں   کچھ اس کے سوا اب میری تدبیر نہیں یاں

مغلیہ خاندان کے آخری دور میں شاید ہی کوئی شہزادہ ایسا تھا جو اردو میں اشعار نہ کہتا ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اردو شاعری ان کی گھٹّی میں پڑتی تھی۔ ایسے شہزادے جو اردو کے شاعر ہوئے ان کی فہرست بڑی طویل ہے ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں۔ سپہر شکوہ اسرار، مرزا وجیہہ الدّین اختر، مرزا محی الدّین اشکی، مرزا غلام حسین انداز، مرزا رحیم الدّین ایجاد، مرزا فخر الدّین حشمت، مرزا رحیم الدین حیا، مرزا خضر، مرزا رفعت، مرزا فخر الدّین سیادہ، مرزا غیاث الدّین شرر، مرزا نصیر الدّین حیدر شہرہ، مرزا عالی بخت عالی، مرزا عزیز الدّین عزیز، مرزا کلن عشرت، مرزا قادر شکوہ قادر، مرزا قادر شکوہ خادر، مرزا غلام نصیر الدّین قناعت، بہرام شاہ محب، مرزا منگو محزون، مرزا محمود محمود وغیرہ ان کے یہاں برابر شعر و شاعری کی مجلسیں آراستہ کی جاتیں۔ جن سے سلطنت کو تو نقصان پہنچا لیکن اردو شاعری کی غیر معمولی آبیاری ہوتی رہی۔۔

بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں تو لال قلعہ مستقل ایک مشاعرہ کی مجلس بن کر رہ گیا تھا۔ اس زمانہ کے تمام شعراء بہادر شاہ ظفر کے حضور میں جمع رہتے

لیکن ان میں سب سے زیادہ تقرب ذوق کو حاصل رہا۔ محمد حسین آزاد نے اپنے استاد سے غایت عقیدت میں کہہ دیا ہے کہ ضخیم دیوان کا زیادہ تر حصہ ذوق ہی کا کہا ہوا ہے۔ حالاں کہ یہ صحیح نہیں۔ لیکن اس بحث میں پڑنے کی ضرورت اس وقت نہیں۔ ذوق و ظفر ایک دوسرے سے ایسے وابستہ رہے کہ دونوں کی نوک زبان پر اشعار رہتے تھے۔ ایک بار برسات کا موسم تھا۔ بہادر شاہ اپنے خاندان والوں کے ساتھ قطب صاحب گیا ہوا تھا۔ مرزا فخرو اور ذوق بھی ساتھ تھے۔ دونوں چاندنی رات میں ایک تالاب کے پاس چاندنی کی بہار دیکھ رہے تھے۔ مرزا فخرو کی زبان سے نکلا۔

چاندنی دیکھے اگر وہ مہ جبیں تالاب پر

ذوق سے کہا گیا کہ مصرع لگایئے۔ انھوں نے فوراً کہا

تابِ عکسِ رخ سے پانی پھیر دے مہتاب پر

ایک دفعہ قلعہ میں مشاعرہ تھا۔ حکیم آغا جان عیش نے اپنی غزل پڑھی تو اس میں ایک شعر تھا

اے شمع صبح ہوتی ہے روتی ہے کس لئے
تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گذار دے

حکیم صاحب کے بعد ہی ذوق کے سامنے شمع پیش کی گئی تو انھوں نے اپنی غزل کا ایک شعر اس طرح پڑھا۔

اے شمع تیری عمرِ طبیعی ہے ایک رات
رو کر گذار یا اسے ہنس کر گذار دے

لوگوں نے اسی وقت اندازہ لگایا کہ ایک منزل پر دونوں صاحب پہنچے مگر کس کس انداز سے پہنچے۔ ایک دن معمولی دربار تھا۔ ذوق موجود تھے۔ ایک شہزادہ آیا اور بادشاہ سے آہستہ آہستہ کچھ کہہ کر چلا گیا۔ حکیم احسن اللہ نے عرض کیا کہ یہ آنا کیا تھا اور جانا کیا تھا۔ بادشاہ کی زبان سے نکلا ع

اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

ذوق نے اُسی وقت کہا

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

اسی دربار میں بہادر شاہ کی موجودگی میں ذوق اور غالب میں برابر چوٹیں ہوتی رہتیں۔ غالب نے ذوق ہی پر طنز کیا ہے

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

اور پھر جب غالب نے مرزا جواں بخت کی شادی کے موقع پر سہرا کے مقطع میں یہ کہا کہ

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بہتر سہرا

تو بہادر شاہ ظفر کے ساتھ ذوق نے بھی اس کی چبھن محسوس کی، اور ذوق نے اپنے سہرا میں یہ کہہ کر جواب دیا

جس کو دعویٰ ہے سخن کا یہ سُنا دو اس کو
دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

اور آخر میں غالب کو یہ کہنا پڑا

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ
سودا نہیں، جنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے

جگن ناتھ آزاد

غزل

تڑپ کہیں ہو چکی تھی پیدا ظہورِ بزمِ جہاں سے پہلے
کہ اپنے جلووں میں خود گھرا تھا مکیں نمودِ مکاں سے پہلے

ضیائے شمس و قمر سے پہلے، تجلّیٔ کہکشاں سے پہلے
دل اپنے جلوے لٹا رہا تھا فروغِ بزمِ جہاں سے پہلے

ادھر میں وابستۂ ازل ہوں ادھر ابد سے مرا تعلّق
مرا فسانہ تھا ہر زباں پر فسانۂ دو جہاں سے پہلے

ترے لئے میرے دل میں وہم و گماں کی گنجائشیں کہاں تھیں
کہ بس چکا تھا یقین دل میں نمودِ وہم و گماں سے پہلے

بہار والو! اسی گلستاں کے ایک گوشے میں شاخِ گُل پر
مرا بھی اک آشیاں تھا لیکن بہار کی داستاں سے پہلے

لبِ زمانہ پہ آئے گا کیا بیانِ فرہاد و قیس کا اب
ہوئے ہیں فرہاد و قیس لیکن یہ تھے مری داستاں سے پہلے

کہیں سے چھیڑوں میں اپنا قصّہ یہ دردِ فرقت کی داستاں ہے
سناؤں بھی میں یہ قصّۂ غم اگر تو آخر کہاں سے پہلے

جو بے خودی کی یہی ہے صورت جو سرخوشی کا یہی ہے عالم
تو رازِ دل کا نہ فاش کر دوں کہیں میں خود رازداں سے پہلے

غزل میں حسنِ بیاں بڑی شے ہے شک نہیں مجھ کو اس میں لیکن
میں سوزِ جذبے کا دیکھتا ہوں غزل میں حسنِ بیاں سے پہلے

مری جبینِ نیاز آزاد! ایک سجدہ بنی ہوئی تھی
وجودِ ہر سنگِ در سے پہلے نمودِ ہر آستاں سے پہلے

رحمت کے فرشتے

کردار :-

عشرت : پروفیسر فیروز کی بیوی، "رحمت کے فرشتوں" سے نالاں، عمر بائیس سال

نسیم - عشرت کی چھوٹی نند، عمر گیارہ سال

لی لی اور نیلی - عشرت کی بچیاں، عمر بالترتیب چار سال اور سات ماہ

کریمن اور ظہور - عشرت کی ملازمہ اور ملازم

خالہ حفظی، رادھا، ناصر، ایک آدمی، رضیہ اور نجیبن چچی - رحمت کے فرشتے

پروفیسر فیروز - کسی اور شہر میں ملازم، پروفیسر، عمر ۳۰ سال

مقام - ہندوستان کا کوئی شہر

وقت - آخر نومبر - گیارہ بجے دن سے ۱۲ بجے دن تک

نوٹ :- اس ڈرامے میں کچھ مکالمے چھوٹے بریکٹ "( )" میں لکھے گئے ہیں، وہ دل کی آوازیں ہیں اور وہ آوازیں بیک گراؤنڈ سے آتی ہیں۔

[پردہ اٹھتا ہے تو ایک ایسا کمرہ نظر آتا ہے جس کی سجاوٹ مغربی اور مشرقی طرزوں کا امتزاج ہے - عشرت کمرے کے پوربی گوشے سے کسی قدر ہٹ کر پڑے پلنگ پر بائیں ہاتھ کی کہنی ٹکے، بیٹھے کچھ لکھ رہی ہے - لی لی پاس ہی چٹائی پر بیٹھی منی، پلاسٹک اور المونیم کے ننھے ننھے برتنوں سے کھانا پکانے کا کھیل کھیل رہی ہے - نیلی کمرے کے وسط میں پنگوڑے پر لیٹی ایک سرخ بیلون سے کھیل رہی ہے اور غوں غاں کر رہی ہے - نسیم صوفے پر لیٹی بچوں کا کوئی ناول پڑھ رہی ہے -- کلاک گیارہ بجا رہا ہے -]

عشرت [لکھتے ہوئے] (فیروز صاحب کو خط بھی لکھنا ضروری ہے -- اچھا اُلٹے سیدھے چند جملے لکھ دوں، پھر نیلی کا سوئٹر مکمل کر دوں گی - اُف اُسے کتنی سردی لگتی ہوگی - لیکن یہ بھی میرا خبط ہی ہے نا کہ بازار کا سوئٹر پسند نہیں آتا - بھلے ہی تو فیروز صاحب بازار سے لے آئے تھے - خواہ مخواہ میں نے واپس کروا دیا - وہ بھی ہوتا اور پھر بُن بھی دیتی -- اور ہاں - ابھی ایک کتنا ضروری کام باقی ہے - فیروز صاحب کی نئی کتاب کل سے آئی پڑی ہے اور مجھ بدنصیب کو دیکھو کہ ایک ورق بھی نہیں پڑھ سکی - کاش رحمت کے فرشتے آج کرم کریں تو خط لکھ کر شام تک سوئٹر مکمل کر لوں اور پھر ساری رات جاگ کر فیروز صاحب کی کتاب پڑھ ڈالوں - لیکن یہ رحمت کے فرشتے -- یا اللہ !)

لی لی :- [پلاسٹک کی ننھی سی پیالی میں چائے لے کر آتی ہے] ممی چائے لو، بھئی جلدی سے پی لو نا - پھر مجھے بہت سارا کام ہے - گڈو کو نہلانا ہے، کپڑے دھونے ہیں، برتن مانجھنے ہیں، خود نہانا ہے اور پھر بپّا کو خط لکھنا ہے -- ارے ممی تم بپّا کو خط لکھ رہی ہو نا -- لاؤ تو کاغذ اور قلم میں بھی لکھوں گی [پلنگ پر چڑھنے کی کوشش کرتی ہے]

عشرت : بیٹیا ذرا مجھے خط لکھ لینے دو پھر تم لکھ لینا، ہے نا ؟

لی لی - بپّا کب آئیں گے ممی ؟

عشرت - جلدی آئیں گے بیٹیا - تم کھیلو نا، پھر خط لکھ لینا، ابھی کھیلو نا، میری راجہ بیٹی !

لی لی :- [منہ بنا کر] نہیں ممی، جب بپّا کی یاد آجاتی ہے تو کھیل ویل اچھا

نہیں لگتا۔

[عشرت لی لی کو پلنگ پر اُٹھا کر سینے سے چمٹا لیتی ہے]

عشرت۔ میری راجہ بیٹی کتنی اچھی ہے۔ اب راجہ بیٹی بندر کا تماشہ دیکھنے جائے گی۔ اور میں خط لکھوں گی۔ پھر لی لی بیٹی واپس آکر اپنے پپا کو خط لکھے گی ۔۔ ہے نا بیٹی؟ نسیم ۔۔ بھئی ذرا لی لی کو بندریا کا ناچ نہیں دکھا دو گی۔

نسیم ۔ پر بجا جی آج تو بندر والا آیا ہی نہیں۔

عشرت ۔ ارے واہ! ڈمرو کی آواز آ رہی ہے اور تم کہتی ہو بندر والا آیا ہی نہیں

[نسیم کو آنکھ مار دیتی ہے اور نسیم مسکرانے لگتی ہے]

لی لی ۔ چلئے باجی [وہ پھوپھی کو باجی کہتی ہے] بندریا کا ناچ دیکھ لیا جائے۔

نسیم ۔ ہاں ہاں ضرور۔ اور آج بندریاں بھی اتنی ساری آ رہی ہیں کہ میں کیا بتاؤں۔

[لی لی کو ساتھ لئے نسیم باہر چلی جاتی ہے، عشرت پھر خط لکھنے لگتی ہے۔ لیکن اسی وقت نیلی کا بیلون پھٹ پڑتا ہے اور وہ رونے لگتی ہے]

عشرت ۔ کریمن ۔۔ او کریمن ۔۔ [کریمن آتی ہے] کریمن ذرا نیلی کو سنبھالو بھائی۔

کریمن ۔ بھوک لگی ہوگی بی بی ۔ پلا لیجئے پھر اطمینان سے مالک کو خط لکھئے گا۔

[مسکراتی ہے]

عشرت ۔ ارے نہیں بھائی، بھوک نہیں لگی ہے ۔ بیلون پھٹ گیا ہے ۔ دوسرا بیلون ہوا بھر کے دے دو، چپ چاپ کھیلتی رہے گی۔ (یہ کریمن بھی کم بخت عجیب ہے، جب بھی کچھ لکھو سمجھ لیتی ہے کہ مالک کو خط لکھا جا رہا ہے ۔۔ مسکراتی ہے کس انداز سے! کاش یہ بے چاری بھی پڑھی لکھی ہوتی اور اپنے مالک کو خط لکھ سکتی ۔ کس قدر دل چسپ کام ہے مالک کو خط لکھنا ۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ خوش نصیب ہیں وہ عورتیں جن کے مالک ان سے دور ہیں اور جنہیں اپنے مالک کو خط لکھنے کی لذت ملتی ہے ۔ اُف کتنا لذت بخش ہے یہ کام ۔۔۔ لیکن آج تو مجھے جلدی جلدی اس لذت سے لطف اندوز ہونا ہے ۔ اُف ۔۔ نیلی کا سوئٹر ۔۔ اور فیروز صاحب کی نئی کتاب! کاش آج رحمت کے فرشتوں سے خدا محفوظ رکھے!)

[کریمن بیلون میں ہوا بھر کے نیلی کو تھما دیتی ہے ۔ وہ پھر کھیلنے لگتی ہے اور عشرت مطمئن ہو کر خط لکھنے لگتی ہے]

[یک بیک خالہ حفظن کمرے میں داخل ہوتی ہے]

خالہ حفظن ۔ اری بیٹی عشّو تم یہاں بیٹھی ہو اور میں تمھیں جمیلہ کے ہاں پوچھ رہی تھی!

عشرت ۔ اوہ ۔ حفظن خالہ ۔ آ یئے آ یئے (لیکن اب انہیں کس بندر کا تماشہ دیکھنے کے لئے بھیج دوں ۔۔ یا اللہ یہ کب بیلون سے بہلنے والی ہیں) بیٹھئے خالہ!

خالہ حفظن ۔ ہاں بیٹی، بیٹھوں گی تو ضرور ۔۔ پر تم ذرا جلدی سے مجھے پان کی ایک گلوری کھلا دو ۔ اوہ درجن سے اوپر ناتی پوتے گھر میں پل بھر آرام کب لینے دیتے ہیں، سو چا کچھ دیر تمہارے ہاں بھاگ جاؤں ۔ سوچتی آئی (اب آرام ہے چار بجے تک)

عشرت ۔ [بلند آواز سے] کریمن ۔۔ او کریمن ۔۔ بھئی حفظن خالہ کے لئے پان لیتی آؤ۔

خالہ حفظن ۔ اے لو ۔ ارے تم خود بنا دو نا بیٹی ۔۔ وہ کیا جانے گی پان بنانا، منہ کاٹ کے رکھ دے گی (یہ لکھنے پڑھنے والی لڑکیاں بڑی کاہل ہوتی ہیں)

عشرت ۔ لیکن خالہ، میں تو پان کھاتی نہیں، مجھ سے ہی منہ کٹنے کا اندیشہ ہے۔ (کیا مصیبت بھیج دی میرے اللہ تو نے!)

خالہ حفظن ۔ اچھا بھئی یوں ہی سہی ۔۔۔ (ذرا اس سے تو پوچھوں جمیلہ کا قصہ ۔ جانتی ہے یا نہیں) اے بیٹی عشّو کچھ سنا تم نے ۔ یہ موئی جمیلہ کیا کہتی ہے اپنی شادی کے بارے میں؟ یا اللہ کیسا زمانہ آ گیا ۔ لڑکی خود کہے کہ بر پسند نہیں ۔ سوچو تو سہی کتنا اچھا لڑکا ہے رؤف سو سو کماتا ہے اور سوٹ بوٹ میں رہتا ہے تو بالکل انگریز لگتا ہے، انگریز!

عشرت ۔ لیکن جمیلہ کی پسند تو ضروری ہے نا خالہ (اب یہ بلا ٹلتی نظر نہیں آتی!)

خالہ حفظن ۔ توبہ کرو، تم بھی ایسی بات کرتی ہو بیٹی ۔ بھلا لڑکیاں اور زبان ہلائیں اپنی شادی کے بارے میں! (سب پڑھی لکھی لڑکیاں کرسٹان ہوتی ہیں)

عشرت ۔ (اس وقت اگر میں جمیلہ کی حمایت میں باتیں کروں گی تو خالہ حفظن

کی نصیحت اور بحث طویل ہو جائے گی لہذا یہی بہتر ہے کہ ان کی ہاں میں ہاں ملاکر قصہ ختم کر دیا جائے) نہیں خالہ [مسکراتی ہے] میں نے طنزاً کہا کہ جمیلہ کی پسند ضروری ہے ویسے میرا بس چلے تو جمیلہ کو گولی مار دوں، بھلا یہی طریقے ہیں شریف گھرانے کی بیٹیوں کے، کیا نام روشن کر رہی ہے خاندان کا!

خالہ حفظن۔ جُگ جُگ جیو میری بیٹی، کتنا اچھا خیال ہے تمہارا، تم بھی تو آخر پڑھی لکھی ہو لیکن خاندانی شرافت تھوڑے کبھی ختم ہوتی ہے —— لیکن ایک بات کہوں بیٹی، جب سے میں نے یہ سنا ہے کہ تم اپنی بڑی بچی کو ڈاکٹر بناؤگی، سچ کہتی ہوں میرا دل کھٹا ہو گیا ہے۔ ارے ڈاکٹری میں لڑکے اور لڑکیاں ساتھ پڑھتے ہیں۔ کیسی بُری بات ہے۔ تم کیسے برداشت کروگی؟

عشرت: (ایک آفت سے تو مر مر کے ہوا تھا جینا)
نہیں خالہ یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ میں لی لی کو ڈاکٹر بناؤں گی (جھوٹ کا سہارا لینا چاہیئے - اور کوئی چارہ کار نہیں) بس یہی تھوڑا بہت مذہبی تعلیم دلوا دوں گی بہشتی زیور وغیرہ رٹوا دوں گی ہو گئی چھٹی۔ لڑکیوں کو اس سے زیادہ کی کیا ضرورت ہے؟

خالہ حفظن۔ اے لو—میں بھی نگوڑی کیسی اوٹ پٹانگ باتوں پر کان دیتی رہتی ہوں، اپنی عشو بیٹی کتنی شریف ہے کتنی پختہ مذہبی —لیکن ایک بات اور کہوں گی بیٹی — یہ تم لوگ کرستانی لوگوں کی طرح سب کی سالگرہ مت منایا کرو۔

عشرت۔ (ہوں —تو آپ آج مجسم نصیحت نامہ بن کر تشریف لائی ہیں —— یا خدا مدد! — لیکن حفظن خالہ کے مقابلے میں خدا بھی کیا مدد کرے گا۔ شیطان سے مدد لینا ہوگی اور پھر وہی —— زندہ باد اے جھوٹ!) خالہ ہم لوگ تو اپنی سالگرہ کرتے نہیں (کرتے تو ضرور ہیں، لیکن آپ سے نجات تو پانا ہے بس جھوٹ کے ہی سہارے) رہی نسیم اور لی لی کی سالگرہ تو اس سلسلے میں میں بالکل مجبور ہوں کیونکہ یہ شوق فیروز صاحب کا ہے!

خالہ حفظن۔ ہائے اللہ تم جیسی شریف لڑکی اور نام لیتی ہو خصم کا؟

عشرت: (یا وحشت یہ کیا کر ڈالا میں نے؟) نہیں خالہ، بات دوسری ہے۔ آپ تو جانتی ہیں لی لی کے والد کے نام کے آخر میں بھی فیروز ہے، اور لی لی کے چچا کا نام ہے ساجد فیروز لیکن لوگ اُن کو ساجد نہ کہہ کر فیروز ہی کہتے ہیں اور لی لی کے والد کو اختر فیروز کے بدلے صرف اختر (بات بن گئی!)۔ تو یہ کہیئے میں ان کا نام لینے لگی! (خدا کرے نصیحت کا یہ نیا باب جو ابھی ابھی میری حماقت سے کھل گیا تھا بند ہو جائے!)

خالہ حفظن: وہ تو میں مان گئی— لیکن بنّو، ابھی تو تم نے ان کا پورا نام اختر فیروز ......

عشرت: [جلدی سے بات کاٹ کر] وہ صرف آپ کو سمجھانے کے لئے خالہ۔ ویسے میں ان کا نام کبھی نہیں لیتی، کیا آپ نے مجھے بھی کرستان سمجھ رکھا ہے؟ (لیکن ایسا لگتا ہے کہ بلا آسانی سے ٹلنے والی نہیں۔ اچھا اب ایک سازش کرنا ہوگی — کیوں نہیں انھیں زرینہ کے پاس بھجوا دیا جائے! یہی صورت ہے ان سے نجات پانے کی!)

[اتنے میں کریمن پان لے کر آجاتی ہے۔ خالہ حفظن منہ میں پان کی چار گلوریاں ڈال بہت سا تمبا کو پھانک، دونوں پاؤں صوفے پر چڑھا کر اطمینان سے بیٹھ جاتی ہے اور عشرت بڑی بے بسی سے اس کی طرف دیکھ رہی ہے]

خالہ حفظن۔ سنا تم نے بیٹی! امام علی نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی —کتنی نیک تھی بے چاری - موا جہنم میں جلے گا۔

عشرت۔ (اگر آپ جہنم میں نہ ہوں گی تو مجھے بھی وہاں جانے سے اعتراض نہیں کاش میں اس وقت آپ کو طلاق دے سکتی —یا اللہ —— خط —— سوئٹر — اور وہ نیا ناول!) ہاں خالہ امام علی نے بہت بُرا کیا میرا بس چلے تو اسے گولی مار دوں (جیسے میں نے سارے زمانے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے) اچھا خالہ — ایک عجیب قسم کی بات میں نے سنی ہے۔ یقین تو نہیں آتا لیکن اگر آپ اجازت دیں تو میں پوچھ لوں۔

خالہ حفظن۔ [کان کھڑے کر کے] پوچھو — پوچھو بیٹی۔

عشرت۔ زرینہ خود مجھ سے کہہ رہی تھی کہ شاید آپ زرینہ کے والد منشی حسین بخش صاحب سے عقد کرانے کی فکر میں ہیں اور زرینہ کو یہ پسند نہیں وہ کسی طرح اس بات کو ختم کرنا چاہتی ہے، قصہ کیا ہے؟

خالہ حفظن۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو [بہت چونک کر] کس مالجادی نے یہ بات اڑائی ہے۔ ابھی میں اس زرینہ کی بچی چڑیل کے ہاں جاتی ہوں — ابھی — ابھی جاؤں گی! [بجلی کی سی سرعت سے اٹھتی ہے اور جانے لگتی ہے]

عشرت [ان کا ہاتھ پکڑ کر] جانے بھی دیجئے خالہ۔ جب بات غلط ہے تو پھر چھوڑیئے پوچھ تاچھ، زرینہ نے دل لگی کی ہوگی!

خالہ حفظن۔ میں کون ہوتی ہوں اس کی جو دل لگی کرے گی — ابھی جاتی ہوں — ابھی [ہاتھ چھڑا کر باہر نکل جاتی ہے]

عشرت [جلدی سے] کریمن — او کریمن — ذرا جلدی آؤ — [کریمن دوڑی آتی ہے] سنو بھئی، تم ذرا لپک کر زرینہ کے ہاں چلی جاؤ، چوک سے رکشا پکڑ لینا سمجھیں — زرینہ سے کہنا کہ میں نے حفظن خالہ سے جو کچھ کہا ہے، صرف ان سے نجات پانے کے لئے۔ وہ کسی نہ کسی طرح بات بنالے، لیکن ایسا نہ ہو کہ پوچھ تاچھ کے لئے وہ پھر آدھمکیں! [کریمن چلی جاتی ہے اور عشرت طویل سانس لیتی ہے] (زیر لب بڑبڑاتے ہوئے) بچی تو نہیں لیکن ویسے بگڑ شرت۔ زرینہ شیطان ہے بڑی عقلمند بات بنالے گی

[عشرت پھر پہلے کی طرح کمنٹی ٹیک کر خط لکھنے لگتی ہے] [لیکن فوراً ہی بعد رادھا کمرے میں داخل ہوتی ہے]

رادھا۔ ہیلو عشی — کیا کر رہی ہو بھئی — غضب ہو گیا — تم کمنٹری نہیں سن رہیں؟ (کتنی بدذوقی ہے کہ آدمی اتنے بڑے میچ کی کمنٹری نہیں سنے! کیا بال بچوں والی عورت ایسی بدذوق ہو جاتی ہے؟)

عشرت۔ ارے رادھا! — آؤ، آؤ (تمہیں بھی اسی وقت نازل ہونا تھا، کر دیا نا بیڑا غرق! اب کیا کروں میرے معبود؟) کمنٹری تو سن رہی تھی لیکن فیروز صاحب کا ایک بہت ارجنٹ خط آگیا، فوراً جواب مانگا ہے انھوں نے۔ اس لئے خط لکھنے لگی اور پھر ابھی تو لنچ ہوگا؟ (تم کیا سمجھو گی کہ کرکٹ کی کمنٹری سننے سے بھی زیادہ لذت بخش کام ہے خاوند کو خط لکھنا! اور پھر بچی کے لئے سوئٹر بُننا، اور پھر خاوند کا لکھا ہوا نیا ناول پڑھنا! — لیکن سب کچھ تو تب ممکن ہے، جب تم، رحمت کے فرشتو اس کا موقع دو۔)

رادھا: لنچ ہی تو ہوا ہے جو میں یہاں آگئی، گھر پر اکیلے سننے میں مزا نہیں آ رہا تھا۔ کمنٹری سننے کا مزا تو تب ہی آتا ہے جب کوئی ساتھ ساتھ تالیاں بجانے والا ہو، ہٹر ہٹر کرنے والا ہو۔ اور پھر کمنٹ کرسکے کیسا کھیل زوروں پر ہے۔ ڈرا بھی ہو جائے تو پھر مزا آجائے گا۔ [چونک کر] ارے تم شاید کچھ نہیں سن رہیں؟

عشرت: اکسکیوز می رادھی — تم کمنٹری سنو، میں ذرا ایک خط لکھ لوں!

رادھا۔ او مائی گاڈ — ہاؤ اسٹرینج — وہاٹ اے اسٹوپڈ گرل — اری بھاگیہ وان، خط تو پھر کبھی لکھا جاسکتا ہے، لیکن اس وقت کا میچ تو پھر نہیں ہو سکتا!

عشرت۔ رادھا پلیز — پلیز رادھا ڈارلنگ — (مان بھی جا میری جان، تو حفظن خالہ تو ہے نہیں، پڑھی لکھی لڑکی ہے، تجھے تو کسی کا وقت ضائع کرنا اچھا نہیں لگنا چاہیئے — اور اگر تو نہیں مانتی تو پھر لے — زندہ یاد، اے مشکل کشا — حضرت دروغ!) — ارے ہاں ایکسیلنٹ آئیڈیا — پھر ایسا کرو رادھا ادھر اولگا نے فون کیا تھا کہ آجاؤ اکٹھی بیٹھ کر کمنٹری سنیں، وہ بھی اکیلی ہے — اور ادھر تمہیں ساتھی کی تلاش — یا تو اولگا کو بلالو یا پھر وہیں چلی جاؤ۔

رادھا [خفگی کے ساتھ] مینی مینی تھینکس، فور دس ایکسیلنٹ آئیڈیا! ڈارلنگ عشی میں خود بھی اولگا کے پاس جاسکتی تھی — ہے بھگوان شادی اگر اس قدر ہولناک بدذوقی کا نام ہے تو پھر مجھے معاف ہی رکھنا (بدتمیز لڑکی!)

عشرت۔ برا نہ مانو رادھا۔ دن کے گیارہ بجے سے تین بجے تک میں عام طور پر کچھ لکھا پڑھا ہی کرتی ہوں اور اس مدت میں سوا کھانے کے میں اور کسی کام کے لئے نہیں اٹھتی۔ ویسے کرکٹ میچ ایک ایکسٹرا آرڈینری بات تھی، لیکن کیا کروں کہ اس سے بڑا کام نکل آیا — تم تو پڑھی لکھی ہو رادھی ڈیر، تمہیں مجھ سے بدظن نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ تمہیں بھی چاہیئے کہ ملنے ملانے کا ایک وقت بنالو

رادھا: جی نہیں! یہ روٹین بازی آپ بڑی ہستیوں کو ہی زیب دیتی ہے! (روٹین! ہُنہہ یہ روٹین کتنی بدذوق قسم کی غیر شاعرانہ چیز ہے — کون شریف آدمی یہ برداشت کرسکتا ہے کہ اپنی ہی بنائی ہوئی روٹین کا غلام ہو جائے!) [خفگی میں پاؤں ٹپکتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ عشرت

کچھ دیر تک خاموش بیٹھی رہتی ہے - لیکن پھر خط لکھنے لگ جاتی ہے اور تقریباً پانچ منٹ بعد ناصر آتا ہے -]

ناصر : آداب عرض ہے بھابھی جان ! (خدا کا شکر ہے کہ کام تو کر رہی ہیں لکھنے ہی کا !)

عشرت - اوہ - ناصر میاں ! آؤ بھی آؤ (ہاں تم نے ہی کیا قصور کیا تھا ، جو نہیں آتے رحمت کے فرشتے بن کر اور اس عظیم فیض سے محروم رہ جاتے -) کیسے آنا ہوا ؟

ناصر - بھابھی جان ! سائیکولوجی آپ کا سبجیکٹ تھا نا ؟

عشرت ہاں بھئی ، تھا تو ضرور ، تمہیں کچھ اعتراض تو نہیں ؟

ناصر - بھابھی ! ذرا مجھے نروس سسٹم سمجھا دیجئے !

عشرت - بھیا ! اس وقت تو میں بہت ضروری کام کر رہی ہوں - شام کو آ جاؤ نا ، اطمینان سے سمجھا دوں گی ، ہے بھی کم سے کم دو گھنٹے کا کام ، بس شام کو آ جاؤ — ہے نا ؟

ناصر - لیکن بھابھی ! شام کو تو مجھے پروفیسر رانا صاحب کے پاس جانا ہے اور کل ہی سائیکولوجی کا ٹسٹ ہے - بھابھی ! پلیز بھابھی — نروس سسٹم اونلی — (اور آپ کو کام بھی بھلا کون سا ہو سکتا ہے - الٹی سیدھی کہانیاں لکھنا ، یا پھر پرویز صاحب کو خط لکھنا !)

عشرت : (اچھا تو حضور بھی دماغ چاٹنے کی قسم کھا کر آئے ہیں - اب اس بلا سے کیسے نجات ملے ؟) [کچھ دیر تک کچھ سوچتی رہتی ہے .... پھر ....] اور اگر میں تمہیں نروس سسٹم پڑھانے کے لئے خود سے بہتر آدمی کے پاس بھیج دوں تو ؟

ناصر - کس کے پاس بھیجیں گی آپ ؟

عشرت - ڈاکٹر خورشید صاحب کے پاس ، میں ایک پرزہ لکھ دیتی ہوں ، وہ بہت اچھی طرح سمجھا دیں گے — کہو منظور ؟ (بھیا تمہیں منظور کیوں نہیں ہوگا ، مجھے معلوم ہے ڈاکٹر خورشید تمہاری دُکھتی رگ ہیں !)

ناصر - [چونک کر] کیا خورشید صاحب کے پاس ؟ — ضرور ضرور - لکھ دیجئے پرزہ مجھے اعتراض کیا ہو سکتا ہے ، مجھے تو نروس سسٹم سمجھنے سے مطلب ہے نا ! (بھابھی ڈارلنگ آپ تو یہ سب کچھ ٹالنے کے لئے کر رہی ہیں ، لیکن میں آپ کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں کہ آپ کی بدولت مجھے ریحانہ کے گھر تک پہنچنے کی راہ مل گئی - اُف آپ کو کیا پتہ بھابھی کہ کس قدر رشک سے وہ دیکھا جاتا ہے جو مس ریحانہ خورشید کے گھر تک پہنچ جائے) [عشرت ایک سلپ لکھ کر ناصر کے حوالے کرتی ہے اور ناصر خوش خوش چلا جاتا ہے اور عشرت پھر خط لکھنے کے لئے جھک جاتی ہے - لیکن اُسی وقت ظہورا آتا ہے .....]

ظہورا - میم صاحب ، صاحب کے پاس سے ایک آدمی آیا ہے ، باہر بیٹھا ہوا ہے !

عشرت [بڑی طرح چونک کر] ہائیں ! صاحب کے پاس سے ، یعنی فیروز صاحب کے پاس سے ؟ کیا بات ہے ؟ خیریت ہے نا ؟ [ایک حد تک اُچھل کر پلنگ سے نیچے اترتی ہے لیکن آنچل درست کر کے بیٹھ جاتی ہے] (یا خدا میرا تو سارا جسم سن سن کر رہا ہے میں تو ایک قدم بھی نہیں چل سکتی) ظہورا ! جلدی سے اس آدمی کو یہیں بھیج دو - [ظہورا جاتا ہے اور چند لمحوں بعد ایک آدمی اندر آ کر ہاتھ جوڑے کھڑا ہو جاتا ہے]

آدمی - میم صاحب .... (کیسے کہوں ، ہمت نہیں ہوتی)

عشرت - ہاں ہاں کہئے نا آپ رک کیوں گئے - کیا بات ہے ؟ آپ فیروز صاحب کے پاس سے آئے ہیں نا ؟ وہ تو خیریت سے ہیں نا ؟ (یا خدا یہ جلدی سے کہتا نہیں کیا بات ہے ؟ یا اللہ اس کی تاخیر تو میرے قلب کی حرکت روک دے گی) کہئے بھی کیا بات ہے ؟

آدمی : صاحب بالکل خیریت سے ہیں آپ گھبرائیے نہیں (لیکن مطلب کی بات کیسے کہوں ؟)

عشرت - [اطمینان کی ٹھنڈی سانس لے کر] خیر اب آپ آ گئے کہہ دیجئے جو کچھ کہنا ہے !

آدمی - حضور ! میرے لڑکے کے سارے پرچے بہت اچھے ہیں ، یقیناً اُسے ڈسٹنکشن آئے گا .... لیکن

عشرت - لیکن ایک فیروز صاحب کا پرچہ خراب ہو گیا ہے ؟ ہے نا یہی بات ؟

آدمی - بات تو سچ یہی ہے حضور ، لیکن اگر آپ کی کرم فرمائی ہو جائے تو ...

عشرت (واہ ری قسمت - جیسے سارے کے سارے رحمت کے فرشتے ایک مجھ ہی میں کھڑے ہیں، اب ان حضرت سے کیسے رستگاری ہو سکتی ہے؟ سوا اس کے کہ جھوٹ بولا جائے!) لیکن جناب کاپی دیکھنا اور نمبر دینا فیروز صاحب کو ہے - اگر میرا بس چلتا تو میں کاپی آپ کے حوالے کر دیتی کہ دے دیجئے اپنے ہاتھ سے جتنا نمبر دینا ہو! لیکن آپ کو تو علم ہی ہو گا کہ فیروز صاحب کتنے سخت آدمی ہیں!

آدمی - اسی لئے تو حضور کے پاس آیا ہوں کہ ایک سفارشی . . . .

عشرت - ارے باپ رے باپ - دیکھئے صاحب اگر آپ کو ہماری ازدواجی زندگی سے ذرا سی ہمدردی ہے تو خدا کے لئے ایسی رائے ہرگز نہ دیجئے۔

آدمی - لیکن میم صاحب (اب تھوڑی بٹرنگ کرنا چاہیئے) میں نے آپ کی بہت تعریف سنی ہے کہ آپ بڑی رحم دل واقع ہوئی ہیں اور اسی لئے میں بڑی امید کے ساتھ آپ کے پاس آیا ہوں - اور مجھے امید قوی ہے کہ آپ کی رحم دلی مجھے خوش خوش لوٹنے کا موقع بخشے گی!

عشرت (اچھا - تو حضور بٹرنگ کرنا بھی جانتے ہیں — بہت خوب — اس طرح نجات کی ایک راہ تو نکل آئی، کیوں نہیں میں بھی ان کا دل خوش کر دوں!) [مسکرا کر] تو گویا آپ کو فیروز صاحب کے طالب العلموں نے میرے بارے میں سب کچھ بتلا دیا ہے - تو پھر سنیئے حضرت - میں فیروز صاحب کے نام آپ کو تو خط دینے سے رہی ہے کیونکہ وہ سرکاری کارلج میں ہیں اور دنیا میں دوست دشمن کی کمی نہیں — آپ کو جب میری رحم دلی کے بارے میں معلوم ہو چکا ہے تو یہ بھی معلوم ہی ہو گا کہ میں فیروز صاحب سے بیس پچیس نمبر تو ضرور ہی بڑھوا سکتی ہوں اور ذرا کوشش کرنے پر پچاس ساٹھ بھی! آپ پورے بھروسے کے ساتھ لڑکے کا رول وغیرہ مجھے دے کر چلے جائیے اور یہ یقین مان لیجئے کہ اسے ڈسٹنکشن مل گیا!

آدمی - (عورت اپنی تعریف سن کر کس قدر خوش ہو جاتی ہے!) میم صاحب، میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں؟

عشرت - (زبان تو حضور کے پاس بہرحال ایک ہی ہے، لیکن شکریے کی ضرورت نہیں، میں ہی پیشگی بہت سا شکریہ ادا کرتی ہوں اگر آپ مجھے بخش دیں!) شرمندہ نہ کیجئے، شکریہ کی کیا ضرورت ہے آپ اتنی دور سے آئے ہیں، آپ کی مدد تو میرا فرض ہے - اور پھر اگر میری ذرا سی کوشش سے قوم اور ملک کا ایک ہونہار سپوت بی، اے ڈسٹنکشن کے ساتھ پاس کر لیتا ہے، تو سمجھئے مجھے بہت بڑا انعام مل گیا، محنت کی قیمت مل گئی، پھر شکریے کی کیا ضرورت! (ہنہ — قوم اور ملک کا سپوت!)

آدمی - تو پھر اجازت؟

عشرت - واہ صاحب! لڑکے کا رول نمبر وغیرہ تو ایک پرزے پر لکھ کر دے دیجئے جسے میں آپ کے جانے کے پندرہ منٹ کے بعد چاک کر دوں گی

[وہ آدمی جیب سے نکال کر ایک پرزہ دیتا ہے، پھر جھک کر سلام کرتا ہے اور رخصت ہو جاتا ہے - عشرت ایک بہت طویل، مطمئن ٹھنڈا سانس لیتی ہے اور پھر لکھنے کے لئے جھک جاتی ہے . . . . لیکن کچھ ہی دیر کے بعد کچھ گنگناتے کی آواز آتی ہے اور پھر رضیہ داخل ہوتی ہے . . . .]

رضیہ - اچھا تو پریم پتر لکھا جا رہا ہے؟ اس تنہائی میں (دیکھو تو دو بچوں کی ماں ہو گئی ہے لیکن پریم پتر کی بیماری نہیں گئی اس کی)

عشرت - افوہ — رضیہ، آؤ بھئی بیٹھو (خدا کرے تم نہ بیٹھو)

رضیہ - [شلف سے ایک کتاب اٹھا کر] فرار — ارے کس کا ناول ہے . . . . . ارے فیروز بھائی کا؟ — قسم خدا کی عشرت تم بھی خوب ہو، کبھی تذکرہ تک نہیں کیا!

عشرت بھئی، یہ کتاب بالکل نئی ہے، ابھی کل ہی تو میرے پاس آئی ہے (لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ فیروز صاحب کی تمام مطبوعات کی اطلاع سرکار کو دی جائے)

رضیہ: بھئی یہ کتاب میں لئے جاتی ہوں!

عشرت [بڑی مایوسی سے] ابھی؟ نہیں رضیہ، ابھی نہیں — ابھی میں نے دیکھی تک نہیں (لیکن تم کیوں مانو گی، تمہارے ہی خاوند کی لکھی ہوئی کتاب تو ہے، جیسے جلد سے جلد پڑھنے کے لئے تم بے قرار ہو — یا اللہ کیسے غیر ذمہ دار لوگ ہوتے ہیں! خیر یوں ہی سہی، لیکن کتاب لے کر تو دفع ہو جاؤ میری جان)

رضیہ: نہیں بھئی بہانہ نہیں چلے گا، میں لے جاتی ہوں رات کو پڑھ

لوں گی ، صبح کتاب تمھیں واپس مل جائے گی (لیکن حامد صاحب تو ضرور پڑھنے لگیں گے پھر ایک ہفتے کی خیر ہے . . . .)

عشرت ۔ کل ضرور — ہے نا رجی ! (لیکن لاکھ خوشامد کروں تمھاری ، کون سی کتاب تم نے ایک مہینے سے پہلے لوٹائی ہے ؟ اور وہ بھی کیسی خستہ حالت میں ! کاش مجھ میں اتنی جسارت ہوتی کہ ہر کسی کو کہہ سکتی کہ کتابیں مانگ کر پڑھنا اُس کے لیے گناہ ہے جو نہ بدنے کی صلاحیت رکھتا ہو ۔ گناہ ہے ، اخلاقی جرم ہے ، بدتمیزی ہے)

رضیہ : ہاں بھئی کتاب مل جائے گی ۔ اچھا سنو ضروری کام یہ ہے کہ ایک دن کے لئے مجھے ذرا سلائی کی مشین بھیج دینا ، تین عدد لحاف کے پلّے سی کر لوٹا دوں گی !

عشرت ۔ (لاکھ عہد کروں کہ مشین اور ریڈیو کسی کو نہیں دوں گی لیکن یہ نامعقول لوگ کب عہد نبھانے دیں گے ؟) رجّی ایسا کرو نا ، یہیں آکر سی لو (نہیں نہیں — اللہ میاں غلطی ہو گئی — خدا نہ کرے کہ وہ یہیں آجائے) اچھا خیر میں ابھی بھیجے دیتی ہوں ، لیکن پھر تم ناول کیسے پڑھ سکو گی (کاش یہ ظالم کتاب تو رہنے دے !)

رضیہ : افوہ — بھئی سارا دن پڑا ہے ، پلّے دن بھر میں سی لوں گی اور رات کو ناول پڑھ لوں گی ۔ صبح کتاب اور مشین دونوں ہی واپس کر دوں گی ۔

عشرت : [بہت ہی کمزور آواز میں] اچھا — ظہور — او ظہور — سلائی کی مشین لے کر ان کے ساتھ چلے جاؤ ۔

رضیہ ۔ دھاگے ہیں نا ؟ (کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے چھ آنے کی ریل خریدنا پڑے)

عشرت : [پکار کر] بھئی ظہور — الماری سے ایک ریل بھی نکال لینا ۔ (پھر ایسا کیوں نہ ہو سرکار کہ لحاف کے تین عدد پلّے بھی حضور کے حوالے کر دئے جائیں —— خیر اس وقت جان بخش دینے کی قیمت ہیں اگر تین پلّوں کے ساتھ تینوں لحافوں کی روئی کا بھی تم مطالبہ کرتیں تو کس کم بخت کو اعتراض ہو سکتا تھا !)

[رضیہ چلی جاتی ہے ۔ عشرت چند لمحوں تک گُم سُم بیٹھی رہتی ہے لیکن پھر خط لکھنے کے لئے بدستور جھک جاتی ہے . . . لیکن کچھ ہی دیر بعد نصیبن چچی وارد ہوتی ہے]

نصیبن ۔ دُلھن ذرا ایک کام تو کر دو !

عشرت ۔ آداب چچی — (اب انھیں کیسے ٹالا جا سکتا ہے ؟ انھیں تو بھلا فیروز صاحب کو دودھ پلانے اور میری ساس بن بیٹھنے کا فخر حاصل ہے ! — او میرے معبود میری پوجا کرنے والی قابل پرستش ، ساس کو تو تو نے اُٹھا لیا اور رہ گئیں یہ دماغ چاٹنے والی اور میری ہر بات میں کیڑے نکالنے والی ! اب کیا کروں میرے معبود ! فیروز صاحب کی کتاب تو خیر جانے کب پڑھنا نصیب ہو گی لیکن خط — اور پھر نیلی کا سوئٹر ؟ — اُف اب میں کیا کروں ؟) تشریف رکھئے چچی !

نصیبن [کسی قدر رعب کے ساتھ] دلھن ذرا ایک خط تو لکھ دو اس بدمعاش افضل کو ۔ جب سے کلکتہ گیا ہے اس نے ایک پیسہ بھی نہیں بھیجا ۔ اور تمھارے چچا ہیں کہ کہتے کہتے تھک گئے مگر کم بخت کو کچھ لکھتے ہی نہیں — اڑاتا ہو گا سینما تھیئٹر میں روکنے والا کون ہے وہاں ؟ پورے سو روپے کماتا ہے —— سوچتی ہوں کچھ پیسے جمع کر لے تو شادی کر دوں ، آدمی بن جائے گا ۔ لیکن کاہے کو آدمی بنے گا پھر ہڑتال کرے گا اور نوکری سے نکالا جائے گا — لکھو تو دُلھن ایک بڑا سا خط ۔

عشرت : تو پھر چچی ، رات کو آئیے نا اطمینان سے خوب لمبا چوڑا خط لکھ دوں گی (اس وقت تو بخش دیجئے ، خدا آپ کو اس کا اجرِ عظیم دے گا ، کروٹ کروٹ جنّت دے گا !)

نصیبن ۔ دُلھن ! فرصت تو بس اسی وقت تھوڑی سی ملتی ہے ۔ اب چلو بہانہ نہ بناؤ ، لکھ بھی دو جلدی سے — میں نے تمھارے میاں کو دودھ پلایا ہے ۔

عشرت ، (مجھے زہر پلا دیجئے چچی آپ کا بڑا احسان ہو گا — اور اگر بدلہ ہی چاہیئے آپ کو تو کہیئے میں آپ کو ایک بکری خرید دوں ، لیکن میرا خون کیوں چوسنے کے درپے ہیں آپ) ؟ [کراہتی ہوئی سی آواز میں] لائیے چچی ، لکھ دوں !

نصیبن ۔ کیا مانگتی ہو ؟ اری دلھن اتنے سارے خط لکھتی رہتی ہو دن بھر ،

ایک پوسٹ کارڈ بھی نہیں ہے تمھارے پاس - میں تمھاری ساس ہوں - ہاں!

عشرت :- (ہاں چچی - جب نثین کے ساتھ دعا کا دینا فرض ہے تو پھر خط لکھنے کے ساتھ ساتھ پوسٹ کارڈ کیوں نہیں دیا جائے - ضرور دوں گی - آپ تو بھلا میری ساس ہیں)

کوئی بات نہیں چچی پوسٹ کارڈ ہے پاس!

[پاس ہی پڑے ایک بیگ سے پوسٹ کارڈ نکال کر عشرت نصیبن چچی کا خط لکھنے کے لئے تیار ہی ہوتی ہے کہ کریمن آ جاتی ہے ...]

کریمن (پُرخلوص اور بزرگانہ غصے کے ساتھ) بی بی! اتنی دیر ہو گئی اور آپ نے بٹیا کو دودھ نہیں پلایا، کیسی ماں ہیں آپ؟ بے چاری سیدھی سادھی ہے، چُپ چاپ پڑی رہتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ جو بچہ روئے نہیں اُسے دودھ نہیں ملے! [پنگوڑے سے نیلی کو اٹھا کر عشرت کی گود میں ڈال دیتی ہے]

نصیبن۔ اے کریمن تجھے بھی مجھ سے عداوت ہے لا میں سنبھالوں مُنی کو!

عشرت - نہیں چچی بس ذرا دیر میں دودھ پلا دوں، سچ مچ بہت دیر سے بھوکی ہے! [نیلی کو چومتی ہے اور پھر آنچل میں چھپا لیتی ہے] (میری بچی آج پھر تو سوئٹر نہیں پہن سکتی)

نصیبن - (ایک نگوڑا خط لکھنے میں ٹال مٹول! آنے تو دو ذرا اس کا مرد - وہ آگ لگاؤں گی کہ نصیبن کو جنم بھر یاد کرے گی - میں اس کی ساس ہوں - مذاق ہے کیا؟ اب جاتی ہوں۔ مگر دیکھ لوں گی رانی صاحبہ کو!) [غصے سے اُٹھ کھڑی ہوتی ہے اور جانے لگتی ہے] اچھا تو میں چلی دُلھن! تم ٹال رہی ہو - میں نے اپنے بال دھوپ میں نہیں سفید کئے! [کریمن کچھ بڑبڑاتی ہوئی چلی جاتی ہے]

عشرت - [جلدی سے اُس کا دامن تھام لیتی ہے] نہیں چچی ایسا نہ سمجھو، میں ہرگز نہیں ٹال رہی ہوں۔ سچ مچ بچی بہت دیر سے بھوکی تھی! ابھی لکھتی ہوں خط!

[نصیبن منہ پُھلائے بیٹھ جاتی ہے - کچھ ہی دیر میں نسیم اور لی لی آ جاتی ہیں]

لی لی – ممی کہیں بھی تو بندریا نہیں ہے - بے چاری باجی نے کہاں کہاں کھوجا لیکن کاہے کو ایک بھی بندریا ملتی!

عشرت اور تم کیا ہو لی لی؟! (ہنستی ہے)

لی لی میں بندریا ہوں ممی؟ جب تو میں ناچتی ہوں - تم ڈمرو بجاؤ - بجاؤ نا ممی!

عشرت بھئی ڈمرو کہاں سے لاؤں؟ (ڈمرو ہوتا تو صبح سے اب تک بجاتی نہ ہوتی کتنے سارے بندر بندریوں سے واسطہ پڑتا رہا ہے!)

نسیم آؤ لی لی میں سگریٹ کے ٹین کا ڈمرو بجاتی ہوں، تم ناچو!

لی لی نئی جھئی - اب تو مجھے بھوک لگ رہی ہے - ممی مجھے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلا دو نا!

نصیبن (اچھا - تو گویا یہ سب کے سب سکھلائے ہوئے ہیں! خیر میں بھی مزا چکھا دوں گی) [پھر اٹھنا چاہتی ہے] میں چلی دُلھن!

عشرت۔ بیٹھئے نا چچی ابھی لکھتی ہوں، ابھی، فوراً!

لی لی - نہیں ممی - پہلے مجھے کھانا کھلا دو - کھلا دو نا ممی بڑی بھوک لگی ہے!

عشرت - بٹیا تم ظہور یا نسیم سے کھا لو - میں تمھاری دادی کا خط لکھ دوں۔

لی لی - نہیں ممی - میں تو تمھارے ہاتھ سے کھاؤں گی! دادی کا خط ظہور لکھ دے گا!

عشرت - ضد نہیں کرتے میری راجہ بیٹی! تم تو بڑی اچھی بیٹی ہو نا؟ کھا لو میری راجہ بیٹی ظہور کے ہاتھ سے یا پھر - نسیم - او نسیم کھلا دو لی لی کو کھانا۔

لی لی - خیر ممی یوں ہی سہی - پیا ہوتے تو میں تمھاری کیوں خوشامد کرتی؟ جاتی ہوں!

عشرت۔ واہ میری بیٹی - کتنی اچھی بیٹی ہے میری لی لی۔

[لی لی نسیم کے ساتھ جانے لگتی ہے لیکن اُسی وقت ظہور خوش خوش دوڑا ہوا آتا ہے ....]

ظہور صاحب آ گئے - صاحب آ گئے - میم صاحب، صاحب آ رہے ہیں۔

عشرت چل بھاگ بدمعاش! [لیکن چونک کر دروازے کی طرف دیکھنے لگتی ہے]

ظہور - نہیں میم صاحب، سچ کہتا ہوں - وہ دیکھئے آ گئے نا۔

[پروفیسر فیروز مسکراتے ہوئے داخل ہوتے ہیں اور لی لی دوڑ کر ان سے

لپٹ جاتی ہے]

عشرت ۔ واہ تم کیسے آ گئے ، کوئی اطلاع نہیں !

فیروز ۔ کمال ہے ! کیا میرا تار نہیں ملا ؟

عشرت ۔ نہیں تو ۔ لیکن سچے دل سے یہ دعا ضرور کر رہی تھی کہ خدا کرے تم آ جاؤ ۔ تاکہ یہ خط جو صبح سے لئے بیٹھی ہوں اور پانچ سطروں سے آگے نہیں لکھ سکی ، وہ تو لکھنے سے بچوں ۔۔ سچ کہتی ہوں فیروز آج تو میں نے دل سے تمنا کی ہے کہ لیجئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو !

فیروز ۔ کیوں ؟ کیا بات ؟

عشرت ۔ سب کچھ اطمینان سے بتاؤں گی ، سب سے پہلے تم ایک کام کرو ۔ ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھا لو اور سیدھے بازار چلے جاؤ ، کم سے کم نیلی کے لئے ایک سوئٹر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

فیروز [پکار کر] ظہور ! میرے سوٹ کیس میں سب سے اوپر کچھ سوئٹر اور ٹافی کے ڈبے ہیں لانا تو جلدی سے ۔۔ عشی ۔ میں نے تین سوئٹر لی لی کے لئے اور تین نیلی کے لئے خرید لئے ہیں ۔ مجھے پتہ تھا کہ یہ رحمت کے فرشتے ۔ ۔ ۔ ۔ [نصیبن کی طرف دیکھ کر زبان نکال کر چپ ہو جاتے ہیں]

عشرت : اوہ ۔۔ ویری گڈ ۔ ہاؤ نائس یو آر مائی فیروز ۔۔۔ تھینک یو ویری مچ ۔۔ آؤ بچی اب اطمینان سے تمہارا لمبا چوڑا خط لکھ دوں ۔

[بیکی نصیبن بغیر کچھ کہے سنے اٹھتی ہے اور آہستہ آہستہ چلی جاتی ہے ۔ فیروز عشرت ، لیلی اور ظہور زور سے ہنستے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے ۔ ۔ ۔]



غلام ربانی تاباں

غزل

ناصحوا راہ نوردانِ طلب ہیں یہ لوگ ۔۔۔ فکرِ فردا نہ غمِ دوش عجب ہیں یہ لوگ

خلوتِ خاص ہیں جو ہم ہیں وہی واعظ و شیخ ۔۔۔ مجمعِ عام میں گو بستہ بلب ہیں یہ لوگ

اہلِ مسجد سے کراماتِ مغاں کیا کہئے ۔۔۔ ناشناسائے مقاماتِ ادب ہیں یہ لوگ

نامناسب ہے یہ رندوں سے تغافل ساقی ۔۔۔ تیرے مے خانہ کی شہرت کا سبب ہیں یہ لوگ

تیرے سائل کبھی تجھ سے بھی نہ کہہ پائے سوال ۔۔۔ کتنے پابندِ رہ و رسمِ طلب ہیں یہ لوگ

ناخداؤں پہ اگر چھوڑ دی کشتی تاباں

ڈوب ہی جائے گی اب اس لقب ہیں یہ لوگ

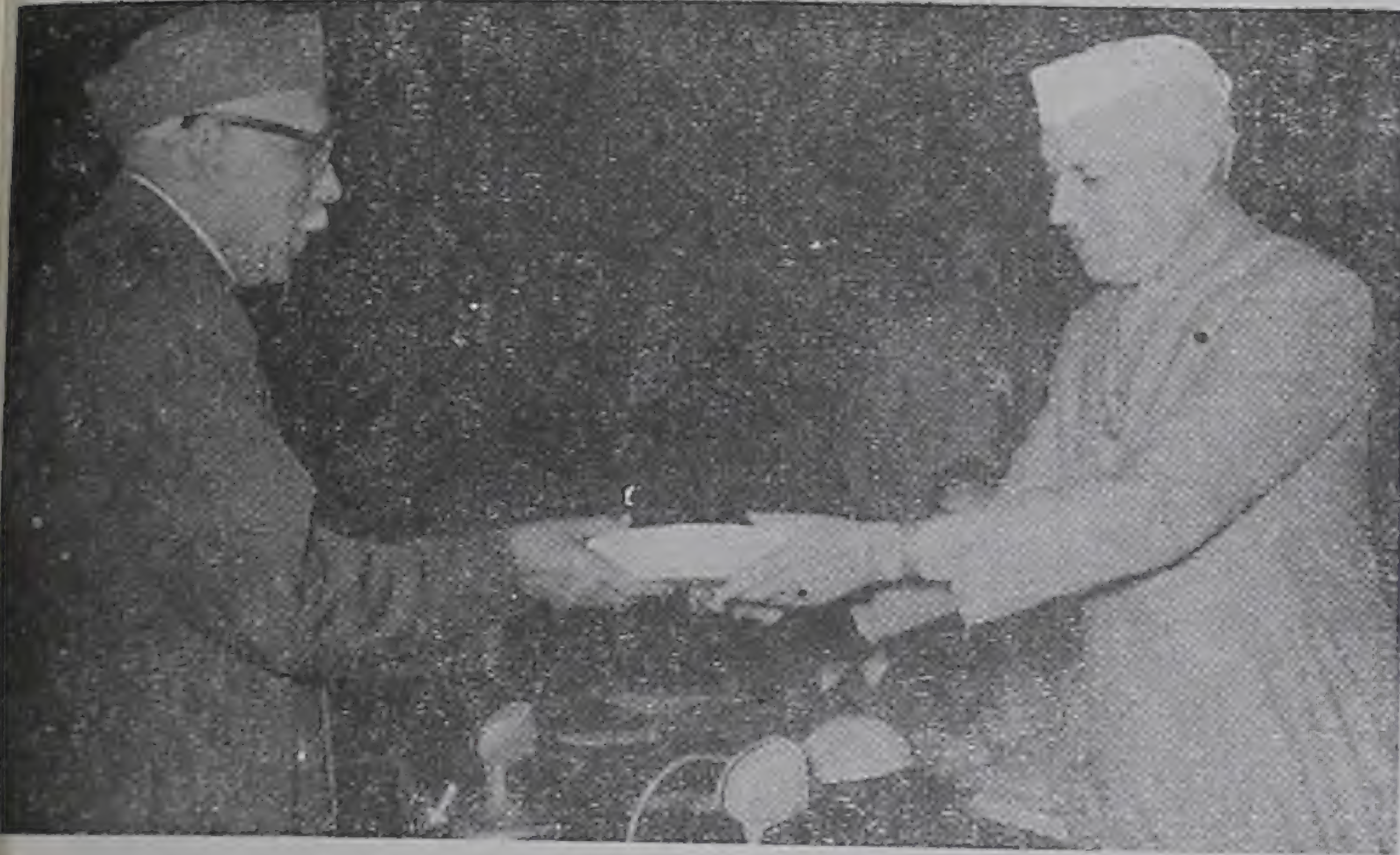


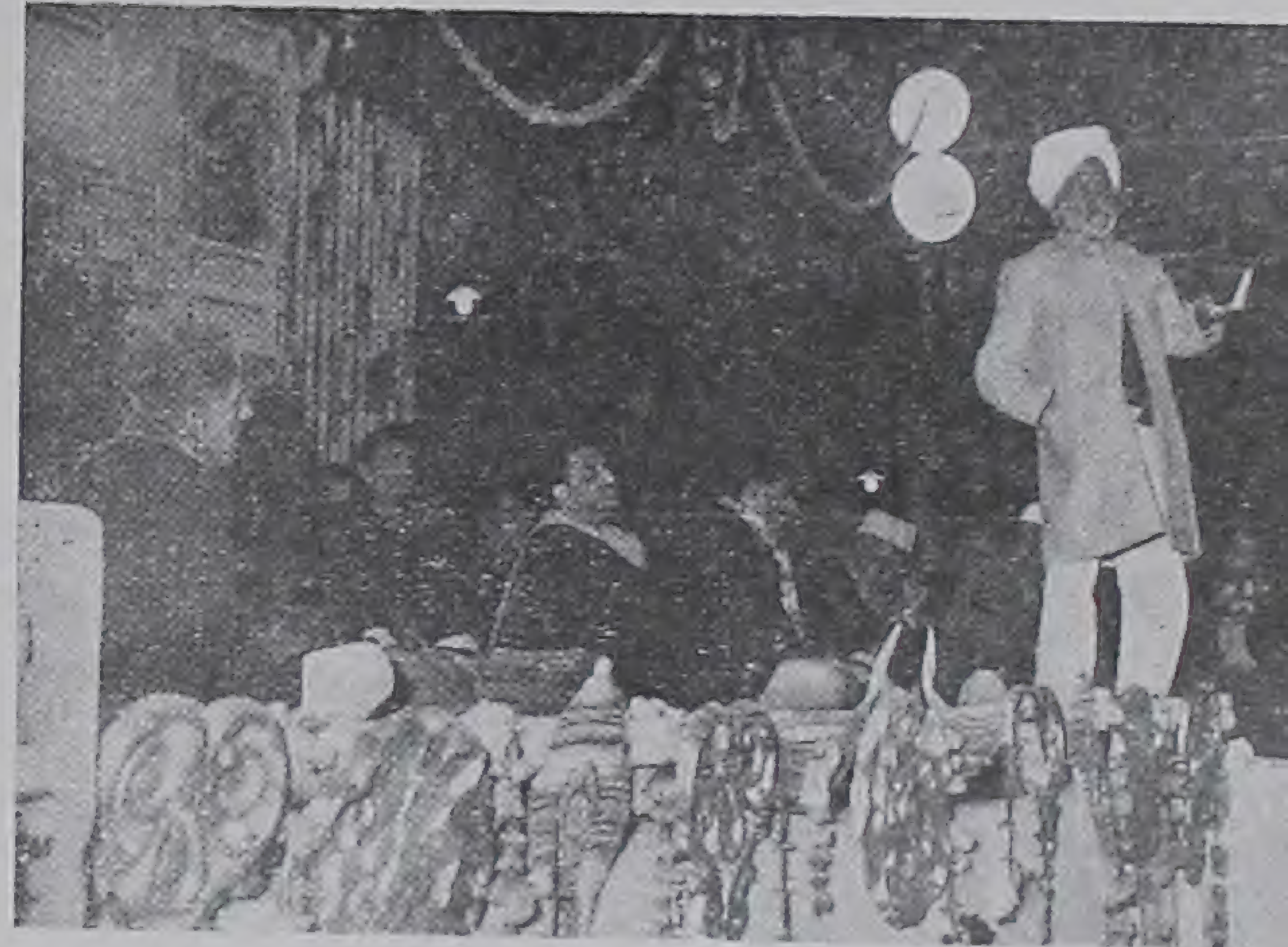
صدر متحدہ عرب جمہوریہ جمال عبدالناصر



صدرِ جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرساد
رُوس کے وزیر اعظم مسٹر خروشچیوف
کا خیر مقدم کر رہے ہیں

دِلّی کے لال قلعہ میں جشن جمہوریہ کا مشاعرہ
حضرت جوش ملیانی اپنا کلام سُنا رہے ہیں





بائیں طرف ، وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو
ود حسن رضوی ادیب لکھنوی کو اُن کی تصنیف
راما اور اسٹیج" پر ساہتیہ اکادمی کا انعام دے رہے ہیں۔



پاکستان کے ہائی کمشنر جناب اے کے بروہی
مہاتما گاندھی کی سمادھی پر پھول چڑھا رہے ہیں

حمیدالدین محمود

جمال عبدالناصر

ابتدائی حالات

جمال عبدالناصر مصر کے ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں جو ایک شمالی صوبے کے مقام بنی مور میں آباد تھا۔ یہیں ۱۵ جنوری ۱۹۱۸ء کو جمال عبدالناصر کا جنم ہوا۔ ابتدائی تعلیم کے لئے آپ کو قاہرہ کی ایک درسگاہ النہضۃ المصریۃ میں داخل کر دیا گیا۔ ابھی وہ آٹھ سال ہی کے تھے کہ اُن کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اُن کی شخصیت اور اندازِ فکر پر اُن کی محبوب ماں کا بہت گہرا اثر تھا اور اُن کی رحلت سے ننھے ناصر کے دل و دماغ پر گہرا اثر ہوا اور وہ بچپن ہی سے تنہائی پسند اور خاموش بن گئے۔ ساتھیوں سے الگ تھلگ اپنا وقت لائبریری ہی میں گزارتے تھے۔ ۱۹۳۴ء میں اُن کے والد اپنے اور نیز بچوں کے ساتھ قاہرہ چلے آئے اور اسی سال ناصر نے امتیاز کے ساتھ میٹرک پاس کیا۔ انھیں بچپن ہی سے بڑے لوگوں کے سوانح اور قانون سے بڑی دلچسپی تھی۔ ۱۹۳۷ء میں وہ ملٹری کالج میں داخل ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ اینگلو مصری معاہدۂ ۱۹۳۶ء ہو چکا تھا جس کی رو سے برطانیہ کو منطقۂ سویز میں اپنی افواج رکھنے کی اجازت دی گئی تھی۔ اس کے خلاف سارے مصر میں غم و غصے کی لہر پھیلی ہوئی تھی۔ ناصر کے جذبات بھی اس معاملے میں شدید تھے۔ ملٹری کالج کی تعلیم و تربیت نے ناصر کی شخصیت کو جِلا دی۔ اُن میں نظم و ضبط، غور و فکر، ڈسپلن، خود اعتمادی پیدا ہوتی گئی۔ اب اُن کے جذبات و خیالات اور سامراج کے خلاف اُن کے محسوسات دوسروں تک پہنچنے لگے۔

فوجی خدمات

ملٹری کالج کا امتحان پاس کر کے وہ تھرڈ رائفل بریگیڈ میں شریک ہو گئے اور منقباد پر پوسٹ کئے گئے۔ یہاں اُن کی ملاقات انوارالسادات اور زکریا محی الدین جو اس وقت انقلابی کونسل میں ہیں، اور احمد انور جو اس وقت چیف آف ملٹری پولیس ہیں، سے ہوئی۔ یہ روابط بعد میں بڑے کارآمد ثابت ہوئے۔

۱۹۳۹ء میں انھیں اسکندریہ بھیجا گیا اور یہاں ان کی ملاقات عبدالحکیم امر سے ہوئی جو آج نہ صرف انقلابی کونسل کے رکن ہیں بلکہ مصری افواج کے کمانڈر انچیف بھی ہیں۔ بعد ازیں ۱۹۴۲ء میں انھیں ال الامین کے میدانِ جنگ میں بھیجا گیا۔ اور پھر اسکندریہ بھیج دئے گئے۔ یہاں انھیں مصری سیاست اور عرب سیاست کو بہت قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا اتفاق ہوا۔ وفدی جماعت اپنی لاحاصل مساعی میں مصروف تھی۔ ایک کے بعد ایک سیاسی قتل ہو رہے تھے اور دوسری طرف فلسطین میں یہودیوں کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس زمانے میں وہ پانچویں بریگیڈ میں لفٹننٹ تھے اور ان بدعنوانیوں کی مزید تاب نہ لا کر انھوں نے اپنا تبادلہ سوڈان کروا لیا جہاں جبل الاولیاء کے مقام پر آپ عبدالحکیم امر کے ساتھ کام کرتے رہے۔ یہاں نہ صرف دونوں کی دوستی اور مضبوط ہو گئی بلکہ دونوں کو مصر کے قومی اور بین قومی معاملات پر دل کھول کر تبادلۂ خیال کرنے کا موقع ملا اور نتیجتہً دونوں میں ایک زبردست یکسانیت نظر و فکر کی پیدا ہوئی جو آگے چل کر انقلاب کی پلاننگ میں بہت معاون ثابت ہوئی۔

اس کے بعد وہ ملٹری کالج میں لکچرر بنا دئے گئے اور پھر وہ اسٹاف کالج میں شریک ہوئے جہاں انھوں نے امتیازی کامیابی حاصل کی۔ یہاں انھیں جو مشقیں کرائی گئیں وہ تھیں قاہرہ اور اُس کے مضافات کی بری اور ہوائی حملے سے مدافعت۔ یہ تجربے بھی آپ کے لئے بہت اہم ثابت ہوئے کیوں کہ اُن کو اپنے فوجی انقلاب کی ٹکنیک اور Strategy کے متعین کرنے میں اس سے بڑی مدد ملی۔ بلکہ ایک

طرح وہ ایک ریہرسل کی صورت رکھتے ہیں۔

انقلاب کی راہ پر

دوسری عالمی جنگ کے بعد مصری سیاسیات میں زبردست تلاطم آیا۔ ایران، شام، مصر اور فلسطین ان چاروں مقامات پر صورت حال خراب ہوتی گئی۔ سیاسی قتل، سازشیں، خفیہ تحریکیں، وحشت، چور بازاری، رشوت خوری و بداعمالی، مفاد پرستی اور شاہی عیاشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ۱۹۴۷ء میں فلسطین تقسیم کر دیا گیا اور ایک یہودی ریاست "اسرائیل" کا جنم ہوا اس کے ساتھ ہی لڑائی شروع ہو گئی جو ۱۹۴۹ء تک جاری رہی اور جس میں مصری فوج کو زک اٹھانی پڑی۔ آٹھ لاکھ عرب بے گھر اور بے سہارا ہو گئے۔ ایک معاشی اور معاشرتی ابتری پھیلی جس کی سب سے زیادہ ذمہ داری شاہی حکومت اور اس کی مفاد پرست کابینہ پر آتی تھی جنھوں نے نہ صرف عرب افواج کو بے ہتھیار لڑنے پر مجبور کیا بلکہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ مصری فوج ابھی فتح نہیں کر سکتی، اس کی "فتح" کا حکم دیا۔ یہ جنگ کی پلاننگ کی خامی نہ تھی بلکہ ایک ایسا اقدام تھا جو بادشاہِ وقت نے قصداً اس لئے کیا کہ مصر کی قوت مفلوج ہو جائے۔ اس جنگ میں والنٹیر کے طور پر حصہ لینے کے لئے ناصر نے استعفیٰ پیش کیا لیکن وہ قبول نہیں کیا گیا، ایک بار وہ زخمی ہو کر آئے تو انھیں دو ماہ تک بستر پر پڑے رہنے کی ہدایت کی گئی لیکن وہ ایک ہفتے کے بعد ہی محاذِ جنگ کو فرار ہو گئے اور اپنی آنکھوں سے شاہی حکومت کے ہاتھوں مصریوں کی قربانی اور ذلت دیکھی۔ ان مسلسل مشاہدوں نے ناصر کے دل میں سخت ترین نفرت پیدا کی اور انھوں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اب اس راج کو اور اس بربادی کو یک لخت ختم کر دینا چاہیئے۔ انھیں زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا کیونکہ ۱۹۴۹ء میں مصطفیٰ نحاس پاشا کے ۱۹۳۶ء کے اینگلو مصری معاہدے کی تنسیخ کے اعلان کے ساتھ ہی مصر میں وزارتی تعطل کا ایک سلسلہ شروع ہوا شام میں آئے دن انقلاب ہونے لگے، ایران میں ڈاکٹر مصدق نے قدم جما لئے۔ ناصر کو صرف وقت کے اشارے کی ضرورت تھی۔

انھوں نے اپنے تمام رفقاء کو جن سے انھیں پہلے ہی تبادلۂ خیال کا موقع ملا تھا اور جن پر انھیں اعتماد تھا یکجا کیا۔ شاہی محل، کابینہ اور فوج میں اپنا جال بچھا دیا اور تمام معلومات مہیا کر کے ایک منظم منصوبہ بنایا۔ ۲۳ جولائی ۱۹۵۲ء کی صبح کو اچانک قاہرہ کے مضافات میں گڑگڑاہٹ ہونے لگی۔ قاہرہ میں مقیم بیرونی سفارت خانوں اور شہریوں کو علم تک نہ ہو سکا کہ فوج اسکندریہ سے قاہرہ کی طرف مارچ کر رہی ہے۔ قاہرہ کا مکمل محاصرہ کر لیا گیا اور فوج کے لوگ شاہی محل کے اطراف اپنی لمبی لمبی توپیں لگائے کھڑے تھے سنگینوں کے سایے میں فاروق نے اپنی معزولی کا اعلان لکھا۔ مصر کو ایک بدترین حکومت سے نجات مل گئی۔

انقلاب کے بعد

نئے دور میں ایک انقلابی کونسل نے اقتدار سنبھالا۔ ناصر نے جو کہ اس انقلاب کا اصل ہیرو تھا، در پردہ رہنے پر اکتفا کرتے ہوئے جنرل نجیب کو صدر نامزد کیا۔ محض شہنشاہیت کو ختم کرنے سے انقلاب مکمل نہیں ہوا تھا بلکہ وہ تو پہلا مرحلہ تھا۔ اس کے بعد ناصر نے مصر کے ناسوروں کو چیرنا شروع کیا۔ غداروں کو پھانسیاں دی گئیں، سیاسی پارٹیاں تحلیل کر دی گئیں، رشوت ستانی اور بدعنوانی کو بیرحمی سے کچل دیا گیا۔ زرعی اصلاحات نافذ کی گئیں اور اس کے بعد ۱۹۵۵ء میں سرزمینِ مصر کو غیر ملکی برطانوی افواج سے پاک کر دیا گیا۔ اس کے بعد جب کرنل ناصر نے محسوس کیا کہ جنرل نجیب کے قدم ڈگمگا رہے ہیں تو انھوں نے جنرل کو برطرف کر کے خود صدارت سنبھال لی۔ ایک نیا قومی دستور پیش کیا جس کے تحت جون ۱۹۵۶ء میں نئے انتخابات ہوئے اور کرنل ناصر کو مصر کا صدر منتخب کیا گیا۔

اپریل ۱۹۵۵ء میں منعقدہ بنڈونگ کانفرنس میں جس ایشیائی افریقی اتحاد کا مظاہرہ ہوا تھا اس نے صدر ناصر کو تقویت دی۔ اسی اثنا میں اسرائیل نے غازہ پر اچانک حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ تب ناصر کو احساس ہوا کہ کمزوری حملہ آور کو ابھارتی ہے۔ انھوں نے فوجی استحکام کے لئے مغرب سے اسلحہ کی درخواست کی جس کے جواب میں مغربی ممالک نے اسرائیل کو مزید ہتھیار فراہم کئے۔ تب لازماً انھیں روس اور چیکوسلواکیہ سے اسلحہ خریدنا پڑا جس پر یہ مضحکہ خیز تہمت لگائی گئی کہ انھوں نے ایشیا میں توازنِ قوت کو متاثر کیا ہے اور ان کی کتاب 'فلسفۂ انقلاب' کو ہٹلر کی 'میری جد و جہد' کے مشابہ بتایا گیا۔ مصر کی معاشی ناکہ بندی کی گئی، اس کی روئی کا بائیکاٹ کیا گیا حتیٰ کہ صدر ناصر کے خلاف شخصی پروپیگنڈے کی مہم چلائی گئی۔

اسوان بند، سویز اور جنگ

مصر کی زرعی خوشحالی کو بڑھانے کے لئے ہمیشہ نیل کی طرف دیکھا

گیا۔ اسوان بند کی تعمیر صدر ناصر کا ایک پرانا خواب تھا اس کے لئے عالمی بنک نے دو ارب ڈالر کی امداد منظور کی تھی اور اتنی ہی رقم امریکہ و برطانیہ بھی صرف کرنے والے تھے۔ لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ صدر ناصر اُن کے حلقہ بگوش ہونے کی بجائے مسٹر نہرو کے ہم نظر ہو کر غیر جانبداری کی طرف مائل ہیں تو انھوں نے نہ صرف اپنا حصّہ دینے سے انکار کیا بلکہ عالمی بنک کو بھی اپنی پیش کش واپس لینے پر مجبور کیا۔ تب صدر ناصر نے اپنے ہی ذرائع کی طرف توجہ کی اور نہر سویز کمپنی کو جو کہ مصری قانون کے تحت مصر ہی میں رجسٹر شُدہ کمپنی تھی، قومیانے کا اعلان کر دیا۔ (۲۶ جولائی ۱۹۵۶ء)۔ اس پر سارے یورپ میں تہلکہ مچ گیا اور یہ غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی کہ مصر نے نہر سویز ہی کو قومیا دیا ہے۔ پہلے تو برطانیہ نے نہر سویز کے مقاطعے کا اعلان کیا اور جب یہ نہ ہو سکا تو مصری اتھارٹی کو تسلیم نہ کر کے بغیر محصول ادا کئے نہر کا استعمال کرنے کی کوشش کی، اپنے پائلٹوں کو واپس بلا لیا تاکہ نہر سویز کام نہ دے سکے۔ پھر اقوام متحدہ میں مقدمہ لے گیا اور وہاں پر بحث کی نوبت آئی تو کہنے لگا کہ بند دروازے میں بحث کی جائے اور جب اِدھر بحث جاری رہی اور سمجھوتے کے امکانات پیدا ہو گئے تو اُدھر فرانس اور اسرائیل کے ساتھ مل کر اکتوبر میں مصر پر حملہ کر دیا۔ سول آبادی کو ہراساں کیا، ہسپتالوں اور مدارس پر بمباری کی اور سر انتھونی ایڈن نے اعلان کیا کہ ناصر کا تختہ اُلٹ دیا جائے گا۔ مصریوں نے ایک جانباز قوم کی طرح اس وحشیانہ حملے کی مزاحمت کی برطانوی فوجیں پورٹ سعید سے آگے نہ بڑھ سکیں اور بالآخر برطانیہ کو جنگ بند کر دینی پڑی۔

متحدہ عرب جمہوریہ کی تشکیل

جنگ سویز نے یہ واضح کر دیا کہ جب تک عرب کمزور اور متفرق رہیں گے اس وقت تک ہمیشہ ایسی کوششیں کی جائیں گی۔ ہر بار کوئی نہ کوئی خونخوار، کسی نہ کسی بہانے، کسی نہ کسی ملک کو اپنی ہوسِ ملک گیری کا نشانہ بنائے گا۔ اس کے نتیجے کے طور پر متحدہ عرب قومیت کا تصوّر جڑ پکڑتا چلا گیا۔ اور بالآخر ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو شام و مصر نے ایک ریاست "متحدہ عرب جمہوریہ" میں اپنے آپ کو ضم کر کے عرب تحریک قومیت کی پہلی نشانی قائم کی اور جمال عبدالناصر اس کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔

خورشید احمد جامی

غزل

مایوس تیرگی سے نہ ہو اے غمِ وطن
لے تجھ کو دے رہا ہوں چراغِ شعور و فن

پگھلا دئے ہیں تلخ حقائق کی آگ نے
خوابوں کی چاندنی سے بنائے ہوئے بدن

آیا ترا خیال تو محسوس یہ ہُوا
رقصاں ہے زندگی کے اندھیروں میں اک کرن

اک عمر خارزارِ الم میں کٹی، مگر
مہکا دئے ہیں فکر و نظر سے کئی چمن

اس زندگی کے اور بھی کچھ نام ہیں نئے
کب تک شبِ فراق کا افسانۂ کہُن

حالات خود ہی پاؤں کی زنجیر بن گئے
ورنہ کچھ اتنی دُور نہ تھی تیری انجمن

یہ کیا ہُوا کہ صبحِ بہاراں کے پاس بھی
پھولوں کی دلکشی ہے نہ گیتوں کا بانکپن

صحرائے آرزو کی مسافت طویل تھی
پہنچے ترے قریب تو بڑھنے لگی تھکن

اب جی رہا ہوں اے غمِ دوراں کچھ اس طرح
جیسے مری حیات ہے بس ایک حُسنِ ظن

ہر تلخ تجربے کو دیا میری فکر نے
الفاظ کا حسین و دل آویز پیرہن

اب کس کے انتظار میں جامی تمام رات
جلتی ہے خونِ دل سے مرے مشعلِ سخن

خواجہ بدیع الزّماں

دِنکر کی شاعری

(ایک جائزہ)

رام دھاری سنگھ دِنکر کی شاعری سے ہندی شاعری میں ایک نئے عہد کا آغاز ہوتا ہے۔ سامراجی شکنجوں میں جکڑے ہوئے ہندوستان کی تمناؤں، حسرتوں اور مجبوریوں کا جتنا بھرپور اظہار دِنکر کی شاعری میں ہوا ہے ہندی کے کسی اور شاعر کے یہاں نہیں ہوا۔ جس طرح بنگلہ میں نذرالاسلام نے، اُردو میں اقبال اور جوش نے آزادی کے ترانے گائے اور اپنی نظموں سے قوم میں ایک نئی روح پھونکنے کی کوشش کی اسی طرح دِنکر نے ہندی میں شعلہ بار نظمیں لکھ کر قومی حوصلہ کو بلند رکھنے اور آزادی کی جدوجہد کو قوت و توانائی بخشنے کا اہم تاریخی فریضہ انجام دیا۔ نذرالاسلام اور اقبال نے جس دور میں نئی زندگی کے ترانے گائے اور قوم کو انقلاب کی دعوت دی اس دور کی بنگلہ اور اردو شاعری کی فضا اس بلند آہنگ اور انقلابی شاعری کے لئے کچھ زیادہ سازگار نہ تھی اور ان شاعروں میں سماجی شعور اور اپنے لئے ایک نئی راہ پیدا کرنے کی صلاحیت نہ ہوتی تو اپنی تمام شاعرانہ صلاحیتوں کے باوجود ان کے قلم سے وہ نظمیں نہ نکل سکتیں جو غلامی افلاس اور بدحالی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے اور آزادی کے لئے تڑپتے ہوئے بھارت کی جیتی جاگتی علامت ہیں۔ دِنکر کو بھی کچھ ایسی ہی فضا سے دوچار ہونا پڑا۔ جب ان کی شاعری کا آغاز ہوا اس زمانے میں چھایاواد اپنے شباب پر تھا۔ چھایاواد کی شاعری ایک فرارپسند رومانی شاعری تھی جس میں سماجی مسائل پر غور و فکر کرنے کا کوئی احساس موجود نہ تھا۔ اس کی حد سے بڑھی ہوئی داخلیت سماجی موضوعات پر کھل کر بحث کرنے کی اجازت بھی نہ دیتی تھی۔ چھایاوادی کوی کا تصور ہمیشہ آکاش میں اڑتا رہتا تھا، اس کے پاؤں دھرتی پر ٹکے ہوئے نہیں تھے۔ زندگی کی حقیقتوں سے آنکھیں چار کرنے کا اس میں دم نہ تھا اس کے طریقِ اظہار میں بھی بے ساختگی اور صفائی نہیں تھی۔ وہ جو کچھ کہتا تھا اس پر ابہام اور اشاریت کی اتنی موٹی تہہ چڑھی ہوئی تھی کہ عام آدمی کے لئے اسے چیر کر اصل مفہوم تک پہونچنا ممکن نہ تھا۔ دِنکر کی شاعری نے چھایاواد کی اسی فضا میں آنکھ کھولی۔ کسی بھی شاعر کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے عہد کے شاعرانہ ماحول اور مزاج سے اپنے آپ کو قطعاً الگ کرے۔ کسی نہ کسی حد تک وہ ان سے متاثر ہوتا ہی ہے لیکن ایک عظیم شاعر کا ذہن ان اثرات کو کسی نہ کسی شکل میں قبول کرتے ہوئے بھی اپنے لئے ایک نئی راہ نکالنے میں لگا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے سے بڑے شاعر کی ابتدائی تخلیقات میں اس عہد کے شاعرانہ مذاق کی گہری چھاپ ملتی ہے لیکن ساتھ ہی ان میں ایک ایسا عنصر بھی موجود ہوتا ہے جو ایک نئی راہ، ایک نئے منظر اور ایک نئی طرز کی غمازی کرتا ہے۔ دِنکر اگر ایک عظیم شاعر بننے کی صلاحیت اور سماجی شعور سے محروم ہوتے تو وہ بھی چھایاواد کی بھول بھلیوں میں گم ہو کے رہ جاتے اور اپنی تخلیقات سے ہندی شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ نہ کر سکتے۔

فطرت نے دِنکر کو ایک حسّاس دل اور قوتِ فکر دی تھی۔ ان کی ذہانت بہت اونچی سطح کی تھی جس نے انھیں لکیر کا فقیر بننے سے باز رکھا۔ اپنی ابتدائی تخلیقات میں دِنکر نے 'چھایاواد' کا اثر قبول کیا ہے جس کا اعتراف انھیں بھی ہے۔

" رینو کا رेणुका میں میرے قومی جذبے کا اظہار

کرنے والی دو تین ہی تخلیقات ہیں۔ باقی اس مجموعہ میں ایسی ہی نظموں کی کثرت ہے جن میں یا تو بھارت کے ماضی کا رونا ہے یا زندگی کی بے ثباتی پر ماتم — اور یہ دونوں خصوصیتیں چھایاواد کے اثر سے آئی تھیں۔ ریبوکا میں ایک تیسری قسم کی نظمیں بھی ہیں جن میں فطرت کی جذبات سے بھری ہوئی مصوری کی گئی ہے اور یہ خصوصیت بھی مجھے چھایاوادیوں کی اس محبت سے ملی جو انھیں فطرت سے تھی۔"

(چکروال' کی بھومیکا، صفحہ ۳۲)

'ریبوکا' دنکر کی نظموں کا پہلا مجموعہ ہے لیکن اس پہلے مجموعہ میں ہی ایک ایسے شاعر کا روپ اُبھر کر سامنے آتا ہے جس کی شخصیت میں شدتِ احساس، جستجو اور شاعرانہ لطافت کا حیرت انگیز اجتماع ہے۔ 'ریبوکا' کی نظمیں ہمیں بے ساختہ اقبال کی ابتدائی نظموں کی یاد دلاتی ہیں جن میں کبھی تو فطرت کے حسن کو تحیر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے، کبھی حال کا ماتم کیا گیا ہے اور کبھی سنہرے ماضی کی حسین یادوں کو تازہ کیا گیا ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ 'ریبوکا' کی وہ نظمیں بھی جن میں چھایاواد کا اثر صاف جھلکتا ہے ایک نئے آہنگ کا پتہ دیتی ہیں۔ اظہار کی بے ساختگی اور صفائی، دل کو چھو لینے والی خصوصیت، زبان کی روانی اور غیر مبہم اندازِ بیان — یہ سب باتیں انھیں چھایاوادی کویتاؤں کی صف سے الگ کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ 'ریبوکا' کی کویتائیں جس زمانے میں لکھی جا رہی تھیں اس وقت بھارت کی سیاست نے کوئی واضح اور معین شکل اختیار نہیں کی تھی۔ ہندی ادب میں بھی، جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، چھایاواد کا غلبہ تھا۔ پھر یہ دنکر کا عہدِ شباب تھا۔ ان تمام باتوں کا اثر ان کی شاعری پر پڑنا فطری ہی تھا۔ لیکن اس کے باوجود 'ریبوکا' کی نظموں میں سماجی شعور اور وطنیت کا احساس بدرجہ اتم موجود ہے۔ 'منگل آہوان' میں جہاں شاعر 'سورسمراٹ' سے یہ درخواست کرتا ہے۔

जलधि-सांस, पत्नी के कलरव — جلدھی[1] سانس، پکشی کے کلرو[2]
अनिल-सनन, अलि का गुन-गुन — انل[3] سنن، الی[4] کا گُن گُن

مेरी वंशी के छिद्रों में — میری ونشی کے چھدروں[1] میں
भर दो ये मधुर स्वर चुन-चुन — بھر دو یہ مدھر سور چُن چُن

وہاں یہ تمنا بھی کرتا ہے:

कर आदेश, फूंक दूं शृंगी — کر آدیش[2]، پھونک دوں شرنگی[3]
उठे प्रभाती-राग महान। — اُٹھے پربھاتی راگ مہان
तीनों काल ध्वनित हों स्वर में — تینوں کال دھونت ہوں سور میں
-जागें सुप्त भुवन के प्राण — جاگیں سپت[4] بھوون[5] کے پران

'منگل آہوان' میں ہی شاعر بیداری کا پیغام دینے کے لئے کتنا بے تاب نظر آتا ہے:

पर हूं विवश गान से कैसे — پر ہوں وِوش[6] گان[7] سے کیسے
जग को हाय ! जगाऊं मैं — جگ کو ہائے جگاؤں میں
इस तमिस्र युग बीच ज्योति की — اس تمسر[8] یگ بیچ جیوتی کی
कौन रागिनी गाऊँ मैं ? — کون راگنی گاؤں میں؟

'ریبوکا' کی نظموں میں ہم شاعر کو ایک ذہنی کشمکش میں گرفتار دیکھتے ہیں۔ ایک طرف عشق کی دلآویز ادائیں ہیں جو شاعر کو اپنی طرف کھینچتی ہیں لیکن سماج کی ٹھوس حقیقتوں سے بھی شاعر کنارہ کش نہیں ہو سکتا۔ اس کا شعور بیدار ہے۔ سماج کی جانب سے جو ذمہ داریاں اس پر عائد ہوتی ہیں وہ انھیں بالکل نظر انداز نہیں کر سکتا۔ دل اور دماغ کی یہ جنگ بہت سے عظیم شعراء کے یہاں ملتی ہے اور اس کشمکش سے کتنی ہی امر تخلیقات عالمِ وجود میں آئی ہیں۔ اسی کشمکش سے دنکر کو بھی دوچار ہونا پڑا ہے اور اس کے نقوش ان کی نظموں میں صاف نظر آتے ہیں۔ 'کلاپترکھ' میں جو 'ریبوکا' میں ہی شامل ہے، اس کشمکش کی مصوری بہت ہی حسن اور فن کاری کے ساتھ کی گئی ہے۔ اس نظم میں شاعر نے حسن اور حقیقت کو بہت ہی ڈرامائی انداز میں پیش کیا ہے اور علاحدہ علاحدہ ان کی تشریح کرنے کے بعد دونوں کے امتزاج سے ایک نئے رُخ کی تشکیل کی ہے۔ اس نظم میں بلا کی اثر انگیزی ہے۔ حالات نے اسے حد درجہ دلکش بنا دیا ہے

[1] سمندر [2] میٹھے بول [3] ہوا [4] بھنورا

[1] سوراخ [2] حکم [3] ایک طرح کا باجا [4] خفتہ [5] دنیا [6] مجبور [7] گانا [8] تاریک

یہ نظم شاعرانہ صناعی کا بہترین نمونہ ہے۔ اس نظم کے کچھ اشعار نیچے دیئے جاتے ہیں۔ شاعر 'سندرتا' یعنی حسن سے مل چکا ہے، اب 'کرتویہ' یعنی فرض سے اس کی ملاقات ہوتی ہے:

میں نے کہا "کون تم؟" بولا وہ "کرتویہ[1]، ستیہ کا پیارا
मैंने कहा, "कौन तुम ?" बोला वह, "कर्तव्य, सत्य का प्यारा,
کرشی سینچن[2] کے لئے جاتا ہوں یہ نرجھر[3] کی دھارا
कृषि-सिंचन के लिए लिये जाता हूं यह निर्झर की धारा
میں بلشٹھ آشا کا سُت[4] ہوں ستت[5] مگن جیون کے رن میں
मैं वलिष्ठ आशा का सुत हूं, सतत मग्न जीवन के रण में
تندرا[6]، الس مجھے کیوں گھیریں؟ میں اوِرت[7] تل لین[8] لگن میں
तंद्रा, अलस मुझे क्यों घेरें ? मैं अविरत तल्लीन लगन में

سندرتا پر کبھی نہ بھولو، شاپ بنے گی وہ جیون میں
सुन्दरता पर कभी न भूलो, शाप बनेगी वह जीवन में
لکشیہ وِمکھ[9] کر بھٹکائے گی، تمہیں ویرتھ پھولوں کے ون میں
लक्ष्य-विमुख कर भटकायेगी, तुम्हें व्यर्थ फूलों के वन में

وہ رت[10] ہوا کرم میں اپنے، میں شرم شتھل[11] بڑھا نج پتھ پر
वह रत हुआ कर्म में अपने, मैं श्रम-शिथिल बढ़ा निज पथ पर
سندرتا یا ستیہ شریشٹھ[12] ہے؟" اٹھنے لگا دونددو[13] پگ پگ پر
"सुन्दरता या सत्य श्रेष्ठ है ?" उठने लगा द्वन्द्व पग-पग पर
سندرتا انند مورتی ہے، پریم ندی موہک متوالی
सुन्दरता आनन्द-मूर्ति है, प्रेम नदी मोहक, मतवाली
کرم کسم کے بنا کنتو، کیا بھر سکتی جیون کی ڈالی
कर्म-कुसुम के बिना किन्तु, क्या भर सकती जीवन की डाली

---

۱ فرض ۲ کھیتی کی سینچائی ۳ جھرنا ۴ بیٹا
۵ ہمیشہ ۶ نیند ۷ لگاتار ۸ معروف ۹ گمراہ
۱۰ معروف ۱۱ محنت سے تھکا ہوا ۱۲ عمدہ ۱۳ کش مکش

اور آخر میں شاعر کو ایک سنگم مل جاتا ہے جہاں حقیقت اور حسن ہم آغوش نظر آتے ہیں۔ یہ سنگم "کلا کا بھوَن" ہے:-

ایک ونڈو پہ ملے مارگ دو اکر دو پرتی کول[1] وِجن[2] سے
سنگم پر تھا بھون کلا کا ستدر گھٹی ہوت گگن سے

'رینوکا' کی نظمیں ایک حساس نوجوان شاعر کی سیماب صفت فطرت کی مظہر ہیں۔ وہ کبھی فطری مناظر کے حسن میں کھو جاتا ہے، کبھی اس کا ذہن حال کی تلخیوں سے گھبرا کر ماضی کی حسین یادوں میں سکون کا جویا ہے اور کبھی بغاوت کا جذبہ اسے سب کچھ پھونک دینے پر اُکساتا ہے۔ رومانیت اور حقیقت پسندی، ان دونوں کا امتزاج 'رینوکا' میں ملتا ہے۔

'ہنکار' میں دنکر کی وہ نظمیں شامل ہیں جو قومیت اور وطنیت کے جذبے سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں۔ ان نظموں میں وہی جوش، قوت اور اثرانگیزی ملتی ہے جو اردو میں جوش کی نظموں میں نظر آتی ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ جس طرح جوش کو شاعرِ انقلاب کہہ کر ان کی انقلابی نظموں کو ہی زیادہ سراہا گیا اور دوسری نظموں کی اہمیت کو ایک حد تک نظرانداز کیا گیا بالکل اسی طرح دنکر کی انقلابی نظموں کو ہی نسبتاً زیادہ مقبولیت نصیب ہوئی اس کا بڑا سبب یہی ہے کہ یہ نظمیں ملک کی اہم ترین سیاسی ضرورت یعنی آزادی کے حصول میں معاون ثابت ہوتی تھیں۔ حالانکہ فنی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو جوش اور دنکر کی دوسری نظمیں ان کی انقلابی نظموں سے کہیں اعلیٰ درجہ کی ہیں۔

'ہنکار' کے بعد 'رس ونتی'، دنکر کی نظموں کا ایک اور قابلِ ذکر مجموعہ ہے۔ اس کی نظمیں موضوعات کے اعتبار سے 'ہنکار' سے بہت مختلف ہیں۔ 'رس ونتی' کی نظموں کے بارے میں بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ وہ شاعر کی فرار پسندی کی نمائندگی کرتی ہیں۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ دنکر جس زمانے میں 'ہنکار' کی جوش آفریں نظمیں لکھ رہے تھے اسی زمانے میں وہ 'رس ونتی' کی کویتاؤں کی بھی تخلیق کر رہے تھے۔ 'رس ونتی' کی نظمیں شاعر کے لطیف جذبات کی آئینہ دار ہیں۔ اس میں شاعر کا لہجہ فطری طور پر وہ

---

۱ مخالف ۲ سنسان علاقہ

نہیں ہے جو 'ہنکار' کی نظموں میں ملتا ہے۔ ان میں نرمی ہے، مٹھاس ہے اور دل کی گہرائی کو چھو لینے والی خصوصیت ہے۔ 'رس ونتی' میں دنکر نے عورت کی زندگی کے مختلف رُخوں کی عکاسی کی ہے لیکن کہیں بھی انھوں نے عیش کوشی اور ہوس پرستی کو راہ نہیں دی۔ شاعر نے عورت کو مختلف روپوں میں دیکھنے کی کوشش کی ہے لیکن کہیں بھی اس کے تصورات میں کوئی آلودگی نہیں ہے۔ "رس ونتی" کی نظموں میں بہت اعلیٰ درجہ کی مصوّری ملتی ہے۔ 'بالکا سے ودھو' میں ایک لڑکی کی تصویر دیکھئے جس کی شادی ابھی ابھی ہوئی ہے:

ماتھے میں سیندور پہ چھوٹی دو بندی چم چم سی
پپنی پر آنسو کی بوندیں موتی سی، شبنم سی
لدی ہوئی کلیوں سے مادک[1] ٹہنی ایک نرم سی
یووَن[2] کی وِنتی[3] سی بھولی، گم سم کھڑی شرم سی

. . . .

بھینگ رہا میٹھی امنگ سے دل کا کونا کونا
بھیتر بھیتر ہنسی دیکھ لو، باہر باہر رونا

دنکر کی تمام تخلیقات میں 'کروکشیتر' کو افضلیت حاصل ہے۔ یہ ایک طویل رزمیہ نظم ہے جس کا موضوع مشہور مہا کاویہ 'مہا بھارت' سے لیا گیا ہے۔ جنگ کے زمانہ میں اور اس کے بعد جنگ کو موضوع بنا کر ہندی میں بے شمار نظمیں لکھی گئی ہیں لیکن ان میں دو چار نظمیں ہی ایسی ہیں جو جاندار ہیں۔ اس کا بڑا سبب یہی ہے کہ زیادہ تر نظموں میں ذاتی تجربہ اور شدّتِ احساس کا فقدان ہے۔ دنکر نے جنگ کو ایک وسیع پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے جو سوالات اُٹھائے ہیں ان کی نوعیت ہنگامی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ 'کروکشیتر' کی تخلیق ہندوستانی روایات اور تاریخ کے دائرے میں رہ کر کی گئی ہے جس کی بنا پر یہ ہندوستانی ذہن کے لئے ایک خاص کشش کی حامل ہے۔ فکر اور جذبے کی آمیزش نے اس نظم میں بے حد حسن اور دلکشی پیدا کر دی ہے۔ شاعر کے اپنے الفاظ میں "یہاں اس کا اندیشوں سے بھرا دل ہی دماغ کی سطح پر آ کر بول رہا ہے۔"

---

۱ نشیلی ۲ جوانی ۳ جھکی ہوئی

اس میں مہابھارت کی جنگ کا مفصل بیان نہیں ہے۔ کروکشیتر کی جنگ تو یہاں صرف ایک پس منظر کا کام دیتی ہے۔ شاعر نے اسے ایک علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ دراصل یہ نظم ان شکوک اور اندیشوں کا اظہار ہے جو حساس انسانوں کے دل میں دوسری جنگِ عظیم سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس میں جنگ کے جواز اور عدم جواز سے بحث کی گئی ہے اور اس کے لئے شاعر نے یدھشٹر اور بھیشم کو ان دونوں رخوں کی نمائندگی کے لئے چُنا ہے۔ یدھشٹر عدم تشدد اور امن کے نمائندہ ہیں۔ وہ جنگ کو کسی بھی حالت میں جائز اور مناسب نہیں سمجھتے۔ بھیشم ناانصافی اور ظلم کے انسداد کے لئے جنگ کو جائز اور ضروری قرار دیتے ہیں۔ ان دونوں کرداروں کا سہارا لے کر شاعر نے جنگ سے متعلق اس کے دل میں اُٹھنے والے شکوک، اندیشوں اور سوالوں کا اظہار بہت ہی مؤثر انداز میں کیا ہے۔ کروکشیتر کی جنگ اور اس کے اسباب کی جو تشریح شاعر نے کی ہے اس کا اطلاق موجودہ دنیا کی جنگوں پر بھی ہوتا ہے۔ کروکشیتر کی جنگ کی ذمہ داری صرف یدھشٹر اور دریودھن پر ہی نہیں تھی وہ تو پورے بھارت ورش میں صدیوں سے پھیلی ہوئی باہمی نفرت اور دشمنی کا نتیجہ تھی۔ دنکر کا یہ شعر دوسری جنگِ عظیم کی کتنی سچی تصویر ہے:

نہ کیول یہ کو پھل کروونش کے سنگھرش[1] کا تھا
وِکٹ وِسپھوٹ[2] یہ سمپورن بھارت ورش کا تھا

(न केवल यह कुफल कुरु वंश के संघर्ष का था
विकट विस्फोट यह सम्पूर्ण भारत वर्ष का था)

یدھشٹر اور بھیشم کی زبان سے جنگ کے متعلق ان دونوں نظریوں کی وضاحت کرنے کے بعد شاعر مہابھارت کے میدانِ کارزار سے ہٹ کر دوسری جنگِ عظیم کی طرف آتا ہے اور جنگ کے مسئلہ کا حل ڈھونڈ نکالنا چاہتا ہے۔ اس کے خیال میں سائنس کی ترقی انسان کو کبھی بھی جنگ کی ہولناکیوں سے آزاد نہیں کر سکتی۔ جنگ کے انسداد کی ایک ہی صورت ہے اور وہ ہے نوعِ انسان میں محبت اور رفاقت کے جذبہ کی فراوانی۔ دنیا پر جب تک صرف عقل کی حکمرانی رہے گی اور دل کی رہبری قبول نہیں

---

۱ تصادم ۲ شدید دھماکہ

کی جائے گی تب تک جنگ کا خطرہ باقی رہے گا:

کنتو ہے بڑھتا گیا مستشک[1] ہی بنہ شیش[2]
چھوٹ کر پیچھے گیا ہے رہ ہردے کا دیش
نر مناتا نتیہ[3] نوتن بدّھی کا تیوہار
پران میں کرتے دکھی ہو دیوتا چیتکار[4]
چاہیئے ان کو نہ کیول گیان
دیوتا ہیں مانگتے کچھ سنیہہ[5] کچھ بلیدان
موم سی کوئی ملائم چیز
تاپ پاکر جو اُٹھے من میں پسیج پسیج

किन्तु है बढ़ता गया मस्तिष्क ही निःशेष
छूट कर पीछे गया है रह हृदय का देश,
नर मनाता नित्य नूतन बुद्धि का त्यौहार
प्राण में करते दुखी हो देवता चीत्कार।
चाहिए उनको न केवल ज्ञान,
देवता हैं मांगते कुछ स्नेह, कुछ बलिदान
मोम सी कोई मुलायम चीज
ताप पाकर जो उठे मन में पसीज-पसीज

'کروکشیتر' بہت ہی بلند پایہ نظم ہے اس میں دنکر کی شاعرانہ صلاحیت اپنے اوج پر نظر آتی ہے۔ اس میں غضب کا جوش اور روانی ہے، تشبیہات واستعارات حد درجہ خیال انگیز ہیں اور اندازِ بیان بہت ہی شستہ اور مؤثر ہے۔ بھیشم کی زبان سے کہلوائے گئے اس شعر میں نا انصافی اور ظلم کی بنیاد پر قائم امن کی کتنی پُر معنی تصویر پیش کی گئی ہے۔

آنن سرل، وچن مدھومے[6] ہے۔ تن پر شبھر وسن[7] ہے
بچو یدھشٹر! اس ناگن کا وِش سے بھرا دشن[8] ہے

आनन सरल, वचन मधुमय है, तन पर शुभ्र वसन है
बचो युधिष्ठिर! इस नागिन का विष से भरा दशन है

ہندی میں دنکر کی شاعری پر بہت سے تنقیدی مضامین لکھے گئے ہیں جن میں اس کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے لیکن میرے خیال میں ان کی شاعری کے ایک بہت ہی اہم پہلو کا ابھی تک سیر حاصل تجزیہ نہیں کیا گیا ہے۔ میرا اشارہ دنکر کے اندازِ بیان اور اسلوب کی طرف ہے۔ دنکر ہندی میں ایک نئی طرز کے موجد ہیں۔ ان کا سا اتنا صاف، واضح اور غیر مبہم اندازِ بیان ہندی کے کسی اور شاعر کے یہاں مشکل سے ہی نظر آئے گا۔ ان کے اسلوب میں پہاڑی جھرنے کی سی روانی اور صفائی ہے۔ ہندی میں کھڑی بولی کی شاعری کی عمر ابھی کچھ زیادہ نہیں ہے۔ دنکر نے ہندی شاعری کو کھڑی بولی کے قالب میں ڈھالنے اور اس کی نوک پلک درست کرنے میں جو مدد دی ہے وہ حد درجہ قابلِ تعریف ہے۔ مشکل اور پیچیدہ خیالات کا اظہار وہ بہت صفائی اور سادگی کے ساتھ کر جاتے ہیں۔ ان کے اسلوب کی طرح ان کی زبان بھی بہت سادہ اور شستہ ہے۔ ہندی کے بہت سے دوسرے شاعروں کی طرح انھوں نے صرف سنسکرت کے مشکل الفاظ کو ہی فوقیت نہیں دی ہے اردو اور عام بول چال کے الفاظ کو بھی اپنی شاعری میں نمایاں جگہ دی ہے۔ دنکر کی شاعری نے چھایاواد کے شاعرانہ ماحول میں آنکھ کھولی تھی۔ اس ماحول میں رہتے ہوئے بھی دنکر نے اپنے لئے شاعری کی ایک نئی راہ نکالی جو موضوع، مواد اور اسلوب کے اعتبار سے چھایاوادی شاعری سے بہت مختلف ہے۔ یہی ایک بات ان کی شاعرانہ عظمت کو منوانے کے لئے کافی ہے۔

---

[1] دماغ [2] بے انتہا [3] انسان [4] روز [5] چیخ [6] محبت [7] سادہ چہرہ [8] میٹھا [9] سفید لباس [10] ڈسنا

'آج کل' اگست ۱۹۶۰ء کا شمارہ 'ہندوستانی مصوری نمبر' ہوگا

بانیانِ مشاعرہ سے

اے منتظمِ بزمِ سخن، بانیٔ صحبت — کچھ تجھ سے مقامی شعراء کو ہے شکایت
بہتر ہے فریقین میں ہو جائے صفائی — بہتر ہے کہ باقی نہ رہے دل میں کدورت
یہ بات مسلّم کہ تجھے دردِ سخن ہے — اور یہ بھی بجا، تجھ کو میسّر ہے فراغت
اوقات گذاری کے لئے تیری نظر میں — بہتر مۓ و مینا سے ہے اشعار کی لذّت
پرہیز اگر رقص و غنا سے ہے بظاہر — کچھ مصلحتِ وقت ہے کچھ پاسِ شریعت
پھر اس کے علاوہ یہ کھلی بات ہے ابتک — بزمِ شعراء کرتی ہے دونوں کی نیابت
القصّہ ترا ذوق جو اُکساتا ہے تجھکو — مائل بہ سخن ہوتی ہے جب تیری طبیعت
کرتا ہے بپا اپنے یہاں مجلسِ شعری — پیشِ شعراء بھیج کے پروانۂ دعوت
گھر پر ترے جُٹ جاتے ہیں دس بیس خوش آہنگ — موقع ہو تو واہی کی بھی ہو جاتی ہے شرکت
ہوتی ہے تمام آخرِ شب تک کہیں جا کر — جمتی ہے سرِ شام سے اکثر جو یہ صحبت
جی کھول کے اشعار سناتے ہیں سخن ور — اور داد کی تقسیم بھی ہوتی ہے بہ کثرت
لیکن کبھی اس بات پہ بھی غور کیا ہے — تو اُن کی کیا کرتا ہے کس طرح ضیافت
پنواڑی کی دوکان کی دو ایک گلوری — یا چائے کی اک آدھ پیالی بہ کراہت
چھ گھنٹے جو محبوس رہیں بزم میں تیری — کیا اُن کے تحمّل کی یہی ہوتی ہے قیمت
کیا تجھ کو گماں ہے کہ ہیں شاعر ولی اللہ — کھانے کی ضرورت ہے نہ پینے کی ضرورت
کیا تجھ کو گماں ہے کہ انھیں ضعفِ جگر ہے — بیچاروں کو ہے بھوک نہ لگنے کی شکایت
کیا تجھ کو گماں ہے کہ وہ ہیں قحط کے مارے — اور قحط کے ماروں کو تو فاقوں کی ہے عادت
مطبخ جو ترا ہو، دلِ واہی کی طرح سرد — ہوٹل کو تو کاشانۂ احساں سے ہے قربت

واہی کی ہے یہ نظم وکالت شعراء کی
واللہ کہ خود اُس کو نہیں کوئی شکایت

تحسین سروری

سالک اور غالب

مرزا غالب کے شاگردوں میں مرزا قربان علی بیگ سالک کا نام محتاجِ تعارف نہیں۔ غالب کے اب تک جتنے خطوط دستیاب ہوئے ہیں ان میں سالک کے نام اگرچہ صرف دو ہی خطوط ہیں۔ لیکن انھیں سے ان کے مراسم دوستی باہمی اتحاد و ارتباط اور خلوصِ بے پایاں کا اندازہ ہوتا ہے۔ سالک کی شاعرانہ حیثیت بھی مسلّم ہے۔ لیکن سچ پوچھیے تو محض غالب کے دوست اور شاگرد ہونے کی وجہ سے اردو ادب کی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

سالک، نواب مرزا عالم بیگ خان کے بیٹے اور مرزا عاشور بیگ خان غالب جنگ کے پوتے تھے۔ وہ اوزبک تُرک قوم کی نسل سے تھے۔ ان کا خاندان مدّت سے دہلی کو اپنا وطن بنائے ہوئے تھا۔

مرزا عالم بیگ خان روزگار کے سلسلے میں حیدرآباد بھی گئے تھے۔ جہاں مرزا قربان علی بیگ خان سالک پیدا ہوئے۔ جب سالک چھ برس کے تھے ان کے والد ملازمت ختم کر کے اپنے وطن دہلی آ گئے۔ اس لحاظ سے سالک کی تعلیم و تربیت اور ذہنی نشو و نما دہلی ہی میں ہوئی۔ غدر کے بعد مہاراجہ شیودان سنگھ والیٔ الور کی سلکِ ملازمت میں منسلک ہوئے۔ جہاں خدمتِ وکالت ان کے ذمّہ کی گئی۔ الور کی ملازمت ترک کر کے سیدھے حیدرآباد پہنچے۔ حیدرآباد میں اُن کے چچا پہلے سے مقیم تھے اور وہ نواب صاحب ناظربن، نواب دن بہادر خان کے ہاں ملازم تھے اور بعد میں انھیں کی دُختر سے شادی کر کے خانہ داماد ہو گئے تھے۔ سالک نے انھیں کے پاس اپنا مستقل قیام رکھا۔

حیدرآباد پہنچنے کے بعد سالک نے محکمۂ تعلیمات میں سررشتہ داری کا عہدہ سنبھالا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ حیدرآباد میں تعلیمی اور معاشرتی بیداری پیدا ہو چلی تھی۔ اُس وقت محکمۂ تعلیمات کے ناظم نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی تھے۔ سالک نے نواب صاحب کی سرپرستی میں ایک رسالہ "مخزن الفوائد" ۱۸۷۲ء میں جاری کیا۔ غالباً اردو کا یہ پہلا رسالہ تھا جس میں جدید علوم و فنون اور سائنسی موضوعات پر مضامین شائع ہوتے تھے۔ اسی طرح تحقیقی و تاریخی مضامین بھی فراہم کر کے چھاپے جاتے تھے۔

سالک کو شعر گوئی کا شوق پندرہ برس کی عمر سے ہوا۔ شروع میں حکیم مومن خان کو اپنا کلام دکھلایا۔ پھر چند روز بعد غالب کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا ابتدا میں قربانؔ تخلص رکھا تھا لیکن غالب کو یہ تخلص پسند نہ آیا۔ انھیں کے ایماء سے سالکؔ تخلص اختیار کیا۔ ۷۵ برس کی عمر پا کر ۱۸۸۰ء (۱۲۹۷ھ) میں حیدرآباد میں انتقال کیا۔ قدر بلگرامی شاگرد غالب نے تاریخ وفات کہی۔

"نواب قربان علی سالک ہزار افسوس مُرد۔"

سالک کے چھوٹے بھائی مرزا شمشاد علی بیگ رضوان بھی غالب کے شاگرد تھے، ان کے نام بھی غالب کے دو خطوط ہیں[1] دونوں بھائی شطرنج

---

[1] مولانا غلام رسول مہر، خطوط غالب (طبع دوم) میں تحریر فرماتے ہیں "رضوان بھائی (یعنی سالک) کی وفات کا صدمہ برداشت نہ کر سکے ۱۸۸۰ء میں وہ بھی چل بسے۔" لیکن یہ تحقیق سراسر غلط ہے۔ دراصل رضوان خود سالک کی زندگی میں فوت ہوئے۔ اس واقعہ کے پانچ سال تک سالک زندہ رہے اور رضوان کی وفات پر قطعہ تاریخ اور ۴۴ ابیات کا جو مرثیہ لکھا ہے (باقی اگلے صفحہ پر)

بھی خوب کھیلتے تھے اور "جلسۂ شطرنج دہلی" کے رکن تھے۔ یہ جلسہ نواب علاؤالدین احمد خان بہادر نے ۱۸۶۶ء میں قائم کیا تھا۔

اس وقت ہمارے پیشِ نظر کلیاتِ سالک کا مطبوعہ نسخہ ہے جو ۱۲۹۷ھ (۱۸۸۰ء) میں اکمل المطابع دہلی سے سید فخرالدّین کے زیرِ اہتمام زیورِ طبع سے آراستہ ہوا تھا۔ یہ کلیات (۳۸۰) صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں غزلیات و قصائد، قطعات و رُباعیات، مخمس و مسدّس، واسوخت و ترجیع بند اور دیگر اصنافِ سخن شامل ہیں۔

جناب مالک رام صاحب نے تلامذۂ غالب میں لکھا ہے کہ "سالک کے دو دیوان ہنجارِ سالک اور میخانۂ سالک کے نام سے تھے۔" لیکن پیشِ نظر کلیات کو ان دونوں سے علیحدہ مجموعۂ کلام خیال کرنا صحیح نہ ہوگا۔ بلکہ اوّل کے دو دواوین کو یک جا کر کے ترتیب دیا گیا ہے۔ ہمارے اس خیال کی بنیاد سالک کے فرزند مرزا خان عابدؔ اور راجہ گنیش پرشاد[۱] بہادر شادؔ کے قطعات تاریخ طبع کلیات پر قائم ہوئی ہے۔ عابدؔ کا قطعہ یہ ہے ؎

ہے دلی نعمی کے تصنیفات سے — یہ کتاب نادرلے دل چھپ گئی
ہیں سخن کی زمزمہ پردازیاں — لو یہ تعلیم عنادل چھپ گئی
کیوں نہ ہاتھوں ہاتھ لیں اہلِ نظر — کس کی یہ سعی انامل چھپ گئی
پہلے تو تھے چند جزو اس کے مگر — اب کلامِ نو کے شامل چھپ گئی
سال کی تھی فکر، عابدؔ نے کہا — دیکھ نظم قبلہ، کامل چھپ گئی

یعنی نہ صرف پہلے کے دو مجموعوں کو ہی ملا کر چھاپا گیا ہے۔ بلکہ کلیات میں بعد کا کلام بھی شامل کیا گیا۔ راجہ گنیش پرشاد کے قطعہ تاریخ سے بھی اس کی وضاحت ہوتی ہے ؎

اب کے پوری نظمِ سالک چھپ گئی — مژدہ باد اے ناظرینِ ذی کمال

غالبؔ کے دوسرے شاگردوں کی طرح سالکؔ کو بھی اپنے اُستاد سے والہانہ محبت تھی۔ وہ بھی غالب کو یگانۂ روزگار جانتے تھے اور اُن کے علم و فن اور ذہانت و ذکاوت کو دل سے مانتے تھے۔ ایک غزل کے مقطع میں کہتے ہیں ؎

روشن بیاں کہیں مرے اُستاد سا نہ پائیں
سالکؔ اگر لئے پھریں اہلِ جہاں چراغ

جب غالب کا انتقال ہو گیا تو معلوم ہوتا ہے کہ تا دمِ زیست اُن کے غم میں رنجور و ملول رہے۔ چنانچہ کلیات میں غالبؔ کے انتقال پر جو قطعات درج ہیں اس کے ثبوت میں پیش کئے جا سکتے ہیں ؎

اسد اللہ خاں بہادر کا — بھر گیا کیوں حیات کا ساغر
اِس ضعیفی و ناتوانی میں — کیوں عدم کی طرف کیا ہے سفر
حیف اے آسمانِ ناہنجار — وائے اے روزگارِ کینہ پرور
ہائے وہ تاجدارِ مُلکِ سخن — ہائے وہ اوستادِ اہلِ ہنر
اُس کے غم میں ہوا ہے ماتمِ عام — پھر نہ کیوں کر سیاہ ہو دفتر
گمرہانِ رہِ معانی کا — آج دُنیا سے گم ہوا ہے خضر
پاؤں رکھنا سنبھال کر سالکؔ — اب طریقِ سخن ہے بے رہبر
کس کو اہلِ زمانہ جانیں گے — بہترینِ زمانہ سے بہتر
اُن کے اوصاف کیا رقم ہوں کہ ہیں — میری حدِ بیان سے باہر
فکر اُن کی گئی وہاں کہ جہاں — طائرِ سدرہ کا رہے شہپر
اُن کے اندیشے کی بلندی سے — قصرِ معنی ہے آسماں منظر
نثر دیکھو تو معدنِ معنے — نظم دیکھو تو رشکِ عقدِ گہر

(پچھلے صفحہ سے آگے) اس کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بھائی کی مفارقت کا داغ عمر بھر اُن کے دل پہ رہا۔ اس سانحہ سے متعلق اُن کی آٹھ رُباعیات بھی موجود ہیں۔ قطعہ تاریخِ وفات یہ ہے ؎

روز یکہ برادر از جہاں رفت — گفتیم کہ وائے وائے رضواں [۱۲۹۳ھ]
از عالمِ بے مدار بگزشت — گردید بہ خلد جائے رضواں [۱۸۷۶ء]

مذکورہ رباعیات میں سے دو ملاحظہ ہوں

رضواں سے جُدا ہو کے جو نکلا گھر سے — آنسو نکل آئے میرے چشمِ تر سے
اب چھوٹ کے نہ مل سکیں گے باہم سالکؔ — یہ بات ہویدا تھی دلِ مضطر سے

کیا دارِ فنا میں ہم نے آ کر دیکھا — آغاز سے انجام برابر دیکھا
ایّام طفولیت میں ماں سے چھوٹے — اب پیر ہوئے داغِ برادر دیکھا

اسی طرح مولانا مہرؔ نے سالک کا سال وفات بھی غلط لکھا ہے۔ دراصل وہ ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) میں فوت ہوئے۔ ۱۲۹۱ھ و ۱۸۷۴ء کسی طرح بھی صحیح نہیں۔

[۱] کلیات کے آخر میں سالک کی تاریخ طبع سے معلوم ہوتا ہے کہ راجہ گنیش پرشاد کی سعی و امداد سے اس کی طباعت عمل میں آئی۔

اُن کے اجمال سے عیاں توضیح   اُن کے انداز میں ادا مضمر
ہائے وہ لطف یاد آتے ہیں   جی میں ہوتی ہے کاوشِ نشتر
مجھ کو سودا نہیں کہ اس غم میں   در و دیوار سے نہ پھوڑوں سر
کور ہو جائے بس ابھی یا رب   گر نہ دریا بہائے دیدۂ تر
ہوں نہ اس غم سے جس کے دو ٹکڑے   میرے سینے میں ہے کہاں وہ جگر
مجھ سے کیا پوچھتے ہو سالِ وفات   ہوش کب ہیں بجا کہ ہوں مضطر

۱۲۸۱   ۱۲۸۰

دیکھ لو رنجِ حسرتِ دوری   دلِ نومید پہ ہجوم آور

(۱۲۸۵)

قطعہ دوم

غمِ مرگِ دبیرالملک عام است   سپہر ابواب غم در دہر بکشاد
ریاحینِ سخن پژمردہ گشتند   خیابانِ معانی رفت بر باد
ز دل پرسیدم از سالِ وفاتش   بہ سالک[111] داغِ نجم الدولہ[۱۲۷۴] بنہاد
نظر کردم سرِ ہر مصرعے را   بنائے عیسوی تاریخ افتاد[۱۲۸۵]
۱۸۶۹

قطعہ سوم

صدمۂ مرگِ حضرتِ غالبؔ   سببِ رنجِ خاص و عام ہوا
اور اُسی سال میں چھپی یہ کتاب   طبع کا اس کی انصرام ہوا
خوب ہے سالِ طبع و سالِ وفات   آج اُن کا سخن تمام ہوا

(۱۲۸۵)

مولانا حالیؔ اور میر مہدی مجروحؔ نے غالبؔ پر مرثیے لکھ کر جو حقِ شاگردی ادا کیا ہے سالکؔ بھی اس ادائے حق میں پیچھے نہیں ہیں۔ اس میں شک ہی نہیں کہ حالیؔ کا مرثیہ اردو کے بلند ترین مرثیوں میں شمار کرنے کے لائق ہے لیکن یہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ سالکؔ کا مرثیہ بھی کسی طرح نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔ کم از کم میر مہدی کے مرثیے کی ٹکر کا مرثیہ تو ضرور کہا جا سکتا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سالکؔ کے پورے مرثیے کو یہاں نقل کیا جائے۔

ترجیع بند در نوحہ سرائی وفات جناب استادی نجم الدولہ
دبیرالملک مرزا اسد اللہ خان بہادر نظام جنگ غالبؔ

شب کو اختر شمار ہوتا تھا   روز آنکھوں میں تار ہوتا تھا
اب کہاں گُل فشانیٔ مضموں   خامہ حسرت نگار ہوتا تھا
شب نہ شبِ انتظار بنی تھی   روز نہ روزِ شمار ہوتا تھا
حشر برپا ہوا تو خوب ہوا   یہ بھی لے روزگار ہوتا تھا
کیوں بر آئے مری کوئی اُمید   نا اُمیدی شعار ہوتا تھا
نفسِ چند کیوں رہے باقی   دہر میں شرمسار ہوتا تھا
ہر ستم میرے واسطے اے چرخ   خنجرِ آبدار ہوتا تھا
تیغِ بیداد تیز ہوتی تھی   اور مجھ پر ہی وار ہوتا تھا
نغمہ سنجِ نشاط کیا ہوتا   زیبِ لب بار بار ہوتا تھا

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مُرد
اسد اللہ خان غالب مُرد

اب نہیں ہوش میں رہا کوئی   کیا مرا حال پوچھتا کوئی
کوئی آزارِ چرخ کا گلہ مند   شاکیٔ بختِ نارسا کوئی
چشمِ تر سے ہے کوئی طوفاں خیز   ضبط سے ہے بھرا ہوا کوئی
ہے کسی کی فغاں شرر افشاں   سوزِ پنہاں سے جل گیا کوئی
جو نہ مانگے کبھی کوئی مجبور   لب پہ لاتا ہے وہ دعا کوئی
اپنے عالم میں مبتلا ہے جہاں   کوئی دشمن نہ آشنا کوئی
نہیں چھٹنے کا زندگانی تک   غم کی سمجھا نہ انتہا کوئی
راز اتنا تو کھول دے مجھ پر   نہیں اسرار داں ملا کوئی
اب یہ کیوں آسماں کو ہے گردش   فتنہ اس سے بھی ہے سوا کوئی

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مُرد
اسد اللہ خان غالب مُرد

جس میں رہتا تھا ہائے جلوۂ یار   ہے وہی آنکھ غم سے طوفاں بار
تھا سکوں میں جو مرکزِ خاکی   نہیں اس دل کو مثلِ برق قرار
جان لب پر کبھی نہ آئی تھی   اب لبوں سے بھی ہو گئی بیزار
زیبِ کف تھا جو ساغرِ سرشار   اب وہ پیمانۂ حیات ہوا
یک نفس زندگی محال ہوئی   کاش آساں ہو مُردنِ دشوار
رات بدتر ہے روزِ ماتم سے   روز ظلمت میں غیرتِ شبِ تار
مرگ کا اب خدا سے طالب ہوں   پہلے کیا کیا تھی مانگنے میں عار
زہر کھانے میں خوف تھا کیا کیا   اب سمجھتا ہوں چارۂ آزار

سببِ گریہ پوچھتے ہیں لوگ   مجھ کو کہنا پڑا یہی نا چار
رشکِ عرفی و فخرِ طالب مُرد
اسداللہ خان غالب مُرد

نہ کروں گا علاجِ دردِ جگر   زندگی موت سے نہیں بہتر
دلِ گم گشتہ کا کہوں کیا حال   کہ مجھے جان کی نہیں ہے خبر
سطحِ خاک کی الہٰی خیر   آج رُکتے نہیں ہیں دیدۂ تر
شمعِ بزمِ سخن کی خاموشی   دے گئی نالہائے صور اثر
یہ کس آتشِ زباں کا مرنا آہ   گر گیا برق سے ہوا مضطر
کشتِ اُمید ہو گئی تاراج   خرمنِ صبر پر چلی مرمر
نخلِ حرماں میں تازگی آئی   شجرِ آرزو ہوا بے بر
مجھ پہ سو بار حشر بھی گزرا   پر نہ اس حادثہ سے تھا بڑھ کر
ہو گیا ہے مرا یہ تکیہ کلام   پہلے ہر بات سے ہے یہ لب پر
رشکِ عرفی و فخرِ طالب مُرد
اسداللہ خان غالب مُرد

خضرِ راہِ سخن جہاں سے گیا   ہادیٔ راہ کارواں سے گیا
مرگ کا زندگی میں تھا کھٹکا   یہ بھی غم ہائے جاوداں سے گیا
شعلے ہر بات میں نکلتے ہیں   ضبط اب سوزشِ نہاں سے گیا
شکر ہے موت جلد اگر آجائے   شکوہ اب مرگِ ناگہاں سے گیا
دہر ہی پر نہیں ہے رونقِ دہر   باعثِ زیبِ دہر یہاں سے گیا
گل ہیں لیکن نہیں بہارِ نظر   رنگ گویا کہ گلستاں سے گیا
دل ہے لیکن نہیں ہے دل کو قرار   صبر گویا کہ اپنی جاں سے گیا
خاک میں مل گیا عروجِ سخن   مہرِ معنی کے آسماں سے گیا
یاد ہے وہ عذوبتِ گفتار   اب سخن کا مزا زباں سے گیا
رشکِ عرفی و فخرِ طالب مُرد
اسداللہ خان غالب مُرد

غمِ استاد ہے اگر یہ ہی   یا خدا کیونکہ زندگی ہو گی
مبتلائے الم ہوں، کیا جانوں   عیش کیا شے ہے اور خوشی کیسی
دمبدم اپنے حال پر رونا   اور رونے پہ گاہ گاہ ہنسی
میں ہوں اور رنج بےکسی افسوس   وہ بھی دن تھے کہ خوش گزرتی تھی
ایک دن دہر میں مری فریاد   ہائے ہو جائے گی کہانی سی
آسماں گر پڑے تو گرنے دو   سر پہ ایک بوجھ اپنے یہ بھی سہی
شق اگر ہو زمیں تو ہو جائے   میں ہوں پیوند کاش جیتے جی
کیجئے نالہ اور مر رہیئے   زندگی کی ہے کائنات یہی
کیا کہوں کون مر گیا سالک   آپ کہتے ہیں طالب و عرفی
رشکِ عرفی و فخرِ طالب مُرد
اسداللہ خان غالب مُرد

یہ عجیب بات ہے کہ دوسرے شعراء کے مقابلے میں شاگردانِ غالب نے اپنے استاد کی غزلوں پر بہت کم غزلیں کہی ہیں۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ چند معروف و غیر معروف شعراء نے غالب کے رنگ میں شعر موزوں کرنے کی مشق کی لیکن شاگردانِ غالب میں سے ایک بھی ایسا نہیں ملتا جس کی یہ کوشش رہی ہو کہ وہ اپنے استاد کا طرز اختیار کرے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ خود شاگردانِ غالب کو غالب کا رنگِ شاعری پسند نہ تھا، لیکن چونکہ دُور دُور تک اُن کی شہرت تھی اور ساتھ ہی اُن کے بہرۂ علم اور سخن سنجی و سخن دانی کا سکہ بیٹھا ہوا تھا، اس لئے لوگ اُن کی دوستی یا شاگردی کو اپنے لئے باعثِ افتخار سمجھتے تھے اور پھر غالب کا طرزِ اصلاح بھی کچھ ایسا تھا کہ ان کی ندرتِ بیان، بلندیٔ فکر اور "غیب سے آنے والے مضامین" شاگردوں کے افکار سے ہم آہنگ ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ اس موقع پر یوں کہنا مناسب ہوگا کہ سب کے سب غالب کے رسمی طور پر شاگرد تھے۔ زیادہ تر اُن میں ایسے تھے جنھیں دوست یا عقیدت مند احباب کہا جا سکتا ہے۔

مختصر یہ کہ سالک نے بھی چند غزلیں استاد کی غزلوں پر کہی ہیں لیکن ایک شعر میں بھی غالب کی خصوصیت نہیں پائی جاتی۔ لیکن چونکہ بہر حال غالب کے ایک مشہور شاگرد کا کلام ہے اور غالب کی زمینوں میں ہے اس لئے کچھ غزلوں کے منتخب اشعار پیش کئے جاتے ہیں:

نالہ جو دل سے نکلا اثر افشاں نکلا   کرۂ نار مرے سینے میں پنہاں نکلا
میں نکلتا تری محفل سے اکیلا اے کاش   غم یہ ہے ساتھ مرے غیر کا ارماں نکلا
جذبۂ دل کا اثر دیکھ کے کھائے سو تیر   پر کوئی توڑ کے سینے سے نہ پیکاں نکلا

دل خلشِ دوست ہے اور جذب ہے حاصل کس کو
پاؤں سے یاں نہ کوئی خارِ مغیلاں نکلا
پیچ میں اس بُتِ عیّار کی آیا افسوس
سالکِ غمزدہ سیدھا سا مسلماں نکلا

کچھ ہو پر اس کو جانبِ دیوار دیکھنا
اک بار منع کیجے تو سو بار دیکھنا
ہمسایہ میں وہ آئے ہیں یاں لگ گئی ہے آگ
کچھ روشنی سی ہے سرِ دیوار دیکھنا

کیجے کیا، ناتوانی مانعِ پرواز ہے
ورنہ دروازہ قفس کا رہ گیا اکثر کھلا

لہو کا رنگ مری چشمِ تر میں خاک نہیں
کہ دل میں حال نہیں اور جگر میں خاک نہیں
تمہارے جی میں ہے، باقی غبار کچھ اب بھی
دمِ آج عاشقِ شوریدہ سر میں خاک نہیں

گیا ناپسند مجرد ہوئی آسماں نہیں
لیکن، زمینیوں پہ خدا مہرباں نہیں
بُو آ رہی ہے آمدِ فصلِ بہار کی
رنجِ خزاں نتیجۂ فصلِ خزاں نہیں
تنکے جلے ہوئے نہیں اے برق کس جگہ
باندھا چمن میں ہم نے کہاں آشیاں نہیں
سالک خموش بیٹھ رہے پڑھ کے چند شعر
پورا ہوا فسانۂ غم کا بیاں نہیں

بنایا دوست اک مدّت میں ہم نے دل سے دشمن کو
کہوڑیں لاکھوں جھکا کر راہ پر لے آئے رہزن کو
ابھی ہم کو ملا دے خاک میں اے چرخِ کیں پرور
ابھی اس شہسوارِ ناز نے چھیڑا ہے توسن کو
جنوں سے کم نہیں یہ بخیہ سازی چارہ گر میری
رفو تارِ گریباں سے کیا ہے چاکِ دامن کو

آپ کی چال قیامت ہی سہی
داد خواہی مری عادت ہی سہی
مے کدہ کی نہیں ملتی گر راہ
آؤ مسجد کی زیارت ہی سہی
کوئی تو بات ہنسی کی نکلے
خندۂ صبحِ قیامت ہی سہی
وصل اس بُت کا نہیں گر سالک
آج کی رات عبادت ہی سہی

یوں حال اس گلی کا سنانا نہ تھا مجھے
آخر یہ حیلہ چھوڑ گیا رہنما مجھے
انصاف کا گماں ہے شبِ وصل کی امید
ہے شکوۂ درازیٔ روزِ جزا مجھے
گرداب کا ہے کشتیٔ عمرِ رواں کو خوف
گھیرے ہوئے ہے بحرِ محیطِ فنا مجھے

کیا رشک ہو کہ دیکھنے کی کس کو تاب ہے
عارض پہ تیرے فرطِ تجلّی نقاب ہے
دیدارِ حسنِ یار ہے دامانِ چشمِ تر
کاشانہ سوزِ شبنمِ گُل آفتاب ہے
یاں ہو گئی ہے بند زباں رعبِ حسن سے
وہ جانتے ہیں بات مری لاجواب ہے
لو خون ہو کے اور زیادہ ہوا عزیز
آنکھوں میں مسکنِ دلِ خانہ خراب ہے
چُن چُن کے میں نے لکھے ہیں اوصافِ حسنِ یار
ہر شعر اس غزل میں مرا انتخاب ہے
اس قلزمِ گناہ میں سالک ہوں آشنا
ساحل پہ جس کے زورقِ جامِ شراب ہے

اس نالہ و زاری سے یہ آیا مرے آگے
آتش مرے سر پہ ہے تو دریا مرے آگے
بہلاتے ہیں دن رات تماشا یہ ترے بن کر
کرتے ہیں مہ و مہر تماشا مرے آگے
روتے ہی بن آئی مجھے بازار میں ناچار
قاصد نے کیا ذکر کچھ ایسا مرے آگے
ناصح کی بھی سنتا نہیں اے عشق ملامت
احباب تو سب بن چکے دانا مرے آگے
کس شہر میں ہو حضرتِ سالک کا ٹھکانا
کل جھاڑتے تھے گوشۂ صحرا مرے آگے

کھائیے ہر زخم پہ سو زخم یاں یہ دل میں ہے
واں نزاکت تیغ کے بدلے کفِ قاتل میں ہے

حسنِ حیرت خیز نے بے ہوش سب کو کر دیا
آج خلوت میں ہے گویا جو تری محفل میں ہے

غلط کی راہ گھر سے ڈھونڈنے کو جب کہ ہم نکلے
چلے تھے اس گلی کو جانبِ ملکِ عدم نکلے
جو ہم سے رندِ مفلس کو کبھی قسمت سے مل جائے
تو پینے کے لئے دو روز ہی میں جامِ جم نکلے
دلِ آشفتہ گر یادِ بتاں میں خون ہو جائے
تو ہر قطرے سے آوازِ انا بیت الصنم نکلے
شکایت کس زباں سے ہو سکے اس زلفِ پیچاں کی
بڑے اپنے مقدر ہی میں لاکھوں پیچ و خم نکلے
کہو الزام دیں کیا کہہ کے ان کو ہم نے دیکھا کیا
اُدھر دشمن نے محفل میں قدم رکھا کہ ہم نکلے

سوزشِ محبت سے جسم و جاں نے کیا پایا   آگ میں جلا دیکھا خاک میں ملا پایا

غالب نے چکنی ڈلی کی تعریف میں جو قطعہ کہا تھا وہ اس قدر مقبول ہوا کہ ان کے بعض معاصرین نے اس کی تقلید میں قطعات لکھ کر دادِ سخن دی ہے۔ سالک نے یہ جدت کی ہے کہ 'فلفلِ سُرخ' کے عنوان پر طبع آزمائی کی ہے۔ بحر و ردیف وہی غالب کی چکنی ڈلی والی ہے لیکن قافیہ غالب سے الگ ہے۔ اگرچہ سالک کی یہ کوئی مستحسن کوشش نہیں کہی جا سکتی تاہم اس قطعہ میں جو نادر تشبیہیں استعمال کی گئی ہیں وہ یقیناً دلچسپی کا باعث ہو سکتی ہیں۔ یہ قطعہ ضیافتِ طبع ناظرین کے لئے یہاں پیش کیا جاتا ہے ؎

قطعہ بفرمائشِ دوستے بہ تعریفِ فلفلِ سُرخ
فلفلِ سُرخ بھی ہے خوانِ زمیں پر اک چیز
اس کی تعریف میں جو کچھ کہ ہے شایاں کہیئے
لبِ پاں خوردۂ معشوق سے نسبت دیجیے
سرِ انگشتِ حنا بستۂ خوباں کہیئے
بے تکلف قدِ گلرنگ لباساں لکھیئے
مدِ شنجرفی و یاقوتِ رقم خاں کہیئے
سبز رنگی میں سزاوار ہے جو کہیئے فرض
سبز فولاد کا نو ساختہ پیکاں کہیئے
سُرخ رنگی میں نہ کہیئے کہ اسے کیا لکھیئے
خنجرِ تر شدۂ خونِ شہیداں کہیئے
سببِ سُرخیٔ منقار بسیاں گر کیجیے
تو اسے لقمۂ طوطیٔ سخنداں کہیئے
دیکھ لیجیے جو لٹکتے ہوئے اُلٹا اس کو
سبزۂ حلقۂ گوششِ چمنستاں کہیئے
سرنگوں شاخ میں ہے شکلِ حیا مندوں کے
ہاتھ آ جائے تو اک شوخِ ستم راں کہیئے
دامنہ رکھتے ہیں بہت اس پہ حریفانِ جہاں
اس کو ہم لذتِ بوسِ لبِ جاناں کہیئے
دیکھیے گر ہاتھ پہ دو چار اُٹھا کر سالک
ہاتھ کو رشکِ دو پنجۂ مرجاں کہیئے

دیوانِ سالک کے آخری صفحات میں اساتذۂ فارسی و اردو کی غزلوں پر مخمس بھی ملتے ہیں۔ ان میں غالب کی بھی دو غزلوں پر تضمینیں لکھی گئی ہیں۔ چند بند آپ بھی سن لیجیے۔

میں کون ہوں جو یہ کہوں مجھ سے نباہ ہو   ہو جس پہ لطف اس پہ کرم کی نگاہ ہو
بیٹھے اسی سے آپ کا جو نیک خواہ ہو   تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ سے بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

دل ہی نہیں بچا تو پھر اب کیا جگر کی قید   چھوٹے ہیں آشنا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
سب سے ہوا جدا تو پھر اب کیا جگہ کی قید   جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

تقریرِ زاہدوں کی سمجھتے ہیں کب درست   ہر اک جہان کہنے لگا سن کے جب درست
اس اجتہاد پر نہ یقیں کیوں ہو اب درست   سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

عرقاب سطحِ خاک اگر ہو تو ڈر نہیں   گر جائے آسماں بھی تو اتنا خطر نہیں
حاجب کسی کی دید میں سالک اگر نہیں   غالبؔ بھی گر نہ ہو تو کچھ ایسا ضرر نہیں
دنیا ہو یارب اور مرا بادشاہ ہو

طالع نہ مہر ہے نہ اذاں زیبِ گوش ہے   نے طائروں کو زمزمہ سنجی کا ہوش ہے
آغازِ صبح کا ہے نہ پیدا خروش ہے   ظلمت کدے میں اپنے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

سنتا ہے کون کس سے کہوں جا کے اپنا حال   کٹتے ہیں رنج و غم میں شب و روز و ماہ و سال
کہیے تو کس طرح سے نہ ہو زندگی محال   نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال
مدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے

اک عمر تک نگاہ بدو نیک پر نہ کی   گویا تھی ایک چادرِ غفلت پڑی ہوئی
آخر کو ہوش آئے تو آیا نظر یہی   ساقی بہ جلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

رکھتا تھا دل کشی کا اثر گوشۂ بساط   تھا غیرتِ بہار مگر گوشۂ بساط
سمجھے ہوئے تھے باغِ نظر گوشۂ بساط   یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے

یکسو صلائے بادہ و یکسو نوائے چنگ   وہ جلوہ ہائے دلکش و وہ نغمہائے چنگ
دل میں ہوس شراب کی سر میں ہوائے چنگ   لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

نے دورِ جام ہے نہ وہ ساقی نہ وہ خوشی   افسردہ اہلِ بزم ہیں بیزار زندگی
اب کس سے پوچھیے کہ ہوئی کیا یہ بیکسی   داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

تضمین اس غزل کی ہمارے مقال میں   گویا کہ آبِ خضر ہے جامِ سفال میں
سالک کہے پھنسا نہ ہو گر اپنے حال میں   آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

سالک نے جن لوگوں کی شان میں قصائد لکھے ہیں اور جن اشخاص کی کسی تقریبِ مسرت یا انتقال پر تاریخی قطعات لکھے ہیں ان میں بعض ایسے بھی ہیں جو غالب کے مربی، شاگرد، دوست یا قریبی عزیز تھے۔ ان میں چند ایسے بھی ہوں گے جن سے غالب کے راست تعلقات نہ تھے، لیکن مکاتیبِ غالب میں کسی نہ کسی عنوان سے ان کا ذکر ملتا ہے۔

ا۔ قصائد و قطعاتِ تہنیت

۱۔ ثنائے نواب کلب علی خان بہادر والیٔ رام پور
۲۔ قصیدہ و سہرہ بتقریبِ شادی راجہ شیودان سنگھ والیٔ الور۔
۳۔ قصیدہ محمد تفضل حسین خاں کوکبؔ
۴۔ مسند نشینی والیٔ الور
۵۔ کدخدائی میرزا احمد سعید خاں خلف نواب ضیاء الدین احمد خان بہادر
۶۔ تولد فرزند میاں داد خاں سیاحؔ

ب۔ قطعات جو دیگر مواقع پر کہے گئے

۱۔ طبع بوستانِ خیال ترجمہ اردو از خواجہ بدر الدین
۲۔ یافتن خطاب نواب غلام بابا خان بلقب خانی و بہادری
۳۔ طبع دیوان نواب مرزا خان داغؔ موسوم بہ گلزارِ داغ
۴۔ طبع شرح و سانیز مصنفہ مولوی نجف علی ساکن جھجر

ج۔ وفات کے تاریخی قطعات

۱۔ محمد نصیر الدین معروف بہ کالے صاحب
۲۔ میرزا زین العابدین خاں عارفؔ
۳۔ یوسف میرزا
۴۔ نواب امین الدین احمد خان بہادر رئیس لوہارو
۵۔ مفتی صدر الدین آزردہؔ
۶۔ میرزا شہاب الدین احمد خان بہادر ثاقبؔ
۷۔ محمد تفضل حسین خان کوکبؔ
۸۔ مرزا یوسف علی خان عزیزؔ
۹۔ میرزا باقر علی خان کاملؔ خلف زین العابدین خان عارفؔ
۱۰۔ میرزا شمشاد علی بیگ رضوانؔ برادر سالکؔ
۱۱۔ خواجہ بدر الدین خاں عرف خواجہ امان مترجم بوستانِ خیال
۱۲۔ مولوی غلام امام شہیدؔ

چاہیئے یہ تھا کہ ان قطعات میں سے چند اہم قطعات کا انتخاب دے دیا جاتا، لیکن چونکہ مضمون طویل ہو گیا ہے اس لئے ان قطعات کی فہرست ہی پر اکتفا کیا گیا۔

ڈال ڈال کے پات

قطعاتِ تاریخ ——— کسریٰ منہاس

بر وفاتِ اعتبار الملک حکیم الشعراء لسان الدہر حکیم ضمیر حسن خاں دلؔ شاہجہانپوری جانشین امیر مینائی

اے وائے حکیم ضمیر حسن خان دلؔ

۱۹۵۹ء

چھبیسویں ماہِ دسمبر، روزِ ہفتہ، دوپہر
جب چل دیئے اس دارِ فانی سے سوئے ملکِ جناں
کسریٰ لکھو تم ان کی رحلت کا یہ سال عیسوی
آہ اعتبار الملک دلؔ تھے شاعر نازک بیاں

۱۹۵۹ء

ولہ

آہ کسریٰ! شمعِ مینائی بجھی
دل نہ کیوں ہو ان کے غم میں مضمحل
شاعرانِ خلد کی محفل میں ہیں
نور افروز اعتبار الملک دلؔ

۱۳۷۹ھ

کتبہ برائے سنگِ مزار

مرقدِ اعتبار الملک دلؔ جانشین امیر مینائی رح

۱۹۵۹ء

(نیرنگِ خیال)

اسد ملتانی ——— ماہر القادری

جناب اسد ملتانی مرحوم سے میری ملاقات سب سے پہلے دلّی میں ہوئی تھی اسے بھی سولہ سترہ سال ہونے کو آئے۔ ان کے لب و لہجہ اور وضع قطع سے میں شروع شروع میں یہ سمجھا کہ ان کی سنجیدگی تشنگی لئے ہوئے ہے۔ مگر جب اُن سے بار بار ملنا ہُوا تو مجھ پر میرے اندیشہ کی یہ غلطی کُھلی۔ وہ سنجیدہ ضرور تھے مگر خشک اور بے لچک نہ تھے۔

اسد صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے کے مواقع تو کراچی میں میسّر آئے بعض دفعہ ان کے یہاں کئی کئی گھنٹہ کی صحبتیں اور علمی مذاکرے رہے ہیں، مگر طبیعت نے گرانی محسوس نہیں کی۔ بس ان کی محفل سے کبھی ملول، مکدّر اور دل برداشتہ ہوکر نہیں اُٹھا۔ جاتے وقت ایسا لگا جیسے تشنگی اس بزم میں کشاں کشاں لے آئے گی اور یہ جانا دوبارہ آنے کی تمہید ہے!

اسد ملتانی کا مطالعہ غیر معمولی تھا۔ کتابیں ان کا اوڑھنا بچھونا تھیں۔ ملتان ان کا وطن اور مولد و منشا تھا، مگر اردو زبان پر اتنی قدرت تھی کہ دلّی اور لکھنؤ کے زبان دانوں سے وہ آنکھیں ملا کر اور سر افتخار بلند کر کے زبان و محاورہ اور مصطلحات و روزمرہ پر گفتگو کر سکتے تھے۔ اردو اور انگریزی کا کس قدر پاکیزہ خط تھا۔ اردو تحریریں کتنی شُستہ اور دل کش و سادہ ہوتی تھیں۔ دفتری ملازمت کے بجائے اگر کوئی علمی ادارہ ان کو سونپ دیا جاتا تو اسد ملتانی کی قابلیت کے جوہر وہاں کُھلتے

اسد ملتانی بڑے نستعلیق آدمی تھے، شریف، وضعدار، مہذب اور مؤدب! انھوں نے بڑے معرکہ کی طویل مزاحیہ نظمیں کہی ہیں، مگر گفتگو بڑی سنجیدہ اور باوقار کرتے، بازاری مذاق کی انھیں ہوا بھی نہ لگی تھی۔ ہلکی اور

گھٹیا بات ان کے منہ سے نکلتی ہی نہ تھی ۔صوم وصلوٰۃ کے پابند، دینداری ان کے مزاج وطبیعت میں رچی ہوئی تھی ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کے فدائی اور شیدائی، صوفیا کرام کے عقیدت مند مگر شرک و بدعت سے کوسوں دُور اور انتہائی بےتابی سے پاکستان کو کتاب و سنت کی بنیاد پر صحیح اسلامی حکومت دیکھنے کے تمنائی! سابق جماعت اسلامی جن دنوں اسلامی دستور سازی کے لئے جدوجہد کر رہی تھی اس مسئلہ پر ان سے گفتگو ہوتی تو بڑی خوشی کا اظہار کرتے!

ماہنامہ "طلوعِ اسلام" میں اسد ملتانی کی برسوں نظمیں چھپتی رہی ہیں اس لئے اوروں کا کیا ذکر کیجئے خود میں اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ اسد صاحب منکرینِ حدیث کے ہم نوا معلوم ہوتے ہیں مگر ان سے ملنے کے بعد یہ غلط فہمی دُور ہوئی کہ وہ تو "انکارِ حدیث" کو دین کا سب سے بڑا فتنہ سمجھتے ہیں اور سنت رسولؐ کے دین میں حجت ہونے کا محکم عقیدہ رکھتے ہیں ۔مسٹر پرویز کے وہ بہت مخالف تھے اور شکوہ کرتے تھے کہ یہ شخص علامہ اقبال کو اپنے مسلک کی تائید میں غلط طور پر پیش کرتا ہے ۔

اسد ملتانی نے عاشقانہ غزلیں بھی لکھی ہیں ۔ جو شخص غزل کا ایسا مطلع کہہ سکتا ہو ؎

رہیں نہ رند یہ زاہد کے بس کی بات نہیں تمام شہر ہے دو چار دس کی بات نہیں

اس کے کمالِ غزل گوئی سے کون انکار کر سکتا ہے! مگر انھوں نے اس انداز پر غزلیں کہنا بہت دنوں سے چھوڑ دیا تھا۔ ان کی شاعری دین، اخلاق کی ترجمان اور اسلام کے مقدس پیغام کی حامل بن کر رہ گئی تھی ۔مقصدیت ہی مقصدیت، مگر تمام شاعرانہ خوبیوں کے ساتھ ۔ فرماتے ہیں :

کی فرنگی نے ترقی جو مسلماں بن کر
یہ فرنگی کی ترقی ہے مسلماں کی نہیں

وہ ایک مصلح اور صاحب پیغام شاعر تھے ان کی شاعری میں زبان کی سادگی وسلاست، بندش کی چستی اور صفائی کے ساتھ گہرا خلوص اور فکر کی بلندی پائی جاتی ہے ۔علامہ اقبال سے وہ شدید متاثر تھے مگر ان کی شاعری میں خود اپنا رنگ بھی نمایاں طور پر جھلکتا ہے، اسد ملتانی کے اٹھ جانے سے اخلاق و شرافت اور شعر و ادب کو اتنا بڑا نقصان پہنچا ہے کہ اس کی تلافی کے لئے ایک ایک شاعر پر نگاہ جاتی ہے اور لوٹ آتی ہے ۔ اللہ تعالیٰ اسد ملتانی کی قبر کو حجلۂ عروسی بنا دے کہ وہ "عروس" کی طرح قیامت تک چین کی نیند سوتے رہیں اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رحمت اور رسول اللہ کی شفاعت سے حصۂ وافر پائیں ۔ (بیرنگِ خیال)

نئی کتابیں اور رسالے

میری غزلیں

مصنف علی جواد زیدی ۔ ضخامت ۱۱۲ صفحات، تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶

کاغذ، کتابت، طباعت اوسط، کتاب جلد اور جلد پوش کی حامل ہے ۔

ناشر۔ ڈاکٹر علی سجاد زیدی، ڈاک خانہ کرہان ضلع اعظم گڑھ، یو، پی

قیمت ۸/ع

علی جواد زیدی اردو نثر و نظم کے دو گھوڑوں پر سوار ہیں ۔ عام طور پر دو گھوڑوں کی سواری خطرناک ثابت ہوتی ہے لیکن زیدی بڑے چابک دست اور پُرکار ہیں اور ان کا یہ کمال ہے کہ نثر و نظم دونوں پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ یوں تو 'نظمیں' آپ کا موضوع محبوب رہا ہے لیکن 'غزلیں' بھی کچھ کم منظورِ نظر نہیں ۔ سب سے بڑی بات ان کی غزلوں میں یہ ہے کہ ان کی جہد و عمل کی زندگی کی پرچھائیاں ان میں ملتی ہیں ۔ کلاسیکی انداز چھوڑا نہیں لیکن ہمہ جدّت نظر آتے ہیں ۔ طرزِ فکر پُرانی نہیں سوچنے کا دھارا تیز بھی ہے اور گہرا بھی۔ خوش فکر اور باعمل انسان جو آزادیٔ ملک کی خاطر قید و بند کی مصیبتیں بھی سہ چکا ہو بورژوا نہیں ہو سکتا ۔ ان کی پر دلتاریت ملاحظہ فرمایئے

میکدے بھر پہ مراحق ہے مگر پیرِ مغاں   اک کسی چیز پہ رندوں کا اجارا بھی تو ہو

ہم اہلِ دل نے میارِ محبت بھی بدل ڈالے

جو غم ہر فرد کا غم ہے اسی کو غم سمجھتے ہیں

خراجِ فطرت سے لے چکی ہے نگاہ شوخ عوام اکثر

ہم ایسے مستوں کی لغزشوں سے بدل گئے ہیں نظام اکثر

ان غزلوں میں بہت سے اشعار ملتے ہیں جو جہدِ عمل کا سبق دیتے ہیں

سیاسی اشاریت بھی جا بجا نظر آتی ہے لیکن بڑی صحت مند اور حوصلہ پرور ۔ لطف یہ ہے کہ تغزّل بہ ہر صورت قائم ہے ۔

اب نہ وہ شورشِ رفتار نہ وہ جوشِ جنوں   ہم کہاں پھنس گئے یارانِ سبک گام کے ساتھ

اس میں ساقی کا بھی درپردہ اشارہ تو نہیں   آج کچھ رند بھی تھے واعظِ بدنام کے ساتھ

کس سے کہتا دل کی باتیں کس سے سنتا ان کا راز

بزم میں تو سب نظر آتے تھے بیگانے مجھے

منزلِ دل کہاں ملی ختمِ سفر کے بعد بھی   رہگذر ایک اور تھی راہگذر کے بعد بھی

رندوں سے بازپُرس کی پیرِ مغاں سے دل لگی

آج یہ محتسب نے بھی پی ہے کہیں شراب کیا

شہبازوں سے ہم کترا کے چلے زنجیر و قفس سے بچ نکلے

لیکن یہ نکتہ بھول گئے دانے ہی سے ملحق دام بھی ہے

آ ہی جائے گی سیہ خانوں میں بھی کوئی کرن

روشنی اب تو در و بام تک آ پہنچی ہے

صحیح تغزّل ان کے یہاں صحت مندی کے ساتھ ملتا ہے ۔ چند منتخب شعر ملاحظہ فرمایئے

یہ قشقۂ خلوص ہے زخمِ جبیں نہیں   ہر چند ہم بھی کوچۂ قاتل سے آئے ہیں

جس درد کو سمجھتے تھے ہم ان کا فیضِ خاص   اس درد کے بھی لاکھ خریدار ہو گئے

جن حوصلوں سے میرا جنوں مطمئن نہ تھا   وہ حوصلے زمانے کے معیار ہو گئے

وہ کیسے کم نگاہ تھے جو ظلمتوں سے ڈر گئے   ہمیں تو روشنی ملی جہاں گئے جدھر گئے

شاخ سے ٹوٹ کر سکوں نہ ملا   خشک پتی ہوا میں تھرّائی

ہمیں سر بہ سر تو جو کبھی بے سبب کشیدہ — انھیں خوب جانتا ہے مرا عشقِ خوش عقیدہ

وفائے یارِ جفا سے بھی جاں گسل نکلی
نہیں ہے عشقِ ستم دوست کو فراغ ہنوز

ہجومِ غم میں تبسم کا کھیل دیکھ لیا — میں کہہ رہا تھا مرے غم کا اعتبار نہ کر

اب نہ چھیڑو کہ جی بھر آتا ہے — دل گیا دل لگی کی بات گئی
میں ہوں اب اور اک خلائے وجود — تم گئے ساتھ کائنات گئی
قصہ گو سوئے فراق اب سو جا — صبح ہونے کو آئی رات گئی

یہ مجموعۂ نظم شائستہ غزل کا ایک اچھا نمونہ ہے اور اس دور میں جب کہ سستی غزل پروان چڑھ رہی ہے اور مشاعرے اس بدذوقی میں اضافہ کر رہے ہیں، اس مختصر مجموعے کا شائع ہونا بھی مغتنمات میں سے ہے۔

باغ و بہار

تالیف کیا ہوا میر امن دلی والے کا۔ مقدمہ و فرہنگ از ممتاز حسین صدر شعبۂ اردو اسلامیہ کالج کراچی۔ ناشر اردو ٹرسٹ کراچی۔ کاغذ، طباعت (ٹائپ)، جلد، جلد پوش عمدہ، تقطیع ۱۸×۲۲، ضخامت تقریباً تین سو صفحے قیمت چھ روپے آٹھ آنے۔ مقدمہ مندرجہ ذیل ابواب پر مشتمل ہے۔

تالیف نسخہ سے متعلق، داستانوں کی بابت، باغ و بہار کا ماخذ، میر امن کے حالاتِ زندگی، میر امن کے ترجمے کی نوعیت اور اہمیت، قصۂ چہار درویش کا تنقیدی مطالعہ، زبان و بیان، باغ و بہار میں دلی کی معاشرت کی جھلکیاں۔

اس کے بعد جان گلکرسٹ کے مقدمے کے ساتھ اصل کتاب، اس کے بعد فرہنگ، اختتامیہ اور غلط نامہ۔

باغ و بہار کا یہ ایڈیشن یونی ورسٹیوں کے طلبا کے لئے بہت مفید ہے۔ فاضل مؤلف ممتاز حسین صاحب نے مقدمہ بڑی محنت سے لکھا ہے۔ اس میں ان کی ادبی بصیرت بھی شامل ہے۔

رسالے ۔ **آندھرا پردیش** ۔ حکومت آندھرا پردیش کا یہ رسالہ ایک مدت سے جاری ہے، لیکن اب اس کی حیثیت ایک ادبی رسالے کی بھی بن گئی ہے۔ ریاستی معلومات کے علاوہ معیاری منظومات اور مضامین اس میں درج ہوتے ہیں۔ رسالے کو بڑے سلیقے سے مرتب کیا جاتا ہے۔ حکومت آندھرا پردیش اردو کی اس سرپرستی کے لئے قابلِ مبارکباد ہے۔ رسالہ مصور ہے۔ کاغذ کتابت عمدہ۔ چندہ سالانہ ۲ روپے ۱۶ نئے پیسے۔



Edited and Published by the Director, Publications Division, Old Secretariat, Delhi-8
and Printed by the Model Press Private Ltd., Delhi.

Regd. No. D-509.

اردو کا مقبول عوام مصور ماہنامہ

آج کل

دہلی

جلد ۱۸ ۔ نمبر ۱۰

ویشاکھ شک سمت ۱۸۸۲

مئی ۱۹۶۰ء

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومت ہند

ترتیب

سرورق :۔ اندرانی رحمان اوڈیسی رقص کے انداز میں
رسالے کی پشت پر :۔ دارجلنگ سے کنچن جنگا کا نظارہ

سالانہ چندہ :۔ ہندوستان میں :۔ چھ روپے
پاکستان میں ۔ چھ روپے (پاک)
غیر ممالک سے :۔ نو شلنگ یا سوا ڈالر
فی پرچہ :۔ ہندوستان میں ۔ ۵۰ نئے پیسے
پاکستان میں ۔ آٹھ آنے (پاک)

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر "آج کل" اردو، اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۸

مُلاحظات

جنوبی افریقہ میں حکومت کے ہاتھوں وہاں کے اصل باشندوں کا قتلِ عام ایک انتہائی المناک حادثہ ہے جس نے بقول وزیراعظم نہرو دنیا اور خاص کر ایشیا اور افریقہ کے لوگوں کے دل ہلا دئے۔ جنوبی افریقہ کی حکومت نسلی امتیاز کی جس پالیسی پر چل رہی ہے حالیہ واقعات اسی کا نتیجہ ہیں۔ ان واقعات پر دنیا بھر میں غم و غصہ کا اظہار کیا گیا اور اس بربریت کی ہر طرف سے مذمّت ہوئی۔ یہ بات اقوامِ متحدہ تک پہونچی، سلامتی کونسل کا اجلاس طلب کیا گیا اور افریشیائی ملکوں کی یہ تجویز منظور کرلی گئی جس میں جنوبی افریقہ کی حکومت سے کہا گیا ہے کہ وہ نسلی امتیاز پر مبنی اپنی پالیسیوں کو ترک کر دے۔ اقوامِ متحدہ کے سیکریٹری جنرل کو ہدایت دی گئی ہے کہ وہ جنوبی افریقہ کی حکومت سے بات چیت کرکے اس سے اقوامِ متحدہ کے چارٹر کے اصولوں کی تعمیل کرانے کا انتظام کریں۔ دنیا میں ان واقعات کا جو شدید ردِّعمل ہوا ہے بلاشبہ انجام کار افریقہ کے حکمرانوں کو اس کے سامنے جھکنا پڑے گا۔

حال ہی میں متحدہ عرب جمہوریہ کے صدر جمال عبدالناصر ہندوستان کے دورے پر تشریف لائے۔ ہندوستانی عوام نے جس جوش و خروش کے ساتھ ان کا استقبال کیا وہ ہند اور متحدہ عرب جمہوریہ کی دوستی کا مظہر تھا۔ متحدہ عرب جمہوریہ اور ہندستان ملکی اور غیر ملکی معاملات میں جس راہ پر گامزن ہیں اس میں بڑی یکسانیت پائی جاتی ہے دونوں ملک دنیا کی امن و سلامتی کے خواہاں ہیں اور غیر جانبداری کی پالیسی پر مضبوطی سے کاربند۔ صدر ناصر نے جو تقریریں کیں ان میں دونوں ملکوں کے مشترکہ مفاد، باہمی تعاون اور نقطۂ نظر کے اتفاق کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں۔ انھوں نے غیر جانبداری اپنے عقیدے کا اعادہ کیا اور کہا کہ فوجی معاہدوں کی پالیسی ناکام ثابت ہوچکی ہے اور خود بڑی طاقتیں بھی اس بات کو محسوس کرتی جا رہی ہیں۔ یقیناً اس کا سہرا ہندوستان اور متحدہ عرب جمہوریہ کے سر ہے۔

۱۹-۲۰ مارچ کو نئی دلی میں قومی ترقیاتی کونسل کے اجلاس میں تیسرے پنجسالہ پلان کا خاکہ منظور کرلیا گیا، جس کے مطابق تیسرے پلان پر ۹۹۵۰ کروڑ روپیہ کے کل خرچ کا اندازہ رکھا گیا ہے اس میں سے ۵۹۵۰ کروڑ روپیہ سرکاری حلقے میں اور ۴۰۰۰ کروڑ روپیہ نجی حلقے میں خرچ کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ ۱۰۵۰ کروڑ روپیہ دوسرے پلان میں شروع کئے گئے کاموں کو پورا کرنے میں لگایا جائے گا اس طرح سرکاری حلقے میں ۷۰۰۰ کروڑ روپیہ خرچ ہوگا۔ پلان کے لئے ۱۱۵۰ کروڑ روپے کا سرمایہ ریاستیں مہیا کریں گی اور ۵۸۵۰ کروڑ روپیہ مرکز۔ ریاستوں کے منصوبوں کے لئے ۳۶۵۰ کروڑ روپیہ کی پونجی رکھی گئی ہے۔

کشمیر کے وزیراعظم جناب بخشی غلام محمد نے حیدرآباد میں ادارۂ ادبیاتِ اردو کی نئی عمارت "ایوانِ اردو" کا افتتاح فرمایا۔ یہ ادارہ گذشتہ تیس برس سے اردو کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ بخشی صاحب نے ادارے کو پانچ ہزار نادر مسودات اور پچیس ہزار قیمتی کتابوں کی فراہمی پر مبارک باد دی۔ آپ نے فرمایا کہ اردو سارے ہندوستان کی زبان ہے اور اردو کے مستقبل کے بارے میں مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ اردو ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ ثقافت کی نشانی ہے اور دونوں نے صدیوں مل کر اسے دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے مدِمقابل لا کھڑا کیا ہے۔ اردو ہندوستان کی قومی زبان تسلیم کی جاچکی ہے اس لئے ہم سب کو اسے سیکھنا چاہیئے۔ جب ہم ایک غیر ملکی زبان انگریزی کو برقرار رکھ سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک قومی زبان اردو کو اس کا جائز مقام نہ دیا جائے۔

سید لطیف حسین ادیب

رتن ناتھ سرشار کی تصانیف

(تعارف اور تبصرہ)

رتن ناتھ سرشار کو دُنیا فسانۂ آزاد کے مُصنّف کی حیثیت سے جانتی ہے۔ بہت کم تعداد ایسے اشخاص کی ہے جو اس امر سے واقف ہیں کہ سرشار چھوٹی بڑی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ سولہ کتابوں کے مُصنّف ہیں۔ سرشار کو سب سے زیادہ شہرت فسانۂ آزاد سے ملی۔ اس کے بعد جامِ سرشار، سیرِ کہسار اور کامنی بھی ان کی شہرت کا باعث ہوئے۔ ان ناولوں کے علاوہ ان کی کتابیں ناولچوں اور تراجم کی شکل میں ہیں۔ ناولچوں کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یہ چھوٹی ہوئی پھلجھڑیاں ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ ناولچے کتنے ہی ناپختہ سہی لیکن ان میں بھی سرشار کی عظمت کے اشارے پوشیدہ ہیں۔ انھیں چھوٹی ہوئی پھلجھڑیاں کہہ کر سہل انگاری سے نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ دور سرشار کی عظمت کے باقاعدہ اقرار کا دور ہے۔ تاہم میں محسوس کرتا ہوں کہ ان کے ناولوں سے عام رغبت اور واقفیت کم ہو جائے گی۔ مختصر افسانے اور کم فرصتی کے اس عہد میں سرشار کے ناول بطور تفنّنِ طبع بھی نہیں پڑھے جا سکتے ہیں۔ درحقیقت سرشار کے ناولوں سے رغبت کی کمی بہت دن پہلے سے ہے۔ اس کا ثبوت ان کے ناولوں کی اشاعت سے ملتا ہے۔ اس میں شک نہیں فسانۂ آزاد سات بار چھپی مگر ۱۹۳۴ء کے بعد کا کوئی اڈیشن بازار میں نہیں ملتا۔ جامِ سرشار تین بار اور اس کا آخری اڈیشن ۱۹۱۴ء کا ہے۔ سیرِ کہسار چار بار چھپی اور آخری اڈیشن ۱۹۳۴ء کا ہے۔ ممکن ہے جامِ سرشار، سیرِ کہسار، اور فسانۂ آزاد کے ایک دو اڈیشن اور بازار میں آجائیں۔ مگر شاید عوام سے زیادہ اہلِ علم کی ضرورتوں کے پیشِ نظر ایسا ہو، متذکرہ بالا تین ناولوں کے علاوہ ان کی باقی کتابیں (باستثناء الف لیلہ و ترجمہ خدائی فوجدار) مطبع نولکشور کی سرپرستی سے محروم رہیں اور الف لیلہ و خدائی فوجدار سمیت ان کو وہ مقبولیت میسّر نہیں ہوئی جو ان تین ناولوں کو ہوئی ہے۔ نتیجہ واضح ہے۔ سرشار کے کم مقبول ناول آسانی سے فراہم نہیں ہوتے اور شاید آنے والے پچیس تیس سال میں یہ بچے کھچے ناول جو بعض کتب خانوں میں محفوظ ہیں ختم ہو جائیں گے اور اس طرح سرشار کی عظمت کے چند اشارے مٹ جائیں گے۔ چناں چہ اس مضمون میں ہم نے سرشار کی ہر کتاب سے واقفیت کا اظہار اس انداز سے کیا ہے کہ ان کی کم یاب کتابیں خصوصیت سے متعارف ہو جائیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ سرشار پر مزید تحقیق کرنے والوں کے لئے یہ مضمون مفید و کار آمد ہوگا۔

شمس الضحیٰ — تاریخِ اشاعت ۱۸۷۸ء — مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ۔

سرشار کو ترجمہ کرنے میں خاص مہارت حاصل تھی۔ حکومتِ ممالکِ متحدہ آگرہ و اودھ کے شعبۂ تعلیم نے ان کے تراجم کو بہ نظرِ استحسان دیکھا تھا۔ یہ کتاب انگریزی کی کسی کتاب کا ترجمہ ہے جس میں ابر و ہوا اور برف و بخارات کی ماہیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ہماری کوشش کے باوجود یہ کتاب کسی کُتب خانے میں نہیں مل سکی۔ مطبع نولکشور میں اس کا اصل متن بھی نہیں ہے۔ ۱۹۰۴ء میں سرشار پر مضمون قلمبند کرتے وقت چکبست نے اس کتاب کا تعارف ان الفاظ میں پیش کیا ہے "۱۸۷۸ء میں ایک علمِ طبیعی کی کتاب کا اردو میں انگریزی سے ترجمہ کیا۔ اس میں ابر و ہوا و برف وغیرہ کی ماہیت کا حال درج ہے۔ چوں کہ اس کے ہر صفحے میں تحقیقاتِ علمی کا نور سمایا ہوا تھا لہٰذا نام شمس الضحیٰ رکھا۔ ایسے ادق مضامین کا بیان جس کا نقشہ اُتارنے کے لئے اردو میں پورے الفاظ بھی موجود نہیں نہایت عام فہم اور سلیس عبارت میں لکھا ہے۔" (مضامین چکبست ص ۳۵) چوں کہ ۱۸۷۸ء سے پہلے سرشار کی کسی

اور کتاب کا پتہ نہیں چلتا ہے اس لئے قرین قیاس یہ ہے کہ شمس الضحیٰ ان کی پہلی نثری کتاب ہے۔

فسانۂ آزاد (چار جلد) ۔ تاریخ اشاعت ۱۸۸۰ء مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ۔
اودھ اخبار میں ایک کالم لکھنؤ کی مقامی خبروں کے لئے مخصوص تھا۔ بعد کو اسی کالم میں ہی فسانۂ آزاد چھپا ہے۔ فسانۂ آزاد کی طوالت اور بے ترتیب پلاٹ کا باعث یہ کالم ہیں۔ ان کالموں کو ہی بے سلیقگی سے مرتب کر کے بعنوان فسانۂ آزاد کتابی شکل دی گئی ہے۔ خود یہ کالم بھی لاپروائی سے لکھے گئے تھے۔ لیکن اس کتاب کو جو شہرت ملی اور عوام کے دلوں کو جیسا مسخر کیا ہے کہ باید و شاید۔ بیس بائیس سال کے عرصے میں ایسی ضخیم کتاب کے پانچ ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گئے۔ اس کا باعث فسانۂ آزاد کی زبان اور لکھنؤ کی مقامی زندگی کے چلتے جاگتے نقشے ہیں۔ فسانۂ آزاد لکھنؤ کی معاشرت کی بھرپور تاریخ ہے۔ اس کے علاوہ خوجی فسانۂ آزاد کا ایک لافانی کردار ہے جس نے بیسویں صدی کے مزاحیہ کرداروں پر اثر ڈالا ہے۔ خوجی اس وقت ایک تاریخی شخصیت سے محسوس نہیں ہوتا کہ وہ افسانے کا ایک کردار ہے۔

مطبع نولکشور سے اب تک فسانۂ آزاد سات بار چھپ چکی ہے سرسوتی پریس بنارس نے دیوناگری لپی میں تقریباً ساڑھے پانچ سو صفحات میں اس کا اختصار ۱۹۴۷ء میں چھاپا ہے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی نے اس کتاب سے اقتباسات جمع کر کے بعنوان خوجی ایک کتاب ۱۹۵۴ء میں راجہ رام کمار پریس لکھنؤ (وارث نولکشور پریس) سے شائع کرائی ہے۔

جام سرشار ۔ تاریخ اشاعت ۱۸۸۷ء ۔ مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ۔
ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے تاریخ ادب اردو میں پنڈت رتن ناتھ سرشار کی کتابوں کی فہرست پیش کرتے وقت ایک کتاب کا نام فسانۂ جدید بھی لکھا ہے۔ ہمارے خیال میں ڈاکٹر صاحب سے سہو ہوا۔ فسانۂ جدید سرشار کی کوئی مستقل اور مطبوعہ تصنیف نہیں ہے۔ سرشار نے اس عنوان سے اودھ اخبار میں ایک نیا ناول لکھنا شروع کیا تھا جو بعد کو جام سرشار کے نام سے شائع ہوا۔ پنڈت مادھو پرشاد صاحب ڈپٹی کلکٹر و اکسٹرا اسسٹنٹ ممالک مغربی و شمالی اودھ نے اس ناول پر تقریظ لکھی ہے۔ اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ منشی نولکشور نے مادھو پرشاد صاحب سے فسانۂ جدید پر نظر ثانی کر کے مرتب کرنے کی درخواست کی تھی تاکہ وہ کتابی شکل میں مطبع سے شائع ہو سکے چنانچہ مادھو پرشاد صاحب نے سرشار کے تعاون سے فسانۂ جدید کو بعنوان جام سرشار ایک ناول کی شکل میں بعد نظر ثانی مرتب کر کے شائع کرایا ہے

سرشار نے یہ ناول مذمت شراب میں تحریر کیا تھا۔ تمہید میں وہ ناول کا مقصد ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں ۔" الغرض شراب خواری کی مضرتیں اہل خرد پر مخفی نہیں رہ سکتیں۔ کوئی فرد و بشر ایسا نہیں جو کثرت بادہ گساری کو پسند کرتا ہو یا اس کی توصیف میں دلائل عقلی پیش کر سکتا ہو۔ دوا کے طریق پر پینا اور اعتدال کا ہمیشہ خیال رکھنا عمدہ بات ہے۔ اس تمہید کے بعد ہم اپنے ناظرین کو مضار شراب خوری کے ثبوت میں ایک داستان عبرت توامان سناتے ہیں اور بادہ گساری کی بے شمار خرابیوں کو قصے کے پیرائے میں مو بمو بتاتے ہیں۔" جہاں تک نفس قصہ کا تعلق ہے اس میں مے گساری اور بادہ خواری کی حیثیت ضمنی ہے۔ نواب امین الدین حیدر جو اس ناول کے ہیرو ہیں۔ ان کی محل سرا میں شراب کی محفلیں جمتی ہیں جن کا ذکر سرشار نے تفصیل سے کیا ہے۔ تقریباً ہر قسم کی شراب اور اس کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں ساتھ ہی ساتھ ان کے استعمال کے اوقات اور خوراک بتائی گئی ہے۔ بحیثیت مجموعی قصے کے بننے اور بگڑنے میں شراب کی کارفرمائی معلوم نہیں ہوتی۔ نواب امین الدین حیدر کی تباہی کا سبب ان کی تعیش پسندی ہے۔ وہ ظہورن کی وجہ سے ڈوبے اور ان کے دوست سیٹھ گوجر مل مس للی کے چکر میں تباہ ہوئے۔ قصے کے ارتقاء اور انجام میں شراب کا ہاتھ نہیں ہے۔ تاہم سرشار کی تصانیف میں یہ واحد ناول ہے جس کو تکنیک کے اعتبار سے ناول کہا جا سکتا ہے۔ یہ مختصر اور مربوط ہے۔ اس میں پلاٹ کا شعور ملتا ہے۔ قصہ دلچسپ اور نتیجہ خیز ہے۔ دنیا جہان کے افراد کی نہ نمائش ہے اور نہ بے فروٹ باتوں کا بے تکلفانہ ذکر۔ اس ناول میں نوابین کی گھناؤنی عیاشیوں کا بیان ہے جو جاگیردارانہ نظام کی ایک خصوصیت تھی۔ اس میں ان کی خلقی کمزوریاں بیان کی گئی ہیں اور ان کے بدقماش درباریوں کی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے لکھنؤ کے اس جاگیردارانہ عہد میں بدکردار عورتیں سماج میں کیا حیثیت رکھتی تھیں۔ چوک نے لکھنؤ کی تہذیبی قدروں کس حد تک متعفن کی تھیں۔ سرمایہ داروں کی دولت کس طرح نذر عیاشی ہو رہی تھی، جام سرشار ان کا ایک مختصر جواب ہے۔ علاوہ ازیں فسانے کا دردناک انجام یعنی گوجر مل کی دیوالی ظہورن کا قتل امین الدین حیدر کی خودکشی یہ سب اسی مقصد کے ماتحت اور مصنف کی اسی منشاء کے ماتحت عمل میں آیا کہ دنیا میں گندگی کے پھلنے پھولنے کا موقع زیادہ نہیں ہے۔

جامِ سرشار کی زبان صاف اور منجھی ہوئی ہے مگر اس میں وہ خوش تبسّمی نہیں ہے۔ جو فسانۂ آزاد اور سیرِ کہسار کے لئے وجہ امتیاز ہے۔ مزید براں اس ناول میں کوئی مزاحیہ کردار نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عوام جو سرشار کے مزاح کے دلدادہ تھے اس ناول کا خیر مقدم اس گرمجوشی سے نہیں کر سکے جس کا اظہار انھوں نے فسانۂ آزاد کی اشاعت پر کیا تھا یا بعد کو سیرِ کہسار پر ہوا۔ ہمارے خیال میں اس ناول کا سب سے بڑا اکتساب ظہورن کی سیرت ہے جس کی توانائی اور جاذبیت آج بھی متاثر کئے بغیر نہیں رہتی۔

سیرِ کہسار (دو جلد) — "تاریخِ اشاعت ۱۸۹۰ء — مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ۔ سیرِ کہسار کی تاریخِ اشاعت کے متعلق سب کتابیں خاموش ہیں اور خود اس ناول کے بعد کے اڈیشن بھی۔ رضا لائبریری رام پور میں سیرِ کہسار کا پہلا اڈیشن موجود ہے۔ جس پر تاریخِ طباعت جولائی ۱۸۹۰ء ملتی ہے۔ اس طرح اس امر میں شبہ نہیں رہتا کہ سیرِ کہسار ۱۸۹۰ء کی تصنیف نہیں ہے۔

سیرِ کہسار کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ اس کی تعمیر فسانۂ آزاد کے بچے ہوئے روڑے سے ہوئی ہے۔ ہمارے خیال میں یہ بات صداقت پر مبنی ہے فسانۂ آزاد کی طرح یہ ناول بھی لکھنؤ کی سماجی زندگی کا من و عن آئینہ دار ہے لکھنؤ کی رسوم لکھنؤ کے توہم اور لکھنؤ کے اَن گنت افراد پیشہ کی زندگی کا مکمل خاکہ ہے چوں کہ اس حیثیت سے فسانۂ آزاد پہلی بھرپور تصنیف تھی اس لئے سیرِ کہسار کا پلان نقش و نگار اور طریقۂ زیبائش فسانۂ آزاد سے ہی مستعار معلوم ہوتے ہیں۔ فسانۂ آزاد کے مقابلے میں سیرِ کہسار دو جلدوں میں طبع ہوئی ہے جس کی وجہ سے وہ مقابلتاً جاذبِ توجہ ہے۔ بایں ہمہ فسانۂ آزاد میں سماج کے نیچے طبقے کے افراد اور بیواؤں اور کسبیوں کے ذکر کے باوجود کسی بیوا، کسی کسبی یا کسی نیچے طبقے کے فرد کا کردار مکمل نہیں ملتا ہے۔ سیرِ کہسار میں قمرن کی سیرت ایک کامیاب سیرت ہے جو بیوا ہوتے ہوئے بیوائیت سے ناواقف رہی۔ جس کا بچپن اور جس کی کم ظرفیاں اس پر ہمیشہ حاوی رہیں اور پایان کار وہ اپنی کمزوریوں کا شکار ہو کر قبل از وقت دُنیا سے رُخصت ہو گئی۔ قمرن کی سیرت کا مطالعہ کرنے کے بعد سرشار کی ادبی صلاحیت اور غیر معمولی وسعتِ نظر و مشاہدہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی ناول میں دوسری سیرت منشی مہاراج بلی کی ہے۔ خوجی کے سامنے منشی جی کا چراغ نہ جل سکا اور خوجی کی مقبولیت نے منشی جی کو اُبھرنے نہیں دیا۔ ورنہ جہاں تک فنی پختگی کا تعلق ہے منشی مہاراج بلی کی سیرت خوجی سے زیادہ مستحکم ہے

منشی جی کے مزاج میں بھی گہرائی اور دیرپائیت ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ سیرِ کہسار کی تخلیق ہی قمرن اور منشی مہاراج بلی کے لئے ہوئی تھی۔ سیرِ کہسار نامربوط اور فسانۂ آزاد کی چھاپا سہی لیکن قمرن اور منشی مہاراج بلی کی سیرتیں سرشار کے اکتسابِ فن و ادب میں باوقار اضافہ ہیں۔

سیرِ کہسار کے اب تک چار اڈیشن طبع ہو چکے ہیں آخری اڈیشن ۱۹۳۴ء کا ہے۔ بسنت کمار ٹھاکر نے سرسوتی پریس بنارس سے ۱۹۵۳ء میں سیرِ کہسار کو ناگری رسم الخط میں ایک مختصر کتابی شکل میں چھپوایا ہے جو دلچسپی کا حامل ہے۔

کامنی — "تاریخِ اشاعت ۱۸۹۴ء — باہتمام ڈاکٹر سی سی گھوش جوبلی پرنٹنگ ورکس لکھنؤ میں طبع ہوئی۔

سرشار کا یہ ناول مطبع نولکشور سے نہیں چھپا ہے۔ اس زمانے میں سرشار اودھ اخبار کی ادارت سے سبکدوش ہو چکے تھے اور مالی طور پر پریشان تھے کامنی لکھنے سے پہلے انھوں نے الٰہ آباد ہائی کورٹ میں کچھ دن مترجم کی حیثیت سے بھی ملازمت کی تھی۔ اس زمانے میں انھوں نے ڈاکٹر سی سی گھوش جوبلی پرنٹنگ ورکس لکھنؤ سے ایک معاہدہ کر لیا تھا اور اس کے ماتحت نہ صرف کامنی بلکہ پانچ ناولچے بھی لکھے جن کے نام علی الترتیب یہ ہیں۔ کڑم دھم، بچھڑی ہوئی دلہن، پی کہاں، ہشّو، طوفانِ بے تمیزی۔ یہ ناولچے "خمکدۂ سرشار" نام کی میگزین میں چھپے ہیں۔ ہمارے جن معاصرین نے خمکدۂ سرشار کو سرشار کی تصنیف بتایا ہے۔ ان سے سہو ہوا ہے۔ علاوہ ازیں ہم نے جو ترتیب ناولچوں کی پیش کی ہے وہی صحیح ہے۔ سب سے پہلے کڑم دھرم چھپا ہے اور سب سے بعد میں طوفانِ بے تمیزی، ہماری نظر سے اس زمانے کے دو اشتہار گذرے ہیں جن سے ہماری تحقیق کا ثبوت ملتا ہے۔ پہلا اشتہار کامنی کے ساتھ چھپا تھا اور اس کا اقتباس یہ ہے۔ "ماہ ستمبر میں ہر پندرھویں روز یعنی مہینے میں دو بار سو صفحوں کا ایک ناول تصنیف رتن ناتھ صاحب سرشار لکھنوی شائع ہوتا ہے۔ جس کی اوّل جلد موسومہ کڑم دھم اور جلد دوم بچھڑی ہوئی دلہن اور تیسری پی کہاں نذر ہو چکی ہیں اور چوتھی پانچویں چھٹی زیرِ طبع ہیں......" دوسرا اشتہار بچھڑی ہوئی دلہن کے سلسلے میں شائع ہوا تھا۔ اس کا اقتباس یہ ہے "یہ خمکدۂ سرشار نام میگزین کے سلسلے کا دوسرا دور ہے۔ اس کا پلاٹ قابلِ دید ہے اور بچھڑی ہوئی دلہن کا حسن اور عفت دید ہے نہ شنید ہے۔ بالکل فرنچ اور انگریزی ناولوں کے ڈھنگ پر ہے۔ اسکے پڑھنے سے عیب بینوں تک کو ماننا پڑے گا کہ

"پیمبر ہے نثر کا سرشار"

یہ پانچوں ناولچے ۱۸۹۴ء میں شائع ہوئے ہیں۔

اب ہم کامنی کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ اس ناول میں ٹھاکروں کی معاشرت پیش کی گئی ہے۔ مگر یہ ٹھاکر بھی لکھنؤ کے ہیں اور ان کی معاشرت میں بھی لکھنوی رنگ شوخ اور تیز ہے۔ ٹھاکروں کی تلوار میں ریشم کی نرماہٹ اور بہادری کی دیرینہ روایت میں دل باختگی کے مجبور رسود سے بھی شامل ہیں۔ کامنی ایک باعصمت عورت کی کہانی ہے جس کا مایۂ حیات شوہر کی محبّت ہے۔ کامنی کی سیرت میں حسن آراء کے نقوش پیوست ہیں۔ حسن آراء کے انتظار اور کامنی کے انتظار شوہر میں بنیادی فرق نہیں ہے۔ اگر فرق ہے تو بس اتنا کہ کامنی آسودۂ شبنم ہے اور حسن آراء ناشگفتہ غنچہ۔ اس میں شک نہیں کہ کامنی کے کردار میں مثالیت پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی قاری پر اس کے کردار کی مضبوطی کا اثر بہت گہرا پڑتا ہے۔ قاری اس کی شوہر پرستی سے متاثر ہو کر اپنے خیالات میں رفعت محسوس کرتا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ اچھا اثر اس ناول کی کامیابی کا ثبوت ہے۔

ناول کامنی کم یاب ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے دوبارہ چھپنے کی اُمید نہیں ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں چند اقتباس نقل کر دئے جائیں:۔

بچّے کی پیدائش کے وقت ٹھاکروں کی رسموں کا ذکر کرتے ہیں:۔

"اے مولی صاحب ان کے گھر کی ساری خدائی سے نرالی ریت ہے۔ نہ انگیٹھی ہے نہ کالا دانا، ایک تلوار رکھی ہے وہ بھی ننگی اور ایک ڈھال جو دیو کے اٹھائے بھی نہ اُٹھے اور ایک جوڑی پنیچے کی۔ پیدا ہوتے ساتھ ہی تلوار چھوائی گئی۔

"اتنے میں اندر سے مہری آئی اور گھر کا پیغام لائی کہ بندوقیں دغوایئے۔ رسالہ دار بمبر ایک مسکرائے کہ اتنی توپیں دنادن دغ چکیں، ابھی تک ان کو بندوق کے سر ہونے کی خواہش ہے۔ رسالہ دار بمبر دو نے اکیس ضرب کی سلامی اُتاری۔ دائیں، دائیں، دائیں۔ پھر پیغام آیا کہ بچّے کے عین سرہانے پر بھی بندوق داغی جائے اور بل زور سنگھ نے اپنے لڑکے اندر بکرم سنگھ کو بھیجا۔ اس نے بھائی کے سرہانے گیارہ دفعہ بندوق داغی جب کہیں جا کے عورتوں کو تسلّی ہوئی۔" (کامنی۔ ص ۵)

ایک موقع پر سرشار ناگ پنچمی کے میلے کا ذکر کرتے ہیں:۔

"دھنّو ٹھکرائن بھاری کامدانی کی گلابی چادر اوڑھ کر سہیلیوں سہیلیوں ماؤں مہری اور بارن کو لے کر سورج کنڈ گڑیاں پڑھانے چلیں۔ سینک کی نئی رنگین ڈلیا ماؤں کے ہاتھ میں تھی اس میں کپڑے کی گڑیا بنی ہوئی تھی، چھوٹا سا کمخواب کا لہنگا، گلنار کا دوپٹہ اس میں لچکا اور لیس ٹکی ہوئی، ڈلیا میں گیہوں اور چنا اور جو گڑیا لڑکوں نے پیٹی۔ ماؤں نے اس کو چنا اور گیہوں دیا۔ سورج کنڈ کی مٹی لی اور سہیلیوں نے آپس میں پان اور گوٹا تقسیم کیا اور جھولا جھولیں اور تین تین چار چار خوش گو طرّار طرحدار کمسنوں نے مل مل کر اپنے اپنے جھولوں سے میٹھی تانیں لگانی شروع کیں پیا بن ہوئی برہا کی پیر، رہی میں ترس نہ آئے تیر۔ لگا اساڑھ جب سے آئی، گھٹا چھائی کالی کالی، پیا پردیس عمر بالی، محل میں پڑی سیج خالی، گرج گھمنڈ برسن لاگیں، گھٹا گھمنڈ چھاوے واکو رسہن چکور کو کلا مور مچاوت شور، جھمک جھڑ لگا دامن۔ ساون سکھی جھولیں، جھولا کر میں تیج تہوار، دمک رہی وا سن سی کامن سولہ سنگار بدن پہ پہنچے کسمی چیر۔ رہی میں ترس نہ آئے تیر۔ سکھی بھادوں چشم نمکیں۔ لگی دم گھڑی گھڑی جھڑکی۔ خطا کیا ہم نے ہمدم کی۔ محبّت ہم سے کیوں کم کی اتر ساوے آوے نہیں کر سوتن سے پریت، بھادوں رُخصت گیا پیا بن جلے بہاں کی ریت۔ غم گیا کلیجہ ریت رہی میں ترس نہ آئے تیر....." (کامنی ص ۸)

ایک موقع پر ایک برہمن کی گفتگو پیش کی ہے:۔

"آج تو ٹھاکر گجراج سنگھ کی بگری ہیں۔ تو جھنیا لنگی ہے۔ سمپورن چندرمان ایک تو مہالکشمی سہائے ہے اور پرمیشر کا دیا سب کچھ ہے۔ وہ دو ڈبل دیتے ہیں۔ اور اپنے لڑکوں کی برس گانٹھ کے دن برہمنوں کو کھلاتے اور دکشنا دیتے ہیں اور برسن میں دو ئی بریا برہم بھوج ہوتا ہے۔ منگوار کو بندروں کو گڑ دھانی بھیجتے ہیں اور کنیاؤں کو مہینے میں ایک دن کھیر اور پوری بھجیا کھلاتے ہیں اور کئی کنیادان کروائے۔ گرمی میں پوسالے

بٹھا دیتے ہیں۔ بیلوں کو گھی اور گڑ کھلاتے ہیں۔ ایک تھرشالہ ہے اور گھر بھر میں میل اور لڑکیاں دونوں سورج اور چندرما ایک ابھی کنواری کنیا ہے۔ تمہارے گھر میں آئے تو اس کا بھاگ اور بھی کھل جائے اور سچ پوچھو تو یہ ہے سو جس کو بیاہ کے جائے اس کا بھی بھاگ کھل جائے اور اب بیاہ کے یوگ ہے۔ سیانی بھئی ہے اور جو ہے سو بات چیت تو یہاں سے رنبیر سنگھ کی گئی ہے " (کامنی ص۔ ۵۰۔ ۵۱)

ان اقتباسات سے سرشار کی قوتِ مشاہدہ اور ان کے کامیاب اظہارِ بیان پر قدرت کا اندازہ بھی ہو سکے گا۔ یہ سرشار کا ہی حصہ تھا اور وہ اس حیثیت سے آج بھی منفرد ہیں۔ لکھنؤ کی انیسویں صدی کی معاشرت ان سے بہتر کوئی اور ناولوں میں نہیں پیش کر سکا ہے۔

سرسوتی پریس بنارس نے کامنی کا بھی ایک مختصر ایڈیشن ناگری رسم الخط میں ۱۹۵۱ء میں شائع کیا ہے۔ اب ہم "خمکدۂ سرشار" کے سلسلے کے پانچوں ناولچوں کا جائزہ لیں گے۔

کڑم دھم:۔

اس وقت میرے پیشِ نظر کڑم دھم کا ۱۹۱۵ء کا اڈیشن ہے۔ جو مطبع سیٹھ کندن لال لکھنؤ میں چھپا تھا۔ تعداد صفحات اٹھاسی ہے۔ اس ناول میں باب کی جگہ "مرحلہ" لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً "مرحلہ ایک اور مرحلہ دو سب تیرہ "مرحلہ" ہیں۔ ہر مرحلہ کا ایک عنوان ہے۔ کڑم دھم اس ناول کا نام اس وجہ سے ہے کہ قصّے کی ابتداء ڈھنڈورے کی آواز سے ہوتی ہے۔ پلاٹ بالکل سادہ ہے۔ نوشابہ اور نواب بہادر کی محبّت کا قصّہ ہے جو لکھنؤ کے افراد ہیں۔ ناول کا ماحول اور فضا لکھنؤ کی معاشرت کا عکس ہیں۔ اس میں کوئی ندرت نہیں۔ فسانۂ آزاد کی ایک مبہم، سمٹی ہوئی، ناپائیدار پرچھائیں ہے۔ نہ کردار نویسی ہے اور نہ جذبات نگاری، طرزِ گفتگو لکھنؤ کے محاورات اور لب و لہجہ کا حامل ضرور ہے مگر اس میں مُصنّف کی شوخی اور خوش مزاجی کا رنگ نہیں ہے۔ البتہ اس ناول کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ابتذال سے پاک اور افراط سے مبرّا ہے۔

بچھڑی ہوئی دُلہن

خمکدۂ سرشار کے سلسلے کا یہ سب سے عمدہ ناول ہے۔ اس وقت کمیاب ہے۔ ٹیگور لائبریری لکھنؤ یونی ورسٹی میں اس کا خستہ اور بریدہ اڈیشن میری نظر سے گزرا ہے۔ تعداد صفحات چھیانوے ۹۶ ہے۔ اس ناول میں سرشار نے باب اور "مرحلہ" کے بجائے "سماں" استعمال کیا ہے۔ کل نو "سماں" ہیں۔ شروع کے تین سماں پر عنوان نہیں ہے۔ اس ناول کا پلاٹ دلچسپ مربوط اور اضطراری ہے۔ قاری اس خلش میں مبتلا رہتا ہے کہ دیکھئے اب کیا ہو۔ سرشار نے پلاٹ بنانے میں کاوش کی ہے اور وہ کامیاب ہو گئے ہیں اس ناولچے کے مطالعہ سے احساس ہوتا ہے کہ سرشار میں پلاٹ تعمیر کرنے کی صلاحیتیں ہر اچھے ناول نویس کی طرح موجود تھیں۔ ان کی یہ صلاحیت اودھ اخبار کے کالموں نے نہیں اُبھرنے دی ورنہ ان کے ناولوں میں پلاٹ کی بے ربطی نہیں ہوتی۔ منموہن اور بی بی جو اس ناول کے مرکزی کردار ہیں بچپن میں بیاہے جا چکے تھے، وداع نہ ہو سکی تھی۔ بخت و اتفاق کے ہاتھوں ایّامِ جوانی میں یہ ایک دوسرے کے قریب ہو جاتے ہیں۔ مگر پہچانتے نہیں دونوں کے دل ایک دوسرے کی طرف بے ساختہ کھنچتے ہیں۔ حیا و شرم بھی غالب ہے۔ بی بی اس وجہ سے بھی منموہن سے دُور رہنے کی کوشش کرتی ہے کہ وہ بچپن میں کسی کی ہو چکی ہے اور دوسرے مرد سے تعلّق پیدا کرنا پاپ ہے۔ ناول اسی قسم کی کشمکش میں تعمیر ہوتا ہے۔ سرشار کی خوبی یہ ہے کہ وہ اس کشمکش میں ہیجان و اضطرار کا ماحول پیدا کرتے رہتے ہیں اور قاری سانس روک روک کر ناول پڑھتا رہتا ہے۔

ناول میں جذبات نگاری کی خوبی ملتی ہے۔ برمحل اشعار عبارت کی خوبی کو دوبالا کر دیتے ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"چمن سارے داؤدیوں سے بھرے جوانانِ شبّو کے ہر جا پرے
زمیں نور کی آسماں نور کا جدھر دیکھو ادھر سماں نور کا

ہرے بھرے درخت ان پر ہرے ہرے طوطے لال لال چونچیں کہیں ڈھیر کہیں تیل کھنڈ اور باغ کی روشوں میں نہر کے پانی کی روانی باغ میں مور، بنگلے میں مور۔ ہر کمرے میں دو دو ایک مور۔ ان ہیلیوں کی جھنکار بڑا لُطف دکھاتی ہے۔ روح وجد میں آتی تھی۔ نہروں کے ذریعے سے جابجا فوّارے چھوٹتے تھے ایک حوضِ لطیف بھی باغ کے بیچوں بیچ میں تھا۔ لال لال مچھلیاں کئی سو کے قریب اس میں تھیں ان کو رام دانے کی لیّا دی جاتی تھی۔ گھر کے بچّے جب کھیلتے ہوئے

آتے تھے اور حوض میں لیا ڈالتے تھے مچھلیاں اس چاٹ سے پانی پر ابھر آتی تھیں ۔۔۔۔ اس باغ میں ہر قسم کے میوے تھے ۔ آم کئی قسم کے ، گو باغ بہت پرانا تھا مگر ملیح آباد ، خالص پور ، شاہ آباد بیٹی جہاں جہاں کے آم مشہور ہیں ان سب کا نمونہ یہاں موجود تھا ۔ شریفے ، امرود ، نارنگیاں ، نارنج ، کولے ، میٹھے نیبو ، کرنڈے فالسے ، لکوٹ ، چکوترے ، مہتابی سب میوے تھے ۔ گملے کثرت سے لگے ہوئے اور ایک مقام پر گملوں کا پہاڑ بنایا تھا جو عجیب لطف بہار دکھاتا تھا اور اس کا نام کوہستان گلزار رکھا تھا ۔ واجد علی شاہ فردوس آرام گاہ نے جو پہاڑ بنا کر اس میں سانپ پالے تھے اس کا نام جبل الشعبان رکھا تھا ۔ اس کے جوڑ پہ انھوں نے کوہستانِ گلزار اپنے پھولے ہوئے گملوں کے پہاڑ کا نام رکھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

(بچھڑی ہوئی دلہن ص ۱۶ - ۱۷)

پی کہاں

سب سے پہلے میں نے یہ ناول ناگری رسم الخط میں پڑھا تھا جو ۱۹۵۱ء میں سرسوتی پریس بنارس سے چھپا ہے ۔ اس کے بعد مطبع شمس المطابع بلوچپورہ لکھنؤ کا ۱۹۲۱ء کا اڈیشن میری نظر سے گزرا جس کی تعداد صفحات چھہتر ہے ۔ اس میں باب کی جگہ " ہوک " استعمال ہوا ہے ۔ کل نو ہوک ہیں اور کسی پر کوئی عنوان نہیں ہے ۔ ناول کے عنوان کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ہیرو اور ہیروئن شدتِ عشق میں " پی کہاں " پکارتے ہیں اور جس کی تکرار طبیعت پر بار گزرتی ہے ۔ سرشار نے پہلی بار اس ناولچے میں المیہ جذبات اور المیہ پلاٹ پیش کرنے کی کوشش کی ہے ۔ ہیرو اور ہیروئن دونوں کا انجام موت پر ہوتا ہے عبارت میں جذبات کی تپش ہے ۔ مگر سرشار کو المیے سے فطرتاً مناسبت نہیں تھی اور اس کا آئینہ دار خود یہ ناولچہ ہے ۔ اس کو زیادہ سے زیادہ سرشار کی ایک کوشش اور ایک اُپج کہا جا سکتا ہے ۔ اس میں مصنف کے داخلی احساس و تجربے کا رنگ شامل نہیں ہے ۔ اس ناول میں سرشار کی عبارت کہیں کہیں دعوتِ توجہ ضرور دیتی ہے ورنہ اس کے علاوہ ناول میں کوئی ایسی خوبی نہیں ہے جس کے پیشِ نظر ہم اس کی سراہنا کریں ۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمیں اس کو ادبی وقعت دیتے ہوئے ہچکچاہٹ ہوتی ہے ۔

ہُشّو

میرے پیشِ نظر ۱۹۱۵ء کا اڈیشن ہے جو مطبع سیٹھ کندن لال لکھنؤ میں چھپا ہے ۔ اس کتاب میں باب کی جگہ " دور " استعمال ہوا ہے ۔ کل نو دور ہیں اور تعداد صفحات چھہتر ہے ۔ ہر دور کا عنوان غیر سنجیدہ اور مبتذل ہے ۔ کہانی کا مرکزی تصور مذمتِ شراب نوشی ہے جس میں کہانی کے ہیرو لالہ جوتی پرشاد المتخلص ہشو ایم ۔ اے فیلو آف دی کلکتہ یونی ورسٹی ، ایک یادگار رئیس اور آنریری مجسٹریٹ کے بھپنے میں مبتلا ہیں ۔ وہ رکیک اور ذلیل حرکتیں کرتے ہیں حاکم شہر انھیں پاگل خانے بھجوا دیتا ہے ۔ پاگل خانے سے بچ نکلنے کے بعد وہ شراب سے توبہ کر لیتے ہیں اور مذمتِ شراب پر لکچر دیتے ہیں مشتہرین گھوش کمپنی نے اس کو ظرافت کا نمونہ اور ہنسی کا گول گپا " کہا ہے ۔ ہمارے خیال میں ہشو ظرافت سے خالی اور غیر ادبی روش کی حامل ہے ۔ لالہ جوتی پرشاد ایک بے وقوف مسخرے Clown کی طرح ہیں جس کی حرکات مبتذل اور معیارِ ادب و شرافت سے گری ہوئی ہیں ۔ قصے کی ابتداء ان الفاظ سے ہوتی ہے ۔

" مہوسے سے کچھ غرض ہے نہ حاجت ہے تاڑ کی
ساقی کو جھونک دوں گا میں بھٹی میں بھاڑ کی

ہات تیرے پینے والے کی دم میں پرانی بھٹی کا زنگ لگا ہوا بھبکا ۔ اوگیدی ہات تیرے شراب خور کی دم میں میاں آلو بخارا عطار کی قرنبیق ، اوگیدی ہات تیرے متوالے کی پگڑی کے دونوں سروں میں کٹھ پتلی کا ناریچ ۔ تاک دھنا دھن ہات تیرے کی ادرے گا ؟ ۔۔۔۔ " ناول کے واقعات اور عبارت اسی قسم کی ہے ۔ یہ ظرافت نہیں ہے ۔ ظرافت کی پہلی شرط ادبیت ہے ۔ جب ادبیت نہیں تو ظرافت بھی نہیں ۔

طوفان بے تمیزی

اس ناولچے کا ایک نسخہ رضا لائبریری رام پور میں میری نظر سے گزرا جو اتفاق سے ۱۸۹۴ء کا ہے ۔ تعداد صفحات ایک سو چونسٹھ ہے ۔ ٹائٹل شامِ اودھ پریس لکھنؤ میں چھپا ہے ۔ کتاب میں باب کی جگہ " لہرا " استعمال ہوا ہے ۔ کل گیارہ " لہرا " ہیں ۔ گیارھویں " لہرا " پر کوئی عنوان نہیں ہے جس کے ماتحت ایک پولس انسپکٹر اور ایک قیدی عورت کی گفتگو درج ہے جس کے بعض حصے فحش ہیں ۔ بحیثیت مجموعی کتاب غیر سنجیدہ انداز نگارش اور مقصد سے عاری ہے ۔ صرف ایک جگہ یعنی " میلے کی چہل پہل " کے بیان میں قاری دلچسپی کا اظہار کر سکتا ہے گو اس میں بھی ندرت نہیں ہے کیوں کہ سرشار کی دیگر کتابوں میں اس سے بہتر بیانات میلوں ٹھیلوں کے متعلق ملتے ہیں ۔ قصہ کا تعلق فرقہ والا

فساد سے ہے۔ کتاب اچانک ختم ہو جاتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سرشار کو طوفانِ بے تمیزی کی دوسری جلد بھی لکھنا تھی جس کا وہ تکملہ کیے بغیر حیدرآباد چلے گئے۔

گودڑ غریباں اور چنچل نار — ۱۸۹۹ء — (غیر مطبوعہ)

یہ دو ناول سرشار نے قیام حیدرآباد کے زمانے میں تحریر کیے تھے۔ گودڑ غریباں شاید مکمل ہو کر شائع نہیں ہوا، چنچل نار کے مکمل ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ ہماری معلومات کا ذریعہ صرف چکبست ہیں۔ جنھوں نے ان ناولوں کا ذکر کیا ہے وہ فرماتے ہیں۔

"حیدرآباد سے حضرت سرشار نے ایک رسالہ موسوم بہ "دبدبۂ آصفی" نکالا تھا۔ ابتدا میں اس میں اچھے اچھے مضامین شائع ہوتے رہتے۔ خود بھی اکثر لکھتے تھے۔ طرزِ تحریر میں اگلی سی آب و تاب نہیں رہی تھی۔ گودڑ غریباں ناول خدا جانے شائع ہوا کہ نہیں۔ دبدبۂ آصفی میں ایک ناول موسوم بہ چنچل نار سلسلہ وار شائع ہوتا تھا وہ بھی ناتمام رہا اور اچھا ہوا کہ ناتمام رہا۔"
(مضامین چکبست ص ۵۹)

الف لیلہ — ۱۹۰۱ء — مطبع نولکشور پریس لکھنؤ

سرشار کو ترجمہ کرنے میں خاص مہارت حاصل تھی۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز ہی مترجم کی حیثیت سے ہوا تھا۔ شمس الضحیٰ ان کا پہلا ترجمہ تھا اور الف لیلہ، خدائی فوجدار آخری، ایک مترجم کی حیثیت سے بھی وہ لکھنؤ کی فضا سے گریز نہیں کر پاتے۔ الف لیلہ اور خدائی فوجدار دونوں میں ہی لکھنؤ کی سماجی خصوصیات اور بول چال کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں۔ بایں ہمہ ترجمے میں اصل کی شان ملتی ہے۔ ان کی عبارت رواں دواں ہے۔ اس میں دل نشینی، لوچ اور لطافت ہے۔

مطبع نولکشور نے ۱۸۶۸ء میں بھی الف لیلہ کا ایک ترجمہ چھاپا تھا۔ سرشار کے اس ترجمے میں یہ خوبی ہے کہ جتنی بھی اس میں کہانیاں پیش کی گئی ہیں اتنی کسی دوسری الف لیلہ میں نہیں ہیں۔ سرشار کے پیشِ نظر الف لیلہ کا ۱۸۳۶ء کا بولاق اڈیشن اور اس کا انگریزی ترجمہ از لین (۱۸۳۹-۴۱ء) تھا۔ سرشار نے لین کی الف لیلہ کی تمام کہانیوں کا ترجمہ کیا ہے اور ساتھ ہی وہ کہانیاں بھی ترجمہ کر دی ہیں جو بولاق اڈیشن میں تو تھیں۔ لیکن لین نے چھوڑ دی تھیں۔ (بحوالہ ڈاکٹر گیان چند۔ شمالی ہند کی نثری داستانیں)

ہمارے خیال میں سرشار کو عربی زبان و ادب پر اس قدر مہارت حاصل نہیں تھی کہ وہ عربی الف لیلہ کو اردو کا جامہ پہناتے۔ انھوں نے ترجمہ لین کی الف لیلہ سے کیا اور بولاق اڈیشن کی کہانیوں کا ترجمہ مولوی اسمٰعیل صاحب کی مدد سے کیا۔ الف لیلہ کے اختتامیہ میں درج ہے "مولوی اسمٰعیل صاحب کا پروالہ قدیم مطبع کے اہتمام و تصحیح و ترتیب میں اس کتاب کی تیاری کا ایماء فرمایا" انھیں مولوی صاحب نے نولکشوری الف لیلہ کے دوسرے حصے کا ترجمہ کیا ہے جس کا اصل گالاں کی الف لیلہ ہے۔

اب سرشار کی الف لیلہ سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے اور یہ بھی غور کیجئے کہ عبارت میں ترجمے کی نہیں اصل کی شان ہے۔

"شمس النہار نے اس عروس زہرہ تمثال یوسف جمال کے سامنے ان عالی شان مہمانوں کو بٹھایا اور خوش گلو عورتوں کو گانے کا ارشاد فرمایا اور حسب الحکم لہرا لہرا کر گانے لگیں اور سامعین با تمکین کو وجد میں لانے لگیں ؎

افزوں کہیں ہے حسن میں شمس و قمر سے آپ
آئینہ لے کے دیکھئے میری نظر سے آپ

علی ابن بکار کو یہ نغمہ روح افزا بس خوش آیا۔ اور اسی قسم کے اشعار عشقیہ و حسرت بار گانے کو پھر حکم فرمایا اور ستار کو چھیڑ کر یوں گایا ؎

سر پہ کیوں بار محبت کا اٹھایا ہم نے   جان کو ہائے یہ کیا روگ لگایا ہم نے

اس طرح کئی عورتوں نے لحن خوش سے سامعین کو شاد کیا اور قابلیت علم موسیقی کا رنگ جما دیا اور علی کے دل پر اس قدر اثر ہوا کہ بے ساختہ رونے لگا۔ اس کا رونا دیکھ کر شمس النہار اور بھی مزا جان سے عاشق ہو گئی اور علیحدہ اشارے سے بلا کر گلے لگایا اور ایسی خوش ہوئی کہ فرطِ طرب سے غش آیا۔ اتنے میں کنیزان سلیقہ شعار دوڑی ہوئی آئیں اور دونوں کو اٹھایا اور لخلخہ و عطر اور کیوڑا سنگھایا۔ جب ہوش آیا تو ابوالحسن کو نہ پایا۔ شمس النہار نے پوچھا ابوالحسن کہاں چلے گئے۔ یہ سن کر ابوالحسن مسہری کے ادھر سے نکلا اور شمس النہار نے کہا خدا تم کو اس نیکی کا

بدلہ دے اور اجر عطا کرے۔ اس کے بعد علی سے کہا میرے دل کا عجب حال ہے۔ تیرے عشق نے سینے کو بجز بنایا ہے۔ بے طور شوق بڑھایا ہے۔ علی نے کہا جانِ من جو محبت میرے دل میں پیدا ہوئی ہے اس کا مٹنا میرے دل کی فنا پر موقوف ہے۔ یہ کہہ کر زار زار رونے لگا اور جوئے اشک کو رواں اور طفل سرشک دواں دیکھ کر وہ بھی ساتھ ساتھ گریہ وزاری اُمید حسرت و بے قراری کرنے لگی۔۔۔۔۔"

(رات ۲۲۷ ص ۴۳۹-۴۴۰)

خدائی فوجدار — ۱۹۰۳ء — مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ

یہ ناول سروانٹیس کے شہرہ آفاق ناول ڈان کیوزا Don Quixote کا اردو ترجمہ ہے۔ انگریزی میں اس ناول کے بہت سے اڈیشن مختلف اوقات میں چھپے ہیں اس لئے بیقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ سرشار کے پیشِ نظر کون سا اڈیشن تھا۔ خدائی فوجدار میں سرشار نے مقامی رنگ دینے کی کوشش کی ہے ڈان کیوزا کا نام خدائی فوجدار اور سینکو پنزا کا نام بدھو نفر رکھا ہے۔ مقامات کے تذکرے میں ہندوستانی مقاموں کے نام دیتے چلے گئے ہیں۔ عبارت میں لکھنؤ کا روزمرّہ اور محاورے ہیں۔ بیانات میں لکھنؤ کی فضا کا اثر ہے۔

خدائی فوجدار سے ایک منظر ملاحظہ کیجئے اور ترجمہ کا لطف بھی لیجئے۔

"اب خدائی فوجدار کی وحشت نے جو زور کیا تو پہاڑی پر سے اُتر کر عراقی پر سوار ہوئے اور مہمیز کے اشارے سے تیز کیا یہ جا وہ جا۔ بدھو نفر نے غل مچایا ارے صاحب یہ کیا جنوں ہے ارے یہ کیا خبط ہے۔ وہ گلہ بان مارتے مارتے ادھیڑ ڈالیں گے از برائے خدا واپس آیئے۔ وہاں نہ سپاہ ہے نہ لشکر، نہ گھوڑے ہنہناتے ہیں نہ باجا بجتا ہے۔ یہ سب آپ کا واہمہ ہے۔ کیوں بے چاری بے زبان بھیڑوں پر ستم ڈھاتے ہو۔ مگر یہ سنتے کس کی تھے۔ انھوں نے غل مچا کے کہا اے لشکریاں وافسراں فوجِ ظفر موج سپہ سالار جنگ تار دوار زنگی کو چک زنیہار شاہ ہفت اقلیم ہشت بر۔ تم سب جوق جوق فوج در فوج مثل موج در موج میری ہمراہ رکاب ظفر انتساب چلے آؤ، قدم بڑھاؤ۔ اے مرداں بکوشید بکوشید تا جامہ زناں نپوشید۔ میں آ تو اب آتش فشاں اژدر دہاں اور اسیاف خارا شگاف سے امیر طرہ شکن ادیچی تہار کے سپاہیوں اور فوجی افسروں کو دم کے دم میں ایسا نیچا دکھاؤں کہ تمام عالم میں نام ہو جائے۔ تم زبردست ہو مگر میں تمہارے بادشاہ سپہ سالار بختک تار دوار زنگی کوچک زنیہار کا ہاتھ بٹاؤں گا اور فتح پا کے واپس جاؤں گا۔ یہ اول جلول گفتگو حسب معمول کر کے آپ نے نیزہ ہلایا اور بھیڑوں کے گلے میں دھنس گئے اور بھیڑوں بے چاریوں کو کوچنے لگے۔ بائیں بائیں کی آواز بلند ہوئی، بھگدڑ گلے بھر میں پڑ گئی۔۔۔۔ ایک دفعہ ہی باآواز بلند کڑک کے فرمایا۔۔۔۔ لیے ٹھہر ٹھہر ٹھہر۔ بڑا مرد ہے تو بڑھ کر کے سامنے آ۔ او نابکار۔ میرا نام سُن کے روپوش ہو گیا۔ ادھر آ بھگوڑے ؎

آں نہ من باشم کہ روز جنگ بینی پشتِ من

آں منم کاندر میانِ خاک و خوں بینی سرے

غنیم کو پیٹھ دکھانا بہادروں کا کام نہیں۔ اگر سب سپاہ بھاگ کھڑی ہو تو خدائی فوجدار نام نہیں۔" (خدائی فوجدار ص ۱۱۳)

رتن ناتھ سرشار کی متذکرہ بالا کتابوں کے علاوہ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے رنگے سیار، مکاتیب ڈفرینہ اور رشا کو بھی سرشار کی فہرست کُتب میں شامل کیا ہے۔ رنگے سیار سرشار کی علیحدہ تصنیف نہیں ہے۔ بغدادی قاعدے کے سائز پر پندرہ صفحات پر مشتمل مینجر مطبع نولکشور نے فسانہ آزاد جلد اوّل کا قصّہ بعنوان رنگے سیار علیحدہ چھپوا دیا تھا جس کا مقصد فسانۂ آزاد کی پبلسٹی ہے۔ رنگے سیار کی طباعت ۱۹۰۶ء میں ہوئی اور اس کا ایک نسخہ نخاس لکھنؤ میں پُرانی کتابوں کے انبار میں مجھے دستیاب ہو گیا تھا اور وہ ہنوز میرے پاس محفوظ ہے۔ ڈاکٹر سکسینہ سے رنگے سیار کے معاملے میں بھی سہو ہوا ہے کیونکہ ہم کسی طرح اس کو ایک علیحدہ تصنیف نہیں مان سکتے۔ رنگے سیار میں درج ہے۔ "یہ قصّہ پنڈت رتن ناتھ سرشار کے فسانہ آزاد سے اخذ کیا گیا ہے۔ اس کے ملاحظے سے آپ پر روشن ہو گا کہ فسانہ آزاد کس پائے کی تصنیف ہے اور کیسی دلچسپ اور دلآویز ہے۔"

ڈاکٹر سکسینہ نے مکاتیب ڈفرینہ کو لارڈ ڈفرن کی کتاب Letters from High Latitude اور رشا کو ویلیس کی کتاب Russia کا ترجمہ بتایا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کے ذرائعِ معلومات کیا ہیں۔ ان کتابوں کے متعلق چکبست بھی خاموش

ہیں۔ حالاں کہ انھوں نے سرشار پر مضمون ۱۹۰۴ء میں تحریر کیا ہے اور بظاہر ان سے یہ کتابیں چاہے مطبوعہ ہوتیں یا غیر مطبوعہ پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھیں۔ سرشار کی دیگر کتب اور مطابع کے اشتہاروں میں ان دونوں کتابوں کا ذکر نہیں ہے۔ ایسی صورت میں دو ہی باتیں ممکن ہیں۔ اول یہ کتابیں ترجمہ ہوئی ہی نہیں اور ڈاکٹر سکسینہ نے سنی ہوئی روایت کو حقیقت سمجھ لیا۔ دوم یہ کتابیں ترجمہ ہوئیں مگر طبع نہ ہو سکیں۔ ہماری رائے میں بعد الذکر خیال قرین قیاس ہے کیوں کہ ہو سکتا ہے سرشار کے اہل خاندان میں سے کسی نے ڈاکٹر سکسینہ کو بتایا ہو کہ دو کتابوں کے مسودے پڑے ہوئے ہیں جن کی اشاعت نہیں ہوئی ہے اور ڈاکٹر موصوف نے بغیر حوالہ دئے ہوئے انھیں فہرست کتب میں شامل کر لیا ہو۔

اگر ہم چاہیں تو سرشار کی تصانیف کے تین دور قائم کر سکتے ہیں۔ دور اول ۱۸۷۸ء تا ۱۸۹۰ء۔ اس دور میں مطبع نولکشور سے شمس الضحیٰ (۱۸۷۸ء) فسانۂ آزاد (۱۸۸۰ء)۔ جام سرشار (۱۸۸۷ء) اور سیر کہسار (۱۸۹۰ء) چھپے ہیں۔ دوسرا دور ۱۸۹۰ء تا ۱۸۹۹ء۔ اس دور میں کامنی ۔ کڑم دھم ۔ بچھڑی ہوئی دلہن ۔ پی کہاں ہشو اور طوفان بے تمیزی (۱۸۹۴ء)۔ تیسرا دور ۱۸۹۹ء تا ۱۹۰۳ء۔ اس دور میں ۔ چنچل نار (۱۸۹۹ء) (نامکمل) گور غریباں (۱۸۹۹ء) (غیر مطبوعہ) الف لیلہ (۱۹۰۱ء) خدائی فوجدار (۱۹۰۳ء) چھپے ہیں۔ دور اول سرشار کے عروج کا زمانہ ہے۔ دوسرے دور میں وہ مالی مشکلات میں مبتلا ہیں اور ان کی مثال ایک تھکے ہوئے مسافر کی سی ہے۔ تیسرے دور میں وہ بجھتے ہوئے چراغ کی آخری بھڑک ہیں جس کا نتیجہ الف لیلہ اور خدائی فوجدار ہیں۔

تلوک چند محروم

غزل

دل جب سے تغافل نے ترے توڑ دیا ہے
ہم نے بھی وہ اندازِ فغاں چھوڑ دیا ہے

اے شیشہ گرو، یہ تو بتا دو کہ کسی نے
ٹوٹے ہوئے دل کو بھی کبھی جوڑ دیا ہے

نکلے تھے خرابات سے کرتے ہوئے توبہ
کیا جانیے پھر کس نے ادھر موڑ دیا ہے

ساقی نے بڑھایا تھا ادھر ہاتھ بہ مشکل
تقدیر نے ساغر کو کہاں توڑ دیا ہے

بھانڈا تری تقدیس کا اشعار نے تیرے
محروم، سرِ رہگذر پھوڑ دیا ہے

کیف احمد صدیقی

غزل

جب خرد منزلِ اظہار سے آگے نہ بڑھی
بے خودی بھی رسن و دار سے آگے نہ بڑھی

ہر سجدہ حرم و دیر پکارا ہی کئے
بندگی میری درِ یار سے آگے نہ بڑھی

خود ہی میں جلوہ گہہ ناز سے لوٹ آیا ہوں
جب نظر حسرتِ دیدار سے آگے نہ بڑھی

راہ تکتے ہی رہے جادۂ گل پوش مگر
زندگی وادیٔ پُرخار سے آگے نہ بڑھی

کیف ساحل پہ پہنچنا بہت آساں تھا مگر
میری کشتی کبھی منجدھار سے آگے نہ بڑھی

علی عباس حسینی

مرزا محمد ہادی رُسوا

مصنف امراؤ جان ادا جو اپنے کہانیوں والے تخلص رسوا کے نام سے مشہور ہیں محض افسانہ نگار، ناول نگار ہی نہ تھے بلکہ حقیقی معنوں میں حکیم اور علامہ تھے۔ ان کا پورا نام مع تخلص اور ڈگریوں کے مرزا محمد ہادی بی اے، پی ایچ ڈی، مرزا رسوا تھا۔ وہ لکھنؤ میں جنوری یا فروری ۱۸۵۸ء میں غدر سے کچھ ہی دنوں پہلے پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد آغا محمد تقی مازندرانی لکھنؤ کے رئیسوں میں سے تھے۔ وہ فارسی، ریاضی اور نجوم سے خاص ذوق رکھتے تھے۔ مرزا رسوا نے یہ علوم انھیں سے سیکھے۔ ابھی وہ پندرہ سولہ برس ہی کے تھے کہ ان کے بڑے بھائی محمد ذکی اور ان کے والد نے انتقال کیا۔ والدہ پہلے ہی انتقال کر چکی تھیں وہی صاحب املاک و جائداد تھیں اس لئے خالہ اور ماموں نے انھیں اپنی ولایت میں لے لیا اور ساری جائداد پر قبضہ کر کے اسے اڑا ڈالا۔ حیدر بخش عرف حسین بخش نے جو خوشنویسی میں ان کے استاد اور آغا محمد تقی مرحوم کے خاص دوستوں میں تھے رسوا کی سرپرستی کی اور وہ لکھنؤ کے بانکوں جیسی زندگی بسر کرنے لگے۔ بزرگوں نے نوجوانی کی غلط روی سے بچانے کے لئے فیض آباد کے ایک شریف گھرانے میں شادی کرا دی۔ اس نیک بیوی کی حوصلہ افزائی سے رسوا نے منشی اور میٹرک کے امتحانات پاس کئے اور ان کے انتقال سے متاثر ہو کر لکھنؤ چھوڑا اور رڑکی چلے گئے۔ وہاں کے انجینئرنگ کالج سے انھوں نے اوورسیری کا امتحان پاس کیا اور صوبہ سرحد میں ریلوے میں ملازمت کر لی۔ کوئٹہ لائن کا سروے مرزا رسوا ہی نے کیا ہے۔ ملازمت کے زمانہ میں کیمسٹری اور میکینک کا شوق ہوا، اس لئے نوکری چھوڑی اور لکھنؤ آ کر گھر کا اثاثہ بیچا اور انگلستان سے کیمسٹری کے قیمتی آلات منگوا کر کیمیا و سیمیا کے تجربے کرنے لگے۔ اس وقت تک عربی اچھی طرح نہ جانتے تھے اس زبان میں کیمسٹری میں کتابیں پڑھنے کے لئے عربی بھی پڑھ ڈالی اور عبرانی بھی سیکھ لی۔

کچھ دنوں کے بعد جب معاش میں تنگی محسوس ہوئی تو نخاس مشن اسکول میں مدرسی کر لی اور ایک لوہار کے لڑکے کا ٹیوشن کر لیا۔ دن میں معلمی کے فرائض ادا کرتے اور شب میں لوہار کے کارخانے سے فائدہ اُٹھاتے اور مختلف آلات اپنے ہاتھ سے بناتے اور ڈھالتے۔ ایک گریجویٹ دوست کے طعنہ دینے پر ایف اے اور بی اے کے امتحانات بھی پرائیویٹ طور پر پاس کر لئے۔ اب سینٹنل ہائی اسکول میں ملازمت کی اور 'اشراق' نامی پرچہ نکالا۔ اس میں افلاطون اور ارسطو کی تصنیفات کے ترجمے بھی چھاپتے تھے اور ان کے نظریات پر علمی بحثیں بھی کرتے تھے۔ جب ریڈ کرسچن کھلا تو اس میں عربی، فارسی، تاریخ اور فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔ انھیں ایام میں ایزابلا تھوبرن گرلس کالج نے بھی اپنے ہاں فارسی کی لکچراری پر مقرر کر لیا۔ دن کو کرسچن کالج میں پڑھانے، شام کا وقت گرلس کالج کی نذر ہوتا۔

اسی مشغولیت میں ایک فرنگی کے عشق میں مبتلا ہو گئے۔ 'مثنوی امیڈیم' اسی ابتلا کا نتیجہ ہے۔ یہ مثنوی اردو میں فلسفیانہ رنگ کی پہلی مثنوی ہے دوران عشق میں جو اختر شماری کی تو علم ہیئت و نجوم میں تکمیل کی خواہش پیدا ہو گئی۔ دونوں کالجوں کی نوکری چھوڑی اور اس علم کے پیچھے پڑ گئے۔ ایک اصطرلاب خود تیار کیا اور ستاروں کے دیکھنے کے کئی آلات اپنے ہاتھ سے بنا ڈالے۔ سنسکرت پڑھ ڈالی۔ قدیم سے قدیم اور جدید سے جدید کتابوں کا مطالعہ کیا

بڑے سورج گرہن میں غیر ملکی نجومیوں کے ساتھ یکسر جاکر خاص طور سے کسوفی حالات کا نظارہ کیا۔ ایک چارٹ ستاروں کا "پیرچ مرزائی" کے نام سے تیار کیا۔ اس زمانہ میں اپنے کچھ فلسفیانہ مضامین کے انگریزی ترجمے امریکہ کی کسی یونیورسٹی میں بھیج دئے اور اس نے پی ایچ ڈی کی ڈگری ان پر دے دی۔

تین چار برس بعد پھر بریڈلے صاحب نے ریڈ کرسچن کالج میں کھینچ بُلایا۔ اب کے 'الحکم' نامی رسالہ مذہبی مباحث پر فلسفیانہ نظر ڈالنے کے لئے نکالا۔ حکیم ممتاز حسین عثمانی اس کے جونیر اور خود سینیر ایڈیٹر تھے۔ کالج میں کرسی کلاس کھولنے کے سلسلے میں ارباب حل و عقد کو اردو شارٹ ہینڈ کی تعلیم کا خیال پیدا ہوا۔ مرزا صاحب نے حکیم عثمانی کی مدد سے اردو شارٹ ہینڈ ایجاد کیا اور ان کے لئے معاش کی مستقل صورت پیدا کرنے کے خیال سے انھیں کے نام سے اس کی رجسٹری کرادی۔ شیعوں کے کچھ صاحبانِ فکر اور اہلِ دل حضرات نے اپنی قوم کی اصلاح و بہبود کے متعلق غور و خوض کرنا چاہا تو رسوا اس کے سرخیلوں میں تھے۔ اور آل انڈیا شیعہ کانفرنس کی بنا پڑی۔ کانفرنس کا شعبۂ تالیف و ترجمہ انھیں کے سپرد کیا گیا اور یہ اس کے معتمد بنا دئے گئے۔ اس سلسلے میں رسوا نے مختلف چھوٹی بڑی دعاؤں کا عربی سے انگریزی میں ترجمہ کیا اور تحفۂ اثنا عشریہ کے جواب میں ہدیہ سنیہ[1] ۷ ، ۲ ، ۸ ، ۲ جلدوں میں لکھی۔

جب حیدرآباد کی عثمانیہ یونیورسٹی میں دارالترجمہ کھلا تو مرزا صاحب وہاں بُلا لئے گئے۔ وہاں کے تراجم و تالیفات کی ایک لمبی فہرست ہے۔ اس جامعہ کے سررشتۂ تالیف و ترجمہ نے جو کتابیں شائع کی تھیں وہ یہ ہیں۔ فلسفۂ اسلام، مفتاح الفلسفہ، حکمۃ الاشراق، معاشرتی نفسیات، مبادی علم النفس، مفتاح المنطق، کتاب اخلاق، جمہوریہ افلاطون۔ آخر عمر میں موسیقی میں کمال حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا اس سلسلے میں مغربی گانوں کی طرح ہندوستانی گانوں میں علامات و نشانات پر ایک بسیط لکھ ڈالی جس میں ساڑھے تین سو کے قریب راگوں، راگنیوں اور گانوں کی علامتیں مقرر کر دی تھیں۔ یہ کتاب زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہونے پائی تھی کہ اس حکیم ہندی نے اکتوبر ۱۹۳۱ء میں انتقال فرمایا۔

رسوا کی ادبی تصنیفات کا ذکر میں نے اب تک عمداً نہیں چھیڑا تھا اس لئے کہ گو کہ مرزا صاحب کا نام رہتی دنیا تک ان کے ناولوں ہی کی وجہ سے زندہ رہے گا لیکن وہ تمام عمر اپنی ان تخلیقات کو رباعیاتِ عمر خیام اور غالب کے اردو کلام کی طرح "بے رنگِ من است" ہی سمجھا کئے۔ اپنے کو شاعر تسلیم کرانے میں انھیں کوئی جھجک نہ محسوس ہوتی تھی۔ مرزا تخلص فرماتے تھے اور تمام منظوم تصنیفات میں اس تخلص کو اپنے نام نامی کے ساتھ بے تکلف استعمال فرماتے تھے لیکن ناول نویسی کے معاملے میں وہ اپنے اسم گرامی کا ذکر نہ فرماتے تھے اور اپنے درخشاں چہرے پر رسوا کی نقاب ڈال لیتے تھے۔

اتنا ہی نہیں بلکہ انھوں نے اپنے سب سے پہلے ناول "افشائے راز" میں مرزا محمد ہادی اور مرزا رسوا کو دو شخصیتیں بنا کر بڑے اہتمام سے کام لیا ہے اور بعد کے ناولوں میں بھی اپنے اور اپنے احباب کے سوانح معمولی ردّ و بدل کے ساتھ طشت از بام کئے ہیں۔ مگر ہادی کے چہرے سے رسوا کی نقاب کسی موقع پر ہٹنے نہیں دی ہے۔

اس کی خاص وجہ یہی ہے کہ وہ ناول نویسی و فسانہ نگاری کو اپنے لئے شاعری کی طرح محض تفنن و تفریح اور اپنے مرتبے سے کم تر درجے کی چیز سمجھتے تھے۔ ان کے خاص شغف کی چیز فلسفہ و ریاضی و ہیئت تھی۔

انھیں فلاسفۂ قدیم میں افلاطون اور ارسطو سے خاص دل چسپی تھی۔ اوّل الذکر سے مخصوص طور سے اس لئے اور بھی کہ افلاطون محض خشک فلسفی نہ تھا بلکہ انھیں کی طرح ادیب و شاعر بھی تھا۔

(ماخوذ از مقدمہ "طلسم اسرار")

---

[1] اس کتاب کی ۲۰ جلدیں غیر مطبوعہ حالت میں اب بھی مدرسۃ الواعظین لکھنؤ میں موجود ہیں۔ بقیہ جلدوں کا کیا حشر ہوا نہیں معلوم۔

"آج کل" اگست ۱۹۶۰ء کا شمارہ "ہندوستانی مصوری نمبر" ہوگا

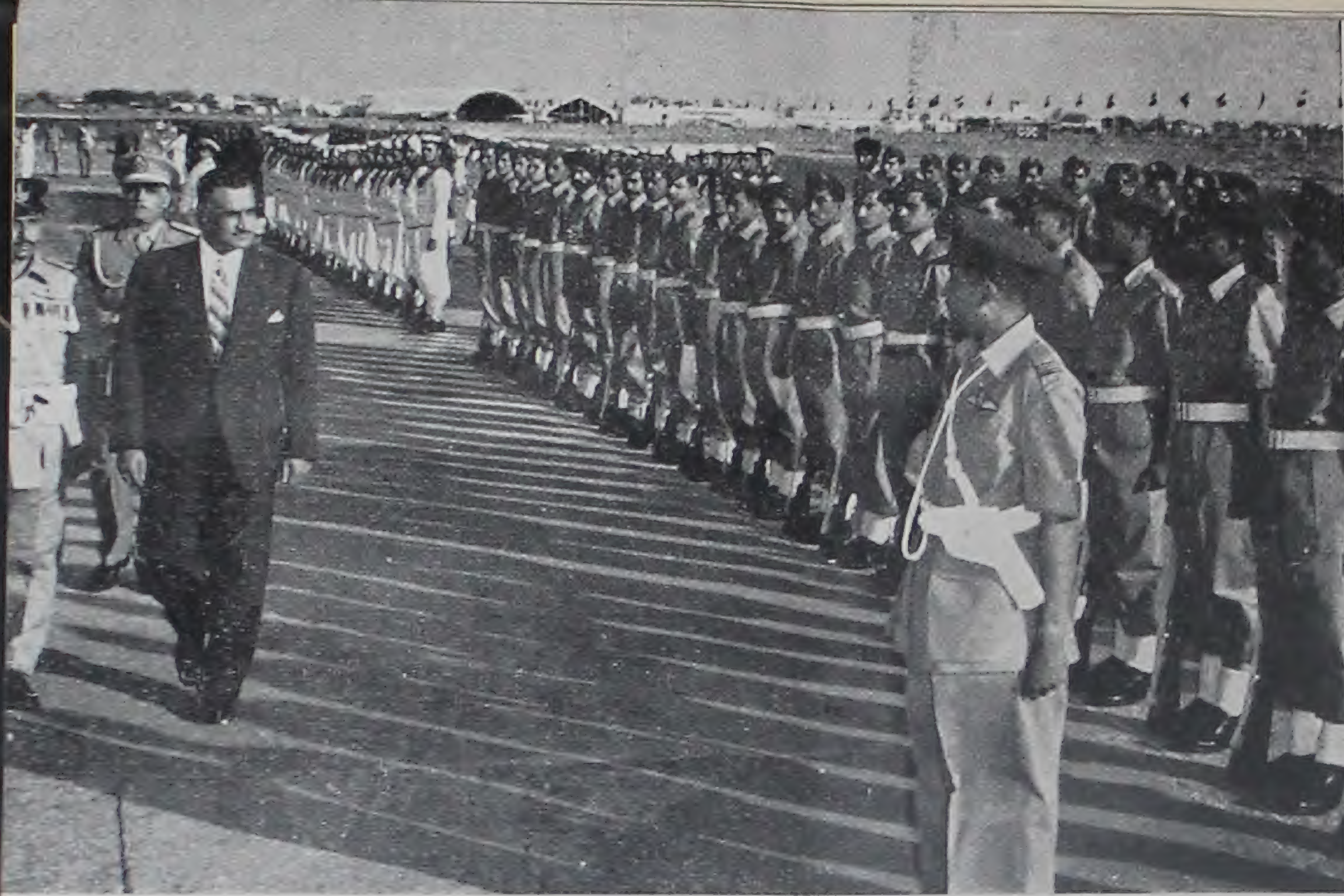
دلی میں

صدرِ متحدہ عرب جمہوریہ

جمال عبدالناصر

کا

پُرتپاک خیر مقدم



صدر ناصر پالم ہوائی اڈے پر گارڈ آف آنر کا معائنہ فرما رہے ہیں۔

دلی کے رام لیلا میدان میں شہریوں کی طرف سے صدر ناصر کا شاندار استقبال



پچھلے دنوں نئی دہلی میں ہند اور پاکستان
کے مابین ایک نئے تجارتی معاہدے پر
دستخط ہوئے ۔ پاکستان کے وزیرِ تجارت
مسٹر ایم حفیظ الرحمٰن اور ہندوستانی وزیرِ تجارت
وصنعت شری لال بہادر شاستری اس
معاہدے کی دستاویزات کا تبادلہ کر رہے ہیں۔

چیلیما بجلی گھر میں ویلڈنگ کا کا



بیراکڈ کے چیلیما بجلی گھر کی تعمیر

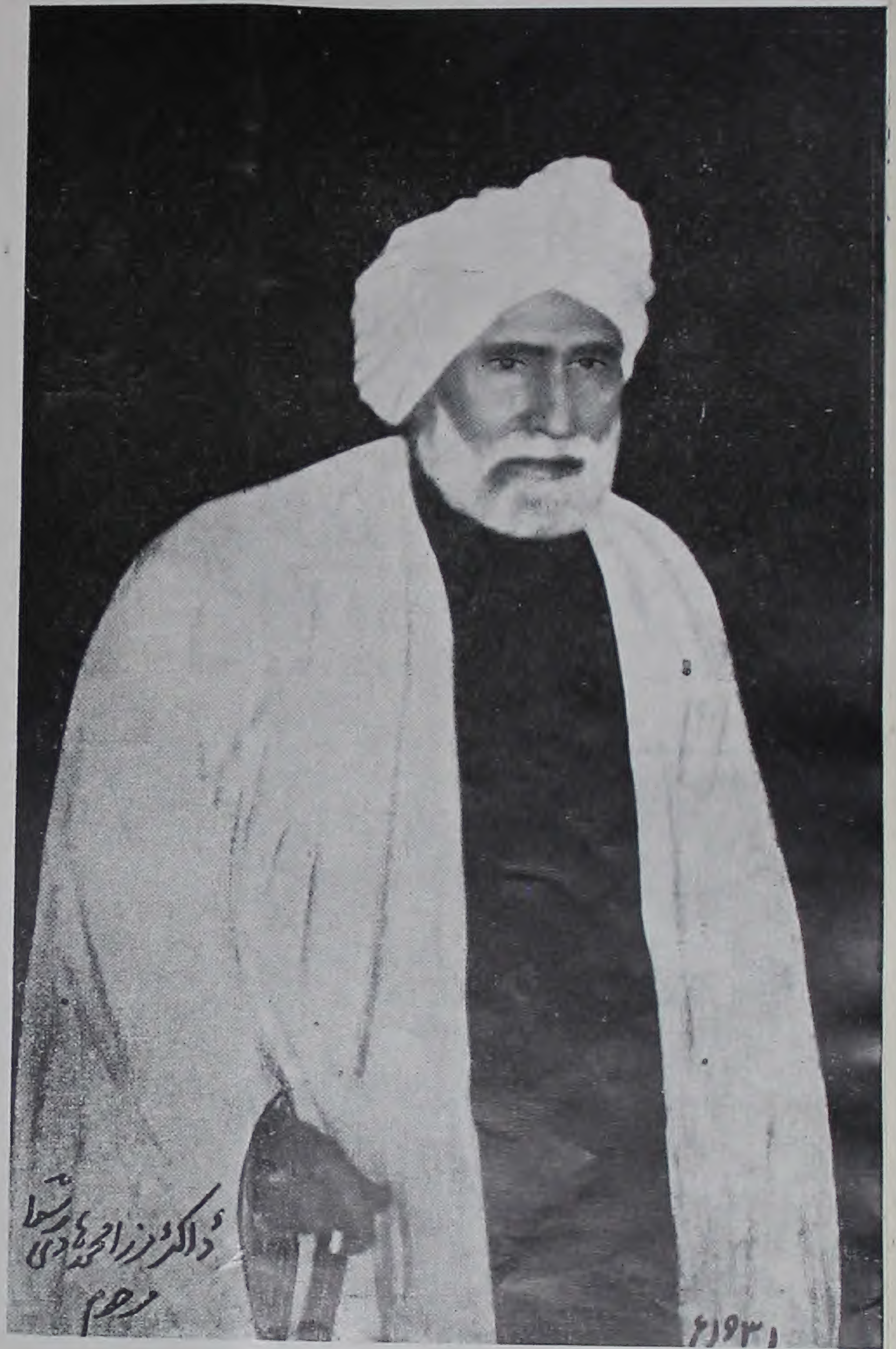


...داور پاکستان
...تی معاہدے پر
...کے وزیر تجارت
...دستانی وزیر تجارت
...استری اِسس
...تبادلہ کرتے ہیں۔

...ویڈنگ کا کام ہو رہا ہے۔



مولوی سیّد خورشید علی ریٹائرڈ ڈائرکٹر سنٹرل ریکارڈز آفس
حیدرآباد کے کلام پر مولانا حالی کی اصلاح
(بہ شکریہ تمکین کاظمی)



مرزا محمد ہادی رسوا مصنف "امراؤ جان ادا"

رشید کوثر فاروقی

اِدراک

وہ نور وہ رعنائیِ رنگیں کے نظارے
لمحات جو گہوارۂ فطرت میں گزارے

رقصاں ہے تصور کے حسیں شیش محل میں
بے ربطیِ زماں آج انھیں لمحات کا عالم
طوفانِ مسرت بھی، تبسم کا سکوں بھی
آفاق کے اسرار و اشارات کا عالم
وہ ذہن کے پردے پہ ابھرتے ہوئے اسلاف
تاریخ کے آثار و نشانات کا عالم
گرتی ہوئی دھاروں پہ چمکتی ہوئی بجلی
تنہائی کی راتوں میں وہ برسات کا عالم
بادل کی ابھرتی ہوئی مٹتی ہوئی شکلیں
دنیا کے بدلتے ہوئے حالات کا عالم
نکھری ہوئی شاخوں پہ نہاتی ہوئی کلیاں
پتوں سے ٹپکتے ہوئے قطرات کا عالم
ہنگامِ سحر جیسے فضا کھوئی ہوئی سی
وہ شہد میں ڈوبے ہوئے نغمات کا عالم
چھائی ہوئی پیڑوں پہ تحیّر کی ردائیں
پھولوں پہ وہ معصوم خیالات کا عالم
وہ جنبشِ صد برگ وہ پھولوں کی کلیلیں
سبزے کی لہکتی ہوئی نباتات کا عالم
غنچے پہ وہ شبنم کی لہکتی ہوئی بوندیں
اک تشنۂ تکمیل ملاقات کا عالم

دریا کے کناروں پہ وہ بکھرے ہوئے سورج
آئینہ دکھاتے ہوئے ذرات کا عالم
برفابِ کہستاں سے ابلتا ہوا سونا
کرنوں کی اترتی ہوئی بارات کا عالم
فواروں کے آنچل پہ بنی قوسِ قزح سی
وہ شوخ پھواریں وہ طلسمات کا عالم
جھرنے سے وہ امواج کا امواج پہ گرنا
سرجوشی و مدہوشیٔ جذبات کا عالم
وہ جھیل وہ سارس کے ٹہلتے ہوئے جوڑے
وہ شام وہ ڈھلتے ہوئے اوقات کا عالم
وہ مست ہوا اور وہ سرگوشیِ اشجار
پاکیزہ محبت کے پیامات کا عالم
جنگل میں کروندے کی مہک ہوش اڑاتی
نوعمر بہاروں کی مدارات کا عالم
مہتاب کی چھیڑی ہوئی موجوں کا تلاطم
بہکے ہوئے رندانِ خرابات کا عالم
وہ نہر کی آغوش میں ہنستے ہوئے جگنو
سمٹی ہوئی شرمائی ہوئی رات کا عالم
آتی ہے کہیں سے مگر آواز کہ ٹھہرو
ایک اور ہے احوال و مقامات کا عالم

نادیدہ چمن زار کے نشنیدہ ترانے
معنی کدۂ روح کے ناگفتہ فسانے

آغا مہدی لکھنوی

قاضی میر ہاشم علی

(جنگ آزادی کا زبردست سورما)

دنیائے شعر و سخن میں عاشور علی خان کا نام چاند سورج کی طرح چمکتا ہے آپ اسی مجسمہ کمال کے شاگرد تھے بیتاب تخلص تھا۔ سید محمد جعفر امید اور آپ پیر بھائی تھے۔ انقلاب سلطنت اودھ سے پہلے لکھنؤ میں وہاں کی علمی ادبی صحبتوں میں شرکت کرتے رہے۔ حکومت نے آبکاری کے محکمہ میں مقرر کیا۔ ایک عرصۂ دراز کے بعد کسی بات پر واجد علی شاہ ناراض ہو گئے اور گرفتاری کا حکم قیصر باغ سے صادر ہوا۔ ان کی خودداری، خاندانی وجاہت اس ذلت کو کب گوارا کر سکتی تھی کہ جہاں منصب دار رہے ہوں وہاں پا بہ زنجیر کئے جائیں۔ لکھنؤ چھوڑنا کہ پیران کے دیس کا پاسی پہرا دے رہا تھا اس نے خاموشی سے ان کو شہر کے باہر نکل جانے دیا۔ رہنے والے پرشند پور تحصیل سلون ضلع رائے بریلی کے تھے۔ صوبہ میں جا بجا بدامنی پھیل چکی تھی۔ کچھ ایسا ہوا کہ گھر نہ جا سکے یوں بھی لکھنؤ کے گلزار میں زندہ رہ کر دیہات میں کہاں دل لگتا مقدر نے دہلی پہونچا دیا اور وہاں کے دورِ مغلیہ کے انحطاطی عہد میں بھی ادبی چہل پہل تھی۔ ہر صحبت میں بجھتے ہوئے چراغوں کی روشنی باقی تھی وہاں پہونچ کر کیا ہوا اس کو بعد میں سنیئے گا پہلے قاضی صاحب کا ابتدائی دورِ زندگی اور خاندان کا حال تو دریافت کیجئے۔

خاندان

آپ کے باپ کا نام قاسم علی اور دادا ظہور علی تھے۔ عہدِ مغلیہ میں بزرگوں کو محکمۂ قضا سپرد تھا۔ جس رات میں قاضی ہاشم علی پیدا ہوئے تو تنگدستی سے گھر میں اندھیرا تھا اور باپ پردیس میں تھے۔ دروازہ پر فقیر آیا اس نے اندھیرا دیکھتے ہوئے بچہ ہونے کی خبر سنی اور پکار کر کہا کہ بابا گھبراؤ نہ جو بچہ پیدا ہوا ہے وہ بڑا آدمی ہوگا۔ آپ کے اجداد سب کے سب نقوی سادات سبزوار ملک ایران سے رائے بریلی کے ضلع میں آ کر بسے تھے۔ "سانڈا سیدان" میں یہ لوگ آباد ہوئے۔ اس وقت اس بستی میں ۳۶۰ اہل علم و کمال تھے لالہ جگن لال رستوگی کے مکان کی پشت پر آپ کے مورثِ اعلیٰ کی قبر اب تک موجود ہے۔ قاضی قاسم علی کی بی بی اور منصف الدولہ شریف الملک سید محمد باقر لکھنوی کی رفیقۂ حیات سگی بہنیں تھیں۔

تعلیم و تربیت

ابتدائی علوم و فنون میں آپ کے اساتذہ کا کچھ پتہ نہیں چلتا مگر جب ماحول علمی تھا تو ایسے گرد و پیش میں ذاتی صلاحیت جن حدوں پر بھی پہونچا دے وہ تھوڑا ہے۔ منشی دیا نرائن نگم اڈیٹر زمانہ نے ۱۹۱۰ء کے لگ بھگ کانپور سے آپ کے حالات اپنے رسالے میں شائع کئے تھے۔ وہ نمبر میرے سامنے نہیں ہے مگر مجھے ان کی زندگی اور خاندانی حیثیت سے پوری واقفیت ہے۔ نجوم اور شاعری میں ان کا جواب نہ تھا۔ لکھنؤ کے دورِ قیام میں دربارِ اودھ کی ایک رسا عورت نے پوچھا: قاضی صاحب! میں آپ کے علم نجوم کو جب جانوں جب آپ بتائیں کہ بادشاہ نے مجھے آج کیا دیا ہے۔ قاضی صاحب نے حساب کیا اور قواعد نے ان کو اس نتیجہ تک پہونچایا کہ چاندی آگ پانی علا ہوا ہے فوراً

ان کا ذہن پہونچا اور فرمایا چاندی کی گڑ گڑی (حقّہ) ملا ہے۔ لکھنؤ چھوٹنے پر تمام مشاغل بند ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ ملک کی فضا ہی مکدر تھی کمالات دیکھنے والا نہ تھا۔ بسا اوقات آپ خاموش رہتے تھے۔

شاعری

افسردگیٔ مزاج اور ناسازیٔ طبع میں دہلی پہونچے۔ ان کا ایک مقطع لوگوں کو یاد ہے ؎

تازگی مشق سخن کی کس کو دکھلائیں اسیرؔ
ذوق، آتش، میر، ناسخ، مصحفی، سودا نہیں

دہلی پہونچکر غالب سے نہ ملنا ایسا تھا جیسے کوئی پیاسا چشمہ تک پہونچ کر تشنہ لب پلٹ آئے اور پانی نہ پیئے۔ ان کو کیا معلوم کہ ہاسنتم علی کون ہیں۔ استاد کے نام سے تعارف چاہا۔ غالب نے کہا عاشور علی خاں تو شاگردوں کو پوری پوری غزلیں کہہ کر دے دیتے تھے۔ اب قاضی صاحب کی شرمندگی کی کوئی حد نہ تھی مگر قدرت نے خود اس مصیبت کا حل پیدا کیا۔ قریبی مکان سے چکی کی صدا آرہی تھی اور ایک عورت گیہوں پیسنے میں لگی ہوئی تھی۔ مرزا نوشہ نے فرمایا اچھا اس پر تو کچھ طبع آزمائی کیجئے۔ قاضی صاحب نے کہا ؎

مثالِ آسیہ ظلم و ستم ایجاد کرتے ہیں
کہ خود ہی پیستے ہیں اور خود ہی فریاد کرتے ہیں

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت چکی کی صدا پر اساتذہ طبع آزمائی کر چکے تھے۔ میرانیس نے کہا ہے ؎

یہ مرض ہے کے جا بجا پھرتی ہے
جاتے ہیں جدھر ساتھ قضا پھرتی ہے
فریاد کناں برائے ہر دانۂ رزق
یوں پھرتی ہے جیسے آسیہ پھرتی ہے

ولہ

گردش عبث ہے کچھ قناعت میں بیٹھ رہ
رزّاق نے رزق خلق کیا آسیہ کے ساتھ

(لا اعلم)

کنج عزلت میں مثالِ آسیہ گوشہ گیر ہوں
رزق پہونچاتا ہے گھر بیٹھے خدا میرے لئے

میر کلو عرش

آسیہ کہتی ہے ہر صبح بآوازِ بلند
رزق سے بھرتا ہے رزّاق دہن پتھر کا

حفیظ دہلوی

مثالِ دانہ پستا ہوں شب و روز
فلک کی آسیہ ہے اور میں ہوں

غرض قاضی صاحب اپنے معاصرین میں سے کسی سے کم نہ تھے اور شعر و شاعری ان کی جاگیر تھی۔

قاضی صاحب کے دہلی پہونچنے پر وہاں بھی بغاوت کی آگ بھڑکی۔ دہلی پہونچکر وہ دس روپیہ پر نوکر ہو گئے تھے۔ جب وہاں نقشِ امن کا ظہور ہوا تو فیض آباد پاس میں آ گئے۔ انگریزوں کو دیس سے نکالنے کا جذبہ ان کے دل و دماغ میں بدرجہ اتم تھا اس لئے فوج تیار کی اور وہاں کے باغیوں کی سرگردگی قبول کر کے انگریزوں سے لڑ پڑے۔ اس وقت کے راوی بتاتے ہیں کہ جیسی فوج شاہ صاحب کی لڑی کوئی رسالہ اس کے سامنے ثابت قدم نہیں رہا۔ جب حالات میں کسی طرح سکون نظر نہ آیا تو آپ بھی دہلی چھوڑنے پر مجبور ہو کر وہاں سے متھرا آئے اور متھرا سے صبح کو گھوڑے پر سوار ہو کے چلے شام کو کانپور پہونچ گئے۔ کانپور سے اپنے وطن پرشد پور آئے۔ اس عرصہ میں کسی مقام پر گھوڑے سے گرے اور خون اس قدر بہ گیا کہ آنکھوں کی روشنی جاتی رہی۔

ملک میں انگریزی حکومت مستحکم ہو گئی اور قاضی صاحب اپنے عقل و دماغ پر بھروسہ کر کے رائے بریلی میں وکالت کرنے لگے۔ رائے بریلی میں ان کا بنگلہ ۵۰ برس پہلے بچہ بچہ جانتا تھا۔ عبدالصمد ان کے محرر کا نام تھا جو سخت مزاج اور بد خو تھا۔ آنکھوں میں روشنی نہ تھی مگر بڑی روانی سے ایک خدمتگار کی مدد سے راہ چلتے رہے۔ وکالت میں دولت اور زیادہ بڑھی۔ فقیر کی پیشین گوئی یاد کر۔ وطن کی محبت نے مجبور کیا کہ دیس میں امام باڑہ بنوائیں۔ ایک لاکھ روپیہ کے صرف سے امام باڑہ بنوایا۔ اس کی تعمیر اور نقشہ میں نواب ناظم آغا علی خان کا مشورہ شریک تھا۔ ناظم صاحب اور قاضی صاحب میں دوستی تھی۔ امام باڑہ پر پھر قلم اٹھاؤں گا۔ قاضی صاحب نے اپنے قانونی مشورہ سے پبلک کی زیادہ سے زیادہ مدد کی اور گرد و نواح میں کوئی ریاست، تعلقہ، زمینداری ایسی نہیں ہے جو ان کی رہینِ کرم نہ ہو۔ میر واجد علی وکیل، پیر محمد عابد وکیل قاضی صاحب کے سکھائے پڑھائے ہوئے وکلا میں تھے اور ان کی عزت و اقتدار کا سرچشمہ قاضی صاحب تھے۔

ضلع میں یہ بات مسلمہ حقیقت تھی کہ قاضی صاحب کی قوتِ تحریر اور ان کے معاصر میر محمد تقی صاحب نصیر آبادی کی قوتِ قلم ممتاز ہے۔

قاضی صاحب کے اشعار ملاحظہ ہوں :

عنایتیں ہیں عجب خدا کی رہا نہ تنہا مزار میں بھی
مری تسلّی کو قبر بیٹھی ملال دیکھا جو ہم نشیں کا

گرے مکانوں میں ہم پکارے کدھر سدھارے مکیں تمہارے
جھکے ستونوں نے کئے اشارے کہ سب نے رستہ لیا زمیں کا

کہاں وہ اہلِ وطن کی صحبت وطن کو چھوٹے ہوئی ہے مدت
کسی کسی کی ہے یاد صورت خیال کچھ ہے کہیں کہیں کا

بدن میں انساں کے چار عنصر کا جمع ہونا ہے اتفاقی
سرا میں جیسے کہ ہوں مسافر کوئی کہیں کا کوئی کہیں کا

گنہ سے محشر میں ہے تباہی مگر جو توبہ ہے یا الٰہی
سمٹ کے سب میری روسیاہی نشانِ سجدہ بنے جبیں کا

قاضی صاحب کی غزلیں، مرثیے، نوحے زمانہ گزرنے پر باقی نہیں ہے ان کے زمانۂ حیات میں گجرات کے ایک زرگر کی بی بی کا تاریخی واقعہ ضبطِ تحریر میں آکر مثنویوں کی صورت اختیار کر چکا ہے اور ان کے ہمعصر عالم اور شاعر مفتی میر عبّاس صاحب نے بیت الحزن مثنوی نظم کی جو پہلے صدرِ اوّل میں عہدِ نتاہی سے قریب طبع ہوئی پھر مطبع سعید المطابع میں ۱۸×۲۲ $\frac{۱}{۱۶}$ سائز، ۲۳۲ صفحات پر چھپ کر شائع ہوئی۔ اس عشق و محبت کے انجام کا رپر

قاضی صاحب نے ایک سو پچاس بند کا مسدس نظم کیا جس کا صرف مطلع لوگوں کو یاد ہے ؎

دم بھرتے ہیں مسیح دلائے حسین کا

۲۷ شعبان مطابق ۲۷ جون ۱۸۹۲ء کو قاضی صاحب کا چراغِ حیات صرصرِ فنا سے بجھ گیا۔ چاند کی تاریخ اور عیسوی سنہ تو یقینی ہے فقط ۲۷ جون میں واقعہ نگار کو شبہ ہے مارچ کا مہینہ تھا یا جون صد سالہ جنتری سے یہ اختلاف دور ہو سکتا ہے۔

قاضی صاحب کی بیاہتا بی بی سے کوئی اولاد نہ تھی۔ میر ناظم علی صاحب ان کے حقیقی بھائی اور بہن پر ترکہ تقسیم ہوا اور اس وقت ان کی املاک کے لئے لوگ وارث و مالک ہیں۔ ان کی دوسری بی بی سے نسل موجود ہے۔ قاضی صاحب کی قبر ان کے تعمیر کردہ امام باڑہ کے چبوترہ پر ت ربح کے درمیں زیرِ آسماں موجود ہے۔

ملک کے عقیدت مند طبقہ نے مرنے کے بعد بھی ان کو فراموش نہ کیا اور ان کی قبر پر آکر مرادیں مانگنے لگے۔ موکل مقدمات میں کامیابی کی دعائیں کرنے آتے تھے بیماروں کی صحتیابی کی مزار پر منت مانی جاتی تھی۔ مریض اچھے ہوتے تھے مقدمہ میں کامیابی ہوتی تھی جو اس سے بھی زیادہ پست خیال کے تھے وہ قبر پر سجدہ کرتے تھے۔ ورثا نے ان بدعات کو روکنے کے لئے نشانِ قبر مٹا دیا۔

قاضی صاحب جن لوگوں کو یتیمی کا داغ دے گئے ان کی تعداد غیر محدود ہے۔ ان کی معنوی اولاد یعنی فرزندوں کا شمار کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔

۱۹۵۸-۵۹ء میں ہریجنوں اور قبائل کی بہبود پر خرچ

۱۹۵۸-۵۹ء میں پس ماندہ طبقوں کی بہبود کی اسکیموں پر ہر مہینے اوسطاً ایک کروڑ بیس لاکھ روپے خرچ کئے گئے۔ سالِ رواں میں اس مقصد کے لئے تقریباً ایک کروڑ روپے ماہانہ کی رقم مخصوص کی گئی ہے۔ ۱۹۵۸-۵۹ء میں کل ملا کر ۱۴ کروڑ ۲۰ لاکھ روپے خرچ کئے گئے جس کی تفصیل یوں ہے :

ریاستی سیکٹر میں : ۹ کروڑ ۹۳ لاکھ ۹۰ ہزار روپے

مرکزی سیکٹر میں : ۴ کروڑ ۳۰ لاکھ روپے

ریاستی سیکٹر کے اخراجات مرکز اور ریاستوں نے مساویانہ تناسب سے برداشت کئے جبکہ مرکزی سیکٹر کے اخراجات کے لئے ساری رقم بھارت سرکار نے مہیا کی۔ ۱۹۵۹-۶۰ء کے لئے کل ۱۲ کروڑ ۲۰ لاکھ روپے کی رقم مخصوص کی گئی ہے۔ یعنی ۵ کروڑ ۷۷ لاکھ ۱۵ ہزار روپے ریاستی سیکٹر کے لئے اور ۶ کروڑ ۴۳ لاکھ ۲۱ ہزار ۹ سو روپے مرکزی سیکٹر کے لئے منظور کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک کروڑ ۱۵ لاکھ ۹۸ ہزار روپے کی رقم ۱۹۵۹-۶۰ء میں کم ترقی یافتہ علاقوں کی ترقی کے لئے بھی مخصوص کی گئی ہے۔ دوسرے پلان میں اس سلسلے کے مصارف کی رقم ۹۰ کروڑ روپے ہے۔

ست پرکاش سنگھ

ندی اور ناری

اس سال نارائن نے ایم اے کا امتحان پاس کر لیا ہے۔ وہ ایک عمدہ ملازمت اور حسین بیوی کی تلاش میں ہے اسے ایسی بیوی چاہیئے جو ماڈرن ہونے کے ساتھ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ماں باپ کی اکلوتی بیٹی ہو۔ اُسے کار اور کوٹھی بھی چاہیئے جو ایسی شادی سے میسّر ہو سکتی ہیں۔ جتنی سگائیوں کی پیش کش آئی اُسے کسی نہ کسی بنا پر ٹھکرانا پڑی۔ ایک لڑکی تو بہت خوبصورت تھی لیکن اس کے بھائی بہنوں کی تعداد ایک ٹیم سے بھی زیادہ تھی۔ ایک امیر باپ کی اکلوتی لڑکی ملی۔ اس سے شادی کرنے کے بجائے وہ عمر بھر کنوارا رہنے کو تیار تھا۔ اس کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ اس کے سر کے بال زیادہ کالے ہیں یا چہرے کا رنگ۔ دانت تو باہر نکل کر اُسے چڑا ہی رہے تھے، لیکن وزن بھی اس کے وزن سے دُگنا تھا۔ یہ درست ہے کہ اس کا باپ بارہ سو ایکڑ زمین کا مالک تھا لیکن اُسے کھیتی نہیں بیوی کی ضرورت تھی۔ امیر گھرانے کی ایک بی اے پاس لڑکی تھی مگر وہ روزانہ شیمپو بناتی تھی۔ اب اس معاملے میں وہ بیوی سے مساوات کا بالکل حامی نہ تھا۔ ایک ریٹائرڈ جج کی لڑکی کے گھر ملاقات کے لئے گیا تو اس کو پسینے چھوٹنے لگے۔ وہ انگریزوں سے بھی تیز انگریزی بولتی تھی اور میموں کی طرح بال کٹواتی تھی، گھوڑے کی سواری کرتی۔ شادی کے بعد وہ آزاد اور بے روک ٹوک زندگی بسر کرنا چاہتی تھی۔ پابندیوں کی وہ سخت ترین دشمن تھی۔ وہ جہاں چاہے، جس کے پاس چاہے، جیسے چاہے جائے گی اور اس کا خاوند اسے کبھی نہیں روکے گا۔ اگر اُسے یہ شرطیں منظور ہوں تبھی اس کو شادی منظور۔ نارائن کو وہاں سے دم دبا کر بھاگنا پڑا۔

شادی کے لئے وہ بے قرار رہتا لیکن اس کے آدرش کے مطابق بیوی ہی نہ ملتی۔ دن وہ پریشانی میں گزارتا اور رات خواب دیکھنے میں۔ ایک رات اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ ایک عجیب و غریب ملک میں گھوم رہا ہے ایک محل ہے۔ وہاں داخل ہونے کے لئے ایک دروازہ ہے جہاں ایک چوکیدار پہرہ دے رہا ہے۔ چوکیدار اُسے راجہ کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اسے دیکھ کر راجہ بہت خوش ہوتا ہے اور کہتا ہے :۔

" نارائن جی! ہمیں آپ کے آنے سے بہت" خوشی ہوئی ہے۔ اندر پوری آپ کے سواگت میں اپسراؤں کا ناچ پیش کرے گی۔ آپ کی آمد کی خوشیاں منائے گی۔"

مہاراجہ اندر کے اشارہ کرتے ہی اپسراؤں کا ناچ شروع ہو گیا۔ ساری اندر پوری خوشی سے جھوم اُٹھی۔ ناچ کے اختتام پر مہاراجہ کی آواز پھر گونجی۔ بولے :۔

" نارائن جی مہاراج! آپ ہمارے مہمان ہیں۔ مہمان کی خاطر کرنا ہم اندر پوری کے باسی اپنا فرض اور سوبھاگیہ سمجھتے ہیں۔ آپ ان اپسراؤں میں سے جتنی چاہیں، منتخب کر لیجئے۔"

وہ بھونچکا سا دیکھتا رہ گیا۔

" حیران ہونے کی ضرورت نہیں" اندر دیو بولے " اپنی مرضی کے مطابق آپ اپسراؤں کو چن لیجئے۔ وہ آپ کی چرن داسیاں بن کر آپ کی سیوا کریں گی۔"

نارائن بے حد خوش ہوا، ہوتا بھی کیوں نہ! پہلے تو ایک بیوی کی مشکل تھی اب اتنی مل رہی تھیں۔ اس نے پانچ اپسراؤں کا انتخاب کر لیا۔ اُن

دونوں چند کوڈ ا ایکٹ پاس نہیں ہوا تھا۔

وہ ان خوابوں کو اپنے دوستوں سے بیان کرتا اور ان کی تعبیریں پوچھتا۔ وہ کہتے "بیٹا! خوش قسمت ہو جو رنگین خیالوں کی دنیا میں رہتے ہو۔ کسی دن یہ ضرور سچے ثابت ہوں گے۔"

اس نے ایک فلم دیکھی جس میں ایک شادی شدہ نوجوان ایک موٹر کار سے ٹکرا کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ کار کا مالک اُسے اپنے گھر لے جاتا ہے اور اس کا علاج کراتا ہے۔ "ٹکر" اس کے دماغ پر اثر انداز ہوتی ہے اور اس کی یادداشت کو ختم کر دیتی ہے۔ وہ اپنی گذشتہ زندگی کو بھول جاتا ہے۔ میزبان کی لڑکی دل و جان سے اس کی خدمت کرتی ہے اور اپنا دل اس کے قدموں پر نچھاور کر دیتی ہے۔ وہ اس سے شادی کر لیتا ہے۔ جب اس کی پہلی بیوی اس سے ملاقات کرتی ہے تو وہ اسے پہچان نہیں پاتا۔ جب دھیرے دھیرے اس کی یادداشت واپس آتی ہے تو وہ ایک کشمکش میں اُلجھ جاتا ہے اور پھر......

نارائن ایسے آدمیوں کی زندگی پر رشک کرتا۔ وہ اکثر سوچتا کہ اگر اس کی بھی ٹکر کسی ایسے آدمی کی کار سے ہو جائے، وہ اسے گھر لے جائے اور اس کی حسین لڑکی......

اور ایک دن جب وہ نیا گرم سوٹ زیب تن کئے سڑک پر جا رہا تھا، اُسے ایک نئی خوبصورت کار آتی دکھائی دی۔ نئی کیڈی لاک، کتنی سُندر۔ ڈرائیور نے ہارن دیا وہ مبہوت سا کھڑا رہا اور ٹکرا کر گر گیا۔

اس کی آنکھ کھلی تو خود کو ایک کمرے میں پلنگ پر پایا۔ یہاں وہ اس سے پیشتر کبھی نہیں آیا تھا۔ اس نے کمرے کے اندر نگاہ دوڑائی تو حیران رہ گیا کس قدر خوبصورت اور سجا ہوا کمرہ تھا۔ واٹر کلر کی پینٹنگز ٹنگ رہی تھیں فرش پر قیمتی قالین بچھا تھا اس پر ایک خوبصورت صوفہ تھا۔ کھڑکی میں سے برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑ کی فلک بوس چوٹی صاف نظر آ رہی تھی۔ دیوداروں کی خوشبودار ہوا کمرے کو معطر کر رہی تھی۔ دروازہ کھلا اور ایک اپسرا کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ ضرور خواب دیکھ رہا تھا۔ اس نے آنکھوں کو ملا۔ حسینہ اب بھی موجود تھی۔ لیکن وہ ہے کون؟ اپسرا بولی

"آپ حیران اور پریشان نہ ہوں۔"

"میں کہاں ہوں؟" اس نے لیٹے لیٹے پوچھا۔

"رنگ پور میں۔"

"رنگ پور؟ یہ کہاں ہے؟"

"ہمالیہ کی گود میں ایک جاگیر ہے۔ اس کے مالک مہاراج مہی پال سنگھ ہیں"

"لیکن میں یہاں کیسے آگیا؟"

"آپ کو یاد نہیں کہ آپ کی میرے پتا جی کی کار سے ٹکر ہو گئی تھی۔ رات زیادہ ہو گئی تھی۔ انھوں نے سوچا آپ کو ہسپتال داخل کرانے سے پولیس کو اطلاع ہو گی اور بیسیوں سوالوں کے جواب دینے پڑیں گے۔ ہو سکتا ہے بات عدالت تک پہونچے اس لئے ہسپتال میں داخل کرانے کے بجائے وہاں مرہم پٹی کر کے وہ آپ کو شہر سے یہاں لے آئے۔ یہاں ہمارے ڈاکٹر اپنے کام میں بہت ہوشیار ہیں۔ آپ چند دنوں میں تندرست ہو جائیں گے۔"

"ابھی مجھے کتنے دن اور بستر میں لیٹے رہنا ہوگا؟"

"میں نے کہا نا صرف چند دن اور۔ آپ باغ میں سیر کے لئے جا سکتے ہیں لیکن آرام کرسی میں ابھی چل نہیں۔"

کچھ دیر بعد سفید کپڑوں میں ملبوس، ایک عورت ناشتہ لے کر حاضر ہوئی حسینہ نے سہارا دے کر نارائن کو پلنگ پر بٹھلایا۔ نوکرانی نے اس کی کمر کے نیچے نرم نرم تکئے رکھ دئے۔ دوشیزہ نے اپنے ہاتھوں سے اسے لذیذ ناشتہ کھلایا۔ نوکرانی برتن لے کر چلی گئی تو دو اور نوکرانیاں آگئیں نوجوان اور حسین انھوں نے اسے گدے دار آرام کرسی میں بٹھلایا اور کرسی کو کھینچ کر باغ میں لے گئیں وہ ششدر رہ گیا۔ دیکھتا تو دیکھتا رہ گیا۔ ایسے حسین باغ کا اس نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا شاید مہاراجہ اندر کے مالیوں کا لگایا ہوا اندر پوری کا باغ بھی اس قدر شاندار نہ ہوگا۔ ریشم جیسی نرم گھاس کے سبزہ زار بچھے ہوئے تھے۔ ان کے چاروں طرف اور درمیان میں پھولوں کی کیاریاں تھیں جن میں انواع و اقسام کے رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے چاروں طرف بہار ہی بہار نظر آ رہی تھی۔ پھول اُسے دیکھ کر مسکرا رہے تھے اور اس کا سواگت کر رہے تھے۔ فواروں سے پانی اُچھل اُچھل کر ناچ رہا تھا باغ میں بادام اور سیب، ناشپاتی اور لوکاٹ، آڑو اور اخروٹ کے درخت لگے ہوئے تھے اور اس کے پس منظر میں پہاڑ کی بلند و بالا چوٹیاں کھڑی تھیں اور ان کی چوٹیاں سفید ٹوپیاں پہنے ہوئے تھیں۔ اس نظارے سے وہ اتنا مبہوت ہو گیا کہ اسے مالیوں کے چلے جانے کا علم تک نہ ہوا۔ اس نے حسینہ کو لان میں بنی ہوئی پختہ کرسی پر بیٹھے ہوئے پایا۔ وہ پوچھنے لگی

"آپ کو یہ باغ کیسا لگا؟"

"میں نے اس سے پیشتر اتنا خوبصورت باغ کہیں نہیں دیکھا۔ ایسے لگتا ہے جیسے یہ گلزارِ جنت ہو۔"

"میرے پتاجی اس میں بہت دلچسپی لیتے ہیں اُن کے پتاجی کو بھی باغ باغیچے کا بے حد شوق تھا۔"

اس نے دیکھا گرم شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ پہنے، سرخ چہرے اور کالی مونچھوں والے ایک صاحب چلے آ رہے ہیں۔ دوشیزہ نے بتلایا کہ وہ اس کے پتاجی ہیں۔ اس نے کھڑے ہو کر اپنے پتاجی کو پرنام کیا۔ نوجوان نے بھی دونوں ہاتھ جوڑ کر نمسکار کی۔

"جیتے رہو بیٹا۔" راجہ صاحب بولے "کتنی مسرت ہو رہی ہے مجھے تمہیں باغ میں دیکھ کر، چند دنوں میں تم چلنے پھرنے کے قابل ہو جاؤ گے۔ مجھے اپنی غلطی پر بہت افسوس ہے لیکن اس بہانے تم سے ملاقات کر کے کتنی خوشی ہوئی ہے۔ یہ تمہارا اپنا گھر ہے، یہاں کسی تکلف کی ضرورت نہیں جس چیز کی ضرورت ہو فوراً کہو، بلا تاخیر مہیا ہوگی۔ تندرست ہونے پر اس علاقے کی سیر کرو گے تو خوش ہو جاؤ گے۔ بیٹا پاربتی!" وہ اپنی بیٹی کو مخاطب کر کے بولے۔" ان کی اچھی طرح سے سیوا کرنا، کسی قسم کی شکایت نہ رہے —— اچھا بیٹا نارائن، میں چلتا ہوں۔"

وہ سر جھکائے کھڑی رہی۔ جب وہ چلے گئے تو نارائن نے پوچھا۔

"میرے نام کا انھیں کیسے پتہ چلا؟"

"میں نے بتلایا۔"

"آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

"اس سے"۔ اس نے ایک چھوٹی سی سونے کی ڈبیا نکالی جس میں اس کا وزیٹنگ کارڈ پڑا تھا۔

"آپ نے اس کارڈ کو سونے کی ڈبیا میں کیوں ڈال رکھا ہے؟"

"قیمتی شے ہے نا" وہ مسکرا کر بولی۔

اس وقت ایک صاحب اور آئے وہ بھی شیروانی اور پاجامہ پہنے تھے اُسے باتیں کرتے دیکھ خوش ہو کر بولے۔

"شکر ہے آپ کی جان بچ گئی۔ بڑی سخت چوٹ لگی تھی۔ کئی دن بعد آپ کو ہوش آیا۔ چند دن بعد آپ اچھی طرح چلنے پھرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ لیکن ابھی آرام کی ضرورت ہے۔ بیٹیا!" وہ پاربتی کو مخاطب کر کے بولے۔ "ابھی انھیں اندر لے جائیے۔ زیادہ باتیں کرنے سے ان کی صحت پر بُرا اثر پڑے گا۔"

وہ سمجھ گیا کہ یہ ڈاکٹر تھے۔

ان کے چلے جانے کے بعد حسینہ نے دونوں ہاتھوں سے تالی بجائی فوراً ہی دو داسیاں آ کر کھڑی ہو گئیں۔ حسینہ کا اشارہ پا کر وہ اس کی پہیوں والی آرام کرسی کو پھر کمرے کے اندر لے گئیں اور بڑے آرام سے اُسے بستر پر لٹا دیا۔

دو ہفتے اسے بستر میں اور رہنا پڑا۔ پاربتی اس کی خوب سیوا کرتی۔ اس کے پاس گھنٹوں بیٹھتی، اس کا دل بہلانے والی باتیں کرتی۔ لائبریری سے اچھی اچھی کتابیں لاتی اور پڑھ کر سناتی۔ باغ میں لے جا کر سیر کراتی۔ دھیرے دھیرے وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا۔ کار میں سیر کے لئے جانے لگا۔ وہ اسے گرد و نواح کی سیر کراتی۔ چند میل کے فاصلے پر ایک ندی تھی۔ دونوں ندی کے پُل پر آ کر کھڑے ہو جاتے اور تیز رفتار ندی کی لہروں کو دیکھتے۔ ایک دن وہ بولی۔

"کیا سوچ رہے ہیں آپ؟"

"یہی کہ ندی اس طرح تیز کیوں بھاگی جا رہی ہے؟"

"اپنے سو بھاؤ کے کارن۔ عادت سے مجبور ہے۔ وہ رک سکتی ہی نہیں۔ جہاں رُکے گی، کناروں کی بندش میں پڑ کر سڑ جائے گی۔ دنیا کے آغاز سے یونہی طرح بہتی آئی ہے اور اختتام تک بہتی رہے گی۔ نہ تو گھبرانا جانتی ہے اور نہ ہی رُکنا۔ مہیب چٹانیں اس کا راستہ نہیں روک سکتیں، بڑے سے بڑا پتھر اسے پیچھے نہیں دھکیل سکتا۔ چھوٹی چٹانوں کے اوپر سے گزر جاتی ہے، بڑی چٹانوں سے بچ کر نکل جاتی ہے۔"

"زندگی کے راز سے خوب واقف ہے۔"

"ہاں، یہ جانتی ہے کہ رُکنے کا دوسرا نام موت ہے اور آگے بڑھنا ہی زندگی ہے۔"

"لیکن یہ قیامت خیز شور کیوں مچا رہی ہے؟"

"دشمنی بھی تو کتنا خطرناک ہے۔ اس کے ساتھ ٹکرانے سے تو شور ہوگا ہی لیکن میدانوں میں داخل ہوتے ہی یہ کتنی خاموش ہو جاتی ہے۔"

"ایسا کیوں ہوتا ہے؟"

"خطرناک دشمن پر جیت حاصل کر کے متانت اور سنجیدگی آ ہی جاتی ہے۔"

"آپ نے ندی کی زندگی کا خوب گہرا مطالعہ کیا ہے؟" نارائن نے کہا۔

"قدرت کی گود میں پلی ہوں۔ قدرت کے معجزوں کو دیکھتی ہوں اور

ان پر حیرت کرتی ہوں۔"

"حیرت کس بات پر؟"

"قدرت کے تغیر پر۔ اُسے ہر لحظہ، ہر لمحہ بدلتے دیکھ کر، برف کو گرتے اور پھر پگھلتے دیکھ کر، سردیوں میں پہاڑوں کی چوٹیوں کو برف سے ڈھکے دیکھتی ہوں، گرمیوں میں اس برف کو پگھلتے ہوئے۔ کیا آپ نے کبھی یہ منظر دیکھا ہے؟"

"نہیں۔"

"سورج کی گرمی جب سفید برف کو پگھلنے پر مجبور کرتی ہے تو وہ پانی کی لاتعداد لکیروں کی صورت میں پہاڑوں کی دیوار کے ساتھ بہتی اس طرح دکھائی دیتی ہے جیسے کسی لڑکی کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دھارے بہتے ہوں۔"

"کسی لڑکی ہی کے آنسوؤں کی طرح کیوں؟"

"کیوں کہ آنسو بہانا محض اسی کی قسمت میں ہوتا ہے۔ مرد اپنے نہیں عورت کے آنسو بہاتا ہے۔" پاربتی نے جواب دیا۔ "تو جب سفید برف آنسو بہاتی ہوئی پہاڑ کی چوٹی سے جدا ہوتی ہے تو لاتعداد نالوں میں تبدیل ہو کر میدانوں کی طرف بڑھتی ہے کھیتوں کو زندگی بخشنے۔ ایک طویل سفر طے کر کے یہ نالے ندیوں سے جا ملتے ہیں اور ندیاں سمندر میں مل جاتی ہیں۔ سورج کی شعاعیں دھواں بنا کر انھیں بادلوں میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ بادل برف کی شکل اختیار کر کے پہاڑ کی چوٹیوں پر بسیرا کرتے ہیں۔ برف پھر پگھلتی ہے۔ یہ سلسلہ ہمیشہ چلتا رہتا ہے۔ سمجھے آپ قدرت کا راز؟"

"کیا؟"

"کہ یہاں کوئی شے ضائع نہیں ہوتی۔ محض چولا بدلتی ہے۔ جب زندگی چولا بدلتی ہے تو لوگ اسے موت کے نام سے پکارتے ہیں اور گریہ وزاری کرتے ہیں۔ آپ نے ایک اور بات پر غور کیا؟"

"کیا؟"

"کہ دھرم کی پستکوں میں دان کی کتنی بڑائی کی گئی ہے۔ دھرموں کے بانی ضرور ان پہاڑوں کے باسی رہے ہوں گے۔ سال ہا سال قدرت کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہوں گے کہ دان کا مطلب محض دینا نہیں۔ جتنا دان دیں گے اتنا لوٹ کر آپ کے پاس واپس آئے گا، جیسے پہاڑ پانی کا دان کرتا ہے وہی اس کے پاس لوٹ آتا ہے۔"

نارائن کا سر چکرانے لگا۔ اس نے آج تک نہ تو قدرت کا اتنا دقیق مطالعہ کیا تھا، نہ دھارمک پستکوں کا۔ پہاڑوں کی گود میں پلی ہوئی، قدرت کی اس چہیتی بیٹی کو اس قدر ذہین دیکھ کر وہ ششدر رہ گیا۔ اسے یہ خوف ہونے لگا کہ اگر پاربتی نے یہی بات جاری رکھی تو کہیں اس کا اپنا پول نہ کھل جائے۔ اسے نہ تو قدرت کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا تھا نہ کتابیں پڑھنے کا وقت۔ وہ تو آج کل کے طالب علموں کا سچا نمائندہ تھا۔ کالج کی تعلیم کے بارے میں اسے معلوم تھا کہ وہاں لڑکے دو سال میں بائیس مہینے عیش و عشرت میں بتاتے ہیں، کلب جاتے ہیں، گپ لڑاتے ہیں۔ اسٹرائیک کرتے ہیں، نعرے لگاتے ہیں، آخری دو ماہ میں پیشہ ور پروفیسروں کے لکھے ہوئے نوٹس رٹ رٹا کر امتحان پاس کر لیتے ہیں۔ کالج میں پڑھنے پڑھانے اور سنجیدہ معاملات پر غور کرنے کی فرصت ہی کسے ہوتی ہے اور یہاں پاربتی فلسفے کی باتیں کر رہی ہے۔

"آئیے گھر چلیں۔" اس نے پاربتی سے کہا۔

ایک دن جب وہ صبح سویرے ندی کے کنارے بیٹھے تھے تو نارائن ندی کے پار، سفید چوٹی کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

"وہ دیکھئے، سورج کی پہلی کرن نے برف کا منہ چوما۔"

"آپ تو شاعر ہوئے جا رہے ہیں۔" پاربتی مسکرا کر بولی۔

"صحبت کا اثر ہے نا۔" وہ اس کا ہاتھ سہلاتے ہوئے بولا۔

پاربتی نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔

"اب دیکھئے۔" وہ برفیلی چوٹی کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔ "سورج کی سنہری کرنیں برف کے سفید جسم سے ہم آغوش ہو رہی ہیں۔"

"یہ نظامِ قدرت ہے" وہ مسکرا کر بولی

نارائن نے پاربتی کو کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پاربتی نے پوچھا۔ "یہ کیا؟"

"نظامِ قدرت" اس نے ہنس کر جواب دیا۔

دونوں کھلکھلا کر ہنس دئے۔ پھر نارائن بولا۔

"آپ نے قدرت کا مطالعہ کیا لیکن اس کے ساتھ یہ نہیں سوچا کہ میرا یہاں آنا بھی قدرت کی سازش ہی کا نتیجہ ہے۔ آپ کے پتا جی کا ٹھہر جانا، میرا ان کی کار سے ٹکرانا یہاں آ کر کسی کے تیر نیم کش کا شکار ہونا اور پھر آج طلوعِ آفتاب کے اس سنہری اور حسین منظر میں ایک دوسرے سے بغلگیر ہونا، یہ قدرت کی سازش نہیں تو اور کیا ہے؟"

"تم جھوٹ تھوڑی بولو گے" پاربتی اس کے گالوں کو سہلاتے ہوئے بولی۔

ایک قہقہہ بلند ہوا۔ پیار کے اس قہقہہ کی سُریلی آواز شاہی محلات میں جا پہنچی۔ سکھیاں خوشی سے ناچنے لگیں، شادیانے بجنے لگے، سارا محل خوشی سے جھوم اُٹھا، جنگل مستی سے سرشار ہوگیا۔

دونوں شادی کی ڈور میں بندھ گئے۔

ناراین کو رنگ پور آئے ہوئے دو سال بیت گئے۔ وہ اتنے دنوں سے برابر اسی ماحول میں رہ رہا تھا۔ وہی ندی نالے، وہی چشمے اور جھرنے، پہاڑ اور برف ان ہی کو ہمیشہ دیکھتا۔ وہی محل، وہی داسیاں، وہی جنگل اور درخت، وہی راجہ اور اس کی لڑکی۔ نہ شہر کی چل پل، نہ بستی کی چہل پہل۔ نہ سینما نہ کلب، اپنا کوئی عزیز اور رشتہ دار نہیں۔ اس کا دل اس زندگی سے اوبنے لگا۔ وہ اداس اور غمگین رہنے لگا۔

پاربتی اس کی دلی حالت کو سمجھ گئی۔ اس کے جوتشی نے اُسے سمجھایا تھا کہ اگر وہ ایک بار وہاں سے چلا گیا پھر لوٹ کر نہیں آئے گا، اُسے اپنے ساتھ نہیں لے جائے گا۔

ایک دن جب وہ دونوں پل پر کھڑے ندی کے بہاؤ کو دیکھ رہے تھے تو ناراین بولا

"پاربتی! میں چند دنوں کے لئے اپنے گھر جانا چاہتا ہوں۔"

"یہ گھر نہیں؟" پاربتی ندی کو تکتی ہوئی بولی

"میں اپنے ماتا پتا سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ سمجھتے ہوں گے کہ کہیں مر مرا گیا ہوگا۔ اتنے دنوں کے بعد مجھے دیکھ کر وہ کتنے خوش ہوں گے۔"

"تو میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے؟ میں جلد لوٹ آؤں گا۔"

"میں بھی تو اپنے ماتا پتا کو دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"ماتا پتا کو!" وہ گھبرا کر بولا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ پرانے لوگ ہیں۔ وہ اچانک اس صورت حال کو قبول نہ کر سکیں گے۔

"کیا بات ہے؟"

"میں جب لوٹ کر آؤں گا، تمہیں پھر لے جاؤں گا۔"

"میں تو ساتھ جاؤں گی اور ابھی۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ جلد لوٹ آؤں گا۔"

"مجھے آپ کے وعدہ پر تو اعتبار ہے لیکن خود پر نہیں۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ آپ کے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتی۔"

"ایک آدھ مہینے کی تو بات ہے۔"

"میں ایک دن بھی نہیں رہ سکتی۔"

"اتنی سمجھدار ہوکر ایسی بات کر رہی ہو۔"

"سمجھدار ہونے کے سبب ہی تو ایسا کہہ رہی ہوں۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"دراصل بات یہ ہے۔ . . ." وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن فوراً سنبھل کر بولی۔ "بات یہ ہے کہ آپ کے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتی۔"

"پاربتی! تمہیں سمجھ سے کام لینا چاہیئے۔"

"سمجھ سے کام لے رہی ہوں، اسی لئے آپ کو جانے سے روک رہی ہوں۔"

"لیکن مجھے ضرور جانا ہے۔"

"مجھے ساتھ لے کر۔" پاربتی نے جواب دیا۔

"یہ بچوں کی سی ضد ہے۔" وہ ناراض ہو کر بولا

"اس ضد کو نبھانا بڑوں کا فرض ہو جاتا ہے۔"

"لیکن تم بچی نہیں، بڑی ہو۔"

"تب میری بات مانو۔"

"یہ ناممکن ہے۔"

"تو آپ کا اکیلے جانا بھی ناممکن ہے۔"

"میں تو جا رہا ہوں اور ابھی۔"

یہ کہہ کر وہ محل کی طرف بڑھا۔

اس وقت پیچھے سے ایک دھماکے کی آواز آئی۔ اس نے گھبرا کر پیچھے دیکھا پاربتی وہاں نہ تھی۔ اس نے نیچے دیکھا۔ وہ پانی کے تیز بہاؤ کے ساتھ ہی جا رہی تھی۔

"پاربتی!" وہ چلایا۔ "پاربتی! پاربتی!!"

"لیکن اسی وقت اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ اس کا جسم پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔



مائع اونس	ملی لیٹر (قریب ترین ملی لیٹر میں)
۱	۲۸
۲	۵۷
۳	۸۵
۴	۱۱۴
۵ (= ۱ گل)	۱۴۲

گل	ملی لیٹر (قریب ترین ملی لیٹر میں)
۱	۱۴۲
۲	۲۸۴
۳	۴۲۶
۴ (= ۱ پائنٹ)	۵۶۸

پائنٹ	لیٹر	ملی لیٹر (قریب ترین ملی لیٹر میں)
۱	-	۵۶۸
۲ (= ۱ کوارٹ)	۱	۱۳۶

کوارٹ	لیٹر	ملی لیٹر (قریب ترین ملی لیٹر میں)
۱	۱	۱۳۶
۲	۲	۲۷۳
۳	۳	۴۰۹
۴ (= ۱ گیلن)	۴	۵۴۶

گیلن	لیٹر	ملی لیٹر (قریب ترین ۱۰ ملی لیٹر میں)
۱	۴	۵۵۰
۲	۹	۹۰
۳	۱۳	۶۴۰
۴	۱۸	۱۸۰
۵	۲۲	۷۳۰
۶	۲۷	۲۸۰
۷	۳۱	۸۲۰
۸	۳۶	۳۷۰
۹	۴۰	۹۱۰
۱۰	۴۵	۴۶۰

گیلن	لیٹر	ملی لیٹر (قریب ترین ۱۰۰ ملی لیٹر میں)
۲۰	۹۰	۹۰۰
۳۰	۱۳۶	۴۰۰
۴۰	۱۸۱	۸۰۰
۵۰	۲۲۷	۳۰۰
۶۰	۲۷۲	۸۰۰
۷۰	۳۱۸	۲۰۰
۸۰	۳۶۳	۷۰۰
۹۰	۴۰۹	۱۰۰
۱۰۰	۴۵۴	۶۰۰

ملی لیٹر	مائع اونس (قریب ترین ۱/۴ مائع اونس میں)
۱۰	½
۲۰	¾
۳۰	۱
۴۰	۱½
۵۰	۱¾
۶۰	۲
۷۰	۲½
۸۰	۲¾
۹۰	۳¼
۱۰۰	۳½

لیٹر	گیلن	کوارٹ	پائنٹ	گل (قریب ترین گل میں)
۱	-	-	۱	۳
۲	-	۱	۱	۲
۳	-	۲	۱	۱
۴	-	۳	۱	-
۵	۱	-	-	۳
۶	۱	۱	-	۲
۷	۱	۲	-	۱
۸	۱	۳	-	-
۹	۱	۳	۱	۳

ملی لیٹر	پائنٹ	گل	مائع اونس (قریب ترین ۱/۴ مائع اونس میں)
۲۰۰	-	۱	۲
۳۰۰	-	۲	½
۴۰۰	-	۲	۴
۵۰۰	-	۳	۲½
۶۰۰	-	۴	۱
۷۰۰	۱	۰	۴½
۸۰۰	۱	۱	۳½
۹۰۰	۱	۲	۱½
۱۰۰۰ (= ۱ لیٹر)	۱	۳	-

لیٹر	گیلن	کوارٹ	پائنٹ (قریب ترین پائنٹ میں)
۱۰	۲	۱	-
۲۰	۴	۱	۱
۳۰	۶	۲	۱
۴۰	۸	۳	-
۵۰	۱۱	-	-
۶۰	۱۳	۱	-
۷۰	۱۵	۱	۲
۸۰	۱۷	۲	۱
۹۰	۱۹	۳	-
۱۰۰	۲۲	-	-

میٹرک نظام اختیار کیجئے

آسانی و یکسانی کے لئے

جاری کردہ بھارت سرکار

DA-59/377

ڈال ڈال کے پات

(چودھری محمد علی (ردولوی) — ایک خاکہ — ہما بیگم

چودھری محمد علی صاحب بڑے نفیس مزاج، بہت بامذاق، خوش دل، خوش گفتار اور جوانی میں تیز، بڑھاپے میں بھی بہت خوش لباس، خوش وضع اور بہت ہی خوبصورت اور منشیٰ آدمی سمجھے جاتے تھے۔ سوشل اتنے تھے کہ یو، پی کا شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جو چودھری صاحب کو نہ جانتا ہو۔ دوستوں سے دوستی بنائے رہنا اور ان کو ان کی پیٹھ پیچھے بھی دل سے چاہنا ان کا خاص حصّہ ہے۔ جو دوست ان کے مر گئے ہیں ان کے لئے اس طرح روتے ہیں جیسے کوئی اپنے عزیز قریب کے لئے روتا ہے۔

علمی شوق اور مشغل بھی اس حد تک تھے کہ گھر پر سوائے پڑھنے لکھنے کے اور کام ہی کیا تھا۔ نوکری کبھی کی نہیں۔ ایک مرتبہ جوانی میں شوقیہ بنک میں نوکری کی تھی مگر وہ گاڑی چلی نہیں۔ طبیعت کے خلاف حساب کتاب کا کام اور کسی کی پابندی یہ ان کے خمیر میں ہی نہ تھا۔ بیمار ہو گئے چھوڑ کر گھر چلے گئے کتابیں ہزاروں کی منگا کر پڑھ ڈالیں۔ عربی، فارسی، ہندی، انگریزی کوئی زبان اور مضمون ایسا نہیں ہے جس میں چودھری صاحب نے خاص قابلیت نہ پیدا کی ہو۔ علمی مباحث بڑے بڑے انگریزی دان اور بڑے بڑے عربی دان علماء سے برابر کے ہوتے تھے اور اکثر چودھری صاحب صحیح ہوتے۔ ڈاکٹری میں بھی بہت زیادہ دخل تھا۔ اکثر امراض میں جہاں بڑے بڑے ڈاکٹر رائے قائم کرنے سے قاصر رہتے چودھری صاحب فوراً صحیح رائے قائم کر کے تشخیص مرض کر دیتے۔ کتابیں جتنی پڑھتے تھے زیادہ تر ان کو یاد رہ جاتی تھیں۔ ذہانت اور یادداشت کی یہ کیفیت تھی کہ ایک مرتبہ کہیں مشاعرے میں گئے وہاں جتنے شعر ان کو اچھے لگے وہ سنتے گئے اور رومال اور کمر بند میں گرہ لگاتے گئے۔ گھر واپس آئے تو گرہ کھولتے گئے اور اشعار لکھتے گئے۔

گانے کا، اشعار کا اور دوسرے ادبی مضامین کا مذاق اتنا عمدہ تھا کہ لوگوں کو اشتیاق رہتا تھا کہ چودھری محمد علی سے ایک بار مل لیں۔ باتیں ایسی عمدہ کرتے کہ ایک مرتبہ ملنے کے بعد کوئی کبھی ان کو بھول نہیں سکتا خصوصاً پڑھی لکھی عورتیں جب مل جاتی تھیں تب تو چودھری صاحب ہنستا پھول بکنی کلی ہو جاتے تھے اور ایسی دلآویز، دلچسپ اور رنگ برنگی باتیں کرتے تھے کہ مرد تو مرد، لڑکیاں، جوان عورتیں سب لوٹ پوٹ ہو جاتی تھیں اور چودھری صاحب کا کلمہ پڑھنے لگتی تھیں۔ ہم لوگ اکثر ردولی سے لکھنؤ جاتے اور دو دو مہینے رہتے۔ وہاں سب سے ملنا جلنا رہتا۔ ایک مرتبہ چودھری صاحب نے اپنے استاد کی لڑکی کو جو ۲۳ سال کی رہی ہوگی کھانے پر بلایا اور بڑی تعریفیں کیں کہ بڑی خوبصورت ہے — پڑھی لکھی ہے وغیرہ وغیرہ۔ کھانے پر وہ آئیں۔ ہم لوگ ملے۔ خاص بات نظر نہیں آئی۔ بعد میں ذکر چھڑا تو ہم سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ خوبصورت تو وہ بالکل نہیں ہے اور عمر بھی خاصی ہے تو بہت تنبیہاً ہم سب کی طرف دیکھا اور مسکرا کر کہنے لگے کہ تم عورتیں کبھی کسی دوسری عورت کو کم سن نہیں بتاتیں اور نہ ہی تم سے دوسری عورت کی تعریف ہوتی ہے۔ ہمیشہ یہ چاہتی ہو کہ دس برس تم سے بڑی نکلے۔ اور کہیں آنکھ ناک میں کوئی کجی ضرور ہو۔ اس کے بعد فرمانے لگے کہ واللہ میں نے آج تک کوئی عورت بد صورت دیکھی ہی نہیں۔ عورت کیسی ہی کیوں نہ ہو مجھے اچھی لگتی ہے۔ ہم لوگ چپ ہو گئے اب اس کے بعد کہہ ہی کیا سکتے تھے۔

جوانی میں پھولوں کا، عمدہ کپڑوں کا، بہترین عطر کا بڑا شوق رہا۔ جامہ دار جامدانی کی شیروانی اور انگرکھے پہنتے تھے۔ مشک اور اگر وغیرہ کے سب قیمتی عطر استعمال کرتے تھے۔ بیلے چنبیلی کے پھولوں کا پورا بستر لگتا تھا

جس پر آرام فرماتے تھے۔ حقہ ایسا پیتے تھے کہ اس کا مثل شاید ہی کہیں دکھائی دے۔ خود ردولی میں پیچے بند کو سمجھا کر پتلی نے کے بڑے سبک اور خوبصورت نیچے بنواتے تھے۔ لکھنؤ وغیرہ میں دوستوں کو بھی بھیجا کرتے تھے۔ چاندی کا چنبر نیچے، چاندی کی تھالی جس میں رنگ برنگ کے پھول نفاست سے رکھے ہوئے اور چاندی ہی کا حقہ بھی۔ بیلے کے پھولوں کا ہار نے میں لپٹا ہوا عجب بہار دکھاتا تھا۔ تمبا کو لکھنؤ کا بڑا عمدہ خمیرہ جس کی خوشبو دور تک پھیلی ہوئی ان کی شئے لطیف (FineArt) سے گرویدگی کا پتا دیتی تھی۔

(ادبی دنیا)

محمد علی ردولوی — ایک مطالعہ — صلاح الدین احمد

محمد علی کا میدانِ تگ و تاز اودھ کی قصباتی فضا اور اس کی نرم رو زندگی ہے۔ اس فضا میں اس نے اپنی زندگی کے کم و بیش ستر برس گذارے ہیں اور یہ ایک فطری تقاضا تھا کہ وہ اپنے فنی کارناموں میں اس فضا کا عکس پیش کرے۔ دنیا میں جتنے بڑے فن کار گذرے ہیں سب نے ایسا ہی کیا ہے اور جب تک ادب میں خالص فن کی قدریں باقی ہیں ایسے فن پاروں کو عظمت و عزت کے وہ مقامات حاصل رہیں گے جو فطری طور پر ان کا حق ہیں۔ آپ میں سے جن حضرات نے والٹر اسکاٹ کا 'آئی ون ہو' پڑھا ہے یا ایملی برانٹی کی 'وُدرنگ ہائٹس' یا گورکی کی 'خزاں کی ایک رات' یا موپساں کی 'دنیی' یا کالی داس کی 'شکنتلا' کا مطالعہ کیا ہے یا سرت چندر کا 'انا پورنا کا مندر' دیکھا ہے ان سے میں یہ سوال کرنا چاہتا ہوں کہ اپنے مطالعے کے استغراق میں کیا انھوں نے یہ محسوس نہیں کیا کہ وہ کسی طلسمی جھولے میں بیٹھ کر خود اس دنیا میں پہنچ گئے ہیں جس دنیا میں ان کا داستان گو سانس لے رہا ہے۔ وادیٔ نربدا کے کسی لہلہاتے ہوئے جنگل کی معطر گپھائیں ہوں یا شمالی برطانیہ کے ویران پہاڑی قلعوں کی سنگین اور کپکپاتی ہوئی نیم روشن خلوتیں، ہمارے حواسِ ظاہری نے دونوں میں سے کسی ایک کو محسوس نہیں کیا۔ لیکن فن کار کی طلسمی چھڑی کی ایک ہی جنبش سے ہم چشم زدن میں ان فضاؤں میں جا پہنچتے ہیں اور ان رومانوں اور کہانیوں کے کرداروں کے دل کی دھڑکنیں ہمارے اپنے دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہو جاتی ہیں اور ہیرو کی آنکھوں کی چمک اور ہیروئن کے سانس کی خوشبو ہمارے کلبۂ ذہن اور مشامِ جان میں سرایت کر جاتی ہے اور ہم ان کے رنج و راحت کے شریک اور اُن کے حاضر و غائب تک کے رفیق بن جاتے ہیں۔

اس کے خلاف آپ نے بیسیوں ایسے افسانے ملاحظہ کئے ہوں گے اور درجنوں ایسی کہانیاں پڑھی ہوں گی جو آپ کو بس یونہی چھوتی ہوئی سی گذر جاتی ہیں اور آپ کے دل یا دماغ پر اپنا کوئی نقش دیرپا نہیں چھوڑتیں۔ افسانے کی ان مختلف صورتوں میں فرق یہ ہے کہ اول الذکر کا خالق اپنی تخلیق کے عناصر میں کسی مقصد کو شامل نہیں کرتا۔ وہ جس طرح زندگی کو دیکھتا ہے جس طرح اُسے محسوس کرتا ہے عین اُسی طرح اسے اپنے تصور کے خلوص اور اظہار کی شدت کی تائید سے ہم تک منتقل کر دیتا ہے اور اس عملِ انتقال میں وہ اہلیت کم یاب جو اسے ارزانی ہوئی ہے اور جسے ہم فن کا نام دیتے ہیں بروئے کار آتی ہے اور اظہارِ محض کو حسنِ اظہار سے آراستہ کرتی اور سخن سادہ کو گرمیٔ گفتار عطا کرتی ہوئی اپنی منزل کو جا لیتی ہے۔ دوسری قسم کی تصانیف ان صاحبوں سے نسبت رکھتی ہیں جو فن کار نہیں بلکہ محض کاریگر ہوتے ہیں اور وہ ایک دئے ہوئے نمونے پر گاہک کے حسبِ منشا اس کے کام کی چیز تیار کر دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی مصنوعات سے زندگی کے ادنیٰ اور معمولی کام تو لئے جا سکتے ہیں لیکن وہ شئے لطیف جسے اہتزازِ نفس اور بالیدگیٔ روح کا منبع کہیئے اور جو سوز و ساز کی ہم رنگ کیفیتوں سے ہم آغوش ہوتی ہے ان کاریگروں کے تصور سے بھی ماوریٰ رہتی ہے اور عنقا کی طرح ان کی پست ہمتیوں پر اپنا سایہ بھی نہیں ڈالتی۔

اردو کے فن کار اور ادیبوں میں جو مادرِ فطرت کے آغوش میں پلے اور بڑھے ہیں اور جن کی سحر بیانی اسی کے سہانے بولوں کی مرہون اور جن کی فکر و دانش اسی کی بتائی ہوئی پہیلیوں کی ممنون ہے محمد علی ایک یکتا اور ممتاز حیثیت رکھتے ہیں میں نے یکتا کا لفظ پورے ارادے اور ذمہ داری سے استعمال کیا ہے۔ وہ اس لحاظ سے یکتا ہیں کہ وہ اپنے ذاتی مطالعے کی حدود سے کبھی باہر نہیں جاتے اور وہ اس اعتبار سے منفرد ہیں کہ بنیادی طور پر ایک قصہ گو ہیں اور ان کا کوئی قصہ کسی اڑتے ہوئے جذبے یا کسی ابلتی ہوئی تحریک سے جنم نہیں لیتا بلکہ ہمیشہ ان کے کسی خیال افروز مشاہدے یا اضطراب انگیز مطالعے کا نتیجہ ہوتا ہے اور وہ اس حیثیت سے بھی ایک امتیازِ خاص کے مالک ہیں کہ وہ فن کی حدود کو ایک بے مثال شانِ بے تکلفی سے عبور کر کے اپنے ناظر سے گھل مل جاتے ہیں گویا وہ خود قصہ نہیں لکھ رہے بلکہ وہ اور اُن کا پڑھنے والا دونوں ہاتھ میں ہاتھ دئے اس قصے میں سے روحانی طور پر

گزر رہے ہیں۔ یہ کیفیت انھیں سے خاص ہے۔ میری اس گذارش سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیئے۔ کہ وہ زندگی کے محض ایک چابک دست عکاس ہیں ہرگز نہیں۔ زندگی کی تصویر کھینچنے کے ساتھ ساتھ وہ اس تصویر میں لطیف اور نادر رنگ بھی بھرتے جاتے ہیں اور یہ رنگ اپنی شوخی ان کی شوخیٔ طبع اور سُرخی انھیں کے خونِ دل سے مستعار لیتے ہیں۔ زندگی کا ہر کامیاب مصوّر ایک دیدۂ بینا کے ساتھ ایک چشمِ باطن سے بھی بہرہ یاب ہوتا ہے۔ محمد علی کو بصارت کے ساتھ بصیرت بھی ارزانی ہوئی ہے۔ وہ ایک نادرہ کار مصوّرِ محسوسات ہونے کے ساتھ ساتھ ایک زیرک ماہرِ نفسیات بھی ہیں اور ان کے بیشتر افسانے، علم النفس خصوصاً اس کے جنسی پہلو کے بیش بہا مطالعات اور دستاویزات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ زندگی کی تصویر کشی وہ نہایت اخلاص سے کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کا پس منظر بھی نمایاں کرتے ہیں اور اس کی پہیلیوں کا حل بھی بتاتے ہیں۔ حقیقتاً وہ تصویر کشی کے لئے بھی زندگی کا وہی پہلو چنتے ہیں جس میں کوئی نفسیاتی خصوصیت پائی جاتی ہو اسی لئے ان کی تصویریں سپاٹ نہیں ہوتیں بلکہ وہ ناظر کے حواس پر چھا جاتی ہیں اور بیشتر اوقات اس پر حملہ بھی کر بیٹھتی اور اس کے پندار کو چھلنی چھلنی کر دیتی ہیں۔

(ادبی دنیا)

حیدرآباد کا سالار جنگ میوزیم

حیدرآباد کا سالار جنگ میوزیم اس اعتبار سے کہ وہ ایک فردِ واحد نواب میر یوسف علی خاں سالار جنگ سوئم کی کوششوں کا نتیجہ ہے، بے مثل ہے۔ مذکورہ عجائب گھر میں آرٹ کے وہ نادر خزانے محفوظ ہیں جو نواب موصوف نے اپنی حیات میں جمع کئے تھے۔

یہ عجائب گھر بنیادی طور پر دو شعبوں مغربی اور مشرقی پر مشتمل ہے۔ مشرقی آرٹ کے جو نمونے اس شعبے میں محفوظ ہیں ان میں قرآن شریف اور مشہور شعراء اور ادباء کی تصنیفات شامل ہیں۔ یہ تمام تصنیفات ماہرِ فن کاتبوں کی لکھی ہوئی ہیں اور ان پر حُسن کاری اور سجاوٹ بین الاقوامی شہرت کے مصوّروں نے کی ہے۔ ان میں سے بیشتر مسوّدے بے مثل ہیں۔ سالار جنگ خاندان کے ہاتھ آنے سے بیشتر یہ نسخے جن جن بادشاہوں کی لائبریریوں میں رہے ہیں ان کے دستخط ان مسودات پر موجود ہیں۔

میوزیم کا مشرقی شعبہ قدیم چینی (۱۰۰۰ - ۱۷۰۰ء) کی نادر اشیاء بھی سالار جنگ میوزیم کی زینت ہیں۔ اس میں مغل بادشاہوں اور شہزادوں کے ہتھیار بھی رکھے ہیں۔ ان ہتھیاروں کے پھلوں پر سونے چاندی سے پچی کاری کی ہوئی ہے۔ ان کے دستوں میں جواہرات جڑے ہوئے ہیں۔ یہ ہتھیار اپنی تاریخی اہمیت، پچی کاری اور میناکاری کی وجہ سے عوام اور ناقدین کو فوراً اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

قالین اور غالیچے مشرقی امراء کے محلات کا ہمیشہ سے ایک جزو رہے ہیں قسم قسم کے قالینوں کے نمونے ہمیں سالار جنگ میوزیم میں نظر آتے ہیں۔ ان میں شمال مغربی ایران، تبریز، شیراز، اصفہان اور ہرات کے قالین شامل ہیں۔ یورپ اور ہندوستانی قالینوں کے نمونے بھی ان قالینوں کے ساتھ رکھے گئے ہیں۔

مغربی شعبہ۔ سالار جنگ میوزیم کے مغربی شعبہ میں لوئی چہار دہم اور لوئی پانزدہم کے زمانے کا فرنیچر، شیشہ نما چینی کے برتن، ڈریسڈن کی چینی اور چینی مٹی کے برتن رکھے ہوئے ہیں۔ اس شعبے میں رکھا ہوا ایک اطالوی بُت تراش کا بنایا ہوا میفسٹوفیلیس (ابلیس) اور مارگریٹا کا بُت آرٹ کا بے مثل نمونہ ہے۔ یہ مجسمہ لکڑی سے بنایا گیا ہے۔

میوزیم میں مشہور بت تراش بنزدونی کا بنایا ہوا سنگ مرمر کا مجسمہ اپنی فنی تفصیل کے لئے ایک نادر فن پارہ ہے۔ اس شعبے میں مشہور یورپی مصوّروں کی بنائی ہوئی تصویریں بھی رکھی گئی ہیں۔

ع-م

نئی کتابیں اور رسالے

دیوانِ غالب اُردو

مرتب امتیاز علی عرشی۔ ناشر انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ۔ ضخامت ۶۳۲ صفحے۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۸۔ کتاب ٹائپ میں چھپی ہے۔ کاغذ، طباعت، جلد، جلد پوش اعلیٰ۔ قیمت بیس روپے۔

اس کتاب میں غالب کا تمام اردو کلام تاریخی ترتیب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ دیباچہ جس میں غالب کی زندگی کے حالات اور دیوان کے مختلف نسخوں کا ذکر ہے ۱۲۰ صفحوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے مرتب غالبیات کے مستند ماہرں میں سے ہیں۔ اس دیباچے میں انھوں نے متعدد نئی معلومات بھی درج کی ہیں۔

دیوانِ غالب کے مندرجہ ذیل نسخے اس نسخے کی ترتیب کے دوران میں مرتب کے زیرِ مطالعہ رہے ہیں۔ نسخۂ بھوپال ۱۸۲۱ء، نسخۂ شیرانی ۱۸۲۶ء، گلِ رعنا ۱۸۲۹ء نسخۂ رام پور ۱۸۳۳ء، پہلا مطبوعہ ایڈیشن ۱۸۴۱ء، دوسرا مطبوعہ ایڈیشن ۱۸۴۷ء، نسخۂ لاہور ۱۸۵۲ء، نسخۂ رام پور ۱۸۵۵ء تیسرا مطبوعہ ایڈیشن ۱۸۶۱ء، چوتھا مطبوعہ ایڈیشن ۱۸۶۲ء، پانچواں مطبوعہ ایڈیشن ۱۸۶۳ء، انتخابِ غالب ۱۸۶۶ء، نسخۂ حمیدیہ ۱۹۲۸ء، لطیف ایڈیشن ۱۹۲۸ء، کتاب کے آخر میں شرح غالب، فہرست اشعار اور اشاریے کے تحت مفید مندرجات ہیں۔

شرح غالب — اس عنوان کے تحت اشعار کی وہ تمام تشریحیں جمع کی گئی ہیں جو مرزا صاحب نے احباب کے استفسار پر تحریر کی تھیں نیز ان کے خطوں کے وہ حصے بھی اس زمرے میں شامل کر لئے گئے ہیں جن میں انھوں نے اپنا کوئی شعر استشہاداً لکھا تھا۔ عنوانِ شرح کے تحت مرزا کے تمام متحد المضمون فارسی و اردو اشعار بھی درج کر دئے ہیں۔

فہرست اشعار — آخر میں ایک فہرست اشعار ہے جس میں دیوان کی تمام مستقل چھوٹی بڑی نظموں کا پتہ ان کے پہلے شعر سے دیا گیا ہے۔ اس کی ترتیب حروفِ تہجی پر رکھی گئی ہے۔

اشاریے — فہرست اشعار کے بعد تین اشاریے ہیں۔ ان میں سے پہلا اشخاص، اقوام اور فرقوں کا ہے دوسرا مقامات کو ظاہر کرتا ہے اور تیسرے میں کتب و رسائل مذکور ہوئے ہیں۔

تصویریں — اس نسخے میں چار تصویریں شامل کی گئی ہیں۔ دو غالب کی اور دو دیوان کے مخطوطوں کے ایک ایک صفحے کی۔ غالب کی خیالی تصویر عبدالرحمٰن چغتائی کے مُوقلم کا نتیجہ ہے۔ دوسری تصویر اس فوٹو کی عکسی نقل ہے جو مرحوم شیخ عبدالقادر نے اپنے شائع کردہ دیوان غالب میں چھاپا تھا۔ یہ تصویر شیخ عبدالقادر مرحوم کو لالہ سری رام صاحب مؤلف خم خانۂ جاوید سے ملی تھی جو ان کو اپنے عم بزرگوار رائے بہادر پیارے لال صاحب آشوب سے ملی تھی۔ یہ عکسی تصویر رائے بہادر ممدوح کو مرزا غالب نے دی تھی۔

دیوانِ غالب کا یہ نسخہ موجودہ تمام نسخوں سے مستند ترین ہے۔ مرتب کا زندگی بھر کا مطالعہ اور کئی سال کی محنت اس کی ترتیب کی پشت پر ہے۔ ہر اچھی کتاب کے دستور و معمول کے مطابق اس کتاب کے ساتھ بھی غلط نامہ شامل ہے۔ یہ کتاب ہر اہلِ ذوق کے پاس ہونی چاہیئے اور کسی لائبریری کو اس سے خالی نہیں رہنا چاہیئے

انتخابِ ریاض خیرآبادی

از مظفر حسین شمیم۔ ناشر اردو اکیڈمی سندھ کراچی۔ ضخامت ۱۹۲ صفحے تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ، کتابت، طباعت، جلد، جلد پوش اوسط۔

قیمت ڈھائی روپے - اردو مرکز گنپت روڈ لاہور سے بھی کتاب مل سکتی ہے -

ریاض خیرآبادی اپنے رنگ کے منفرد شاعر تھے - امیر مینائی کے شاگردوں میں سے آپ کو بہت مقبولیت حاصل رہی ہے - کتاب میں سید عقیل احمد جعفری کے قلم سے ریاض کے حالاتِ زندگی اور مرتب کے قلم سے کلامِ ریاض پر طویل تبصرہ درج ہے -

تذکرۂ شعرائے قدیم نظم نگر (ترچناپلی)

از حسرت سہروردی - ملنے کا پتہ سیکرٹری تامل ناڈ اردو مجلس نشیمن نظم نگر ترچناپلی ۳ - قیمت ایک روپیہ - ضخامت ۹۶ صفحے - تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ طباعت، کتابت، جلد، جلد پوش اوسط -

حسرت سہروردی مدراس یونی ورسٹی میں اردو کے ریسرچ سکالر ہیں - اس کتاب میں انھوں نے شعرائے ترچناپلی کے حالات و کلام درج کئے ہیں - کتاب کے شروع میں پروفیسر عبدالقادر سروری کا مقدمہ ہے - حضرت نظم دہلی سے لے کر حضرت عبدالغفور رداؔ تک جن شعراء کا تذکرہ اس کتاب میں ملتا ہے ان کی زبان ایسی ہے کہ ان میں سے بیشتر دکن کے نہیں شمالی ہندوستان کے ہیں -

جدید فارسی شاعری

از منیب الرحمٰن - ناشر ادارۂ علوم اسلامیہ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ - ضخامت ۱۳۲ صفحے - تقطیع ۲۲×۱۸/۸ کتاب ٹائپ میں چھپی ہے - کاغذ اور طباعت عمدہ - کتاب کے آخر میں لغات مصادر، انگریزی الفاظ اور فہرست یعنی اشاریہ درج ہے - یہ مقالہ بڑی محنت سے لکھا گیا ہے - جدید فارسی شاعری کی ابتدا تقریباً ۱۹۰۶ء سے ہوتی ہے جب ایک مختصر سی جدوجہد کے بعد ملک کے قوم پرست بادشاہِ وقت مظفرالدین شاہ سے اپنی مانگیں منوانے میں کامیاب ہوئے - اس سے پہلے فارسی شاعری اپنی انحطاطی شکل میں بھی روایت کی توانائی رکھتی تھی - جدید فارسی شاعری میں بھی روایت پر ضرورت سے زیادہ زور دیا گیا ہے مگر اس کے خلاف نئے امکانات کی جستجو بھی جاری ہے - جدید فارسی شاعری کے پیش روؤں میں ملک الشعراء بہار کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے - اس کے بعد فرخی، ابوالقاسم عارف، ایرج، عشقی، پروین اعتصامی، فریدوں توللی، فرخ زاد اور کتنے ہی جدید فارسی شعراء کا ذکر ہے -

سلکِ گہر

صالحہ عابد حسین کے مضامین کا مجموعہ - پبلشر رائے صاحب رام دیال اگروالا کٹرہ الہ آباد ۲ - قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے - ضخامت ۱۷۲ صفحے تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ کتابت، طباعت، جلد، کاغذ اوسط -

یہ مضامین گذشتہ ۵ سال میں وقتاً فوقتاً لکھے گئے اور مختلف جلسوں اور مجالس عزا میں پڑھے گئے - ان مضامین میں مصنفہ نے کوشش کی ہے کہ اسلام کی درخشندہ و بے مثال ہستیوں کی زندگی اور سیرت کی ایک جھلک سیدھے سادے انداز میں پیش کی جائے -

چاند تارے

مرتب بزمِ ریاض الادب کوٹری - ملنے کا پتہ مکتبہ اشاعت اردو کوٹری، مغربی پاکستان - قیمت دو روپے آٹھ آنے - ضخامت ۱۹۲ صفحے تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ کتابت، طباعت، کاغذ اوسط -

اس کتاب میں کامل صدیقی کی غزلیں اور نظمیں، وفا راشدی کے مقالات و مکاتیب، افضل سدوزئی کے افسانے، جلیل احمد صدیقی کے کہانیوں کے ترجمے اور شاد کلکتوی کا مزاحیہ کلام درج ہے -

کشمیری زبان اور شاعری

مصنف عبدالاحد آزاد - پبلشر کلچرل اکادمی جموں و کشمیر، سری نگر - ضخامت ۲۱۸ صفحے - تقطیع ۲۲×۱۸/۸ کاغذ، کتابت، طباعت عمدہ قیمت پانچ روپے -

اپنے موضوع پر یہ پہلی اور جامع کتاب ہے - عبدالاحد آزاد مرحوم نے کشمیری شاعری کو پہلی بار طبقاتی سماج کا احساس و ادراک عطا کیا - وہ پہلے شخص تھے جن کے دل میں کشمیری زبان اور ادب کی ترقی و ترویج کی پُرخلوص تڑپ تھی - وہ خود مہجور کی شخصیت سے متاثر تھے - آزاد مرحوم نے مسلسل کوشش سے جو مسودات تیار کئے انھیں سے یہ کتاب مرتب ہوئی ہے - تجویز یہ ہے کہ ان مسودات کو تین جلدوں میں شائع کیا جائے - یہ کتاب پہلی جلد ہے - کتاب قابلِ مطالعہ ہے -

منتخب کشمیری منظومات

چھ جلدوں میں شمس فقیر، آزاد، حبہ خاتون، حقانی، وہاب مقبول کرالہ واری کشمیری زبان کے مشہور شعراء کا کلام اردو ترجمے کے ساتھ کلچرل اکادمی جموں و کشمیر نے شائع کیا ہے - کتابیں حسین و جمیل چھپی ہیں - ہر ایک کتاب کی قیمت ایک روپیہ پچاس نئے پیسے ہے -

سبدِ گل

۱۴- نومبر کو پنڈت جواہر لال نہرو کے جنم دن کی تقریب میں بخشی غلام محمد صاحب وزیر اعظم کشمیر کی سرکاری قیام گاہ پر ایک محفلِ مشاعرہ منعقد ہوئی جس میں فارسی، اردو، کشمیری، گلگتی، ڈوگری اور ہندی کے شعراء نے شرکت کی۔ اس مشاعرے میں پڑھی گئی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ 'سبدِ گل' کے نام سے کلچرل اکادمی جموں و کشمیر نے شائع کیا ہے۔ ضخامت ۲۰×۲۶/۸ کے ۶۴ صفحے۔ قیمت کتاب پر درج نہیں۔

شعر و حکمت

حکیم نیر واسطی کے کلام کا مجموعہ۔ ناشر رضی الدین۔ ادارہ مطبوعات مجلس بوعلی سینا بیرون مستی گیٹ لاہور۔ قیمت تین روپے۔ تقطیع ۲۲×۱۸/۸ ضخامت ۱۶۰ صفحے۔ کاغذ، طباعت، کتابت، جلد نہایت عمدہ۔

حکیم نیر واسطی اختر شیرانی کے عاشقوں میں سے ہیں اور وہی رنگ ان کے کلام پر بھی غالب نظر آتا ہے۔ نظم ہو یا غزل یہ فن کی پختگی کو کہیں چھوڑتے نہیں۔ محرابِ حرم کے عنوان سے اسلامیات سے متعلق بہت اچھی نظمیں اور نعتیں ہیں۔ نیر ہی کا ایک شعر کلامِ نیر کی بہترین داد ہے

تو روحِ قدس کا ہم نوا ہے
نیر تری شاعری کی کیا بات

برگِ آوارہ

حبیب جالب کے کلام کا مجموعہ۔ ناشر مکتبۂ کاروان، ایبک روڈ، انارکلی لاہور۔ کاغذ، کتابت، طباعت، جلد پوش نہایت عمدہ۔ قیمت تین روپے

کتاب بڑی تقطیع کے ۱۲۶ صفحوں پر مشتمل ہے۔ حبیب جالب پاکستان کے نوجوان شاعر ہیں۔ مشاعروں کو اپنے دلآویز ترنم سے لوٹتے ہیں لیکن صرف یہی نہیں ان کے کلام میں بھی نیاپن ہے، رس ہے اور اس کے ساتھ پیچ بھی ملاحظہ ہو۔

اجنبی دیاروں میں پھر رہے ہیں آوارہ
اے غمِ جہاں تو نے یہ بھی دن دکھائے ہیں

گھنی چھاؤں ہے دو گھڑی بیٹھ لو — کڑی دھوپ میں جاؤ گے کس کے پاس
نہ وہ ادائے تکلم نہ احتیاطِ زباں — مگر یہ ضد کہ ہمیں اہلِ لکھنؤ کہیے

ایک اور رنگ بھی ملاحظہ فرمائیے:۔

لال دین کی کوٹھی دیکھی رنگ بھی جس کا لال
شہر میں رہ کے خوب اڑائے دہقانوں کا مال
اور مجھے اجداد نے بخشی مجھ کو یہ جاگیر
روئے بھگت کبیر

شعر و ادب

سید اختر علی تلہری کے ادبی مضامین کا مجموعہ۔ ملنے کا پتہ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ۔ قیمت تین روپے۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ صفحے ۲۰۶۔

اس مجموعے میں مصنف کے ۹ علمی مضامین شامل ہیں جن کے عنوانات یہ ہیں اردو شاعری اور گل و بلبل، مشاعروں کی افادیت، انسانیت پسند ادب، ڈینٹے کا سرمایۂ شاعری و ادب، موازنۂ مومن و غالب، مسدسِ مد و جزرِ اسلام، اثر لکھنوی کی غزلیہ شاعری، علامہ عاملی کی فارسی و عربی شاعری۔ مصنف کا نام ہی مضامین کی جامعیت کی ضمانت ہے۔ حال ہی میں یو، پی گورنمنٹ نے اس کتاب پر مصنف کو انعام بھی دیا ہے۔

مجاز و حقیقت

از پروفیسر نکہت شاہجہان پوری پبلشرز رائے صاحب رام دیال، اگروال کٹرہ الہ آباد۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ ضخامت ۷۲ صفحے۔

یہ کتاب نکہت صاحب کی نظموں اور آخر میں تجربات و تجزیۂ شعری پر مشتمل ہے۔ سب سے دلچسپ حصہ بزمِ رومان کے عنوان سے سراپائے محبوب ہے

گلچین

مصنف صفدر آہ سیتاپوری۔ ناشر کتاب کدہ ۱۳۰ والکیشور روڈ بمبئی ۶۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ ضخامت ۸۴ صفحے تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ اوسط۔ کتابت و طباعت عمدہ۔ کتاب مجلد ہے۔

کتاب کے مصنف جناب صفدر آہ سیتاپوری کہنہ مشق شاعر اور صاحب علم ادیب ہیں۔ اس کتاب میں موصوف کی ۷ نظمیں شامل ہیں۔ صفدر آہ صاحب کی جملہ نظمیں تنوع، ترقی پسند شعور، افادیت اور فکری توازن کا بہت اچھا نمونہ ہیں۔ صرف ایک نظم ملاحظہ ہو "ابن آدم کا عزم"

یہ خارزارِ جہاں صاف کر رہا ہوں میں
زمین پہ ہے بنانا مجھے خود اپنا بہشت

تیرے بہشت کو ٹھکرا کے میں نکل آیا
میں آدمی ہوں اطاعت نہیں ہے میری سرشت
نہیں وہ چاہیئے جو ہاتھ اُٹھا کے ملتا ہے
چمن ہو اپنا گل اپنے ہوں اور اپنی کِشت
مقدرات کی گھتی ہے اب تو عقیق نفس
شکستہ کرنا ہے زنجیر حلقہائے نوشت
میں آرہا ہوں سنبھال اپنے چاند تاروں کو
لگے گی اوجِ ثریا پہ خاکِ ارض کی خشت
وہ دیکھ میرے ہراول فضا سے آگے ہیں
کشش کی ٹوٹ چکی ہے ہر ایک قیدِ نوشت
نہ کر سکیں گے حکومت اب عقلِ انساں پہ
محافظانِ حرم اور لعبتانِ کنشت

نغمۂ حسرت

حسرت موہانی کے شاگردِ رشید جناب شفقت کاظمی کی غزلوں کا مجموعہ ناشر محمد افضل صاحب یدر مالک علمی کتب خانہ مظفر گڑھ، پاکستان - قیمت تین روپے - تقطیع ۲۰ × ۳۰/۱۶ - ضخامت ۱۸۴ صفحے - کتابت طباعت، جلد اوسط -

شفقت کاظمی کی غزلوں میں سوز و گداز ہے - حسن کا احساس ہے اور عشق کی عظمت کی جھلک بھی - موصوف اس نکتے کو بخوبی سمجھتے ہیں کہ غزل کی زبان کیا ہونی چاہیئے - چند اشعار ملاحظہ ہوں

زندگی موردِ الزام نہیں — میری تقدیر میں آرام نہیں
بات اربابِ جفا کی جو کہیں چل نکلے — غیر ممکن ہے کہ ہم ذکر تمھارا نہ کریں
اب طبیعت کہیں نہیں لگتی — شوقِ ناکام کی دہائی ہے
تجھ پہ آیا دلِ شیدا یجوں کر — تیری چاہت کا سبب یاد نہیں
وہاں سو یا کیے بے فکر کوئی — یہاں شب بھر منا جاتیں رہی ہیں

مہ لقا

مرتبہ ثمینہ شوکت ام اے لکچرار اردو زنانہ کالج عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد - ناشر نیشنل فائن پرنٹنگ پریس ۴ کمان حیدرآباد دکن - تقطیع ۲۰ × ۳۰/۱۶ ضخامت ۱۸۰ صفحے - قیمت دو روپے پچاس نئے پیسے -

مہ لقا بائی چندا حیدرآباد کی ایک صاحبِ دیوان شاعرہ تھیں یہ کتاب ان کے حالات اور مجموعۂ کلام پر مشتمل ہے -

صحت کی کہانی ایک ڈاکٹر کی زبانی

از ڈاکٹر محمد نصیرالدین - شائع کردہ سوسائٹی پبلشنگ ہاؤس زین پیرا ۱۹۸ ڈی - پی ، ای ، سی سوسائٹی کراچی ۲۹ -

کتاب ۲۰ × ۳۰/۱۶ کے ۴۹۶ صفحات پر مشتمل ہے - کاغذ، کتابت، طباعت اوسط، کتاب مجلد ہے - قیمت ۵ روپے - اردو میں اس قسم کی فنی کتابیں کم ہیں - یہ کتاب بہ لحاظ مندرجات بڑی جامع اور مفید ہے - صحت اور مرض سے لے کر مختلف امراض اور ان کو دور کرنے کے طریقے اس کتاب میں شرح و بسط سے درج ہیں -

بٹوارہ (ناول)

مصنف سی، ایل کاوش - ضخامت ۳۵۲ صفحات ناشر تاجر کتاب گھر سانتا کروز (ایسٹ) بمبئی - کتابت و طباعت اچھی ہے - قیمت درج نہیں تعارف خواجہ احمد عباس نے لکھا ہے -

ناول ایک شرنارتھی خاندان کی کہانی ہے جو تقسیمِ ملک کے بعد صوبہ سرحد سے آکر ڈیرہ دون میں آباد ہو گیا ہے - اس خاندان کے سربراہ دھنی رام کی دوائیوں کی دکان ہے - بازار کے دوسرے دکاندار دوائیاں بلیک مارکیٹ میں فروخت کرتے ہیں مگر دھنی رام ایمان دار ہے اور اسی وجہ سے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے - بڑا بیٹا رام سروپ لالچ میں آکر بلیک مارکیٹ شروع کر دیتا ہے اس وجہ سے جھگڑا ہوتا ہے اور بٹوارہ ہو جاتا ہے - رام سروپ آدھا مکان اور پوری دکان ہڑپ کر لیتا ہے - دوسرے بھائی رام اوتار اور رام نرائن ماں سہاگی اور دادا بیرا خاں اکٹھے رہ جاتے ہیں اور مکان کے آنگن میں دیوار چُن دی جاتی ہے مختلف اتار چڑھاؤ کے بعد بچھڑے ہوئے مل جاتے ہیں اور دیوار ڈھا دی جاتی ہے -

بیرا خاں کو ڈیرہ دون میں اپنے وطن پشور کی یاد آتی ہے - مصنف نے بڑے مؤثر انداز میں بوڑھے کے جذبات کی عکاسی کی ہے - سب سے جاندار کردار سہاگی کا ہے جس کی ممتا کسی رکاوٹ اور بندھن کو خاطر میں نہیں لاتی اور بالآخر بچھڑوں کو ملا دیتی ہے - رام اوتار اور اس کی بیوی کا کردار کم و بیش مثالی ہے - چندا اس کا جیوتشی بن کر اور رام نرائن کا پولیس انسپکٹر بن کر سیٹھ ہرجی مل کو بے وقوف بنانا

ہندوستانی فلموں کی یاد دلاتے ہیں۔ ان واقعات کا اصل قصہ سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ بہرحال گھریلو جھگڑوں، معاشی مجبوریوں اور سماج دشمن عناصر کو مصنف نے بڑی خوبی سے اُجاگر کیا ہے اور آخر میں اشارہ کیا ہے کہ یہ صرف ایک خاندان کی نہیں ایک ملک کی کہانی ہے جس کا بٹوارہ ہو گیا ہے۔ (ش۔ح)

فنِ خطابت

مصنف سید کلب مصطفےٰ۔ ناشر ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ۔ ضخامت ۲۸۶ صفحات۔ قیمت ۵ روپے۔ مجلد مع گرد پوش۔ کتابت، طباعت اچھی۔

اردو زبان میں بہت سے موضوعات پر کوئی جامع اور مستند کتاب تو کیا ایسی کتاب بھی کمیاب ہے جو ایک عام قاری کی ضرورت کو پورا کر سکے۔ خطابت بھی ان ہی موضوعات میں سے ایک ہے اس لحاظ سے سید کلب مصطفےٰ صاحب کی یہ کوشش بڑی قابلِ قدر ہے۔ انگریزی کی تقریباً تین درجن کتابوں سے استفادہ کر کے مصنف نے سلیس اور عام فہم انداز میں بتایا ہے کہ خطابت کیا ہے ایک اچھے خطیب کے لئے کون سی باتیں ضروری ہیں اور ایک اچھی تقریر کو کن خوبیوں کا حامل ہونا چاہیئے۔

خطابت سے انھوں نے صرف مجمع کے سامنے تقریر کرنا مراد نہیں لیا ہے بلکہ روزمرّہ زندگی کے تمام پہلوؤں جیسے تجارت، وکالت اور سیاست کا احاطہ کیا ہے اور ہر پہلو کے متعلق مفید اور ضروری باتیں درج کی ہیں۔

کتاب نظری اور عملی دو حصّوں میں منقسم ہے۔ نظری حصے میں خطابت کی ابتدا اور ارتقا، اہمیت اور دوسرے علوم سے اس کے تعلق کا ذکر کیا گیا ہے۔ عملی حصّے میں خطابت کے مبادیات، مشق و محنت، حرکت و آواز اور مجمع کی نفسیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ کوئی شخص محض کتاب کے مطالعے سے کسی فن کا ماہر نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لئے خداداد صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر یہ بات بھی اتنی ہی درست ہے کہ مشق و محنت کے ذریعے بھی آدمی کسی فن میں کمال حاصل کر سکتا ہے اور مصنف نے ایسی کئی مثالیں دی ہیں۔

موجودہ جمہوری دور میں قدم قدم پر تقریر یا مخاطبت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسکولوں اور کالجوں، سماجی، مذہبی اور تجارتی اداروں سے لے کر مجالسِ قانون ساز تک ہر جگہ تقریر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ کتاب ان تمام لوگوں کے لئے مفید ثابت ہوگی جو اس فن کے مبتدی ہیں۔

مصنف نے اس کتاب میں بہت سے خطابیہ جملے، لطائف و ظرائف مجلسوں کے آئین و آداب اور مناسب موقعوں کے لئے اشعار بھی شامل کئے ہیں جس سے اس کتاب کی افادیت میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔ کتاب ناشر سے طلب کی جا سکتی ہے۔ (ش۔ح)

رسالے

پگڈنڈی سال نامہ ۱۹۵۹ء پبلشر ادبستان اردو ہال بازار امرتسر۔ قیمت دو روپے۔ مقالات نگاروں میں قاضی عبدالودود، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، مالک رام، منوہر سہائے انور، عبادت بریلوی اور کتنے ہی ممتاز لکھنے والے ہیں۔ افسانہ نگاروں میں سہیل عظیم آبادی، بلونت سنگھ، کوثر چاند پوری کا نام قابلِ ذکر ہے، جوش ملیانی، روش صدیقی، ندیم قاسمی، شمیم کرہانی اور جگن ناتھ آزاد حصّہ نظم کے چند ممتاز نام ہیں۔ طنز و مزاح میں کنہیا لال کپور اور غلام احمد فرقت کی تخلیقات شامل ہیں ۲۲۰ صفحوں پر مشتمل اس سال نامے نے معیاری ادب پیش کیا ہے۔

ساقی خاص نمبر (ادب آہنی پردے کے پیچھے) قیمت ڈھائی روپے۔ اشتراکی نظام کے تحت دنیا کا ایک بڑا حصہ ہے۔ اس خاص نمبر میں دنیا کے اس حصے کے ادب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان تمام مضامین کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ ان ملکوں میں جس قسم کے حالات رائج ہیں فن کار اور ادیب وہاں جس ماحول میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان حالات کے تحت کسی قسم کی ذہنی آزادی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

خاتونِ پاکستان — انقلاب نمبر۔ مدیرہ شفیق بریلوی۔ قیمت فی پرچہ ایک روپیہ ضخامت ۱۴۰ صفحے۔ ملنے کا پتہ پوسٹ بکس نمبر ۷۱۹۹ صدر کراچی۔

ماحول۔ ترتیب دینے والے۔ حمیدہ سلطان، ظفر ادیب۔ قیمت چار روپے سالانہ۔ ملنے کا پتہ ماحول اردو بازار دلی

کاروانِ ادب — اردو لٹریری سوسائٹی سینٹ زیویر کالج بمبئی کا سالانہ میگزین۔ ایڈیٹر پروفیسر این، ایس گوریکر۔ رسالہ ٹائپ میں چھپا ہے اور مضامین معیاری ہیں۔

جائزہ ۵ — اگست ۱۹۵۹ء پاک پبلیکیشنز ۴۔ امریکن لائف بلڈنگ میکلوڈ روڈ کراچی۔ چندہ سالانہ دس روپے۔ قیمت فی پرچہ ایک روپیہ۔ اس رسالے میں اچھی تحریروں کا ذمے دارانہ انتخاب درج ہوتا ہے۔ ڈائجسٹ قسم کا یہ رسالہ اچھے انتخاب کا حامل ہے

ادبی دُنیا — خاص نمبر۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے ایڈیٹر صلاح الدین احمد ملنے کا پتہ، دفتر ادبی دنیا مال روڈ لاہور، ضخامت ۲۰۸ صفحے۔ اختر شیرانی پر ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی کا مقالہ قابلِ مطالعہ ہے۔ محمد علی ردولوی کی یاد میں تین قابلِ قدر مضامین اس شمارے میں شامل ہیں۔ دیگر منظومات اور مضامین بھی بہت اچھے ہیں۔

موصولات

یادِ ضیاءؔ - مرتبہ پرکاش ناتھ پرویز، نابھہ، شملہ - ۶۰ صفحے کے اس کتابچے میں پروفیسر پرشوتم لال ضیاؔ مرحوم کی پانچ غزلیں، قطعاتِ "تاریخ" اور ماتمی نظمیں اور تاثرات درج ہیں -

موازنے - مرتبہ شرقی خالدی - صفحات ۴۷ - قیمت ایک روپیہ - ملنے کا پتہ - مایا بک ڈپو، انوارہ، بھوپال

سیرتِ طیبہ - سہ روزہ 'دعوت' دہلی کی خصوصی پیش کش - تعداد صفحات ۲۴۰ - قیمت ایک روپیہ پچاس نئے پیسے

ہند امروز و فردا - وزیرِاعظم پنڈت جواہر لال نہرو کے ان خطبات کا فارسی ترجمہ جو انھوں نے گذشتہ سال "آزاد میموریل لیکچرز" کے تحت دئے تھے اس کو تہران میں ہندوستانی سفارت خانے کے ادارۂ اطلاعات نے شائع کیا -

آنند امرت بانی اور **لاکھ لاکھ روپے کی ایک بات** } دونوں کتابوں کے مرتب اور مصنف ملک راج آنند ہیں - ملنے کا پتہ - آنند بک ڈپو در گیانہ تیرتھ امرت سر - قیمت فی کتاب ایک روپیہ ۵۷ نئے پیسے

شفیق اینڈ ہز آرٹ شفیق جونپوری کے فن پر انگریزی میں ۲۹ صفحے کا یہ کتابچہ عزیز ربانی عزیز نے مرتب کیا ہے -

---

زرعی پیداوار میں نمایاں اضافہ

مرکزی وزارتِ خوراک و زراعت کے محکمۂ زراعت کی سالانہ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ سال کے دوران میں زرعی پیداوار کا مجموعی عدد اشاریہ (بنیاد ۵۰-۱۹۴۹ء = ۱۰۰) ۵۷-۱۹۵۶ء کے عدد اشاریہ ۱۲۳ء۶ پر ۱۴ء۳ فی صد کے اضافے کے بعد ۱۳۱ء۰ ہوگیا - غلہ کی پیداوار ۷ کروڑ ۳۵ لاکھ ٹن تک پہنچ گئی جبکہ اس سے پہلے کسی سال میں اتنی زیادہ پیداوار نہیں ہوئی تھی - پٹ سن کی تقریباً ۵۲ لاکھ گانٹھیں پیدا ہوئیں - تیلہن کی پیداوار ۴۴ لاکھ ٹن ہوئی اور گنّے سے ۷ء۲ لاکھ ٹن گڑ تیار کیا گیا - صرف کپاس کی پیداوار ہی گذشتہ سال کی طرح سطح پر ساکن رہی -

دوسرے پنجسالہ پلان کے دوران میں کی گئی ترقیاتی کوششوں کے اثر کا، جو ۵۹-۱۹۵۸ء کی پیداوار میں اضافے کی شکل میں ظاہر ہوا ہے، ذکر کرتے ہوئے رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ مرکزی حکومت نے ریاستی حکومتوں کو ان کے زرعی پیداوار کے پروگراموں کے لئے مالی اور ٹیکنیکل امداد مہیا کرنا بدستور جاری رکھا - ۶۰-۱۹۵۹ء کے دوران میں ریاستوں کو مالی امداد مہیا کرنے کے لئے ۳۶ء۸۷ کروڑ روپے کی رقم مخصوص کی گئی - ۱۷ء۴۸ کروڑ روپے طویل المدّت قرضوں کے لئے، ۱۵ء۰۰ کروڑ مختصر المدّت قرضوں کے واسطے اور ۴ء۳۹ کروڑ روپے امدادی رقوم کی فراہمی کے لئے -

آج کل دہلی

احمق پھپھوندوی

(انتخاب)

پالسی کی ملک میں بھرمار رہنے دیجئے
بادشاہت کے لئے بیوپار رہنے دیجئے

ہیڈ کر دیجے عدو کو شہر میں لیکن مجھے
گاؤں کا اپنے ہی چوکیدار رہنے دیجئے

شیخ صاحب آپ پر کھلتا نہیں پتلون و کوٹ
بس وہی انگا وہی شلوار رہنے دیجئے

مجھ کو اپنا سست رو چھکڑا ہی کافی ہے حضور
آپ اپنی تیز موٹر کار رہنے دیجئے

کشتیٔ دل کی بحرِ آنسو میں
لاٹ صاحب نے ناخدائی کی

جوتے کھائیں گے صورتِ نمرود
ہے جنھیں آرزو خدائی کی

وہ جنازے پہ میرے کہتے ہیں
اب کہو کس نے بے وفائی کی

دل کیا ہم نے نذرِ لائڈ جارج
کیسے کھوسٹ سے آشنائی کی

مُنڈ گیا جا کر اس کے کوچے میں
کیا حجامت ہوئی ہے نائی کی

سچ تو یہ ہے کہ شیخ جی تم نے
ناک کاٹی ہے پارسائی کی

آنکھوں نے رو کے نام ہی بالکل ڈبو دیا
گنگا کا، گھاگرا کا، اٹک کا چناب کا

شیخ اشتہار بانٹتے پھرتے ہیں شہر میں
نیلام ہونے والا ہے ٹھیکہ شراب کا

مطلب یہ ہے کہ میں تو جلوں وہ ہوں سرخرو
سگرٹ مجھے ہے اور رقیبوں کو پان ہے

اس چشمِ مست پر بھی پکٹنگ چاہیئے
وہ بھی تو اک کھلی ہوئی مے کی دکان ہے

اعزاز بھی خطاب بھی بسکٹ بھی چائے بھی
سچ پوچھئے تو خیر بڑا اچھا گوان ہے

صاحب بہادروں سے بہت بھاگتا ہے دل
اب اس کو ڈیم فول کا خوگر بنائیں گے



Edited and Published by the Director, Publications Division, Old Secretariat, Delhi—8
and Printed by the Model Press Private Ltd., Delhi.

Regd. No. D-509.

آجکل

جیشٹھ شک سمت ۱۸۸۲
جون ۱۹۶۰ء

۶۰ نئے پیسے



اردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

جلد ۱۸- نمبر ۱۱

جیٹھ شک سمت ۱۸۸۲
جون سنہ ۱۹۶۰ء

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومت ہند

ترتیب

سر ورق:- پنگھٹ کی اور۔ عمل دیوتش بھٹاچارجی
رسالے کی پشت پر:- موتی مسجد لال قلعہ دہلی

سالانہ چندہ:— ہندوستان میں:- سات رُپے
پاکستان میں:- سات رُپے (پاک)
غیر ممالک سے:- ۱۰ شلنگ ۶ پنس یا ڈیڑھ ڈالر
فی پرچہ:— ہندوستان میں:- ۶۰ نئے پیسے
پاکستان میں:- دس آنے (پاک)
غیر ممالک میں:- ایک شلنگ یا ۱۵ سینٹ

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر ”آج کل“ اردو، اولڈ سیکریٹریٹ دہلی ۸

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

مُلاحظات

چین اور ہندوستان کے وزرائے اعظم کی حالیہ گفتگو میں سرحد کے تنازعہ کا کوئی حل تو نہیں نکل سکا مگر اس سے مزید بات چیت کا دروازہ کھل گیا ہے۔ چنانچہ دونوں وزرائے اعظم نے اس بات سے اتفاق کیا ہے کہ دونوں حکومتوں کے عہدے دار مل کر اس سال جون سے ستمبر تک سرکاری دستاویزات، دوسرے کاغذات اور نقشوں وغیرہ کا جائزہ لیں اور غور و خوض کے بعد ان معاملات پر اپنی رپورٹ پیش کریں۔ یہ رپورٹ مزید بات چیت کے لئے مفید ثابت ہو گی۔ اُمید کی جانی چاہیئے کہ چین کے ارباب حل و عقد ہندوستان کے موقف کو سمجھیں گے اور سرحدی تنازعات کا مناسب حل نکل آئے گا۔ ہندوستان صلح و آشتی کا خواہاں ہے اور امن و سلامتی کے راستہ پر گامزن ہے۔ اسی مقصد سے اُس نے غیر جانبداری کی پالیسی اختیار کی ہے اور پُر امن بقائے باہم کے اصولوں کو اپنایا ہے۔

بمبئی کی ریاست کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور یکم مئی سے مہاراشٹر اور گجرات کی دو ریاستیں وجود میں آ گئی ہیں۔ یہ فیصلہ دونوں علاقوں کے اتفاق رائے سے ہوا۔ یقین ہے کہ دونوں ریاستیں تعمیر و ترقی کے لئے صحت مند سابقت کے جذبہ سے کام لے کر آگے بڑھیں گی اور ملک کی مشترکہ دولت میں اضافہ کریں گی۔

گجرات کے پہلے گورنر نواب مہدی نواز جنگ مقرر ہوئے ہیں۔ آپ آندھرا پردیش کی کابینہ کے ممبر رہ چکے ہیں۔ اس سے پہلے حیدرآباد میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ نواب صاحب کو علم و ادب سے بڑی دلچسپی ہے اور سماجی کاموں سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔

سینٹرل اسٹیٹسٹیکل آرگنائزیشن نے قومی آمدنی کا جو جائزہ شائع کیا ہے اس کے مطابق ۵۹-۱۹۵۸ء میں ۵۸-۱۹۵۷ء کے اعداد و شمار کے پیش نظر قومی آمدنی میں ۳ء۷ فی صدی اضافہ ہوا۔ اس جائزہ میں پچھلے گیارہ سال کے قومی آمدنی اور فی کس آمدنی کے اعداد و شمار پیش کئے گئے ہیں ان اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ دوسرے پنج سالہ پلان کے پہلے تین سال میں قومی آمدنی بقدر ۵ء۱۱ فی صدی بڑھ گئی جب کہ پہلے پنج سالہ پلان کی پوری مدت میں قومی آمدنی میں ۴ء۱۸ فی صد اضافہ ہوا تھا۔ اسی طرح فی کس آمدنی کا اضافہ ان دونوں مدتوں میں بالترتیب ۳ء۷ فی صدی اور ۱ء۱۱ فی صدی رہا۔

چترنجن کے ریلوے انجن بنانے والے کارخانہ نے اپنی پیداوار میں کافی ترقی کی ہے۔ یہ کارخانہ دس سال سے قائم ہے۔ اب تک اس کارخانے سے ایک ہزار انجن تیار ہو کر نکلے ہیں۔ اب اس کارخانے میں انجن کے صرف ۴ پرزے باہر سے آتے ہیں۔ اُمید ہے کہ آئندہ یہ پرزے بھی یہیں بننے لگیں گے۔ اس کارخانے کی ترقی سے ہندوستان کی صنعتی منصوبہ بندی کے واضح نتائج سامنے آ گئے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ فولاد سازی کی صنعت کی ترقی سے انجن سازی کی صنعت کو بھی بڑھاوا مل رہا ہے۔

مصطفےٰ احسن رضوی

خالص اُردو کا پون صدی پُرانا نمونہ

اُردو چوں کہ لشکری زبان ہے اس لئے اس میں مختلف زبانوں کے لفظ پائے جاتے ہیں اور شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ اگر وہ تمام الفاظ جو مختلف زبانوں سے مستعار لئے گئے ہیں اصل زبانوں کو واپس کر دئے جائیں تو اردو کا دامن بالکل خالی ہو کر اور یہ دولت مند زبان دیوالیہ بن کر رہ جائے۔ اردو زبان ایک ایسا سنگم ہے جہاں مختلف تہذیبیں آکر ملتی ہیں اور یہی اس کی وہ خصوصیت ہے جس نے اسے بین اقوامی زبان کی حیثیت دے دی ہے۔

اردو زبان میں جو الفاظ دوسری زبانوں سے آکر استعمال ہونے لگے ہیں اب ان پر 'بدیسیت' کی چھاپ باقی نہیں رہی ہے بلکہ وہ سب دیسی ٹکسال ہی میں ڈھلے ہوئے سکے معلوم ہوتے ہیں اور اسی لئے اردو کی ملکیت قرار پا گئے ہیں۔ لفظ چاقو پر جو حق ترکی کو، لفظ گلاب پر فارسی کو، لفظ عمارت پر عربی کو، لفظ دشنام پر فارسی و سنسکرت کو اور لفظ بٹن یا راشن یا کنٹرول پر انگریزی کو حاصل ہے وہی حق ان الفاظ پر اردو کو حاصل ہے اور اس لئے انھیں بدیشی الفاظ کہنا یا انھیں ٹکسال باہر قرار دینا بالکل غلط ہے۔

صحیح اردو تو وہی ہے جو دوسری زبانوں کے ایسے الفاظ کی آمیزش سے مالامال ہو جو اردو میں مستعمل و مروج ہو چکے ہیں اور جنھیں عام طور پر لوگ سمجھتے اور بولتے ہیں۔ لیکن عربی فارسی کے الفاظ ہوں یا سنسکرت اور انگریزی کے اگر ضرورت سے زیادہ مغلق، ثقیل اور غیر معروف الفاظ اس میں بھر دئے گئے ہیں تو وہ اردو نہ رہے گی بلکہ اردو سے مختلف کوئی چیز ہوگی جس کا نام ہمیں کچھ اور رکھنا پڑے گا۔ ہمیشہ آسان سے آسان اور سادہ سے سادہ زبان بولنے اور لکھنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ وہی زبان مقبول عام ہو سکتی ہے جو سہل اور عام فہم ہو۔ اسی وجہ سے مہاتما گاندھی نے ہندوستانی کو رواج دینا شروع کیا تھا جس پر فارسی، عربی، انگریزی اور سنسکرت کسی زبان کا بھی غلبہ و اقتدار نہ ہو بلکہ اس میں بقدرِ ضرورت ہر زبان کا لفظ استعمال کیا جا سکے بشرطیکہ وہ مغلق اور غیر مانوس نہ ہو۔

بہت سے حضرات نے ہمیشہ آسان اردو لکھنے کی کوشش کی ہے جو عربی، فارسی اور سنسکرت کے بھاری بھرکم الفاظ سے عاری ہو۔ ہمارے موجودہ زمانہ میں آرزو مرحوم کو یہ فخر حاصل تھا کہ ان کے کلام میں 'ہندستانیت' ہوتی تھی اور وہ جو زبان استعمال کرتے تھے وہ بہ یک وقت خالص اردو بھی ہوتی تھی اور خالص ہندی بھی۔ ان کا کلام اگر فارسی رسم الخط میں لکھا ہوا ہو تو اس پر اردو کا اطلاق ہو سکتا ہے اور اگر دیوناگری رسم الخط میں لکھا ہوا ہو تو ہندی کا اطلاق۔ ہم اپنے اس دعوے کی تائید میں مرحوم کی سریلی بانسری پیش کر سکتے ہیں جس کی زبان بہ یک وقت ہندی بھی ہے اور اردو بھی اور وہ الگ الگ دونوں رسم الخطوں میں چھپی ہوئی بھی ہے۔

لیکن یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ اس طرزِ جدید کے موجد آرزو لکھنوی ہی تھے اور یہ کہ ان سے پہلے کسی نے اس کی طرف توجہ ہی نہیں کی تھی۔ نہیں۔ ایسا نہیں ہے بلکہ اس وقت ہمارے سامنے ٹھیٹ اردو کا ایک ایسا نمونہ موجود ہے جو ستر پچھتر برس سے بھی زیادہ پُرانا ہے جبکہ سیدھی سادی اردو لکھنے کا رواج ہی نہ تھا بلکہ اس کا لکھنا انتہائی دشوار سمجھا جاتا تھا۔

یہ ایک مختصر سا قصہ ہے جو کتابی شکل میں چھپا ہوا ہے اس کا نام ہے 'ہنسا کہسانی' اور اس کی تاریخ طباعت ہے ۱۸۸۹ء جو سرورق پر درج ہے

اس کے آخر میں جو قطعہ تاریخ امداد حسین خاں المتخلص بہ رضا کا دیا ہوا ہے۔ اس سے سنہ طباعت ۱۳۰۳ھ معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح یہ کتاب جو مطبع نامی لکھنؤ میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی ہے، عیسوی سن کے حساب سے اکہتر برس اور ہجری سنہ کے حساب سے ستتر برس پرانی ہے۔ اس قدیم نسخہ کا کاغذ کسی قدر بوسیدہ ہو چکا ہے مگر پھر بھی اس کا لفظ لفظ پڑھنے میں آتا ہے اور کوئی حرف غائب نہیں ہے۔ اس کے مؤلف سید فدا علی نشّار لکھنوی ہیں جو فدا تخلص کرتے تھے۔ وہ ذاکر امام حسینؑ ہونے کی جہت سے اپنے زمانہ میں بھی ملک گیر شہرت کے مالک تھے اور انتقال کے بعد بھی آج تک ان کا نام اس وجہ سے زندہ ہے کہ وہ فنِ ذاکری کے ایک مخصوص شعبہ نثر خوانی کے موجد تو نہیں مگر اس کے مجدّد و معمار ضرور تھے۔

وہ فنِ ذاکری میں مرزا محمد رضا طور کے شاگرد تھے جنھوں نے اودھ کے تین حکمرانوں — محمد علی شاہ، امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ — کا دور دیکھا تھا اور جو اس کے بعد بھی ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے نتیجہ میں نازل ہونے والے مصائب و آلام کو برداشت کرنے کے لئے زندہ رہے۔

مرزا محمد رضا طور بنارس سے عہدِ واجد علی شاہ میں نواب علی نقی خاں کی تحریک پر لکھنؤ بلائے گئے اور یہاں پہنچ کر بادشاہ کے زمرۂ مصاحبین میں شامل ہو گئے۔ وہ اچھے شاعر تھے اور ناسخ کے گھرانے سے تلمذ رکھتے تھے۔ شاعری میں زبان بھی ناسخ ہی کی استعمال کرتے تھے۔

پہلے مجالس حضرت امام حسینؑ میں پڑھنے والے روضہ خواں ہوتے تھے جو فارسی زبان میں واقعاتِ کربلا بیان کیا کرتے تھے اس لئے ان کا بیان صرف پڑھے لکھے اور اونچے طبقوں کے لئے ہوتا تھا اور عوام اس سے فائدہ نہ اٹھا سکتے تھے مگر مرزا محمد رضا طور وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے اس فنِ روضہ خوانی کو اردو کے قالب میں منتقل کر دیا اور کتاب میں دیکھ کر پڑھنے کے بجائے حافظہ کی رو سے مجلس پڑھنا شروع کیا۔ اردو میں ہونے کی وجہ سے طور کے بیان کی افادیت بڑھ گئی اور یہ طریقۂ ذاکری بہت جلد مقبولِ عام ہو گیا۔

زیرِ نظر کتاب 'ہنسا کی کہانی' کے مؤلف سید فدا علی نشّار نے مرزا محمد رضا طور کی شاگردی فنِ نثر خوانی میں ۱۸۵۷ء کے بعد اختیار کی اور نہ یہ کہ اس فن میں خود شہرت پائی بلکہ اسے مدوّن کر کے باقاعدہ ایک مستقل فن کی حیثیت دے دی۔ اس کے بعد سے اس قسم کی ذاکری کرنے والے افراد روضہ خواں کہلانے کے بجائے نثر خواں یا نشّار کہلانے لگے۔

سید فدا علی نشّار بڑی قابلیت و استعداد کے مالک تھے اس لئے ان کے وہ مسودے جو وہ زبانی مجالس میں پڑھنے کے لئے تیار کیا کرتے تھے بڑے معیاری ہوتے تھے اور عالمانہ زبان میں۔ وہ اس زمانہ کے رواج و مذاق کے مطابق فسانۂ عجائب کے ڈھنگ کی مسجع اور مقفیٰ عبارت لکھنے کے عادی تھے اور ان کی مجالس کے مسودوں کو دیکھ کر اور سن کر یہ باور کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان کا سا ادق عبارت لکھنے والا شخص کیا وہ زبان بھی لکھنے پر قادر ہو سکتا ہے جو 'ہنسا کہانی' میں استعمال کی گئی ہے۔

سید فدا علی نشّار صاحب تصنیف و تالیف تھے۔ مجلس میں پڑھنے والے ان کے مسودات کا ایک مجموعہ چھپا ہوا موجود ہے۔ فنِ نثر خوانی کو بھی انھوں نے مرتّب و مدوّن کیا اور اس کے قواعد و اصول وضع اور متعین کر کے ایک کتاب 'طریقِ نثر خوانی' نامی میں یکجا کر دئے جو ۱۳۰۶ھ میں طبع ہوئی۔

سید فدا علی اپنا تخلص فدا کرتے تھے مگر 'ہنسا کہانی' انھوں نے جس شعر پر ختم کی ہے اس میں فدا تخلص کے بجائے گنی تخلص ہے۔ یہ اس وجہ سے کہ اس کتاب میں چونکہ عربی فارسی کا کوئی لفظ استعمال نہیں کیا گیا ہے اس لئے انھوں نے اپنا تخلص فدا بھی استعمال نہیں کیا جو عربی تھا بلکہ اس کی بجائے گنی استعمال کیا جو خالص ہندی ہے۔

امداد حسین خاں رضا کا وہ قطعۂ تاریخ بھی جو آخرِ کتاب میں دیا گیا ہے سادہ زبان کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ ملاحظہ ہو:-

رہے میرے راجہ پہ داتا کی کرپا — پھرا گنگا جمنا میں جب تک ہے پانی
ڈھنڈورا پٹے پھر نگر میں اسی کا — ملے اس کو پھر اس کی دھرتی پرانی
رضا پیچھے پیچھے چلا چپل فدا کے — گنی نے بھلی بات ہے من میں ٹھانی
لگائی ہے باتوں کی پھلواری اس نے — ہے اس کو جو اک اڑتی چڑیا پھنسانی
رضا اپنے جی میں بچارا یہ میں نے
لگی ہاتھ چاتر کو ہنسا کہانی ۱۳۰۳ھ

دیباچہ میں کتاب کا سببِ تالیف حسبِ ذیل الفاظ میں دیا گیا ہے:-

"۱۳۰۳ھ میں کہ جس زمانہ میں میں بہ عہدہ ذاکری ملازم حضرت سکندر جاہ مرزا محمد واجد علی شاہ مرحوم تھا۔ انھیں دنوں میں وزیرِ اعظم جناب نواب منتظم الدولہ بہادر سے کرنیل جرٹ صاحب نے کہ مٹیابرج میں ایجنٹ تھے اور علم عربی و فارسی و انگریزی

ہیں صاحب کمال مشہور و معروف تھے ایک روز یہ فرمایش کی کہ کچھ عبارت اردو ایسی لکھیے کہ جس میں کوئی لفظ عربی و فارسی نہ ہو۔ ...... حسب اتفاق میں جو صبح کو حاضر خدمت فیض درجت جناب نواب صاحب ہوا تو ہنگام تلفظ ارشاد کیا کہ آپ کچھ عبارت اردو اس طرح کی تحریر کیجیے کہ الفاظ عربی و فارسی سے بری ہو۔ میں نے عرض کی کہ میری زبان کا بیان تو بالکل مرکب ہے میں کیونکر لکھ سکوں گا۔ یہ کہہ کر خاموش ہو رہا لیکن ...... کچھ فکر جو کی تو چند سطریں نکل آئیں۔ اگر کسی مقام پر اس جاہل کی فکر نے خطا کی ہو تو ناظرین معاف فرمائیں کہ عادت اردو لکھنے پڑھنے کی ہے نہ وہ عبارت کہ جس کو نہ اردو کہہ سکیں اور نہ بھاکا ہاں یہ عبارت سبب تحریر تھی جو مرکب لکھی گئی ورنہ یہ بھی اسی صنعت میں لکھی جاتی۔"

فاضل مؤلف کی اس عبارت کے پڑھنے کے بعد جس کے لکھنے کے وہ شروع سے عادی تھے اب ہنسا کہانی پڑھئے جس کا رنگ ڈھنگ ہی دوسرا ہے۔ ہمارے خیال میں ہنسا کہانی، ایسی عبارت کا نہایت قدیم نمونہ ہے جسے خالص ہندستانی کہا جا سکتا ہے اور جسے تعلیم یافتہ ہی نہیں بے پڑھے لکھے جاہل دیہاتی بھی سمجھ سکتے ہیں۔

ہنسا کہانی

اب دیکھنے والے سنیں اور جو نہیں جانتے جانیں، ہم ایسے کو رات دن اٹھتے بیٹھتے پوجتے ہیں جس نے ہو کہا اور سب کچھ ہو گیا اور ہم جاگتے سوتے اسی کی بڑائی کرتے ہیں جس نے ایک پل میں سارا سنسار بنا دیا۔ پھر اپنے بھیتوانے والے اور اچھی باتیں سکھانے والے بھیجے۔ ان سب کے پیچھے ایک ان پڑھ کو جس نے کسی سے لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا پہلے والوں سے اچھا بنایا اور ایسا اس کو چاہا جیسے سنسار والے اس کو پیار کرتے ہیں جس کی بری بری دکھائی دیتی ہے اور اچھی اچھی۔ اسی کو بھلی باتیں سکھانے بتانے کو بھیجا اور سنسار والوں سے کہہ دیا اس سے اچھا آج تک کوئی ہم نے نہیں بھیجا اور اب بھیجیں گے بھی نہیں — سن رکھو اس کا کہنا مانو گے اچھے رہو گے، نہیں، آگ میں جلائے جاؤ گے اور گہرے گڈھے میں گرائے جاؤ گے۔ اسی جگ بنانے والے نے چڑیوں کو بھی ایسا بولنا بتایا ہے جس کو سن کے بات کرنے والے اور بولیاں سمجھنے والے گھڑیوں سوچ میں رہتے ہیں۔

اب ایک کہانی چھوٹی سی جو اگلوں سے سنی ہے سناتے ہیں۔ ایک راجہ جس کے کہنے میں بہت سے راجہ تھے اس نے سوتے میں ایک پنکھیرو کو ہاتھ پر بیٹھا کر ہاتھ پھیرتے دیکھا، گھبرا کر جاگ اٹھا اور پاس کے بیٹھنے والوں سے کہنے لگا جس پنکھیرو کو میں نے سوتے میں ہاتھ پر بیٹھے دیکھا ہے ابھی منگاؤ میں جاگتے میں ہاتھ پر بٹھاؤں گا۔ سب نے پوچھا وہ کون سا پنکھیرو ہے۔ کہا ہنس۔ وہ بولے، مہاراج بھلا ہنس کہاں اور کیونکر ملے گا وہ ایسا ویسا نہیں ہے جو ہاتھ آئے اور جس کسی کا جی چاہے پکڑوا منگائے اور جو چڑیمار چاہے جا کر پھانس لائے یہ نہیں ہو سکتا جیسے آپ راجہ ہیں ویسا پنکھیروں میں وہ بھی راجہ ہے، اس کا ہاتھ آنا دکھائی نہیں دیتا۔ کسی کو نہیں ملے گا۔ یہ سن کے وہ راجہ بہت جھنجھلایا اور بگڑ کر کہنے لگا تم سب کیسے میرے پاس کے بیٹھنے والے ہو ایک چڑیا نہیں لا سکتے اور تم سے کیا ہوگا؟ دیکھو کہے دیتا ہوں جو وہ پنکھیرو نہیں آئے گا ایک ایک کو مار ڈالوں گا اور کسی کو جیتا نہیں چھوڑوں گا۔ اتنا سا کام تم سے نہیں ہو سکتا۔ یہاں لے لاؤ میں نہیں مانوں گا۔ یہ سنتے ہی سب گھبرا گئے۔ ان لوگوں میں ایک چاتر بھی تھا اور راجہ کے بہت منہ چڑھا ہوا تھا اور چڑیوں کی باتیں بھی سمجھتا تھا، کچھ سوچ کر کہنے لگا۔ آپ مجھ کو کچھ روپیہ دیں، میں چھ مہینے میں لا دوں گا۔ راجہ نے کہا اچھی بات ہے جا، میں اتنے دنوں کچھ نہیں بولوں گا۔ یہ کہہ کر راجہ اٹھ گیا اور یہ سب بھی اپنے بیٹھکے میں آئے اور ایک منہ ہو کر اس چاتر سے کہنے لگے، یہ کیا الّو پن کیا تو نے ارے وہ پنکھیرو جو آج تک کسی کو نہیں ملا تجھ کو کیونکر مل جائے گا۔ برا کیا تو نے، جو کچھ سب کے لئے ہوتا تیرے لئے بھی ہوتا۔ بہت بڑی بات تو نے منہ سے نکالی ہے، دیکھئے کیونکر پوری ہوتی ہے۔ اس نے کہا تم میں سے کوئی میری بات کی بھلائی کو نہیں سمجھا۔ تم سب کو میں نے کچھ دنوں مرنے سے بچا پایا ہے، کیا جانے تمھاری سمجھوں کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ پنکھیرو نہیں ملے گا نہیں سہی، چھ مہینے تک تم سب بچ رہو گے اور اپنے اپنے گھروں میں چین سے پاؤں پھیلا کر سوؤ گے۔ میں اس کو ڈھونڈھنے جاتا ہوں، تم یہاں رہو راجہ کے سامنے بات بناتے رہنا۔ یہ کہہ کر روپیہ اور کچھ لوگ لے کر چل نکلا۔ کبھی اس گاؤں میں، کبھی اس بن میں کبھی اس بن میں، کبھی اس ندی پر کبھی اس ندی پر، کبھی اس پہاڑ پر کبھی اس پہاڑ پر، اسی ڈھنگ سے ڈھونڈھتا ہوا اور ٹھوکریں کھاتا ہوا ایک دن ایک پہاڑ کے نیچے پہونچا۔ دن تھوڑا تھا ٹھہر گیا اور اپنے ساتھ والوں

سے کہا آج ہم یہیں رہیں گے۔ یہ کہہ کر پہاڑ پر چڑھ گیا۔ اس پر ایک جھونپڑی پڑی دیکھی، جب اس کے پاس گیا دیکھا ایک بڈھا ڈاڑھی والا دُبلا پتلا منڈھی میں بیٹھا ہے۔ دیکھتے ہی اس نے کہا تو کون ہے اور یہاں تک کیونکر پہنچا اور کیوں آیا ہے۔ اس پہاڑ پر کبھی کوئی نہیں آیا تو کس لئے آیا ہے؟ اس نے کہا میں ایک راجہ سے بچ کر چلا آیا ہوں۔ اس نے ہنس کے منگانے میں ہٹ کی اور کہا لادو نہیں تو سب کو مار ڈالوں گا۔ یہ بگڑنا اس کا دیکھ کر میں نے کہا میں لادوں گا۔ یہ کہہ کر نکل آیا ہوں اور ڈھونڈھتا پھرتا ہوں۔ یہ سُن کر بڈھے نے کہا اتنا میں جانتا ہوں۔ برس دن میں ایک دن اس پہاڑ کی چوٹی پر آکر بیٹھتا ہے۔

سنتے ہی اس بات کے وہ اُتر آیا اور اسی پہاڑ کے نیچے رہنا جی میں ٹھان کر اس اونچی نیچی دھرتی کو بنایا اور کچھ پیڑ پھولوں کے جو بَن میں آپ ہی آپ اُگتے ہیں، پھولتے ہیں، پھلتے ہیں منگائے اور ایک پھلواری سی لگا کر وہاں بیٹھ رہا۔ اتنے میں وہی دن اور وہی گھڑی آئی جو بڈھے نے کہی تھی۔ دیکھا اس نے پہاڑ کی چوٹی پر ہنس آکر بیٹھا، پیچھے اس کے ایک چکور بھی آیا۔ بیٹھتے ہی اس کے ہنس نے کہا یہ جو پھلواری سی پہاڑ کے نیچے دکھائی دیتی ہے بہت جی چاہتا ہے اس میں اتر کر چلنے پھرنے کو۔ چکور نے کہا یہ بات مجھ کو نہیں بھائی۔ راجاؤں کو اپنے بھلے بُرے کا دھیان چاہیئے اور جو ہونے والا ہو اپنے کرنے سے پہلے اسے سوچیں۔ برس دن میں ایک دن آپ یہاں آیا کرتے ہیں کبھی اس دھرتی پر ایسی پھولوں کی پھلواری دیکھی تھی۔ میں نے یہاں کبھی کچھ نہیں دیکھا مجھ کو کھٹکا ہے میں نہیں کہوں گا آپ کو اس پھلواری میں جانے کو۔ آپس میں یہ باتیں کرکے تھوڑا سا اور بیٹھے وہ دونوں۔ پھر اڑ گئے۔ یہ دیکھ کر اس نے راجہ کو لکھا مہاراج میں نے کھوج لگایا ہے تھوڑا سا روپیہ اور بھیج دیجئے اور ساتھ ان روپیوں کے تھوڑے مالی بھی ایسے بھیجئے جو کسی کام کاج میں رہ نہیں جائیں اور جیسا میں چاہتا ہوں ویسا ہی بنائیں اور جو کہوں وہ کریں۔ اگلے برس میں لے ہی آؤں گا۔ جب یہ لکھا ہوا راجہ نے دیکھا کنول اس کے جی کا کھل گیا اور جو کچھ اس نے مانگا تھا بھجوا دیا۔ جب روپیہ اور وہ کام کرنے والے اس کے پاس پہنچے اسی گھڑی سے پھلواری بنانے کا لگا لگایا اور تھوڑے ہی دنوں میں ایک پھلواری جگ بھاتی بنوائی اور اس کے بیچ میں ایک بارہ دری بھی پتھر کی ایسی کھلی ہوئی بنوائی جو سب کونوں سے دکھائی دیتی تھی اور آگے اس کے ایک چبوترہ بھی اسی پہاڑ کے پتھروں سے بنوا کر ایک پچ کا جو کہوں کا اس پر لگایا اور اس چوکے پر اچھا سا بچھونا بچھوا دیا۔ کہاں تک اس کی بھلائی لکھوں۔ نئے ڈھنگ سے پھلواری کو بنا کر بیٹھا اور اس دن کے دھیان میں رات دن رہنے لگا۔ جب تھوڑے سے دن رہ گئے چڑیماروں کو بلوا کر ایسے پھندے بنوائے جو چڑیا ان تک آئے پھنس ہی جائے۔ جب برس پورا ہو گیا اور وہ دن آیا۔ پھلواری بھر میں وہی پھندے بچھا دئے اور چڑیماروں سے کہہ دیا ہنس آکر جانے نہیں پائے جس کے پھندے سے نکل جائے گا وہ مار ڈالا جائے گا۔ یہ کہہ کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اتنے میں وہ ہنس پھر پہاڑ کی چوٹی پر آکر بیٹھا۔ پیچھے اس کے ایک کوّا بھی آکر بیٹھا۔ ہنس نے کہا بھائی کوّے دیکھنا کیا اچھے ڈھنگ سے پھلواری لگائی ہے۔ اور پیڑ بھی پھول پھل کے جی لُبھاتے ہوئے بٹھائے ہیں۔ بہت ہی جی چاہتا ہے اس پھلواری میں چل کر ٹہلنے کو۔ یہ سنتے ہی کوّے نے کہا چلئے۔ ہنس نے کہا پہلے بھی ہم یہاں آئے تھے ان دنوں چکور ہمارے ساتھ رہتا تھا۔ اس نے اس میں جانے نہیں دیا اور یہ کہا تھا، پرائے گھر میں بن سمجھے جانا اچھا نہیں ہوتا، تو کیا جان کے کہتا ہے چلئے۔ کوّے نے کہا راجہ! وہ اُلّو تھا، ایسی ہی پھلواریوں میں راجہ آتے جاتے اور رہتے سہتے ہیں۔ اچھا آپ ٹھہریں میں دیکھے آتا ہوں۔ یہ کہہ اوتر گیا اور کبھی اس پیڑ پہ جا بیٹھا کبھی اُس پیڑ پہ، کبھی اس کے پھل پر چونچ ڈالی کبھی اُس کے پھل کو کھا لیا۔ کوّے کو پھلواری میں ادھر اُدھر اڑتے پھرتے دیکھ کر اس چاتر نے سب سے کہہ دیا سنتے ہو اس کوّے کو ہنکانا نہیں اور جس پھل کو یہ کھائے کھانے دینا۔ جب کوّے نے سناٹا دیکھا، کھا پی کر ہنس کے پاس گیا اور کہنے لگا وہاں کچھ کھٹکا نہیں ہے، میں دیکھ آیا ہوں، چلئے بھی۔ سب جانتے ہیں پاس کے بیٹھنے والوں کا کہنا سُننا بہت ہوتا ہے اور انہیں کی بات بھی جی کو بھلی لگتی ہے۔ سنتے ہی کوّے سے بن سمجھے بوجھے اوتر پڑا۔ پاؤں ٹکتے ہی پھندے کے جنجال میں گھر گیا۔ پھنستے ہی چاہا اپنے کو مار ڈالوں اور جیتے جی کسی کے ہاتھ نہیں آؤں۔ یہ چاتر بولیاں چڑیوں کی سمجھتا ہی تھا۔ ہنس سے کہنے لگا، میں بولی آپ کی جانتا ہوں جو کچھ اس برس آپ سے اور چکور سے باتیں ہوئی تھیں اور جیسے اس برس کوّے سے ہوئی ہیں سب سمجھا ہوں۔ آپ اپنے تئیں مٹائیے نہیں۔ میرا راجہ اتنا ہی چاہتا ہے آپ کو ہاتھ پہ بٹھا کر آپ کی پیٹھ پہ ہاتھ پھیر لے پھر اڑ جائیے گا، کاہے کو آپ دُکھ سہتے ہیں۔ یہ سُن کر ہنس نے تڑپنا چھوڑا۔ اس گھڑی اس چاتر نے راجہ کا سپنے میں دیکھنا اور اپنا ڈھونڈھنے نکلنا اور بڈھے سے کھوج کا پانا اور برس دن تک پہاڑ کے نیچے پڑا رہنا سب کہہ سنایا اور کہا آپ کھٹکا جی سے نکال ڈالئے۔

یہ کہہ کر جو اڈہ جس اڈے پر ہنس بیٹھا تھا بھنڈے کے پاس لایا اور سامنے رکھ کر کہا آپ اس پر آ بیٹھیں ڈریں نہیں۔ یہ سن کر ہنس اس اڈّے پر آ بیٹھا۔ اس کے بیٹھتے ہی اس نے ایک پیچی چاندی سونے کی اس کے پاؤں میں ڈال کر ایک چمکتی ہوئی ڈوری سے باندھ دیا اور اپنے لوگوں سے کہا چلو ڈھیل کرنا اچھا نہیں۔ یہ سنتے ہی وہ سب اس کو لے کر دوڑتے ہوئے اپنی بستی کو چلے اور تھوڑے ہی دنوں میں پہنچ گئے۔

جب راجہ نے سنا جس کو میں نے بھیجا تھا وہ ہنس لے کر آیا ہے یہ سن کر بہت ہی مگن ہوا، بھائی بھتیجے اور کنبے والوں سے کہلا بھیجا کل سب میرے گھر پر اچھے اچھے کپڑے پہن کر اور چمکتے ہوئے ہتھیار لگا کر آئیں جیسے میلوں میں بن ٹھن کر جاتے ہیں۔ پھر وہاں کے رہنے والوں سے جہاں رہتا تھا اور ساتھ کے دوڑنے والوں سے اور گڑھی کوٹ کے لڑنے والوں سے اور جن کو بھلا جانتا تھا ان سے کہا۔ تم سب بھی کل وہاں آنا جہاں ہم گھر سے نکل کر بیٹھتے ہیں۔ ایک پنکھیرو ایسا دکھائیں گے جو کبھی کسی نے نہیں دیکھا ہوگا۔ یہ سن کر دوسرے دن وہ سب آئے جن کو اس نے بلایا تھا اور اپنے اپنے بیٹھکے پر بیٹھے اور جو لوگ بیٹھ نہیں سکتے تھے وہ سامنے اس بیٹھکے کے جس میں راجہ بیٹھتا تھا کھڑے ہوئے۔ جب راجہ نے سنا سب آچکے اس گھڑی اپنے کو دولہا سا بنا کر باہر آیا اور جہاں بیٹھتا تھا وہاں بیٹھ کر اس کو بلایا جو ہنس لے کر آیا تھا۔ سنتے ہی اس بات کے وہ اس کو لے کر سامنے آیا جتنے وہاں بیٹھے کھڑے تھے دیکھتے ہی اس کو ایسا بھولے جو کپڑے پہنے تھے بھنس گئے۔ اتنے میں راجہ نے ہنس کو اڈّے پر سے اٹھا کر ہاتھ پر بٹھایا اور بیٹھ پر اس کی ہاتھ پھیر کر چھوڑ دیا۔ وہ ہنس راجہ کے سامنے اونچے پر جا بیٹھا اور کہا جو میں کہوں راجہ کان دھر کر سن اور میرے کہنے کو گانٹھ باندھیو' بھولیو نہیں' کبھی دھوکا نہیں کھائیگا۔ پہلے جو میں اس پہاڑ پر آیا تھا۔ میرے ساتھ چکور تھا اور بہت دنوں سے میرے ساتھیوں میں تھا اور اچھے گھرانے اور بھلے کنبے سے تھا اور مجھ کو اٹھتے بیٹھتے اچھی بڑی بات کی بھلائی برائی سمجھایا کرتا تھا۔ اس نے مجھ کو اس پھندے کے پھنسنے سے اور بھوک پیاس کے دکھ اٹھانے سے اور بندھوا ہو کر یہاں تک آنے سے بچایا تھا۔ اب کی بری میرے ساتھ کوّا تھا اس کے کنبے اور گھرانے کو جگ جانتا ہے اور میں بھی جانتا ہوں اور تو بھی جانتا ہوگا۔ اس کے کہنے میں آ گیا۔ اس گھڑی نہیں سوجھا یہ کون ہے اور کیا کہتا ہے۔ بن سوچے اس الّو کا کہنا کیا پھنس گیا۔ میرا جی ہی جانتا ہے جو دکھ اٹھایا ہے۔ کبھی میں نے سوتے میں بھی ایسا برا دن نہیں دیکھا تھا جو جاگتے میں اس اپنے کیے کی برائی نے دکھایا۔ ایسی بپت کسی کی نہیں جائے جیسے میری گئی۔ جب بنی بگڑتی ہے نہیں بنتی، لاکھ لیپ پوت کرنے دھبّا نہیں مٹتا۔ دیکھ بھولیو نہیں، اپنے پاس کے بیٹھنے والوں میں ایسے کنبے اور گھرانے والوں کو بلانا نہیں جیسے گھرانے اور کنبے سے کوّا ہے۔ ایسے لوگوں کا اپنے پاس بیٹھنا اوٹھنا اچھا نہیں جاننا اور ان کی باتوں کو نہیں ماننا اور گھر کا بھید ان سے نہیں کہنا اور نیچ کا کام بھی ان سے نہیں لینا اور راج کے کاموں میں کبھی ان کی چھان تک آنے نہیں دینا اور راج کا کام ایسوں سے لینا جو راجاؤں کا کام کیے ہوں۔ گیلے سوکھے کو پہچانتے ہوں، بری بھلی بات کو جانتے ہوں' لکھنے میں تھکیں نہیں، پڑھنے میں جھپیں نہیں۔ راجہ کی بپت کا دھیان رکھیں، اس کے گھر کے بنانے والوں کو مانتے ہوں، بگاڑنے والوں کو برا جانتے ہوں، گھرانے کنبے کے اچھے ہوں انہیں کو اپنا گھر سونپنا۔ میں نے بڑے دکھ اٹھائے ہیں، اسی سے سمجھائے جاتا ہوں۔ ایسا کرے گا اچھا رہے گا۔ نہیں سب گاؤں گراؤں چھن جائیں گے اور راجہ پرجا ہو جائے گا۔ ——————— یہ کہہ کر اڑ گیا۔

اب گئی روک ہاتھ کو اپنے
یہ جو لکھا ہے سب کہانی ہے

آج کل، اگست ۱۹۶۰ء کا شمارہ 'ہندوستانی مصوری نمبر' ہوگا

نوید بلاسپوری

شعر

حسن کی ضو سے دلِ شاعر میں بھر جاتا ہے نور — موجزن آنکھوں میں رہتا ہے محبت کا سرور
اس کے آگے عشق ہے اور حسن کی اک کائنات — حسن سر تا پا محبت، عشق سر تا پا حیات
جب دلِ شاعر میں ہوتا ہے محبت کا اثر — غم کے شعلوں سے سلگ اٹھتا ہے شاعر کا جگر
دل سے جب دل کو ملا دیتا ہے جذب کامیاب — جز محبت کچھ نہیں ہوتا محبت کا جواب
چند نغمے جاگتے ہیں پردہ ہائے ساز میں — اور ڈھل جاتے ہیں پھر یہ شعر کے انداز میں
یوں جھلکتی ہے محبت شاعری کے روپ میں — جیسے سونے کی چمک ہو چلچلاتی دھوپ میں
حسن سے مطلب نہیں نظارہ ہائے بام و در — یہ تو اک اظہار کے انداز ہیں اے بے خبر
عاشقی سے میرا مطلب اک لگن اک آرزو — یعنی اک ذوقِ مکمل ایک ان تھک جستجو
سرفروشوں کا مرے مسلک میں پروانہ ہے نام — شمع سے مقصود ہے حسنِ طلب سوزِ مدام
شاعری قطعاً گل و بلبل کا افسانہ نہیں — ہم جسے دیوانہ کہتے ہیں وہ دیوانہ نہیں
خار و خس کے ساتھ ہی گلشن میں رہتا ہے گلاب — لاکھ ذوقِ نامکمل ایک ذوقِ کامیاب

بات نکتہ کی سمجھ جاتا ہے جو ہے نکتہ رس
عقلِ ناپختہ کی خاطر پھول بھی ہیں خار و خس

محمود نیازی

حضرت نیاز بریلوی کی ہندی شاعری

ہندی نظم کی تاریخ پر اگر نظر ڈالی جائے تو یہ بات ظاہر ہو جائے گی کہ اس زبان کو صرف ہندوؤں نے ہی ترقی نہیں دی بلکہ مسلمانوں نے بھی اس میں اتنی ہی مہارت حاصل کی کہ بعض تو ہندی شاعری کے لئے سرمایۂ ناز بن گئے۔ قدیم زمانہ میں ہندو اور مسلمانوں کے تعلقات برادرانہ تھے۔ دونوں کی زبان فارسی اور برج بھاشا تھی۔ امیر خسروؒ کے زمانہ کے مسلمان شعراء کا کلام دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ بہت اچھی بھاشا بولتے تھے۔ اردو کا تو اس زمانہ میں نام و نشان تک نہ تھا۔ ہندو فارسی ادب کا مطالعہ ذوق و شوق سے کرتے تھے۔ اور مسلمان شعراء ہندی میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ وہ لوگ فارسی الفاظ کے بجائے بودھا، پران، نین، درپن، برہ، سودا، بیاگ، سمرن، اگن اور درپن وغیرہ بلا تکلّف بولتے اور لکھتے تھے۔ معشوق کے لئے سجن، موہن، پیتم، سندر پی، ہمرجن، لالن اور ساجن لاتے تھے۔ باہمی تعلّقات کی کشیدگی اور فرقہ وارانہ منافرت کا اس زمانہ میں کوئی سوال نہ تھا۔ فارسی اور سنسکرت کے دقیق الفاظ اور ثقیل بندشوں کے استعمال کو بُرا سمجھا جاتا تھا۔ اس طرح دونوں قوموں نے مل کر ایک مشترک ادب کی بنیاد ڈالی اور سیدھی سادی بھاشا میں حبِّ وطن کے ترانے سُنا کر ہندوستانیوں کے دلوں میں اتحاد و محبّت کی روح پھونکی۔ مسلمان شعراء بھاشا کی سادگی اور سلاست پر بھی مفتوں تھے۔ اسی کی وجہ مولانا محمد حسین آزاد نے یہ لکھی ہے[1]" بھاشا کا فصیح استعارہ کی طرف بھول کر بھی قدم نہیں رکھتا۔ جو جو لطف آنکھوں سے دیکھتا ہے اور جن خوش آوازیوں کو سُنتا ہے یا جن خوشبوؤں کو سونگھتا ہے ان ہی کو اپنی میٹھی زبان سے بے تکلّف، بے مبالغہ صاف صاف کہہ دیتا ہے۔" اس زمانے کے سیدھے اور ایمان دار لوگ اسی لئے بھاشا کو پسند کرتے تھے۔ تصنّع اور تکلّف کے نہ وہ خود قائل تھے اور نہ اس زبان میں اس کی گنجائش تھی۔

ہندی شاعری میں سب سے پہلا نام مسلمان شعراء میں حضرت امیر خسروؒ کا آتا ہے۔ ان کے دوہے، گیتوں، پہیلیوں اور کہہ مکرنیوں نے مسلمانوں کو ہندوؤں کے دلوں میں نہ صرف ہر دل عزیز بنایا بلکہ باہمی تعلقات کو بڑھایا اور محبّت و رواداری میں اضافہ کیا۔ ان کے بعد ملک محمد جائسی، رحیم، رس خان، مبارک اور رحمت وغیرہ کے نام بھی ہندی شاعری کے لئے باعث فخر ہیں۔ اسی سلسلے میں اٹھارویں صدی کے مشہور درویش اور خانوادۂ نیازیہ کے سرسلسلہ قطب عالم حضرت شاہ نیاز احمد بریلویؒ کا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔ اس زمانہ کے صوفیائے کرام اور خصوصاً چشتیہ سلسلہ کے اکابر کا یہ اصول تھا کہ ہندوؤں سے خوشگوار تعلقات رکھے جائیں۔ اسی اصول کو سامنے رکھ کر حضرت نیاز بریلویؒ نے بھی ہندی میں طبع آزمائی کی۔ آپ کے دیوان میں، اردو، فارسی اور عربی کلام کے علاوہ ہندی کے دوہے بھی موجود ہیں۔ آپ کے ہندی کلام میں توحید، معرفت، حقیقت، ریاضت، کرم کانڈ، گیان، یوگ، بھگتی اور پریم سب ہی کچھ ہے۔ زبان وہی ہے جو اس زمانہ میں عوام کی تھی۔ بعض مقامات پر بھاشا کے وہ الفاظ استعمال کئے ہیں جن کو دیکھ کر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو اس زبان سے پوری واقفیت حاصل تھی۔ جگہ جگہ ہندی محاورے بھی استعمال کئے ہیں جیسے "نرے ٹرے تارہ" "نین ڈرانا" "آنکھوں میں سرسوں پھولنا" "ان کہی کہلوانا" "سدبدھ بسرانا"

---

[1] آبِ حیات ص ۶۰

"جی ملسانا" وغیرہ ۔ تلمیحات کا استعمال بھی کافی کیا ہے جیسے ۔ من موہن کی مرلی ، من موہن ، برج کی نگری ، دیوڈگریا ، شیام ۔ ہندی کا کلام اگرچہ کم ہے لیکن قسم قسم کی صنعتوں سے منزہ ہے ۔ تشبیہہ اور استعارہ کا استعمال بھی کافی ہے ۔

حضرت نیازؒ نے ہندی کلام کے علاوہ اردو کلام میں بھی جگہ جگہ ہندی کے الفاظ استعمال کئے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی اور اردو کے مشکل اور دقیق الفاظ کے مقابلہ میں بھاشا کے سیدھے سادے الفاظ کو پسند فرماتے تھے اردو کا پورا دیوان ان مثالوں سے بھرا ہوا ہے ۔

آنکھیں مُندی ہوئی ہوں تو پھر دن بھی رات ہے　　اس میں قصور کیا ہے بھلا آفتاب کا
ہے سنگ سکھیاں لگیدن رنگ سینتی کا برن　　کیا ہی خوشی اور عیش کا سامان لاتی ہے بسنت
جوں مہر کے سنمکھ ہے آئینہ انا الشمس　　یوں ہوں انا اللہ سر دار سے کہہ دو

حضرت کا ہندی کلام پیش کرنے سے پہلے بہتر یہ ہے کہ آپ کے مختصر حالات بھی دے دئے جائیں تاکہ اس کلام کی اہمیت اور قدامت پر بھی روشنی پڑ سکے ۔ قطب عالم حضرت مولانا شاہ نیاز احمد بریلویؒ ۲۵ ربیع الاول ۱۱۵۵ھ کو بمقام سرہند پیدا ہوئے تھے ۔ ۱۵ برس کی عمر میں آپ علوم ظاہر سے فارغ ہو کر علوم باطن کی طرف راغب ہوئے اور اپنے استاد حضرت مولانا فخر الدین محمد دہلویؒ کے مرید ہوئے ۔ عرصہ تک آپ نے شیخ کے مدرسہ فخریہ میں درس و تدریس کا کام انجام دیا ۔ مشہور شاعر غلام ہمدانی مصحفی بھی آپ کے شاگردوں کے زمرے میں داخل تھے ۔ ریاض الفصحا میں مصحفی خود لکھتے ہیں :-

"چند روز میزان ہم از ایشاں در شاہجہان آباد خواندہ بود[1]"

آپ کے شیخ نے آپ کو خلیفہ راشتیں بنا کر بریلی میں اقامت کی ہدایت فرمائی تھی ۔ بریلی آکر آپ نے ایک خانقاہ قائم کی جو بقول مولانا غلام سرور بہت جلد "معدن فیوض ربانی" اور "مطلع انوار سبحانی" بن گئی ۔ پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی لکھتے ہیں :- "حضرت[2] مولانا شاہ نیاز احمد صاحبؒ شاہ فخرؒ کے مشہور ترین خلفاء میں تھے ۔ علم و فضل میں یکتائے عصر تھے ۔ زہد و تقویٰ کا دور دور شہرہ تھا ۔ بریلی میں ان کی خانقاہ تھی ۔ ہزاروں عقیدت مندوں کا وہاں ہجوم لگا رہتا تھا ۔ تشنگان معرفت اپنی روحانی پیاس بجھانے کے لئے دُور دُور سے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے ۔"

مولانا غلام سرور صاحب اس طرح لکھتے ہیں ۔

"خلق بے شمار بہ حلقہ ارادت وے در آمد و مردمان از اقالیم دور دراز یعنی کابل و قندھار شیراز و بدخشاں بہ خدمت بابرکت وے حاضر آمدہ مستفید و مستفیض شدند[1]"	"بے شمار خلقت ان کے حلقہ ارادت میں شامل تھی اور لوگ دور دراز سے یعنی کابل ، قندھار ، شیراز اور بدخشاں سے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر فیض پاتے اور فائدہ اٹھاتے تھے ۔"

حکیم قطب الدین باطنی نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے :-

" نیاز تخلص ، مولوی نیاز احمد نام ، جلوہ افروز بریلی ... صاحب کشف اہل باطن ، رموز دان حقائق ایزدی پیرمغاں میخانہ جذب و سلوک ، صوفی باصفائے سرمدی ، عرصہ قلیل ہوا کہ تعلق دُنیا سے دل کو آزاد کیا شہر خموشاں آباد کیا ۔ عالم فکر مدرسہ کا عتہ میں مباحثہ حق و باطل کرتا ہے ۔ یہاں تک کہ شاعر طبع بھی نیاز حاصل کرتا ہے ۔ یہ مسئلہ سخن ہے شائقین پہ مُبرہن ہے ۔ پھر بہ تکلف کہ مزاج مائل تصوف ہے ۔[2]"

حضرت نیاز بریلویؒ نے وصال سے ۲۵ سال پہلے شعر کہنا چھوڑ دیا تھا ۔ اس لئے اٹھارہ سال کی عمر سے ۱۲۲۵ھ تک ۴۲ سال کا زمانہ اردو شاعری کے تیسرے دور میں شامل کیا جاسکتا ہے ۔ آپ کی زبان بھی وہی ہے جو میر و مرزا کی تھی لیکن متروکات کا استعمال نسبتاً کم ہے ۔ سارا کلام شستہ زبان اور روزمرہ کا نمونہ ہے ۔ آپ نے رعایت لفظی کے ناپسندیدہ رنگ کو ترک کر کے صفائی ، سادگی صداقت بیان اور سوز و گداز کو پسند کیا پھر فصاحت اور بلاغت کا خیال رکھا تصوف کی چاشنی نے خیالات کو اور زیادہ بلند اور مؤثر کیا ہے ۔ جگہ جگہ چشتیہ اور قادریہ سلسلوں کے اذکار و اشغال کے اشارے ہیں اور اکثر اصطلاحات تصوف کا استعمال کیا ہے ۔ آپ نے اپنے اور اپنے محبوب کے درمیان کبھی غیر کو گوارا نہ کیا ۔ اس لئے آپ کے یہاں رقیب اور حریف نام کی کوئی چیز نہیں ملتی ۔ آپ نے تمام عمر نہ کسی کی ہجو لکھی اور نہ کسی سے لاگ ڈانٹ رکھی حالانکہ یہ چیزیں ان کے زمانہ میں عام تھیں ۔ مولانا غلام سرور لکھتے ہیں :-

---

[1] ریاض الفصحا ص ۳۳۹ (مطبوعہ انجمن ترقی اردو)
[2] تاریخ مشائخ چشت ص ۵۶۱

[1] خزینۃ الاصفیا جلد اول
[2] گلستان بے خزاں (مطبوعہ ۱۲۶۱ھ)

"حضرت شاہ دل آگاہ بشعر رغبت تمام داشت و اشعار آبدار متضمن حقائق و معارف گفتے۔ چناں چہ دیوان نیاز کہ از تصانیف آں حضرت است بسیار مرغوب و مطبوع جماعت اصفیاء است[1]

حضرت شاہ صاحب شعر کی جانب بڑی رغبت رکھتے تھے اور نہایت آبدار اشعار جن میں حقائق و معارف کا ذکر ہوتا تھا کہتے تھے۔ چنانچہ آپ کی تصانیف سے 'دیوانِ نیاز' جماعت صفا میں بے حد مرغوب ہے۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں[2]:-

" شاہ صاحب کو سوز و گداز سے بھری ہوئی طبیعت ودیعت کی گئی تھی۔ عشق ان کے خمیر میں تھا۔ جذباتِ عشق و محبّت کبھی کبھی شعر کی صورت اختیار کر لیتے تھے۔ شاہ صاحب شعر بہت کم کہتے تھے اسی وجہ سے ان کے اردو فارسی کے دونوں دیوان بہت مختصر ہیں لیکن جو کچھ بھی ہے وہ اپنی جامعیت اور افادیت میں کم نہیں۔ ان کی فکر رسا نے تصوّف کے نہایت باریک مسائل کو انتہائی حسن اور دلکشی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے کلام میں آورد نہیں وہ قلبی واردات کو نہایت خوبی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ سوز و گداز، درد، علو معانی کے علاوہ نفاست سلاست اور روانی ان کے کلام کے خاص جوہر ہیں۔"

حضرت نیاز بریلوی نے ۶۔ جمادی الثانی ۱۲۵۰ھ (۱۸۳۴ء) کو وصال فرمایا اور بریلی میں مدفون ہوئے۔

اب آپ کے ہندی کلام کا نمونہ ملاحظہ فرمایئے:

۱- اچرج دیکھ مور پیرو سدا رہت مورے گھر ماہیں
ہوں اگیانی گھر ناہیں کھوجت بھٹکت جاہیں تاہیں
ست گرو کی کرپا کینو پیا پائے ڈارے گھر باہیں
گھر باہر آپ وہی ہے نیاز ہوں ناہیں ہوں ناہیں

(مطلب) تعجب ہے کہ میرا محبوب میرے ہی گھر میں تھا اور میں اتنا بے خبر تھا کہ اسے اِدھر اُدھر ڈھونڈتا پھرا۔ سچے گرو نے جب کرم کیا تو میرے محبوب نے میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پھر وہی وہی تھا نیاز کا وجود ختم ہو چکا تھا۔

اس جگہ حضرت نے بتایا ہے کہ اگر ایک بار محبّت حاصل ہو جائے تو خودی ختم ہو جاتی ہے یا دوسرے لفظوں میں آپ نے من عرف نفسہ فقد عرف ربہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ آپ ہی کا ایک شعر ہے ؎

جس نے پہچانا ہے اپنے آپ کو
ہے نیاز اپنے قدم پر سرنگوں

دوسرے شعر میں فرماتے ہیں ؎

من و تو اُٹھے جہاں ہوں ہو ہیں وہاں کہاں ہوں
جو دوئی کے تھے تو ازم سو رہائی ان سے پائی

کہتے ہیں کہ برہم جاننے والا برہم ہی ہو جاتا ہے ब्रह्मविद ब्रह्मैव भवति اسی مضمون کو مہاتما کبیر داس اس طرح کہتے ہیں:

جب میں تھا تب گورو نہیں جب گورو ہے ہم ناہیں
پریم گلی اَت سانکری تا میں دو نہ سماہیں

(۲) محبوب کی تلاش میں اس تک پہونچنے کا راستہ معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ فرماتے ہیں:-

ہوری کھیلیں شیام سے میں چلی برج کی نگریا
ہاتھ میں تھال عبیر گلال کو سر پر رنگ کی گگریا
جو پیا ہمرے چونر چھر کے میں بونڈں واکی پگریا
نیاز کچھو نا جانت بوجھت کوئی بتائے دیو ڈگریا

(مطلب) محبوب سے ہولی کھیلنے کے لئے میں برج نگریا جا رہی ہوں۔ ہاتھ میں عبیر گلال کا تھال اور سر پر رنگ کی گگری ہے۔ اگر پیا نے میری چونری ہولی کھیلنے میں اتاری تو میں اس کی پگڑی اتاروں گی۔ تیاریاں تو سب کچھ ہیں لیکن نیاز کو وہ راستہ ہی نہیں معلوم ہے کوئی اسے ڈگریا (محبوب کا راستہ) بتا دے۔

اسی مضمون کو کبیر داس نے اس طرح کہا ہے:-

لمبا مارگ، دور گھر، بکٹ پنتھ بہو بھار
کہہ کبیر کس پائے دُرلبھ گورو دیدار

(۳) عشقِ حقیقی آپ کے رونگٹے رونگٹے میں بسا ہوا تھا۔ محبوب حقیقی

---

[1] خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل
[2] شاہ نیاز احمد بحیثیت شاعر' رسالہ اردو ص ۴۰۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء

کی جدائی ایک لمحہ کے لئے بھی شاق ہے فرماتے ہیں :-

ہلسات جیا پیا دیکھن کو نہ سہات کچھ موہنہ برہن کو
دو نین بھئے جھر کے جھرنا مانوں بدرا ہیں رت ساون کو
پیا پیا تڑپت پری ہوں ہری پیا ادھکت ہی یا بیدن کو
توری بل بل جاؤں نیاز پیا دکھ دور کرو مورے تن من کو

(مطلب) محبوب کو دیکھنے کے لئے دل بے چین و بے قرار ہے اسی وجہ سے برہ کی ماری کو کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ دو آنکھیں تھیں تو وہ بھی روتے روتے جھرنا بن گئیں جیسے ساون کے بادل ہوں۔ پیا کی دھن مجھ پر سوار ہے اس بیماری کا علاج تو حکیم کے پاس بھی نہیں ہے۔ اے نیاز کے محبوب تیرے واری جاؤں میرے تن من کا دکھ دور کر دے۔

(۴) ایک برہن کی فریاد سنئے۔ اس میں زبان کی شگفتگی، سلاست اور روانی بھی قابل لحاظ ہے۔ فرماتے ہیں :-

اُمگو جوبنوا کیسے کر راکھوں سنبھار
انبوا موسے ٹیسو پھولے برن برن کی بہار
آیا پھاگن سب ہوری کھیلیں تر نی باری بار
ہمرے میت گونوا کینو دینو موہے بسار
برہ اگنی موہے جارے ہی ڈارے چھن پل سو سو بار
نیاز پیا بن جی نکست ہے ایسی لگن بہت یار

(مطلب) میرا جوبن ابھار پر ہے اسے کیسے سنبھالوں۔ اس پر ستم یہ ہے کہ آم پر بور آیا ہوا ہے۔ سرسوں پھول رہی ہے اور رنگ برنگ کی بہار ہے۔ پھاگن آتے ہی الھڑ دوشیزائیں اپنے ساجنوں کے ساتھ ہولی کھیل رہی ہیں لیکن ہمارا پریتم ہمیں چھوڑ گیا ہے۔ برہ کی آگ جلائے ڈال رہی ہے۔ پل پل میں سو سو بار پھونک رہی ہے۔ اے نیاز کے محبوب ایسے وقت میں تو آ جاؤ کہ پریم کا جوار ہے تمہارے بغیر پران نکلے جا رہے ہیں۔

متفرقات

(۱) نظام الدین گریب نواج یا نہہ گہے کی تم کو لاج
زری زر بخش محبوب الہٰی سرس امیر مہا سرتاج
گنج شکر کے پیارے دلارے سوہت تم پہ ہند کو راج
سب مورے من کے کاج سنوارو تن من جوبن کیہوں نیاج

(۲) گیسو رچوری رنگ اجمیر خواجہ
نرنا ری کی پاک چیریا پیم کی رنگ چکوری
رانا راؤ اور شیخ مشائخ رل مل چا نجر جوری
جا بیں ہن محبوب الہٰی گو پن میں کشوری
یا رسیا کی نرمل مورت جوتی روپ بجوری
ایسے رنگیلے پیئے سے لاگی نیاز کی من ڈوری

بھلائی میں فولاد کی پیداوار

اس کارخانے نے فولاد تیار کرنے کا کام ۱۲ اکتوبر ۱۹۵۹ء کو شروع کیا تھا۔ جب فولاد تیار کرنے والی پہلی بھٹی کی رسم افتتاح بھارت میں مقیم روسی سفیر مسٹر آئی۔ بنیڈکٹف نے ادا کی تھی۔ اس کے بعد دو مزید بھٹیاں جاری کی گئیں یعنی دوسری بھٹی ۷ دسمبر ۱۹۵۹ء کو اور تیسری ۲۲ مارچ ۱۹۶۰ء کو جاری ہوئی۔ اس کے علاوہ تین مزید بھٹیاں زیر تعمیر ہیں جو اس سال میں مکمل ہو جائیں گی۔ پہلی تین بھٹیوں میں ہر ایک بھٹی میں روزانہ پانچ سو ٹن فولاد تیار کرنے کی صلاحیت ہے۔ مگر بھلائی کے کارخانہ کی ۶ بھٹیوں میں سالانہ دس لاکھ ٹن فولاد پیدا کیا جائے گا۔

سحر عشق آبادی

رُباعی کا فن

"آج کل" جولائی ۱۹۵۹ء میں سلام سندیلوی کا مضمون بعنوان "رباعی کا فن" نظر سے گزرا۔ سلام صاحب نے چند حضرات کی تصانیف سے چند رائیں تحریر کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ رباعی کہنا آسان نہیں اور صفحہ ۴ سطر ۵ میں غزل کو سب سے زیادہ آسان صنفِ سخن لکھا ہے۔

لیکن یہ دونوں باتیں حقیقت سے کوسوں دور ہیں۔ جتنی آزادی عروض نے رُباعی کو بخشی ہے اور اصنافِ سخن کو نہیں کیونکہ اور کسی نظم میں جہاں کوئی عروضی جواز آجاتا ہے وہیں سننے والوں کے کان کھڑے ہوجاتے ہیں اور ناواقفانِ عروض تو اُسے بے دریغ ناموزوں کہہ ہی دیتے ہیں۔ زحافِ تسکینِ اوسط اگر کسی شعر میں آجاتا ہے تو اُسے عام کیا خاص بھی سکتہ سے تعبیر کرتے ہیں لیکن رباعی میں یہ زحاف کثیر الاستعمال ہونے کی وجہ سے کوئی بھی سکتہ سے تعبیر نہیں کرتا لہذا ظاہر ہے کہ رباعی کو کس قدر آزادی ہے کہ چار مصرعے چار جدا اوزان پر ہوں تو بھی صحیح ہیں۔ اب دیکھیے غزل گو کہ علاوہ آتش لکھنوی کے بھارت بھر میں بڑا غزل گو کوئی بھی نہیں۔

رباعی کے تیسرے مصرع پر یہ قید نہیں کہ وہ مقفیٰ ہی ہو اس لیے شاعر کو اختیار ہے کہ وہ رباعی کے چاروں مصرعوں میں قافیہ رکھے یا تین میں۔

صفحہ ۴ کالم ۱ سطر ۱۱۔ "وہ رباعی کے اخرب کی بحر میں ہے"۔ قطع نظر جملہ کی بے ترتیبی سے، بھلا اخرب کون سی بحر کا نام ہے؟

اخرب تو اُس رکن کو کہتے ہیں جو مفاعیلن سے بذریعہ زحاف خرب (خرم + کف) حاصل ہوتا ہے یعنی مفعولُ

سلام صاحب اسی صفحہ اور اسی کالم کی سطر ۱۵ میں لکھتے ہیں کہ "رباعی کے لئے بحر ہزج ابتدا ہی سے متعین ہے۔" پھر آگے یہ کیا لکھتے ہیں کہ اس بحر کے ارکانِ مزاحف وسالم مل کر بعض کے نزدیک اٹھارہ اور بعض کے نزدیک چوبیس ہوتے ہیں مگر زیادہ تر چوبیس اوزان مانے گئے ہیں یہ چوبیس اوزان دس ارکان سے مل کر بنتے ہیں۔

سطر زدہ عبارت دیکھیے کہ ارکان اٹھارہ ہیں نہ چوبیس بلکہ وہ خود اقبالی ہیں کہ دس ہیں یہ ہے عبارت کا بے تکا پن۔

اسی صفحہ پر کالم ۲ سطر ۲، ۳، ۴ میں رقم طراز ہیں کہ رباعی کی بحروں[1] کی تعداد صرف چوبیس ہی نہیں ہوسکتی بلکہ ان بحروں[2] میں اضافہ بھی ہوسکتا ہے۔ مولف بحرالفصاحت کے حساب سے رباعی کی بحروں[3] کی تعداد ۲۷۴۱۴ تک پہنچتی ہے۔

اس عبارت میں تین جگہ بحروں آیا ہے۔ بحر تو صرف ہزج ہی رہے گی جیسا اوپر بیان ہوچکا۔ ان بحروں کی جگہ شکلوں چاہیئے تھا۔

صاحب بحرالفصاحت نے تو تعداد شکلوں کی ۴۴۹۲۸ لکھی ہے مگر ان شکلوں میں تو انھیں مجوزہ ۲۴ اوزانِ رباعی کا ذکر ہے پچیسواں[۲۵] وزن کوئی ہے ہی نہیں۔ اگر ہے تو سلام صاحب ثابت کریں۔

اس کے علاوہ لفظ بحر اور بحروں چھ جگہ وزن اور اوزان کے معنی پر اد۔ لکھا ہے۔ ملاحظہ کیجیے

(صفحہ ۴ کالم ۲ سطر ۱۵ و ۱۸) (صفحہ ۵ کالم ۱ سطر ۲۶) (صفحہ ۵ کالم ۲ سطر ۱۷) (صفحہ ۸ کالم ۱ سطر ۱۷ میں دو جگہ)

صفحہ ۵ کالم ۲ سطر ۱۰ اور ۱۱ میں نقطہ سوم لکھا ہے۔ یہ صحیح نہیں ایسی پابندی مصرع سوم پر عائد نہیں ہوتی یعنی اگر مصرع اوّل دوم اور چہارم میں

فعول یا فاع آئے تو تیسرے میں بھی ضرور آئے۔

صفحہ ۵ کالم ۲ سطر ۲۰ پر جو رباعی اخرب کی دی ہے اس کا پہلا مصرع (ہے چشم حیراں کو مجھ سے یہ حجاب) بروزن مفعولن مفعولن مفعولُ فعول ہے جو دائرہ اخرب سے خارج ہے۔ یہ غلطی صاحب معیار البلاغت کی نہیں بلکہ سلام صاحب کی ہے یا کاتب صاحب کی۔ معیار البلاغت میں یہ مصرع اس طرح درج ہے اور صحیح دائرہ اخرب کا ہے "ہے شبنم حیراں کو مجھ سے یہ حجاب" ——— اور یہ رباعیاں عبدالعزیز خاں عزیز دہلوی کی ہیں نہ کہ لکھنوی کی۔

رباعی پر نمبر اوزان لکھے تو وزن پر مصرع کا لکھنا واجب تھا۔

رباعی کا موجد رودکی ہے اور اسی نے رباعی کے ۲۴ اوزان بھی منضبط کئے ہیں اس نے اخرب و اخرم کے دائرے نہیں بنائے یہ ڈھونگ قطان خراسانی نے رچایا جو حقیقت میں یہ نہ سمجھا کہ رباعی میں رکنِ اخرم آتا ہی نہیں۔ اس راز کا انکشاف محقق طوسی علیہ الرحمہ نے کیا ہے اور ان کے فرمان کی رُو سے رباعی کے دس نہیں گیارہ ارکان بھی باطل ہو کر رہ گئے صرف ۶ زحافات پر رباعی کے تمام اوزان ختم ہو جاتے ہیں اور ان کی تشریح یہ ہے خرب[1]۔ قبض[2]۔ کف[3]۔ جب[4]۔ ہتم[5]۔ تسکین[6]۔

صدر و ابتدا کے لئے : رکن اخرب "مفعولُ"

مصرع کے دوسرے رکن حشو کے لئے : رکن مکفوف "مفاعیلُ" یا مقبوض "مفاعلن"

مصرع کے تیسرے رکن حشو کے لئے : رکن مکفوف "مفاعیلُ"

عروض و ضرب کے لئے : رکن مجبوب "فَعَل" یا اہتم "فعول"

یعنی مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ فَعَل یا فعول

یا مفعولُ مفاعلن مفاعیلُ فَعَل یا فعول

چھ ارکان (۱) اخرم مفعولن (۲) سالم مفاعیلن (۳) اشتر فاعلن (۴) ازل فاع (۵) مخنق مجبوب فع (۶) مخنق مفعولن کا ذکر وہم باطل ہے۔ یہ سبب تسکین اوسط سے پیدا ہو جاتے ہیں اور انھیں اس طرح لکھنا چاہیئے۔

مفعولن مفعولُ مفاعیلن فع   مفعولُ مفاعیلن مفعولن فع   مفعولن فاعلن مفاعیلن فاع

اخرب مکفوف مسکن مکفوف مجبوب مسکن   اخرب مکفوف مجبوب مسکن   اخرب مقبوض مسکن مکفوف اہتم مسکن

مفعولُ مفاعیلن مفعولُ فَعَل   مفعولن مفعولن مفعولن فاع

اخرب مکفوف مسکن مجبوب   اخرب مکفوف مکفوف اہتم مسکن

اب غور فرمایئے اور دکھایئے کہ مذکورہ پانچ ارکان کہاں آئے؟

رہا سوال غالب کی رباعی کا جو صفحہ ۵ پر تحریر ہے جس کا دوسرا مصرع ہے "دل رک رک کر بند ہو گیا ہے غالب" اس کے لئے نظم طباطبائی نے یہ الفاظ بھی تو لکھے ہیں۔ "مصرع ثانی میں ایک سبب خفیف زیادہ ہے۔ غالب کے خود نوشتہ مسودہ میں بھی یہ مصرع اسی طرح درج ہے۔ اگر عربی بحروں کے پیش نظر اس مصرع کو رکھا جائے تو البتہ ہو سکتا ہے لیکن ہمیں اپنی فارسی بحروں متداولہ کے اندر کہنا چاہیئے غالب جیسے شاعر سے ایسی غلطی کا سرزد ہونا تعجب سے خالی نہیں۔"

میرزا نوشہ نے مجھ سے کہا کہ نظم طباطبائی نے جان کر مجھ پر بے وزنی کا الزام لگایا ہے اُسے معلوم تھا کہ اس میں کیا راز ہے۔ آخر میں مجھ سے التجا کی کہ اس میں جو عروضی نکتہ ہے تم خوب جانتے ہو اس کی وضاحت کر کے صحیح ثابت کر دو۔ میں ابد تک تمہارے لئے دعا کرتا رہوں گا۔

ہاں میرزا نے صحیح کہا نظم طباطبائی نے عربی عروض کا محض بہانہ تراشا ورنہ فارسی عروض سے بھی وہ ثابت کر سکتا تھا کیونکہ رودکی اور مرادی کی مثالیں میرے پیش نظر ہیں۔ سعدی ہند میرزا ہرگوپال تفتہ سکندرآبادی نے جو الفاظ اس رباعی کے بارے میں کہے تھے وہ مجھ سے منشی پال مکند بیصبر سکندرآبادی نے خود فرمائے تھے۔

مجھے آخر میں یہ کہنا ہے کہ مضمون نگار کا فرض ہے کہ وہ جس عنوان پر کچھ لکھے اپنی آزاد رائے کا اظہار بھی ضرور کرتا جائے کہ کسی نے کتنا صحیح اور کتنا غلط کہا ہے لیکن اس بات کے لئے بڑے وسیع مطالعہ اور ذوقِ سلیم کی ضرورت ہے۔

ضروری گذارش

۱۔ مضمون کاغذ کے ایک طرف اور خوش خط لکھئے۔

۲۔ غیر طلبیدہ مضامین اُسی صورت میں واپس کئے جائیں گے۔ جبکہ ان کے ساتھ مناسب سائز کا لفافہ اور ڈاک کے ٹکٹ ہوں گے (ادارہ)

بسمل سعیدی

غزل

اگر دل ہو شوقِ فراواں کے بس میں
محبت کو تبدیل کر دے ہوس میں

خوشا عالمِ رنگ و شادابیٔ حُسن
شرابور ہو جیسے پھولوں کے رس میں

نہ ہے عالمِ شوق و شرم اُس نظر کا
کوئی راہرو جس طرح پیش و پس میں

کہاں دستِ شوق اور کہاں ان کا دامن
بظاہر مگر جیسے ہو دسترس میں

جوانی کا عالم ہے کچھ ہی نفس کا
مگر ایک عالم ہے ایک اک نفس میں

مرا کارواں منزلِ مرگ میں ہے
کوئی صُور پھونکو صدائے جرس میں

اُدھر لرزہ اندازِ افلاک، انساں
اِدھر جنبشِ چشم و ابرو کے بس میں

شفیق جونپوری

غزل

دل کو تو شرابِ عنبی یاد رہے گی
ساقی کو مری تشنہ لبی یاد رہے گی

اک شاہدِ معصوم سے دعوائے محبت
بھولے گی نہ یہ بے ادبی یاد رہے گی

پھولوں میں بھی اس قسم کا پندار نہ دیکھا
کانٹوں کی گلستاں نسبی یاد رہے گی

دیوانہ کہیں آپ اس اعزاز کے صدقے
دنیا کو مری خوش لقبی یاد رہے گی

اندازِ فغانِ سحری یاد رہے گا
فریادِ غمِ نیم شبی یاد رہے گی

اظہارِ محبت کے سوا کچھ بھی نہ کہنا
ان کو بھی مری بے طلبی یاد رہے گی

وہ اور شفیقِ جگر افگار کے مشتاق
اے عشق تری بوالعجبی یاد رہے گی

جیلانی بانو

ضمانت

راشد باہر سے ڈاک لے کر آیا تو ایک لفافہ رضیہ کی جانب اُچھالتا ہوا اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔

"خیریت تو ہے۔ تمہارے ابا کا کیا حال ہے۔؟" لنگڑی پھوپو کو ہر وقت رضیہ کے ابا کے مرنے کا انتظار رہتا تھا کہ جلدی سے مریں تو ان کا بھتیجا راشد ساری جائداد کا مالک بنے۔

"حامد بھائی کا خط ہے۔" رضیہ جانے کیوں خط پڑھ کر مسکرائے جا رہی تھی۔

"تمہارے ابا کا کچھ حال نہیں لکھا؟"

"سنا آپ نے! حامد بھائی کی شادی ہو رہی ہے۔" وہ پھوپو کو جواب دینے کی بجائے راشد کی طرف مڑ گئی۔

"سچ!" رضیہ کے اونگھتے ہوئے سسر نے چونک کر پوچھا اور اس کی ساس بی بی بھی ہمہ تن گوش ہو گئیں۔

"لکھا ہے یہیں کہیں شہر میں نسبت ٹھہری ہے۔ بہت بڑے لوگ ہیں۔ پانچ ہزار کا جہیز دینے کا وعدہ کر رہے ہیں۔ لیکن حامد بھائی چاہتے ہیں کہ ہم لوگ خود وہاں جا کر ان لوگوں کو دیکھیں اور ان کے لین دین کا اندازہ کر آئیں۔"

"ٹھیک ہی تو ہے!" لنگڑی پھوپو نے کہا۔ "بڑے لوگ ہمیشہ دس ہزار کہہ کر پانچ ہزار پکڑا دیتے ہیں۔"

"تو یہ ہے' ان کی یادداشت کس بلا کی ہے!" بی بی نے سوچا "تیس برس گزر گئے مگر لنگڑی پھوپو یہ بات نہیں بھولیں کہ بی بی کے باپ نے کم جہیز دیا تھا۔"

"اونہہ چھوڑو آپا اس ذکر کو۔" رضیہ کے سسرے نے کھسیا کر کہا۔ "تو خیر۔ حامد میاں کسی طرح بیاہ کرنے پر راضی ہو ہی گئے! مگر بھئی بڑے خاندانوں میں تو اپنی طرف سے بھی دھوم دھام کرنا ضروری ہے۔ مگر حامد میاں ایسے کنجوس تو دھیلے دھیلے پر جان دیں گے۔ حامد میاں لاوارثی مال تھے۔ خاندان میں ایسے نکھٹو اور بے سہارا لڑکے کو کسی نے اپنا بھانجا، بھتیجا بنانے کی حامی نہ بھری میٹرک تک رضیہ کے ابا نے پڑھا دیا اس کے بعد خیرات اور بھیک کے سہارے آخر وہ گریجوئٹ ہو ہی گئے۔ لیکن رضیہ کے سسر کا کہنا تھا کہ انھیں نوکری دلوانے میں صرف ان کی سفارش کا ہاتھ ہے ورنہ بی اے پاس کو آج کل کہاں دو ڈیڑھ سو کی نوکری مل جاتی ہے! لیکن یتیمی کی مار اور بھیانک مفلسی کے ساتھ نے حامد کو دولت کے معنی سمجھا دئے تھے۔ پہلے وہ اس لئے بھوکے سوتے تھے کہ کھانے کو کچھ نہ جڑتا۔ اب اس لئے خالی پیٹ کروٹیں بدلتے کہ یہ دو چار آنے بھی جمع ہو جائیں۔ کوئی مذاق اڑاتا تو ہنس کر ٹال دیتے جیسے سوچ رہے ہوں کہ اور تھوڑے دنوں کی بات ہے پھر میں بھی موٹر میں بیٹھنے کے بعد آپ کا سگا بھتیجا بن جاؤں گا۔

ویسے حامد کا کوئی اور کام آ پڑتا تو کوئی پلٹ کر بھی نہ پوچھتا مگر یہ تو شادی کا معاملہ تھا۔ ایسے ہی موقع پر تو سمدھن بن کر ناز و انداز دکھانے کی حسرتیں پوری ہوتی ہیں۔ ادھر حامد میاں پر یہ احسان کر لو بھئی "آخر تمہارے بیاہ کے فرض سے بھی ہم ہی سبکدوش ہوئے۔

ایک دم گھر میں ہل چل سی مچ گئی۔ بی بی نے فوراً اپنے زیور بینک سے نکلوا لئے۔ یہی وقت تو ہوتا ہے لوگوں پر رعب ڈالنے کا۔ چاند درزی کے ہاں دوڑی ہوئی گئی تاکہ بلاؤز کا نیا ڈیزائن سمجھائے اور رضیہ نے ارشد کو مجبور کیا کہ اسے ایک نئی زرّیں ساری لا دے، کیونکہ سب ہی ساریاں وہ کئی کئی

یار پہن چکی تھی۔

دوسرے دن ساتھ جانے کے لئے دلہن کا چھوٹا بھائی آیا تو سب کیل کانٹے سے لیس تھے۔ آج تو لنگڑی پھوپو نے بھی بی بی سے مانگ کر نہ صرف چکن کی ساری پہنی تھی بلکہ ہاتھوں میں سونے کی چوڑیاں بھی پہنے تھیں۔ بی بی نے آج زور دار مسّی لگائی تھی۔ خاص خاص موقعوں پر وہ سنہری فریم کی عینک بھی لگاتی تھیں تاکہ بھاری بھرکم بدن کے رعب میں مزید اضافہ ہو۔ جس قدر زیور پہننا ممکن تھے وہ انھوں نے پہن لئے پھر بھی زیوروں کا بکس جوں کا توں بھرا رہا۔ اس لئے وہ چاند اور رضیہ کی خوشامد کرتی رہیں کہ وہ دونوں بھی تھوڑے سے زیور اور پہن لیں۔ یہ دیکھ کر غزل نے اس مسئلہ کو حل کرنا چاہا۔

" نانی آپ زیوروں کا یہ بکس ساتھ کیوں نہیں لے چلتیں سب کو دکھا دیں گے وہاں۔ "

" اوئی پگلی ہوئی ہے لڑکی! کیا ہم ان لوگوں کو دکھانے کے لئے زیور پہن رہے ہیں؟ "

البتہ چاند نے ہزار کوششوں کے باوجود کسی زیور کو ہاتھ نہ لگایا۔ اس لئے لنگڑی پھوپو اور بی بی طے کئے بیٹھی تھیں کہ وہ چاند کے خالی گلے اور ننگی کلائیوں پر خوب اعتراض کریں گی۔ مگر جب وہ فلم اسٹاروں کی طرح میک اپ کئے، بال بنائے نکلی تو سب کھسیا گئیں۔

اوئی یہ کون سا نیا فیشن ہے کہ بال منہ پر بکھرائے اور لنڈورے ہاتھ لئے چلی جا رہی ہیں۔" لنگڑی پھوپو اعتراض برائے اعتراض کی شدت سے قائل تھیں۔

" رہنے دیجئے بھئی ہمیں نہیں چاہئیں آپ کے زیور۔" چاند نے اترا اٹھا کر بڑی نفاست سے کہا تاکہ اس کے ہونٹوں کی عنابی لپ اسٹک پر شکن نہ پڑ جائے۔

فوزیہ گھنٹوں پہلے سے سرخ مخمل کا فراک پہنے نئے جوتوں کو پٹک پٹک کر اکڑتی پھر رہی تھی۔ بار بار وہ اپنی فراک دیکھتی پھر غزل کا وہ پرانا فراک دیکھتی جو اسی کا تھا اور بی بی نے رضیہ سے مانگ کر غزل کو پہنا دیا تھا اس لئے وہ غزل کی نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئی تھی اور بار بار جب غزل دلھن کے مسکین صورت بھائی کو مار مار کے بھاگتی تو وہ ضرور جتا دیتی۔ دلھن کا بھائی بے چارا بڑا مظلوم سا لڑکا تھا اور کرسی پر بیٹھا محض اس لئے غزل کے مکّے برداشت کر رہا تھا کہ شاید یہی اس کی بہن کی سب سے چہیتی نند ہو گی جو بار بار اس کی ٹوپی چھیننے کی کوشش کر رہی تھی۔ دس گیارہ برس کا وہ بڑا شرمیلا سا لڑکا تھا۔ صورت پر ایسی کرب آمیز مایوسی تھی جیسے آج تک وہ جی بھر کے نہ ہنسا ہو۔ اس لئے وہ بڑے تحمل سے بڑی بے بسی سے اپنی ٹوپی بچانے کے لئے غزل کو سمجھاتا رہا۔

" زمین پر مت بیٹھو، تمھارے کپڑے میلے ہو جائیں گے۔"

" یہ میری فراک پہنے ہیں۔" فوزیہ نے فوراً اسے اطلاع دی۔

" ہائیں یہ بُری بات ہے۔ ایسا نہیں کہتے ہیں۔" اس نے نرم لہجہ میں فوزیہ کو سمجھایا۔" ذرا سی دیر کے لئے کسی کے کپڑے مانگ کر پہن لئے تو کیا ہوا؟"

" تمھارا نام کیا ہے میاں؟" بی بی نے الماریوں میں قفل ڈالتے ہوئے پوچھا۔

" جی، سلام حسین فاروقی، اب آپ جلدی چلئے نا بہت دیر ہو گئی۔" اس نے بے چینی سے کہا۔

" اچھا تو سلام حسین فاروقی صاحب! اتنی جلدی کیا ہے جانے کی۔" چاند نے آئینے میں اپنی لپ اسٹک ٹھیک کرتے ہوئے پوچھا۔

" ہماری آپا نے دوپہر کا کھانا تیار کر لیا ہو گا۔"

" نہیں بھئی ہم کھانا نہیں کھائیں گے۔" رضیہ نے منہ بنا کر کہا۔

" تو ہمارے اتنے بہت سے روپے جو ضائع ہو جائیں گے۔" سلام گھبرا گیا۔

یہ سن کر سب نے اس لڑکے کو دیکھا اور پھر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

" اچھا تو ہم شام کو کھا لیں گے۔" بی بی نے اس کا دل رکھنے کو کہہ دیا۔

" مگر برتن۔!"

" برتن — یہ برتن کیسا۔؟" بی بی نے پوچھا۔

" جی برتنوں کا کرایہ جو بڑھ جائے گا شام تک۔"

یہ سن کر بی بی اس کے پاس آ بیٹھیں۔

" تمھاری جس بہن کی شادی ہو رہی ہے وہ اسکول میں نوکر ہیں؟"

" جی نہیں۔" سلام اس سوال سے بے حد گھبرا گیا۔" بڑی آپا کہتی ہیں وہ اب شادی نہیں کریں گی۔ اپنی ساری تنخواہ چھوٹی آپا کے جہیز کے لئے جمع کرتی ہیں"

" اچھا تو وہی پانچ ہزار کا جہیز دے رہی ہیں؟" لنگڑی پھوپو بھی پاس آ بیٹھیں۔

" ہمارے بڑے بھائی کو ایک ہزار روپے ایک مہینے میں ملتے ہیں وہ بھی چھوٹی آپا کے جہیز میں دیں گے جب چھوٹی آپا کی شادی ہو جائے گی تو بڑے بھائی پڑھیں گے۔"

" تم لوگ اپنی بہن کی شادی اتنی جلدی کیوں کر رہے ہو ؟" بی بی نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

" نہیں تو وہ بھی تھوڑے دنوں کے بعد بڑی آپا کی طرح کہنے لگیں گی کہ میں اب شادی نہیں کروں گی۔"

اس کے بعد کیا پوچھنا باقی رہ گیا تھا۔

راستے میں بی بی نے رضیہ سے کہا۔" بھئی ایسے بیہنچر لوگوں کی بات کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ ان سے تو پکے کاغذ پر پہلے لکھوا لینا۔" رضیہ نے بھی ہاں میں ہاں ملائی کیونکہ اس کا دل بھی اچاٹ سا ہو گیا تھا ان لوگوں سے۔

وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ گھر تو واقعی بہت بڑا تھا اور سارے کمرے یوں خالی پڑے تھے جیسے مفلسی نے وہاں بڑی نفاست سے جھاڑو دی ہو۔ گھر والے بھی بڑے آدمیوں میں شمار ہو سکتے تھے خود دلہن بھی کافی لمبی اور دُبلی تھی یوں لگتا جیسے کسی نے بانس پر کپڑے ٹنکا دئے ہوں۔ مگر حامد میاں کو دلہن کی خوبصورتی سے کیا لینا دینا تھا۔ اصل حُسن تو پانچ ہزار روپوں کا تھا۔ دُلھن کی بڑی بہن کو چلتے پھرتے دیکھ کر خدا کی قدرت یاد آتی تھی۔ تیس بتیس برس کی عمر میں وہ چالیس پچاس برس کی لگتی تھی۔ اتنی کمزور اور بیمار سی تھی کہ بات کرتے میں ہانپ جاتی۔

بہرحال باتیں شروع ہوئیں اور سب دوسرے کی سُنے بغیر اپنی سناتے رہے۔ البتہ چاند اور فوزیہ بہت بور ہوئیں کیونکہ وہاں ان کے فیشن اور کپڑوں کو رشک بھری نظروں سے دیکھنے والا کوئی نہ تھا مگر غزل حسب عادت اڑوس پڑوس کی لڑکیوں میں فوراً گھل مل گئی اور دور آنگن میں بیٹھی لنگڑی پھوپو کی چھینگی آنکھوں اور دُلھن کی اماں کے گنجے پن پر زور زور سے قہقہے لگاتی رہی۔

پھر وہ پکے امرود دیکھ کر بندریا کی طرح پیڑ پر چڑھ گئی۔ اس پر سلام اور فوزیہ چلانے لگے۔ فوزیہ کو اپنی فراک کے پھٹ جانے کا ڈر تھا اور سلام کو امرودوں کے نقصان کا۔

" امرود مت توڑنا انھیں ایک مالی خرید چکا ہے۔"

" چھی تم لوگ کتنے کنجوس ہو خود کیوں نہیں کھاتے ؟" غزل نے پیڑ پر اچھے اچھے پھل تاکتے ہوئے کہا۔

" جب خوب بہت سے پیسے آجائیں گے ہمارے پاس تو سب پھل ہم لوگ کھایا کریں گے۔" سلام نے کہا۔

" بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے بچوں کو امرود پسند ہی نہیں اس لئے مجبوراً سب بیچ دیتی ہوں۔ بیکار ضائع کرنے سے کیا فائدہ ۔" سلام کی ماں نے سب کو سنایا۔

نیچے اُترنے کے بعد غزل سب کے ساتھ کھانے پر ٹوٹی اور مرغ سے لے کر باسی چاول تک نگل ڈالے۔ باتوں باتوں میں دُلھن کی بہن نے جتایا کہ دوکان دار نے بے ایمانی کرکے اتنے مہنگے داموں پر خراب گھی بھیج دیا اور اسی وجہ سے اس دعوت پر پورے تیس روپے خرچ ہوئے ہیں۔ پھر غزل اور فوزیہ نے مل کر ان کمروں کا معائنہ کیا جہاں ٹوٹا پھوٹا سامان سمیٹ کر اس پر میلی چادریں ڈال دی تھیں۔ غزل وہاں سے ایک رنگین تصویروں والی کتاب نکال لائی اور اچھے اچھے فوٹو دیکھنے لگی۔ ایسے رنگین تصویریں بڑے مزے کی لگتی تھیں۔ مگر اسی وقت پھر سلام آگیا اور کتاب کی یہ گت دیکھ کر تو جیسے کسی نے اس کے آگ لگا دی۔

" اب کیا ہوگا ؟ معلوم ہے یہ پورے ایک روپے کی کتاب تھی۔" اور کتاب اس کے ہاتھ میں سے چھین لی۔

" کنجوس مکھی چوس ، تم نے اپنے امرود بھی ہمیں نہیں کھلائے۔ جاؤ اب ہم اپنے حامد ماموں کا بیاہ تمھاری بہن سے نہیں کریں گے۔" غزل نے بھی اتنی دیر میں اندازہ لگا لیا تھا کہ یہاں اتنی خاطر مدارات کیوں ہو رہی ہے۔

یہ سُن کر سلام نے یوں غزل کو دیکھا جیسے کوئی خوبصورت چڑیا اس کے ہاتھ میں ہو۔ پھر جانے کیوں وہ سسک سسک کر رونے لگا۔ پھر اُٹھ کر غزل کے پاس آیا اور سامنے کتاب پٹک کر بولا۔" لو کتاب ۔ اب تو ہماری آپا کا بیاہ ہو جائے گا نا !"

" اونھ ۔" غزل بدستور روٹھی ہوئی تھی۔" پہلے ہمیں ایک امرود لاکر دو۔"

" مگر وہ امرود تو اب مالی کے ہو چکے ہیں۔ معلوم ہے چوری کرنے سے اللہ میاں خفا ہو جاتے ہیں۔"

بیزار ہو کر غزل پھر چاند کے پاس آ بیٹھی۔ دُلھن کی بہن لنگڑی پھوپو سے کہہ رہی تھیں۔

" بس جو پہنے ہوں یہ ساری چالیس روپے کی ہے۔ یہ بھی ہم آمنہ کے جہیز میں دیں گے۔"

" یہ پُرانی ساری ۔ !" لنگڑی پھوپو نے حقارت سے کہا۔" آپ جہیز

کی فہرست ایک کاغذ پر لکھ کر دے دیجئے۔"

"مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے ___" دُلھن کی ماں ہکلانے لگیں۔ "ہم تھوڑا تھوڑا کرکے جمع کر رہے ہیں۔ آپ ہماری بات پر یقین کیجئے۔ بڑے آدمیوں کی زبان ہی سب کچھ ہوتی ہے۔"

یہ بات سن کر رضیہ کو ہنسی آگئی۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر آج کل ایسا زمانہ ہے کہ جب تک لکھا پڑھی نہ ہو بات کیسے طے سمجھیں!"

بہو کی بات سُن کر جانے کیوں بی بی پسینہ پونچھنے لگیں۔

"آمنہ کے چچا نے وعدہ کیا ہے کہ وہ دولھا کو منہ دکھائی میں سونے کی انگوٹھی دیں گے۔" دُلھن کی بہن پھر بولیں۔ وہ بےچاری ذراسی بات کرکے ہانپ جاتی تھیں۔

"آپ سے سچی سچی بات کہہ دوں ___!" دُلھن کی اماں نے ایک اور کوشش کرنا چاہی۔ "ساڑھے تین ہزار نقد تو آپ دُلھن کے ساتھ لے جایئے۔ باقی رقم کی تکمیل میری بڑی لڑکی اپنی تنخواہ دے دے کر ایک سال میں کردے گی۔ آپ یقین کیجئے کہ ہم ضرور یہ رقم ادا کر دیں گے۔"

یہ سن کر سب چونک پڑے۔

"اُدھار ___! ہائے اللہ۔ لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے۔ کہیں جہیز بھی ادھار ہوتا ہے؟" پھوپو نے بگڑ کے کہا۔

"اور بھئی آپ کی بیٹی کی تنخواہ کا کیا ٹھیک ___" رضیہ نے بھی صاف صاف کہنا مناسب سمجھا۔ "کل کو کہیں بیاہ ہوگیا تو کون ذمہ داری سے گا روپیہ نبٹانے کی۔ آپ تو کاغذ پر لکھ کر بھی نہیں دیں گی؟"

"میرا بیاہ ___!" دُلھن کی بڑی بہن دُور کہیں خلاء میں گھورنے لگی۔

"کیا آپ کو یقین ہے ___ آپ کو یقین ہے کہ مجھے ___ میرا مطلب ہے میرا بیاہ بھی کہیں ہو سکتا ہے ___؟" اس نے گردن اُٹھا کر پھوپو سے پوچھا۔

سب نے اس کے سر پر چھائی ہوئی شام کی سنہری دھوپ کا اُجالا دیکھا اور پھر لاجواب سے ہوگئے جیسے اب پکّے کاغذ پر لکھوانے کی ضرورت نہ ہو۔

گھر آکے رضیہ نے فوراً حامد کو خط لکھا۔

"حامد بھائی، آپ کی سسرال والے بہت بڑے لوگ ہیں وہ یقیناً پانچ ہزار دیں گے۔ اس بات کی ذمہ داری میں لے سکتی ہوں۔"

کنور محمد یٰسین علی خاں شہاب مرنی

آغا حشر بہ حیثیت غزل گو

آغا حشر جنھیں ادبی دنیا میں "شیکسپیرِ ہند" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ایک شہرۂ آفاق نثر نگار تھے۔ اُن کی آبِ کوثر میں دُھلی ہوئی نثر جس نے برسوں بساطِ ادب پر ڈراموں کی شکل میں علم و دانش کے ساغر چھلکائے اردو نثر کی تاریخ میں ادب العالیہ کا درجہ رکھتی ہے۔ ان کی زندگی میں بھی اور ان کی وفات کے بعد ناقدین نے بہ حیثیت نثر نگار ان کی شخصیت و فن کے تقریب قریب ہر پہلو پر اظہارِ رائے کیا اور مشاہیرِ ادب نے اپنے اپنے مضامین میں پوری فراخ دلی کے ساتھ ان کو خراجِ تحسین بھی پیش کیا مگر افسوس کہ ان کی شعر گوئی پر تفصیلی انداز میں کسی نے بھی روشنی نہیں ڈالی اور ہماری اس غفلت و کوتاہی کے ہاتھوں ان کے وہ اشعار یا وہ ادبی شہ پارے جو زر و جواہر میں تولے جانے کے قابل ہیں منظرِ عام پر آنے کی بجائے قعرِ گمنامی میں روپوش ہیں۔

آغا حشر کے کلام کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نیرنگیِ فکر و جولانیِ طبع نے نثر کے علاوہ نظم کے میدان میں بھی شہسواری کے وہ وہ جوہر پیش کئے ہیں جو بلاشبہ اپنی نظیر آپ ہیں لیکن اس کے باوجود نئی نسل کے نوجوانوں کا ایک وسیع حلقہ اس حقیقت سے بے خبر ہے کہ آغا حشر مرحوم ایک جلیل القدر نثر نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بے مثال شاعر بھی تھے۔

آغا حشر کو ایک شاعر کی حیثیت سے قدم قدم پر دشواریاں پیش آتی رہیں۔ سب سے بڑی زیادتی تو ان کے ساتھ یہ ہوئی کہ انھیں اپنا سلسلۂ معاش برقرار رکھنے کے لئے اپنی توجہ شعر گوئی کی جگہ نثر نگاری پر زیادہ مبذول رکھنا پڑی۔ اس کے علاوہ ان کی شعر گوئی کی صلاحیتیں تجارتی منفعت کی خاطر غزل گوئی کی بہ نسبت زیادہ تر منظوم مکالموں کے لئے وقف رہیں جو وہ اس ڈرامائی دَور کے رواج کے مطابق اپنے ڈراموں میں کرداروں کی بات چیت کے لئے لکھتے تھے۔

یہ منظوم مکالمے بھی فصاحت و بلاغت اور شعری محاسن کے اعتبار سے اردو ادب کا کافی قیمتی سرمایہ ہیں۔ ان کے ان ڈراموں میں جن کے منظوم مکالمے ادبی لحاظ سے انمول کہے جا سکتے ہیں نیک پروین، عشق و فرض، اسیرِ حرص، صیدِ ہوس، ترکی حور، یہودی کی لڑکی، خوبصورت بلا اور پہلا پیار وغیرہ شامل ہیں۔ ان ڈراموں کے منظوم مکالموں نے چالیس سال پیشتر ہندوستان کے طول و عرض میں دھوم مچا رکھی تھی اور ان منظوم مکالموں کے بے شمار اشعار زبان زدِ خاص و عام تھے۔ انتہائی افسوس کی بات ہے کہ آج آغا حشر کی وفات کو پورے پچیس برس گذر چکے ہیں مگر اب تک اُن کے کلام کا کوئی بھی مجموعہ شائع نہیں ہو سکا۔ تقسیمِ ہند سے پیشتر لاہور سے ایک کتاب ضرور شائع ہوئی تھی جس میں ناشر نے ان مضامین کو یکجا کر دیا تھا جو اردو ادباء نے آغا کے متعلق ان کی وفات کے بعد سپردِ قلم کئے تھے۔ اسی کتاب کے آخری چند صفحوں میں ناشر نے آغا کی کچھ غزلیں بھی شائع کی تھیں اس کتاب کے بعد پھر ایسی کوئی کتاب نظر سے نہیں گذری جس میں آغا کا کلام شائع کیا گیا ہو۔ حالانکہ آغا کی غزلوں کے علاوہ ان کے منظوم مکالموں سے بھی اچھے اشعار کا نایاب ذخیرہ دستیاب ہو سکتا ہے نیز آغا نے عشقیہ غزلوں اور ڈراموں میں منظوم مکالموں کے علاوہ متعدد نظمیں بھی کہیں جن میں سے موجِ زمزم، دُعا اور شکریۂ یورپ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن مضمون ہذا میں ان کے منظوم مکالموں اور نظموں وغیرہ سے قطعِ نظر کرتے ہوئے صرف ان کی غزلوں پر

تبصرہ مقصود ہے۔

جس طرح آغا حشر کی نثر نگاری یا ڈراما نگاری کے مختلف دور گذرے اور ہر دَور کے ڈراموں میں ایک تدریجی ترقی و تبدیلی نمایاں ہے۔ اسی طرح ان کے کلام کا سلسلہ وار مطالعہ کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ ان کی شعر گوئی کے بھی کئی دور گذرے۔ ہر دَوران کے شاعرانہ نظریات میں تبدیلیاں کرتا رہا جس سے ان کے رجحانات نکھرتے سنورتے رہے اور ان کی فکر و نظر میں پختگی آتی رہی۔ آغا کی شعر گوئی کے ہم تین دور متعین کر سکتے ہیں۔ پہلا دَور ۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۱ء تک۔ دوسرا ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۲ء تک، اور تیسرا ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۴ء تک۔

ان کے پہلے دَور یا عنوانِ شباب کی شاعری پر قدیم رواجی و روایتی رنگ چھایا ہوا ہے جس کے سبب اس دَور کے اشعار صرف زبان و بیان کی خوبیاں لئے ہوئے ہیں۔ نمونے کے طور پر اس دَور کے کچھ اشعار درج کئے جاتے ہیں:-

پُر کیف، مست، خندہ بہ لب جھومتا ہوا — بادل بھی آ رہا ہے کہیں سے چھکا ہوا
ساقی بھی ہے، چمن بھی ہے، ٹھنڈی ہوا بھی ہے
ٹوٹے جو آج توبہ تو اے دل مزا بھی ہے

چوری کہیں کھلے نہ نسیمِ بہار کی — خوشبو اڑا کے لائی ہے گیسوئے یار کی
گلشن میں دیکھ کر مرے مستِ شباب کو — شرمائی جا رہی ہے جوانی بہار کی

شہیدِ عشق کے ماتم میں چشمِ نا نہ پُرنم ہو
مبارک اس کا مرنا جس کے مرنے کا تمھیں غم ہو

بہار آئی ہے، ابر آیا ہے، یارب وہ بھی آ جائے
ادھر پانی کی رم جھم ہو ادھر پائل کی چھم چھم ہو

بنی کے محلوں میں ہزاروں رنگ کے فانوس تھے
جھاڑ ان کی قبر پہ ہیں اور نشاں کچھ بھی نہیں

جوانی میں علم کے واسطے سامان کر غافل — مسافر شب کو اٹھتے ہیں جو جانا دور ہوتا ہے

نہ پوچھ اے بے وفا کیوں تک رہا ہوں تیری صورت کو
مقدر کی کہانی پڑھ رہا ہوں تیرے تیور میں

لے جاتی ہیں سانسیں دوش پر طوفانِ ناکامی
ہزاروں آرزوئیں ساتھ لے کر دم نکلتا ہے

دوسرے دور کی شاعری موضوع کے تنوع، مضامین کے اچھوتے پن، شعری نزاکت، کیف نوازی، رومان پسندی اور فطرت پرستی کی عکاسی کرتی ہے

ہوئی ہیں یوں حسن کے اُفق پر تجلیاتِ شباب پیدا
کہ جس طرح ہو رواقِ زریں سے صبح کا آفتاب پیدا

چھلک رہے ہیں بہ صد تجمل شرابِ نکہت سے ساغرِ گل
کہ بطنِ دوشیزۂ چمن سے ہوئے ہیں حسن و شباب پیدا

بنا دے دیوانہ عقل و دیں کو پھر آج اس چشمِ سرمگیں سے
ہے جس کی ہر گردشِ جبیں سے خرامِ موجِ شراب پیدا

اب کہاں جاؤ گے رہ جاؤ یہیں رات کی رات
میرے گھر آئی ہے تقدیر سے برسات کی رات

اس کی تنویر میں یہ جلوۂ پُر کیف کہاں
صبحِ فردوس پہ ہنستی ہے خرابات کی رات

عشق کہتے ہیں جسے خواب ہے بیداری کا
اور جوانی ہے فقط عالمِ جذبات کی رات

ہزرے ُتاب نہ معشوق بس اے حشر نہ پوچھ
ہائے افلاس مرا ہائے یہ برسات کی رات

یہ تارے ہیں کہ موجِ نور کے چھلکے ہوئے قطرے
کہاں سے اے قمر تو نے یہ جامِ آتشیں پایا

وہ آنسو جن کی کچھ قیمت نہ تھی تیری نگاہوں میں
اُنھیں کو رونقِ دکانِ جیب و آستیں پایا

محبت حشر سازِ حسن کے پردوں کی جنبش ہے
اسی سے روحِ شاعر نے سرودِ دلنشیں پایا

یارب ترے کوثر میں نہ تلخی ہے نہ مستی — ہم کو جو پلانی ہو تو دنیا سے منگا دے
برسات ہے توبہ کا گلا کاٹوں گا ساقی — بوتل میں جو رکھی ہے وہ تلوار منگا دے
یہ توبہ انگور ہے کیا بات ہے اس کی — تو زہر بھی ہاتھوں سے پلائے تو مزا دے

حشر یہ کالی گھٹائیں اور توبہ کا خیال — تم یہیں بیٹھے رہو میں سوئے میخانہ چلا

کتنی گھٹائیں آئیں برس کر چلی گئیں — آنسو مرے مگر نہ تھمے تم سے چھوٹ کے

تیسرے دَور کی شاعری فکر کی گہرائی، احساس کی شدت، جذبات کی تڑپ، قلب و روح کی خلش، حقائق کی تلخی، علم کی وسعت، فن کی بلندی، اور تعمیری و صحت مند رجحانات کی علمبردار ہے جس کا عکس ان اشعار میں بخوبی

چھلکتا ہے

وہ ہنسی کے دن، وہ خوشی کے دن گئے حشر یاد سی رہ گئی

کبھی جام بادۂ ناب تھا مگر اب میں اس کا اُتار ہوں

امیدوں کی تباہی حسرتوں کی پائمالی کو — محبت کے ستم کش عمر کا حاصل سمجھتے ہیں

یہ دل آخر ہجومِ آرزو ہے تم بھی آ جاؤ — ہم اس کو زندگی کی آخری محفل سمجھتے ہیں

ڈھلا چکی نگاہ دمِ واپسیں ہے اب — آ پاس آ کہ دیکھ لوں تجھ کو قریب سے

برباد دل کا آخری سرمایہ تھی اُمید — وہ بھی تو تم نے چھین لیا اس غریب سے

آیا ہے گل فروشی کو پھرتا جسے بہار — گل حشر کہہ رہی تھی صبا عندلیب سے

آج دُنیا مجھے دوزخ ہے پر اک دن وہ تھا — جنتِ عیش و فا تھی تری آغوش مجھے

جہاں میں کشمکشِ جہد کا ہے نام حیات — یقینِ مسئلۂ جبر و اختیار نہ کر

سنا ہے حشر وہ ذکرِ وفائے غیر کرتے تھے

جو ہاں بھی بیچ میں کچھ بول اُٹھا ہوتا تو کیا ہوتا

ڈر ہے کہ کہیں سعی کی طاقت بھی نہ لے لے — قسمت کو دعا اے دلِ ناکام دئے جا

مطرب سے یہ کہتا تھا حشر اپنی غزل سن کے

ہے میری جوانی کا بھولا ہوا افسانہ

بے رنگیں تھا سا وہ پانی بھی — ہائے کیا چیز تھی جوانی بھی

یاد میں تیری جہاں کو بھولتا جاتا ہوں

بھولنے والے کبھی تجھ کو بھی یاد آتا ہوں میں

جلوؤں سے تیرے روشن ہے عالمِ تصور — تارے چھٹک رہے ہیں خاموش آسماں میں

یہ مانا ایک دن اس خستگی کی داد پائیں گے — تسلی دینے والے یہ تو فرمائیں مگر کب تک

نوائے شوق سے گونجی ہوئی ہے عشق کی دُنیا — یہاں کا ذرہ ذرہ گفتگوئے یار کرتا ہے

جس کے ہونٹوں میں دوا اور جس کی آنکھوں میں شفا

آئے سب لیکن نہ آیا وہ عیادت کے لئے

گنہگارِ وفا کو اس ادا سے دی سزا تو نے — کہ ناکردہ گنہ کو حسرتِ تعزیر ہوتی ہے

کیا اے جرأتِ نظارہ آخر تو نے شرمندہ

شکایت کر رہے ہیں جلوہ ہائے رائگاں ہم سے

کشاکش زندگی کی ارتباطِ جسم و جاں تک ہے

یہ سب ہنگامۂ محفل ہماری داستاں تک ہے

خبر ہے خشک ہو جائیں نہ آنسو سوزشِ دل سے

ترا غم گل بہ داماں دیدہ ہائے خونچکاں تک ہے

مٹا دے دل کو، دل کی لذتِ ایذا نہ مٹنے دے

ہجومِ کاروانِ شوق اس جنسِ گراں تک ہے

لہو ہو جائے دل گھُٹ گھُٹ کے پر آنسو نہ ٹپکیں گے

کریں گے ضبط مجبورِ ستم طاقت جہاں تک ہے

وہی آ کر لبِ شاعر پہ شعرِ گرم بنتا ہے

وہ سوزِ زندگی جو شعلۂ دل سے زباں تک ہے

ان اشعار کی موجودگی میں یہ امر ایک ناقابلِ تردید حقیقت بن جاتا ہے کہ اگر آغا حشر مرحوم ایک ڈراما نویس نہ ہوتے یا ان کی کاوشِ فکر و جدتِ تخیل ڈرامے کی نثر کے لئے وقف ہو کر نہ رہ جاتی تو اردو شاعری کے خزانے میں ایک ایسا نادر اضافہ ہوتا جس کی مثال ملنا مشکل ہو جاتی۔ پھر بھی انھوں نے شاعر کی حیثیت سے بطور یادگار جو کچھ اپنا سرمایۂ کلام چھوڑا ہے اس کو ہرگز نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

تصحیح - ماہ مارچ کے شمارے میں صفحہ ۹ پر جناب جوش ملسیانی کے مضمون بعنوان "اصلاحِ شعر" میں میر کا ایک شعر یوں شائع ہوا ہے

صبح گزری شام ہونے آئی میر — تو نہ یاں چیتا بہت دن کم رہا

اصل شعر یوں ہے:

صبح پیری شام ہونے آئی میر — تو نہ چیتا یاں بہت دن کم رہا

اسی کے مطابق اس کا مفہوم بھی ہونا چاہیئے البتہ تنقید کا عیب میر کے یہاں قائم رہتا ہے (ادارہ)

راشٹرپتی بھون میں اعزازات دینے کی تقریب

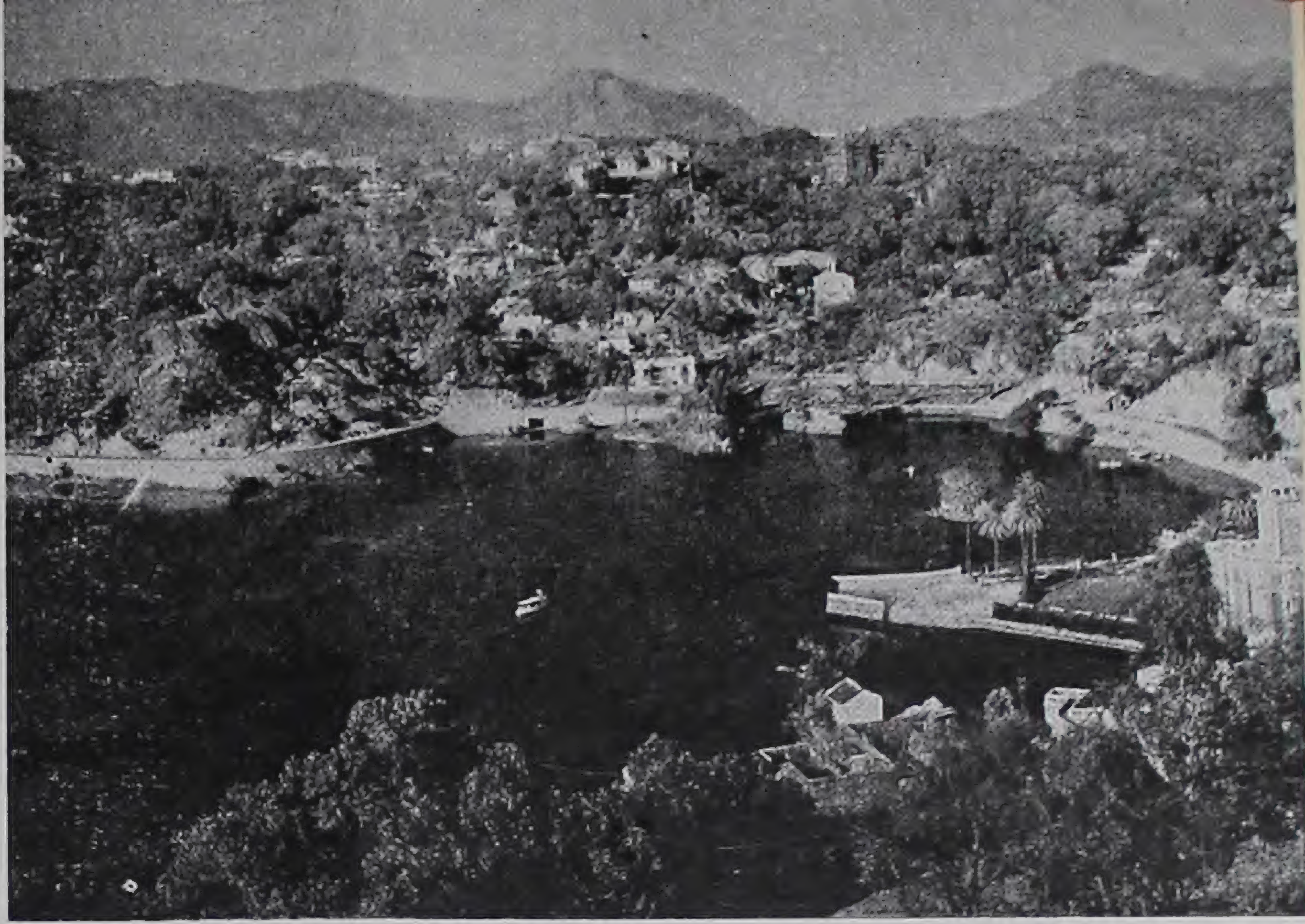


صدرِ جمہوریہ، ڈاکٹر ہادی حسن کو سندِ اعزازی دے رہے ہیں۔

مشہور سرود نواز استاد حافظ علی خاں، صدرِ جمہوریہ کے ہاتھ سے 'پدم بھوشن' کا تمغہ پاتے ہوئے

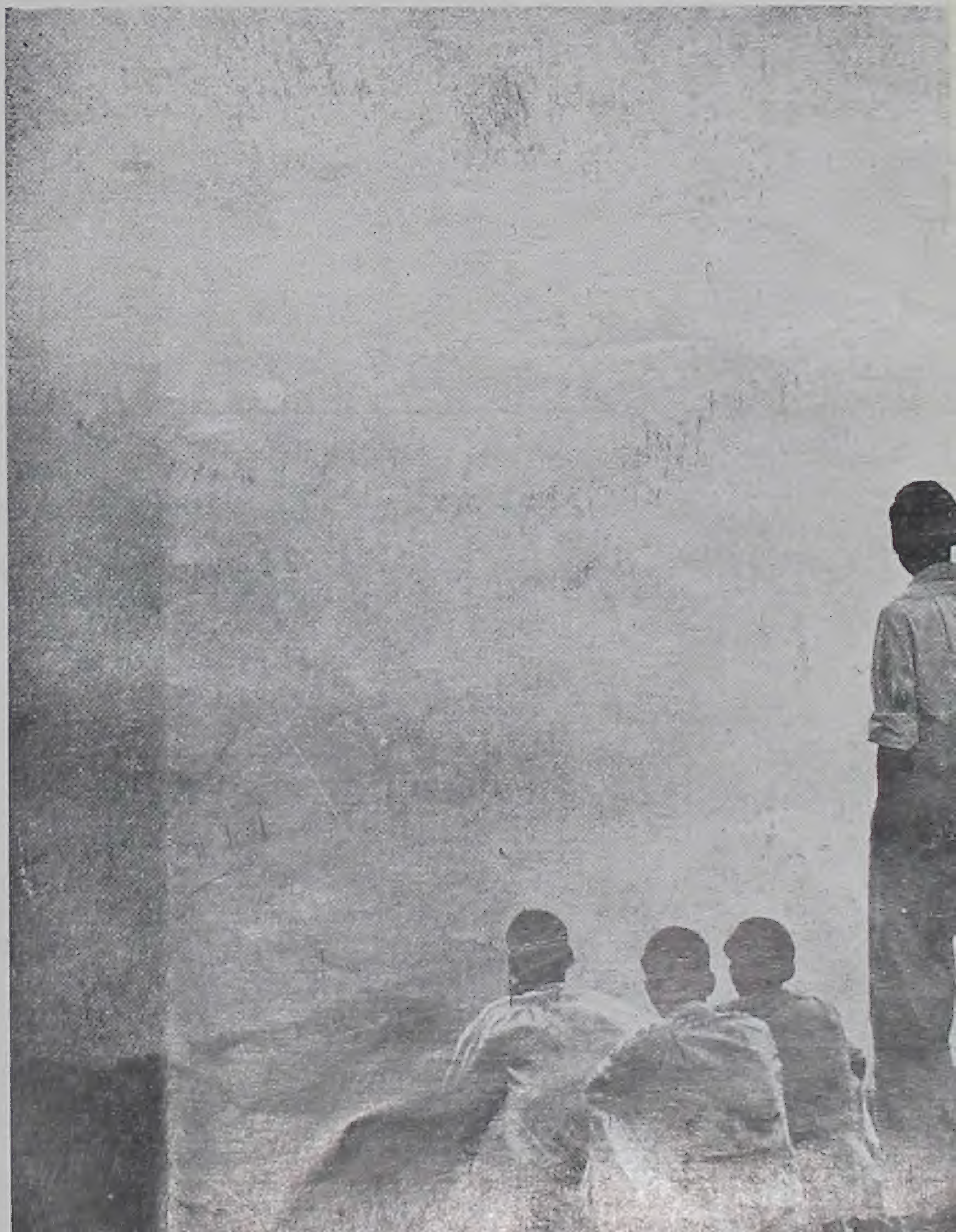




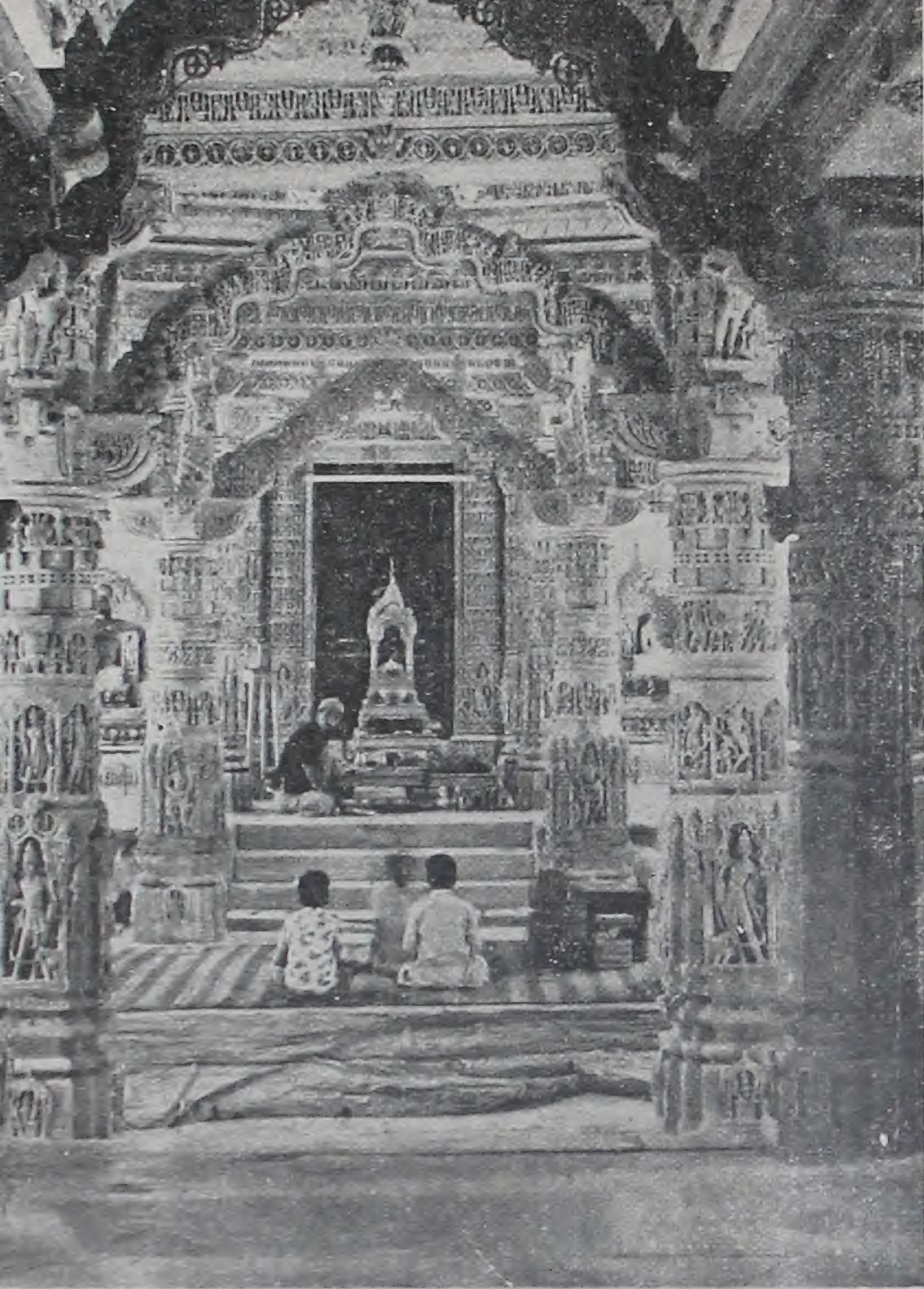


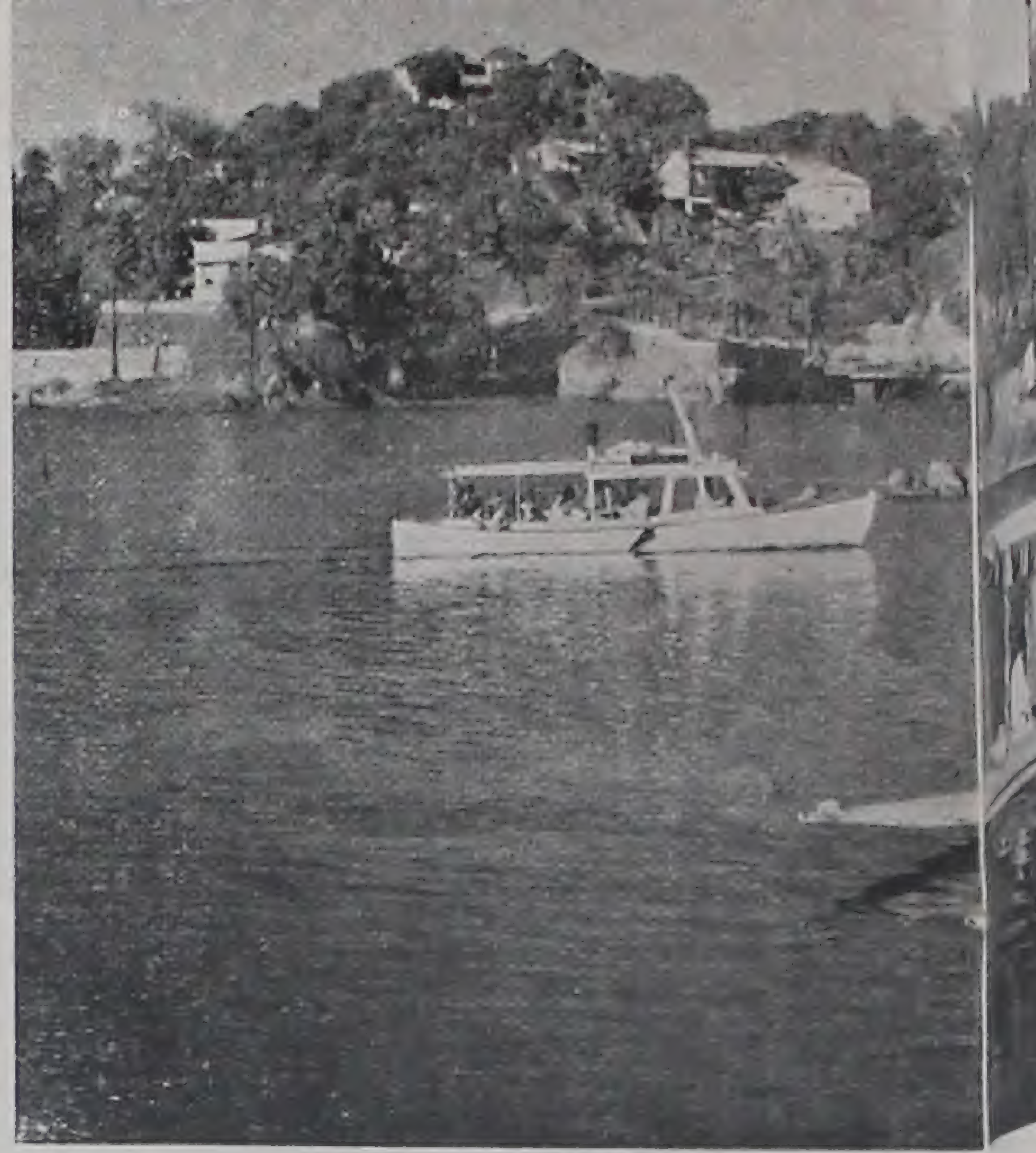
ماؤنٹ

ماؤنٹ آبو راجستھان میں اراولی کے پلیٹیو پر آباد ایک
مقامات سے مختلف ہے۔ یہاں بانس اور کھجور کے پیڑ،
ہوئی بڑی بڑی چٹانیں قدرتی مناظر کی دل کشی میں اضافہ
سری نگر کی ڈل جھیل کی یاد دلاتے ہیں۔ سنگ مرمر کے



اُوپر (دائیں طرف) — ہری بھری پہاڑیوں سے گھری ہوئی نکّی جھیل۔
اُوپر (درمیان میں) — جھیل میں چلتا ہوا شکارا اور بوٹ
اُوپر (بائیں طرف) — دلوارا کے ایک مندر کا اندرونی حصہ
دائیں طرف — 'سن سیٹ پائنٹ' سے غروب آفتاب کا نظارہ
بائیں طرف — چکر پنکھڑی — دلوارا مندر کی بت تراشی کا نمونہ۔
بائیں طرف (کنارے پر) — وِمل وساہی مندر کی چھت پر نقاشی

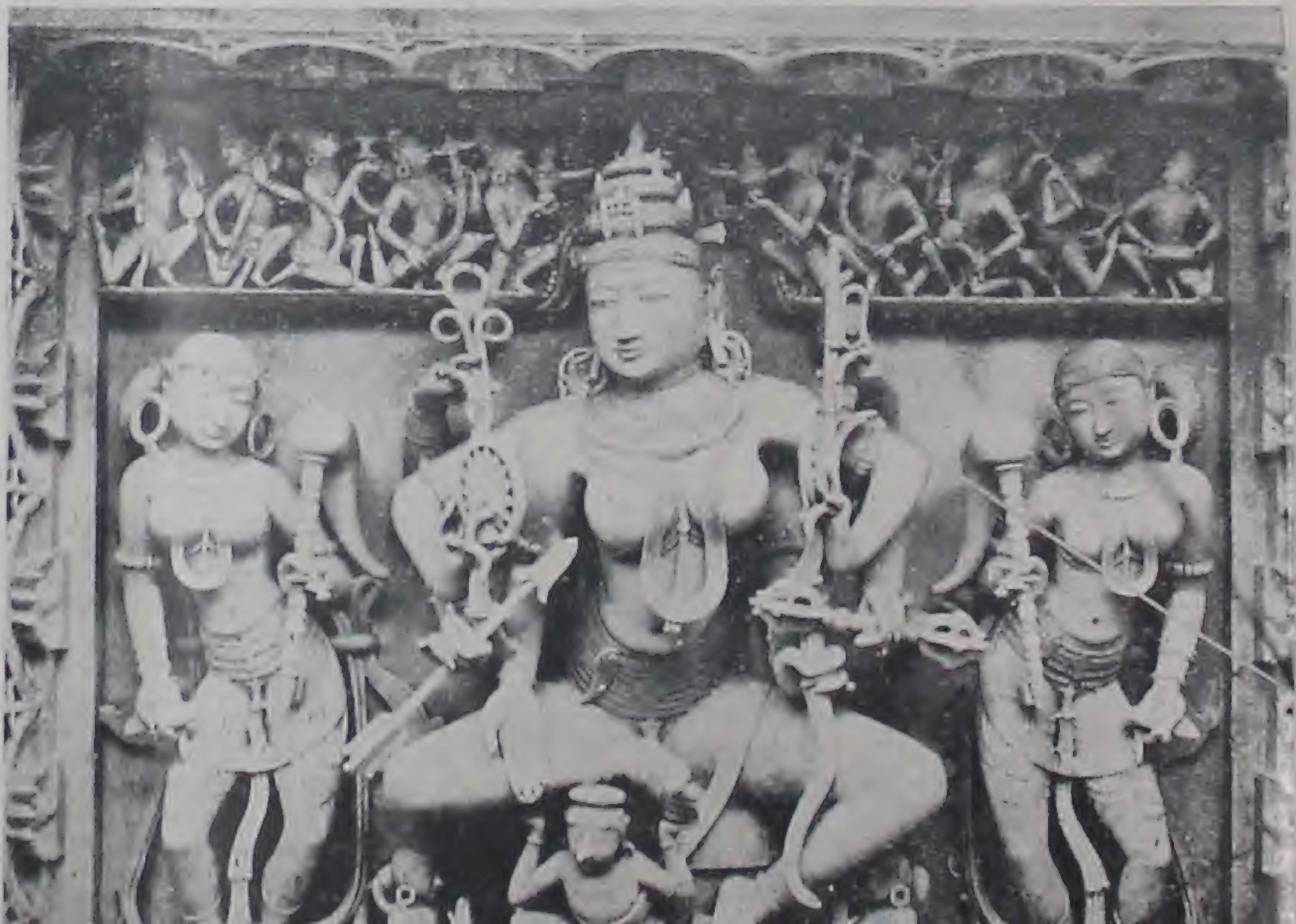




...ٹ آبو

...ایک پر فضا مقام ہے ۔ یہ جگہ ہمالیہ کے پہاڑی
...لمبے درخت اور عجیب و غریب انداز سے کھڑی
...اضافہ کرتی ہیں ۔ خوبصورت نکی جھیل میں چلتے ہوئے شکارے
...بنے ہوئے دلوارا مندروں کی نقاشی آج بھی لاجواب ہے





فلپینس کی تمدنی خصوصیات

اس عنوان سے شفیق الحسن ہاشمی کا مضمون

صفحہ ۲۷ پر ملاحظہ فرمائیں



فلپینو دولہا دولھن اپنے قومی لباس میں



فلپینوں کا رقص



جنوبی فلپینس کے مسلم
مچھیروں کی کشتی

شفیق الحسن ہاشمی

فلپینس کی تمدّنی خصوصیات

فلپینس انڈونیشیا کے شمال مشرق اور چین کے جنوب میں ایک چھوٹا سا مُلک ہے۔ اس کا رقبہ اسّی ہزار مربع میل سے کچھ زیادہ اور آبادی دو کروڑ بیس لاکھ ہے۔ یہ سات ہزار سے زیادہ جزیروں پر مشتمل ہے جن میں سے زیادہ تر بہت ہی چھوٹے چھوٹے ہیں۔ بعض میں تو کوئی آبادی بھی نہیں ہے۔ ملک کے مختلف جزیروں پر مشتمل ہونے کے اثرات یہاں کی زبان، رسم ورواج اور مقامیت کے احساس پر بھی پڑے ہیں۔

آج سے تقریباً چار سو سال پہلے اسپینیوں نے اس ملک کے زیادہ تر جزیروں کو اپنی نوآبادی بنا لیا اور اس کا نام اسپین کے بادشاہ فلپ کے نام پر فلپیناس رکھا جس کو بعد میں چل کر امریکیوں نے فلپینس کر دیا۔ اسپینی حکومت سے پہلے اس ملک میں کوئی ایسی حکومت قائم نہیں تھی جس کا قبضہ سارے جزیروں پر ہو۔ چھوٹے چھوٹے بادشاہ الگ الگ جزیروں پر حکمراں تھے۔ ان کی تجارت دوسرے ملکوں خاص طور پر چین اور انڈونیشیا سے ہوا کرتی تھی۔

اسپین کے حکمراں بہت کٹر قسم کے عیسائی تھے۔ وہ کیتھولک مذہب کو ساری دُنیا میں پھیلانا اپنا ایمان اور فرض سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ دوسرے مذاہب کے پیرو کافر اور بے دین ہیں اور ان کی دنیوی اور دینی نجات اسی میں ہے کہ وہ کیتھولک مذہب کو قبول کر لیں۔ اسی نقطۂ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے اسپینی حکمرانوں نے فلپینس کے رہنے والوں کا مذہب تبدیل کرنا شروع کیا جس میں خوشی اور جبر دونوں کا دخل تھا۔ اسپینیوں کے آنے سے پہلے یہاں زیادہ تر ایسے لوگ رہتے تھے جو مظاہر قدرت کی پُوجا کرتے تھے۔ ان سب کو عیسائی بنا لیا گیا۔ اگرچہ کچھ لوگ جو کہ شہروں سے دُور پہاڑیوں میں وحشیانہ زندگی بسر کرتے تھے وہ اب بھی اپنے پُرانے مذہب پر قائم ہیں۔ ان میں بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو کہ آدم خور ہیں۔ جنوبی فلپینس میں رہنے والوں کی بڑی تعداد مسلمانوں کی تھی جن کو انڈونیشیا اور دوسرے ملکوں کے مبلّغوں نے چودھویں پندرھویں صدی عیسوی میں مسلمان بنایا تھا۔ ان لوگوں نے عیسائیت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور جب تک اسپینی حکومت فلپینس میں قائم رہی وہ برابر اس سے لڑتے رہے اور بڑی حد تک آزاد رہے۔

اسپینیوں کا قبضہ فلپینس پر ۱۸۹۸ء تک رہا۔ اس عرصہ میں انھوں نے پورے ملک کی کایا پلٹ دی۔ نہ صرف انھوں نے مقامی باشندوں کا مذہب تبدیل کر دیا بلکہ رسم ورواج، زبان، تاریخ، فلسفہ، بنیادی اقدار غرض کہ زندگی کی ہر چیز کو بڑی حد تک اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اسپینیوں کے آنے سے پہلے خود فلپینس کے لوگوں کا کوئی ترقی یافتہ اور مضبوط تمدّن نہیں تھا۔ اس کے نتیجہ کے طور پر اسپینیوں کو اپنے اصول، رسم ورواج اور دوسری چیزوں کے پھیلانے میں بڑی سہولت ہوئی۔ پھر انھوں نے زبردستی اور طاقت کو بھی اشاعت کا ایک بڑا ذریعہ بنایا۔

۱۸۹۸ء میں اسپینی۔ امریکی جنگ میں اسپین کو شکست ہوئی اور نتیجہ کے طور پر فلپینس امریکیوں کے ہاتھ آگیا۔ انھوں نے کیتھولک اثرات کو کم کرنے کی کوشش کی اور بعض نئے اصولوں کو سماج میں پھیلانے کی کوشش کی جن میں عام تعلیم اور سماجی مساوات کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ امریکیوں نے اس نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر حکومت کی کہ اپنے فائدے کے ساتھ ساتھ مقامی باشندوں کو بھی ترقی کے مواقع فراہم کرنے چاہئیں۔ انھوں نے یہ بھی سوچا کہ چوں کہ بہت سی بُرائیوں کو جڑ جہالت ہوا کرتی ہے اور اگر ملک کے سب لوگ پڑھنے لکھنے کے قابل ہو جائیں تو کافی بُرائیاں خود بخود

شوہر اور بیوی ایک ساتھ رہتے ہیں۔ قانون نے اگرچہ طلاق کا حق نہیں دیا ہے لیکن "جدائی" کا اختیار شوہر اور بیوی دونوں کو حاصل ہے لیکن وہ دوسری شادی اس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک کہ شوہر یا بیوی بارہ سال تک ایک دوسرے سے جدا نہ رہے ہوں اور یہ پتہ نہ ہو کہ وہ زندہ ہیں یا مردہ۔

مرد کو ایک سے زیادہ شادی کا نہ قانوناً اختیار ہے اور نہ مذہباً۔ ایسے مردوں کی کافی تعداد ہے جو داشتائیں رکھتے ہیں۔ خاص طور پر دولت مند لوگوں میں یہ طریقہ زیادہ عام ہے۔

شادی چرچ میں ہوتی ہے۔ دولہا اگر زیادہ فیشن پرست ہے تو کوٹ، ٹائی اور پتلون پہن کر آتا ہے۔ ورنہ فلپینس کا قومی لباس۔ یہ لباس "بیرنگ تگالوگ" کہلاتا ہے۔ یہ ہلکے کپڑے کا کرتا جیسا ہوتا ہے اور سامنے بیل لگی ہوتی ہے۔ اس لباس کو اس لئے اختیار کیا گیا ہے کہ فلپینس ایک استوائی ملک ہے اس لئے وہاں موسم سال بھر گرم رہتا ہے اور ہلکا لباس ہی وہاں کے لئے موزوں ہے اس کے ساتھ پتلون پہنا جاتا ہے۔ دولھن سفید رنگ کا لباس پہنتی ہے جس کو "بلنتاوک" کہا جاتا ہے۔ یہ غرارہ نما ہوتا ہے اور پاؤں سے نیچے لٹکتا رہتا ہے۔

ویسے عام طور پر مرد بیرنگ تگالوگ نہیں پہنتے ہیں یہ صرف کسی تقریب یا جلسہ میں پہنا جاتا ہے یا پھر بڑے بڑے عہدہ دار اور وزیر اسے ہر وقت پہنتے ہیں عام لوگ ہر وقت پتلون اور بش شرٹ پہنتے ہیں اور عورتیں مغربی طرز کا اسکرٹ اور بلاؤز۔

فلپینو مغربی تہذیب سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ کھانے پینے اور رہن سہن کے طریقے، تفریحات کھیل کود سب ہی مغربی، خاص طور پر اسپینی اور امریکی ہیں۔ اسپین کے لوگوں کی طرح ان کو ناچ گانے کا بے حد شوق ہے۔ چھوٹے سے چھوٹے گاؤں میں تقریب کے موقع پر مخلوط ناچ رکھے جاتے ہیں شہروں میں تو یہ چیز اور زیادہ بڑھی ہوئی ہے یونیورسٹیوں اور کالجوں میں طلباء اور طالبات کی انجمنیں ہیں وہ ناچ کی پارٹیاں ضرور کرتی ہیں اور مشکل ہی سے کوئی ایسا لڑکا یا لڑکی ملتی ہے جس نے ناچنا نہ سیکھا ہو۔ شہروں میں "رات کے کلب" بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ اور لوگ وہاں جا کر رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ فلپینو قوم کے لئے "رات کی زندگی" اس کی معاشرت کا ایک لازمی جزو بن گئی ہے۔

فلپینو لوگوں کو ناچ سے زیادہ گانے بجانے سے دلچسپی ہے۔ دیہات میں مرد اور عورتیں اپنا خالی وقت گانا گا کر گذارتی ہیں۔ فلپینو کسان یا مزدور اپنا کام کاج کر کے "گیتار" (ستار کی طرح کا چھوٹا سا باجا) لے کر بیٹھ جاتا ہے اور گھنٹوں اس سے دل بہلاتا ہے۔ شہروں میں جن لوگوں کے پاس ریڈیو ہے وہ اس کے ذریعہ موسیقی سنتے ہیں۔ بعض ریڈیو اسٹیشن ایسے ہیں جو ۲۴ گھنٹے موسیقی نشر کرتے ہیں۔ لوگ اکثر کام کرتے جاتے ہیں اور گانے سنتے رہتے ہیں بہت سے لوگ ایسے بھی ملتے ہیں جو سوتے وقت بھی برابر اپنا ریڈیو کھلا رکھتے ہیں۔

فلپینس کے شہروں اور دیہات کے طرزِ زندگی میں بہت کافی فرق ہے شہروں کے لوگ زیادہ مغربی تہذیب سے متاثر ہیں۔ موجودہ شہری زندگی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ انسان ایک دوسرے سے بہت کافی بے تعلق ہو جاتا ہے۔ اپنے محلہ میں رہنے والے بلکہ پڑوسی سے بھی اکثر برسوں گذر جاتے ہیں جان پہچان نہیں ہوتی۔ فلپینس کے شہروں میں رہنے والوں کے متعلق بھی یہی بات کہی جا سکتی ہے لیکن ایک اچھی بات جو وہاں کے شہروں میں زیادہ اور دیہات میں کم پائی جاتی ہے وہ احساسِ مساوات ہے۔ لوگ اپنے نوکروں سے آپ جناب کر کے باتیں کرتے ہیں ان کے ساتھ میز پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں جو خود کھاتے ہیں وہی ان کو کھلاتے ہیں اسی طرح دفتروں میں بھی بڑے عہدہ دار اپنے ماتحتوں بلکہ چپراسیوں تک سے مساویانہ برتاؤ کرتے ہیں۔ چپراسی ان کے سامنے بے تکلف سگریٹ پیتے ہیں۔ ان سے مصافحہ کرتے ہیں۔ اور نام لے کر پکارتے ہیں۔ مساوات کے اس برتاؤ کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ جو لوگ معمولی کام کرتے ہیں۔ ان میں بھی احساس کمتری نہیں پایا جاتا اور وہ بھی اپنے آپ کو قابلِ عزت انسان سمجھتے ہیں۔

فلپینو قوم میں جو تھوڑے بہت مشرقی آداب باقی رہ گئے ہیں ان میں ایک مہمان نوازی بھی شامل ہے۔ یہ خصوصیت شہروں میں کم اور دیہات میں زیادہ پائی جاتی ہے۔ فلپینو۔ مہمانوں کو ایک مصیبت نہیں سمجھتا بلکہ اس کے آنے سے حقیقی خوشی محسوس کرتا ہے۔ وہ اس کو آرام پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ کھانے کے لئے جو اس کے پاس حاضر ہے وہ فوراً مہمان کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ اس کے لیٹنے کے لئے بھی وہ اپنے گھر کا سب سے اچھا بستر لا کر اس کو دیتا ہے اور دوسری تمام ضروریات کی چیزیں بھی مہیا کرتا ہے۔ فلپینو اپنے مہمان کی خاطر تواضع اتنی ضروری سمجھتا ہے کہ اگر اس کے پاس روپیہ نہ ہو تو وہ ادھار مانگ کر کام چلائے گا اور مہمان کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دے گا۔ خاص طور پر اگر کوئی غیر ملکی مہمان اس کے پاس آئے تو وہ بہت خوش ہوتا ہے۔ اور اس کا تذکرہ اپنے دوست احباب اور عزیزوں سے فخر کے طور پر کرتا ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ چلتے وقت وہ مہمان کو ایک نہ ایک چیز تحفہ کے طور پر دینا بھی اپنا فرض سمجھتا ہے۔

حامدی کاشمیری

پردیسی کی کہانیاں

۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین وجود میں آئی۔ اس انجمن سے بیدی، خواجہ احمد عبّاس، منٹو، عصمت، رشید جہاں، سجّاد ظہیر اور کرشن چندر جیسے اچھے اچھے افسانہ نگار وابستہ تھے۔ پردیسی نے بھی اسی دور میں کہانیاں لکھنا شروع کی تھیں، اور اس سے پہلے جو کہانیاں وہ لکھ چکے تھے ان کو وہ خود ہی یہ کہہ کر نظر انداز کر چکے تھے "میں نے ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۶ء تک جو کچھ لکھا ہے اس پر فخر نہیں کر سکتا۔" ظاہر ہے اس زمانے میں ان کا فنی شعور پختہ نہ تھا اور زندگی کے مسائل پر ان کی نظر گہری نہ تھی۔

دراصل ۱۹۳۸ء سے پردیسی نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنا شروع کیا۔ ان کے شعور میں پختگی اور رچاؤ آگیا، ان کے فن اور اسلوب میں حسن اور توانائی آ گئی۔ پردیسی کے فکر و نظر کی اس اہم بیداری میں ان سیاسی حالات کا براہِ راست اثر موجود تھا جو ۱۹۳۱ء سے کشمیر کی تاریخ میں ایک نئے انقلاب کے لئے راہیں متعین کر چکے تھے۔ لوگ صدیوں کی غلامی کے بعد پہلی بار آزادی اور مسرت کے خواب دیکھ رہے تھے، وہ جہالت، مفلسی اور پستی کے خوفناک اندھیروں سے بیزار ہو کر مسرت، تعلیم اور آزادی کی روشنی کی تلاش میں نکلے تھے۔ پردیسی ایک حسّاس دل لے کر آئے تھے، وہ لوگوں کی مجبور زندگی کا مشاہدہ کرتے رہے، اور کڑھتے رہے۔ وہ ان کی دبی دبی آرزوؤں کی مجروح دھڑکنیں سنتے رہے اور ان کے فکر و احساس میں تلخیاں اترتی گئیں۔

پردیسی کے فکر و فن کو سمجھنے کے لئے ان کی ذاتی زندگی کا ایک مطالعہ بھی ناگزیر ہے۔ آپ سری نگر میں ایک نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور زندگی بھر مشکلوں اور پریشانیوں سے دوچار رہے، بچپن ہی میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور گھر کا سارا بوجھ آپ کے معصوم کندھوں پر آن پڑا۔ کالج میں داخلہ لیا مگر آپ مالی مشکلات کی وجہ سے تعلیم جاری نہ رکھ سکے اور ایک کلرک کی آسامی پر کام کرنے لگے۔ ذاتی زندگی کی صعوبتوں اور تلخیوں نے آپ کے احساس میں زیادہ سوز و گداز بھر دیا اور آپ اپنے گرد و پیش رہنے والے انسانوں کی مجبور زندگی سے زیادہ قریب آ گئے۔

اس پس منظر میں ہم پردیسی کے فکر و ذہن کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں، آپ خیالی دنیا کی رومان پرور اور رنگین وادیوں میں نہیں بھٹکے، زندگی نے آپ کو زخم دئے، آپ نے ان زخموں کو سینے سے لگایا۔ آپ ہمیشہ ٹھوس اور تلخ حقیقتوں کو اپنے فن کے دامن میں سمیٹتے رہے۔

اُن کی زندگی میں ہی ان کے افسانوں کے دو مجموعے اشاعت پذیر ہو چکے تھے 'شام و سحر' اور 'دنیا ہماری' اور ان کی موت کے بعد تیسرا مجموعہ 'بہتے چراغ' کے نام سے شائع ہوا ہے۔

پردیسی ایک حقیقت نگار ہیں۔ ان کی عظمت اس بات میں پوشیدہ ہے کہ وہ اپنے ہموطنوں کی حقیقی زندگی کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ آپ کشمیری زندگی کے اسرار و رموز سے واقف ہیں، خاص کر آپ نچلے طبقوں کے محنت کش لوگوں کی زندگی ان کی اُمیدوں، محرومیوں اور حسرتوں کو قریب سے محسوس کرتے ہیں، اور ان کے محسوسات ہمیں شدید طور پر متاثر کرتے ہیں۔ کاریگر، سائڈ لائٹ، دیوتا کہاں ہیں، لباس تلے، اُجالے اندھیرے جیسی کہانیوں میں ان لوگوں کے خد و خال جھلکتے ہیں۔ ان میں ان لوگوں کی مایوسیوں، بے چارگیوں اور کبھی کبھی آرزوؤں کا ذکر ہے۔ 'کاریگر' ایک کشمیری صنعت کار مام دین کی کہانی ہے۔ مام دین

اپنے محنت کش طبقے کا نمایندہ کردار ہے، وہ لکڑی پر کھدائی کا کام کرتا ہے اور فن کے حسین نمونے بناتا ہے، لیکن خود افلاس کی گھٹن کا شکار ہے۔ مالکِ دوکان اس کہانی کا دوسرا کردار ہے جو استحصالی طبقہ کی نمایندگی کرتا ہے۔ سائڈ لائن کا ہیرو ایک مفلس ادیب ہے جو خالص ضروریاتِ زندگی کے لئے ترستا ہے۔ 'نئی صبح' کا اڈیٹر اس کا خون چوستا ہے، اور جب ادیب نوکری سے برطرف کیا جاتا ہے تو اڈیٹر بے گانگی اور بے مروّتی سے پیش آتا ہے۔ 'جنت و جہنم' اور 'ہِروں کا رقص' میں مزدور طبقہ کی عکاسی ہے۔ 'جنت و جہنم' میں کشمیری مزدور کشمیر کو چھوڑ کر پنجاب چلے جاتے ہیں مسرت کی تلاش میں، لیکن بے سود۔ 'ہِروں کا رقص' بھی ایسی ہی کہانی ہے جس میں مزدوروں کی تباہ حال زندگی کا نقشہ ملتا ہے۔ 'لباس نئے' اسی نوع کی ایک اور دلچسپ کہانی ہے جس میں دستمبرا اپنے مالک سے تحفہ کے طور پر ایک پُرانا اوورکوٹ حاصل کرتا ہے اور اس کی خوشی کی انتہا نہیں رہتی، لیکن اس کے کھلے اور پھٹے پرانے پاجامے کے ساتھ اوورکوٹ میل نہیں کھاتا۔ لوگ اس کا تمسخر اڑاتے ہیں اور اوورکوٹ کو چوری کا مال سمجھتے ہیں۔ آخر وہ اوورکوٹ پھینکنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کہانی 'سنگرات' ایک دل گداز موضوع کی حامل ہے اس میں افسانہ نگار نے مہاجنی نظام کی جفاکاریوں اور ہوس ناکیوں کو بے نقاب کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس نظام میں معصوم بچیاں اور بچے کس طرح بے رحم اور سنگدل مالکوں کے ماتحت جگر سوز محنت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

ان چند افسانوں کا تجزیہ کرنے سے ہم پر یہ بات روشن ہوتی ہے کہ پردیسی کی طبقاتی نظام کی لوٹ کھسوٹ اور جبر و استبداد پر گہری نظر تھی۔ آپ کی نگاہیں زیادہ تر مظلوم اور مفلوک الحال طبقوں پر لگی رہیں اور آپ ان کی رُوح کے زخموں سے کھیلتے رہے، لیکن گرد و پیش کی سسکتی اور دم توڑتی ہوئی زندگی سے قریب رہ کر آپ مایوسی اور قنوطیت کے شکار نہیں ہوئے۔ اگرچہ آپ کے اکثر افسانوں میں اُداسی اور حسرت کی پرچھائیاں کانپتی ہوئی نظر آتی ہیں، لیکن ہم راجندر سنگھ بیدی کے اس خیال سے اتفاق نہیں کر سکتے کہ پردیسی ایک قنوطی ہیں اور ہمیشہ زندگی کے تاریک پہلو کو دیکھتے رہے ہیں، یہ واقعی ان کے ساتھ زیادتی ہے۔ آپ نے جس کشمیر کی کہانیاں لکھی ہیں، وہ کشمیر بھوک، افلاس، بے چارگی اور بیماری کا شکار تھا اور پردیسی نے اسی کشمیر کو اپنی کہانیوں میں پیش کیا ہے۔ ایک سچے اور دیانت دار فن کار کی طرح آپ نے حقیقت پسندی کی صحت مند اور حیات آفرین روایات کو قائم رکھا ہے، آپ نے کچھ ایسے کردار بھی تخلیق کئے ہیں جو آزادی اور مسرت کے لئے پرانے نظام سے بغاوت کرتے ہیں، یہ کردار اصل زندگی سے لئے گئے ہیں۔ اجالے اندھیرے میں پردیسی، ایک جذباتی اور انقلابی نوجوان کو ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ جو پُرانے نظام کی فریب کاریوں، جھوٹ اور تصنع کو دیکھ کر تلملاتا ہے، کُڑھتا ہے اور آخر شش کہہ اٹھتا ہے:۔

"اس کے جذبات میں آگ لگ گئی۔ میں کسی کا قیدی نہیں ہوں۔ مجھے آزادی کا حق ہے۔ میں اپنی لذات فنا کرنا نہیں جانتا۔ میں زندگی کی اقدار کو جانتا ہوں، زندگی کی حقیقی مسرتوں کو سمجھتا ہوں۔"

اسی طرح فرشتۂ رحمت، نئی صبح، مہمان، جہاں سرحد ملتی ہے، جیسی کہانیوں میں پردیسی کے رجائی تصورِ حیات کے کئی روشن پہلو اُبھرتے ہیں۔ 'فرشتۂ رحمت' میں ایک نوجوان دیہاتی غلام محمد ظالم نمبردار کے خلاف محاذ قائم کرتا ہے اور اسے شکست دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

ان کہانیوں میں مصنّف کی دُور رس نظروں نے مستقبل کے کئی روشن گوشوں کو ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ آپ انسانیت کے ایک تابناک مستقبل پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ انسان جاگ اٹھا ہے، اس کی انسانیت زندہ ہو چکی ہے اور وہ اپنے بنیادی حقوق اور انسانی قدروں کے تحفظ کے لئے استحصالی طبقوں کے ناپاک ارادوں کو خاک میں ملائے گا۔ 'بجھتے چراغ' ایک کامیاب کہانی ہے۔ اس میں پردیسی نے جنگ بازوں کے مکروہ عزائم کی شکست دکھائی ہے اور امن پسند انسانوں کے حسین خوابوں اور امنگوں کو ابھارا ہے۔

"پیسہ بڑا چلتا ہے کپتان صاحب جنگ میں" سیٹھ بڑے رازدارانہ انداز میں کہتا۔

"امن میں اس سے بھی زیادہ چلے گا سیٹھ جی! آپ نے صرف جنگ کا زمانہ دیکھا ہے، امن کا نہیں دیکھا ہے۔"

"خاک چلے گا امن میں، جیسے ہم نے انگریزوں کے زمانے میں امن دیکھا ہی نہیں ہے۔" سیٹھ سن کر کہتا۔

ہرپھول کی سوچیں اس جواب سے بھٹک جاتیں! علی گڑھ کے لباس میں ملبوس سیٹھ اندر سے گیا تھا اور باہر سے گیا، اور سیٹھ پھر کہتا، جنتا کو خوش حال ہونا ہے تو ایک جنگ اور ہونی چاہیئے، ابھی تو آپ کو معلوم نہیں کہ جنگ سے کیا کیا فائدے ہوتے ہیں۔"

"جنگ سے خون بہتا ہے سیٹھ جی" ہرپھول غصّے میں کہتا

"اور اسی خون کی تجارت سے آپ لاکھوں کماتے ہیں۔"

سیٹھ جی بہت زیادہ برہم ہو گئے اور وہیں سے ہرپھول کو گالیاں دینے لگے۔ ہرپھول چپ چاپ کھڑا رہا اور جب سیٹھ جی کا غصّہ ٹھنڈا پڑ گیا تو اس نے کہا:

"اب آپ کے چراغ نہیں جلیں گے، سیٹھ جی دنیا کو امن کی ضرورت ہے۔"

پردیسی کشمیر کی سماجی، معاشرتی اور ثقافتی زندگی سے واقف ہیں، آپ نے یہاں کی تہذیب و تمدّن، سماجی اور مذہبی زندگی کے رسم و رواج، لباس رہن سہن، لوگوں کے اطوار و عادات، ان کے طرزِ فکر اور طرزِ حیات کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کیا ہے آپ نے اپنے افسانوں میں سماجی اور گھریلو زندگی کے کئی مسائل کو بڑی خوبی سے اجاگر کیا ہے، یہ صحیح ہے کہ آپ اس میدان میں اور بھی کچھ کرتے اگر کچھ برس اور زندہ رہتے تاہم آپ کی چند کہانیاں اجرت، چور، چتائیں، جھنجھنا، ٹیکہ ٹنی اور امام صاحب کشمیریوں کی سماجی اور گھریلو زندگی کی کئی باتیں سامنے لاتی ہیں۔ اُجرت میں ایک ہندو بیوی کا کردار اُبھرتا ہے جو شرم وحیا، وفاداری اور ایثار کا مجسمہ ہے، چور ایک سماجی مجرم کا نفسیاتی تجزیہ ہے، یہ چور ضمیر کی آواز سنتا ہے، اخلاقی تبدیلی محسوس کرتا ہے لیکن اس کے باوجود سماجی قوانین اس کا تعاقب کرتے ہیں۔ ماں کا احسان اور جھنجھنا گھریلو زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ جھنجھنا میں ایک ہندو مشترکہ گھرانے کی تصویر ہے۔ مشترکہ گھرانوں میں باہمی غلط فہمیوں اور اُلجھنوں سے جو دلی کدورت پیدا ہو جاتی ہے اس کی زندہ تصویر پیش کی گئی ہے۔

پردیسی انسانی فطرت کے رموز سے آشنا ہیں، انسانی نفسیات کی اُلجھنوں پر آپ کی نظر ہے، آپ نے کئی کرداروں کے کامیاب نفسیاتی تجزیے پیش کئے ہیں جس سے آپ کی فنی عظمت زیادہ بڑھ گئی ہے، 'دھول' ایک عورت کی جذباتی زندگی کا خاکہ ہے۔ جو اپنا سب کچھ قربان کر کے بھی ازدواجی زندگی کی مسرتوں کو حاصل نہیں کر سکتی کیونکہ اس کے کوئی اولاد نہیں۔ 'سوغات' بھی ایک عمر رسیدہ عورت کا نفسیاتی تجزیہ ہے۔ "اجالے اندھیرے" میں ایک نوجوان کی ذہنی اور روحانی بے چینی اور کرب کا اظہار ہے، جو گردوپیش کی جفا کاریوں اور لوٹ کھسوٹ کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

'شام وسحر' میں جو پردیسی کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ ہے، انھوں نے کئی افسانوں میں انسان کی بنیادی خواہشوں اور جذبات کو اُجاگر کیا ہے، آپ محبّت، نفرت، بغض وعداوت اور دوسرے فطری جذبات کی گہرائیوں میں جھانکتے ہیں، راجو کی ڈولی میں افسانہ نگار نے رمضان کی گہری شفقت کو اُجاگر کیا ہے جو وہ اپنی پوتی راجو کے لئے رکھتا ہے۔ 'اپنا سب کچھ' اور 'بچوّں کا فتنہ' میں آپ نے اسی نوع کے دیگر جذبات کے نقوش اُبھارے ہیں۔

پردیسی کا فن بھی ان کے شعور کی پختگی کے ساتھ ساتھ ارتقائی منزلیں طے کرتا گیا۔ ابتدائی کہانیوں میں اگرچہ کوئی خاص فنی یا ادبی حسن موجود نہیں لیکن بعد کی کہانیوں میں جدید افسانہ کے فن اور تکنیک کا شعور ملتا ہے۔ آپ زندگی کے معمولی واقعات کا انتخاب کرتے ہیں اور ان واقعات کو بڑی خوبی اور صفائی سے ترتیب دے کر ایک کہانی تخلیق کرتے ہیں جس سے پڑھنے والے کے ذہن پر ایک گہرا اثر پڑتا ہے، آپ کے آرٹ کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ آپ زندگی سے حاصل کئے گئے تجربات اور مشاہدات خلوص اور ہمدردی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ بقول احتشام حسین "پردیسی کے افسانوں میں نہ کھینچا تانی ہے اور نہ تصنع، نہ واقعات توڑ مروڑ کر بیان کئے گئے ہیں نہ نتیجے محض نتیجہ نکالنے کے لئے نکالے گئے ہیں۔"

پردیسی کی کہانیوں کے پلاٹ پیچیدہ نہیں ہوتے، اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ خیالوں کی دنیا میں رہ کر پلاٹ نہیں بناتے، اور نہ پلاٹ کو خمدار بنانے میں اعتقاد رکھتے ہیں، حقیقی زندگی سے آپ موضوع چنتے ہیں اور اپنی قوتِ تخیل سے اسے تخلیقی حسن عطا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ جگہ جگہ ہم آپ کی دل پذیر شخصیت کے حسین نقش و نگار دیکھتے ہیں — سچی ہمدردی، شرافت، تفکّر اور انسان دوستی — پردیسی کی شخصیت کے یہ تابندہ عناصر ہمیں ان کی اکثر کہانیوں میں جھلکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

پردیسی کی کہانیوں کے کردار آج بھی ہمارے اردگرد نظر آتے ہیں۔ ان کے

کرداروں کی نبضوں میں زندگی کی حرارت اور تڑپ ہے، یہ کردار زیادہ تر نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ پردیسی نے اپنے خلوص اور ہمدردی سے ان کرداروں کو حیاتِ جاوداں بخشی ہے۔ آپ کے کرداروں کا مطالعہ کرنے سے ہماری نگاہوں میں کشمیری شخصیت کے کئی پہلو سامنے آجاتے ہیں۔ مثلاً 'میرا حق' میں عبدل کے کردار میں اس کا جذبۂ فراخدلی 'لباس نئے' میں اس کی بے بسی اور بےچارگی اور 'مہمان' میں اس کی مہمان نوازی ہماری توجہ کا مرکز بن جاتی ہے۔

اردو زبان پر آپ کو اچھی خاصی قدرت حاصل تھی۔ آپ بچپن ہی سے اردو زبان کی طرف مائل تھے، آپ کے دادا جو اپنے وقت کے عالم تھے، اکثر اپنے گھر میں ادبی محفلیں منعقد کرتے تھے اور اردو ادیبوں پر اظہارِ خیال کیا جاتا تھا۔ پردیسی ان سے بہت متاثر ہوئے اور اردو سے آپ کو والہانہ محبت ہوگئی۔ آپ بالکل سیدھی سادی اور آسان زبان لکھتے ہیں۔ آپ کے اندازِ بیان میں سادگی، صفائی اور روانی ہے۔ کہیں کہیں آپ کا شاعرانہ تخیل آپ کی عبارتوں کو آب و رنگ بخش دیتا ہے 'دھول' میں لکھتے ہیں:

"پری محل کی مہیب صورت پہاڑیوں کے پیچھے صبح کا
مسکراتا ہوا سورج دو نیزے اوپر آچکا تھا اور ابھی تک
اسے اپنے پپوٹوں کی نمی کا احساس ہو رہا تھا۔"

'راجو کی ڈولی' میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

"باہر چاندنی گیہوں کے لہلہاتے کھیتوں میں دیوانی
ہو رہی تھی، آسمان پر کہیں کہیں بادل کے ٹکڑے آدمیت
سے خالی لفنگوں کی طرح قدرت کی دوشیزہ کو دیکھ کر
ایک ہی جگہ جم سے گئے تھے۔"

پردیسی کی کئی کہانیاں اردو افسانہ نگاری میں افسانے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ آپ کی عظمت اس لئے بھی بڑھ جاتی ہے کہ آپ نے کشمیر میں نئی نسل کے افسانہ نگاروں کے لئے راہیں ہموار کر دی ہیں۔ آپ بجا طور پر یہاں کے افسانہ نگاروں کے پیش رو ہیں۔

گوردچرن داس آفتاب

غزل

فریب میری نظر کا بنائے عالم ہے
جسے سمجھتا تھا گوہر وہ اشکِ شبنم ہے

دیا ہے خوں مرے غم نے رگِ مسرّت کو
چمن میں خندۂ گل بھی متاعِ شبنم ہے

اثر ہے میرے جنوں کا تمھارے جلووں میں
کہ آج زلف تمھاری تمھیں سے برہم ہے

وہ لوگ بھی ہیں تمھیں بھول کر جو زندہ ہیں
ہمیں تو یاد بھی کرنے کو زندگی کم ہے

چمن ہے جس سے پریشان وہ بہار ہوں میں
میں وہ جنوں ہوں بیاباں بھی جس سے برہم ہے

خلش جو دل کو نگاہوں نے تیری بخشی تھی
کبھی وہ نشترِ جاں ہے کبھی وہ مرہم ہے

سب اپنا اپنا فسانہ غموں کا کہہ بیٹھے
وہ آفتاب کہاں ہے جسے مرا غم ہے

وقار صدیقی

ہڑپا تہذیب میں عورتوں کے بالوں کی آرائش

عورت کی فطرت میں زیبائش و آرائش پھول میں خوشبو کی سی اہمیت رکھتی ہے۔ اس فطرت نے انسانی نفسیات کی تاریخ میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔ اس نے عورت کو خود بینی، خود نمائی اور خود آرائی سکھائی۔ اس جذبۂ زیب و زینت نے عورت کے تصور کو مرقع کیا اور اس میں ایک نئی اپیل اور ایک نمایاں کشش پیدا کی جس نے دنیا کی تمام زبانوں کے شاعروں کی تخیل کو ہزاروں سال تک اسیرِ دام رکھا۔ غالباً اسی خیال سے متاثر ہو کر اردو کے عظیم فن کار شاعر غالبؔ نے اپنا مشہور شعر زیبِ قرطاس کیا جس کی نشتریت آج بھی اتنی ہی رومان پرور ہے جتنی کہ کل تھی ؎

تو اور آرائشِ خمِ کاکل　　میں اور اندیشہائے دور دراز

بال سنوارنے کے انداز Styles کی ابتدا عہدِ پارینہ کی نامعلوم وسعتوں میں گم ہے۔ لیکن گمان یہ ہوتا ہے کہ جب پہلے پہل عورت میں احساسِ جمال پیدا ہوا اور اُس نے اپنے ظاہری حسن اور کشش میں اضافہ کرنا چاہا تو اُس نے اپنے بالوں کو سنوارنا اور سجانا شروع کیا۔ ہندوستان میں نسائی زلفوں کی آرائش کی تاریخ کیا ہے یہ ایک دلچسپ سوال ہے۔ اس سوال کا جواب ہماری قدیم ترین تہذیبوں میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان کی قدیم ترین تہذیب، ہڑپا تہذیب کے نام سے منسوب ہے۔

تاریخِ عالم کے پہلے باب میں دریائے نیل کی وادی کا زرخیز ملک مصر، اور دجلہ و فرات کے ڈیلٹا ہی عرصہ دراز تک مہذب انسانوں کی پیدائش کے مقام تصور کئے جاتے تھے۔ لیکن بیسویں صدی کے پہلے چوتھائی حصے میں سندھ اور اس کے معاون دریاؤں کے علاقے میں کھدائی کے ذریعہ ایک انتہائی عظیم الشان تاریخی دریافت ہوئی۔ اس بازیافت نے ہندوستان کی قدیم ترین ہڑپا تہذیب کی نقاب کشائی کی۔ ہڑپا تہذیب، مصر، میسوپوٹامیا کی قدیم تہذیبوں کی ہمعصر خیال کی جاتی ہے۔ اُس تہذیب کے باقیات نے ہمیں اس زمانے کی زندگی کے ہر شعبہ کی تھوڑی بہت واقفیت عطا کی ہے۔ مگر بقول سید عابد حسین "اس میں شک نہیں کہ جو پرانی چیزیں خصوصاً ٹوٹی پھوٹی عمارتیں زمانے کے جھٹکے کھا کر بچ رہی ہیں ان کا ہر ذرہ زبانِ حال سے عہدِ رفتہ کی داستان سناتا ہے۔ لیکن اس زبان کا سننا اور سمجھنا ہر ایک کا کام نہیں۔ اس کے لئے غیر معمولی جِدّ اور نظر کی ضرورت ہے۔ بڑے صبر اور محنت سے ماضی کی یہ نشانیاں تلاش کی جاتی ہیں اور ان کی اصلیت کا پتہ چلایا جاتا ہے اور بڑی دیدہ ریزی سے باریک سے باریک کڑیاں جوڑ کر واقعات کا سلسلہ تیار کیا جاتا ہے۔ یہ زنجیر جو آثارِ قدیمہ کے ماہر اور مورخ کی متفقہ کوشش سے بنتی ہے حال کو ماضی سے ملا کر خوابِ ہستی کے منتشر اجزاء میں ربط پیدا کر دیتی ہے"[1]۔ اس مختصر مضمون میں ہڑپا، موہن جودڑو، چنہو دارو اور ہی ڈیمب (یہ علاقے اب پاکستان میں ہیں) سے برآمد شدہ پکی ہوئی مٹی پتھر اور کانسے کی بنی ہوئی مورتیوں کے ذریعہ مندرجہ بالا مطالعہ کے تحت ہڑپا تہذیب کی دوشیزاؤں کے بال سنوارنے کے انداز Styles کی تاریخ مرتب کی گئی ہے۔ اُس زمانے کی دوشیزائیں اپنے بال مختلف انداز سے سنوارتی تھیں۔ بالوں کو کنگھی سے پیچھے لا کر چھوڑنے کا سب سے آسان طریقہ مروج تھا۔ اس سے زلفیں سر کے پیچھے لٹکتی رہتی تھیں۔ عموماً پیچھے

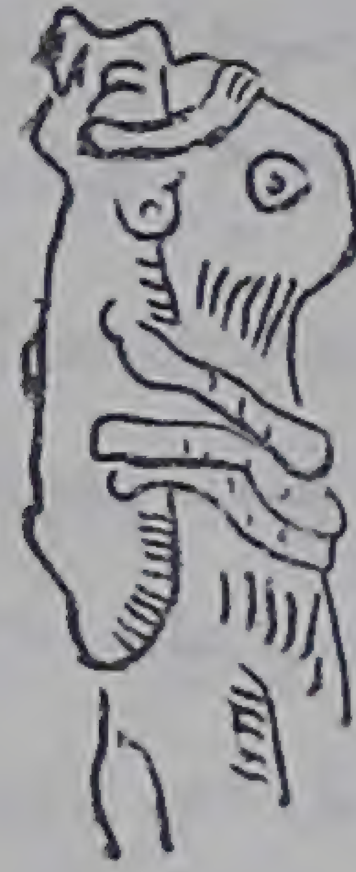


[1] سید عابد حسین ناظم اردو اکادمی کا دیباچہ "ہندوستان کے آثارِ قدیمہ پر ایک اجمالی نظر" تصنیف مولانا غلام یزدانی۔

ڈالے ہوئے بالوں میں ایک آسان سی گرہ ڈال دی جاتی تھی۔ بالوں کو سمیٹ کر سر کے پیچھے ایک فیتے سے باندھنے کا بھی رواج تھا۔ اس ڈھنگ سے سنوارے ہوئے بال نیچے لٹکتے رہتے تھے اور اکثر پونی ٹیل Pony Tail کی گچھے دار شکل میں دکھائی دیتے تھے۔ (بالوں کا سنوارنے کا یہ انداز جس کانسی کی مورتی سے اخذ کیا گیا ہے وہ زنگ خوردہ ہوکر کافی خراب ہوگئی ہے اس لئے اس کا بیان ادھورا ہی ہے)

آج کل کی خواتین کی طرح اس زمانے کی دوشیزائیں بھی وقت کی روش کے ساتھ ساتھ زلفوں کی آرائش کے نت نئے انداز ایجاد کرتی رہی ہوں گی۔ اس زمانے کی مورتیوں کے سنوارے گئے بالوں کے انداز سے اس بات کا احساس ہوتا ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جیسے آج فیشن بدلتا رہتا ہے اس وقت بھی بدلتا رہا ہوگا۔ جس کا اثر آرائش خم کاکل پر بھی ضرور پڑا ہوگا۔

عورتیں بالوں کو کنگھی سے اس انداز سے پیچھے کر لیا کرتی تھیں کہ سر کے اوپر ایک چھلا سا بن جاتا تھا اور بقیہ بال نیچے گردن تک لٹکتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی اس کے ساتھ ساتھ سر کے چاروں طرف ایک فیتا بھی باندھا جاتا تھا۔





سر پر ایک فیتا باندھ کر بال پیچھے کر دئے جاتے تھے جو اسی انداز سے لٹکے رہتے تھے۔ بالوں کو سمیٹ کر سر پر پگڑی کی طرح لپیٹنے کا ڈھنگ دلچسپ اور مختلف انداز کا تھا اس انداز کو دیکھتے ہی موجودہ یورپین عورتوں کے سجے ہوئے بالوں والا سر آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔



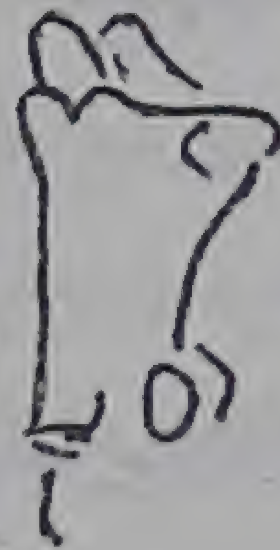


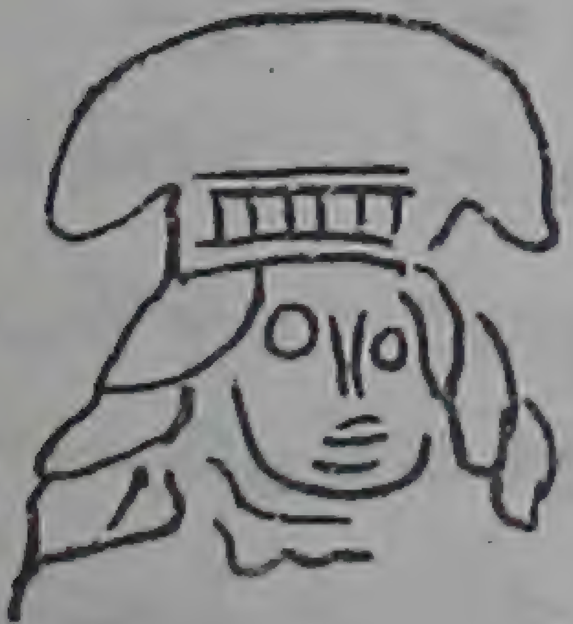
چوٹی کرنے کا رواج تو موجود ہی تھا۔ عورتیں دو چوٹیاں بنا لیتی تھیں جو سامنے کندھوں سے لٹکتی رہتی تھیں۔ آج کی اسکول اور کالجوں کی طالبات میں یہ انداز جس قدر مقبول ہے وہ سبھی لوگ جانتے ہیں اپنی خواہش کے مطابق عورتیں ایک سے چار تک چوٹیاں بناتی تھیں لیکن عام طور پر ایک چوٹی کا ہی رواج ہوگا کیونکہ اس میں وقت کم صرف ہوتا ہے۔ ایک چوٹی سر کے بائیں طرف ہوتی تھی جو کان کے پاس ہی لٹکتی رہتی تھی جیسا کہ تصویر سے ظاہر ہے۔



عورتوں میں بال ترشوانے کا بھی رواج تھا Bobbed Hair اس طرح ترشے ہوئے بال چوٹی کی شکل میں گوندھ بھی لئے جاتے تھے۔ اور ان چوٹیوں کو سر کے اوپر دوگنا کر کے ایک فیتے سے باندھ لیا جاتا تھا۔



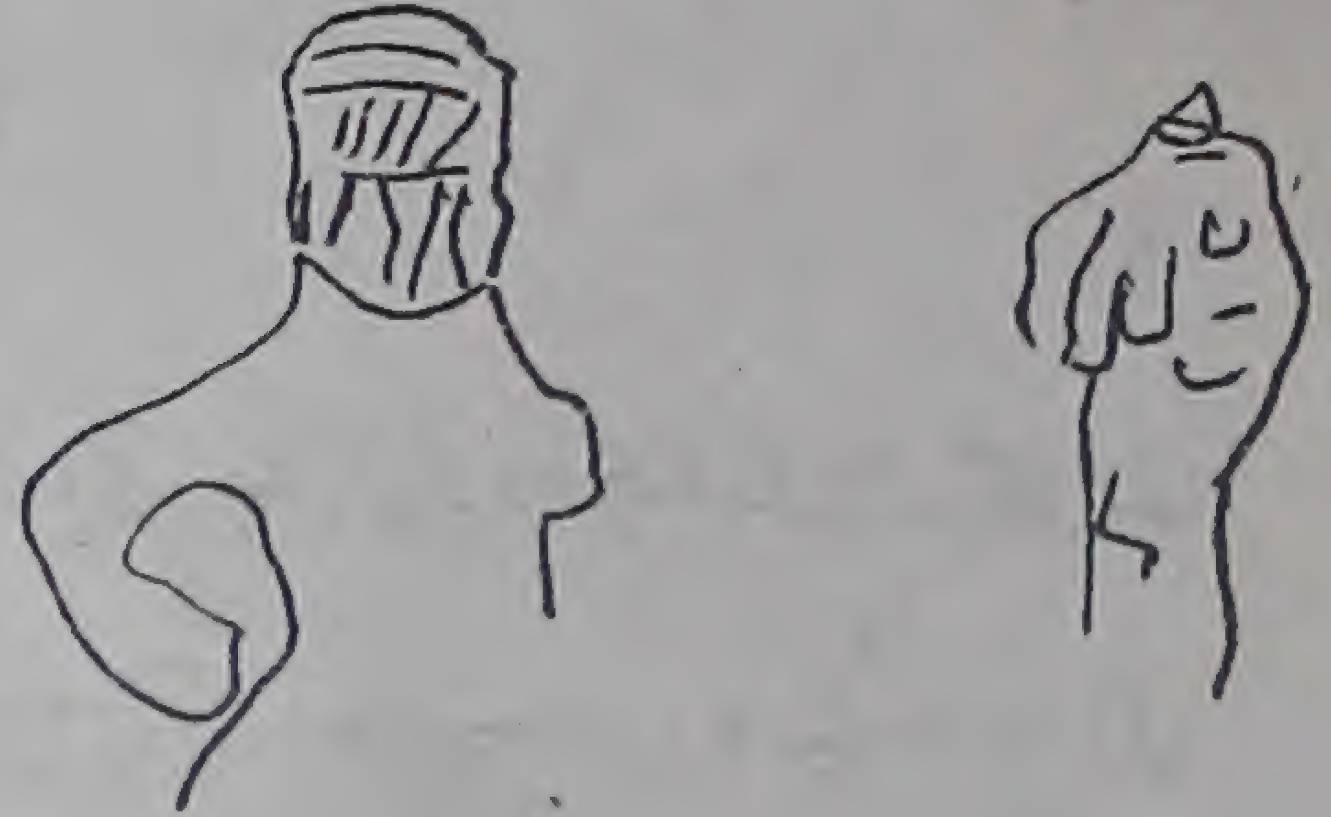




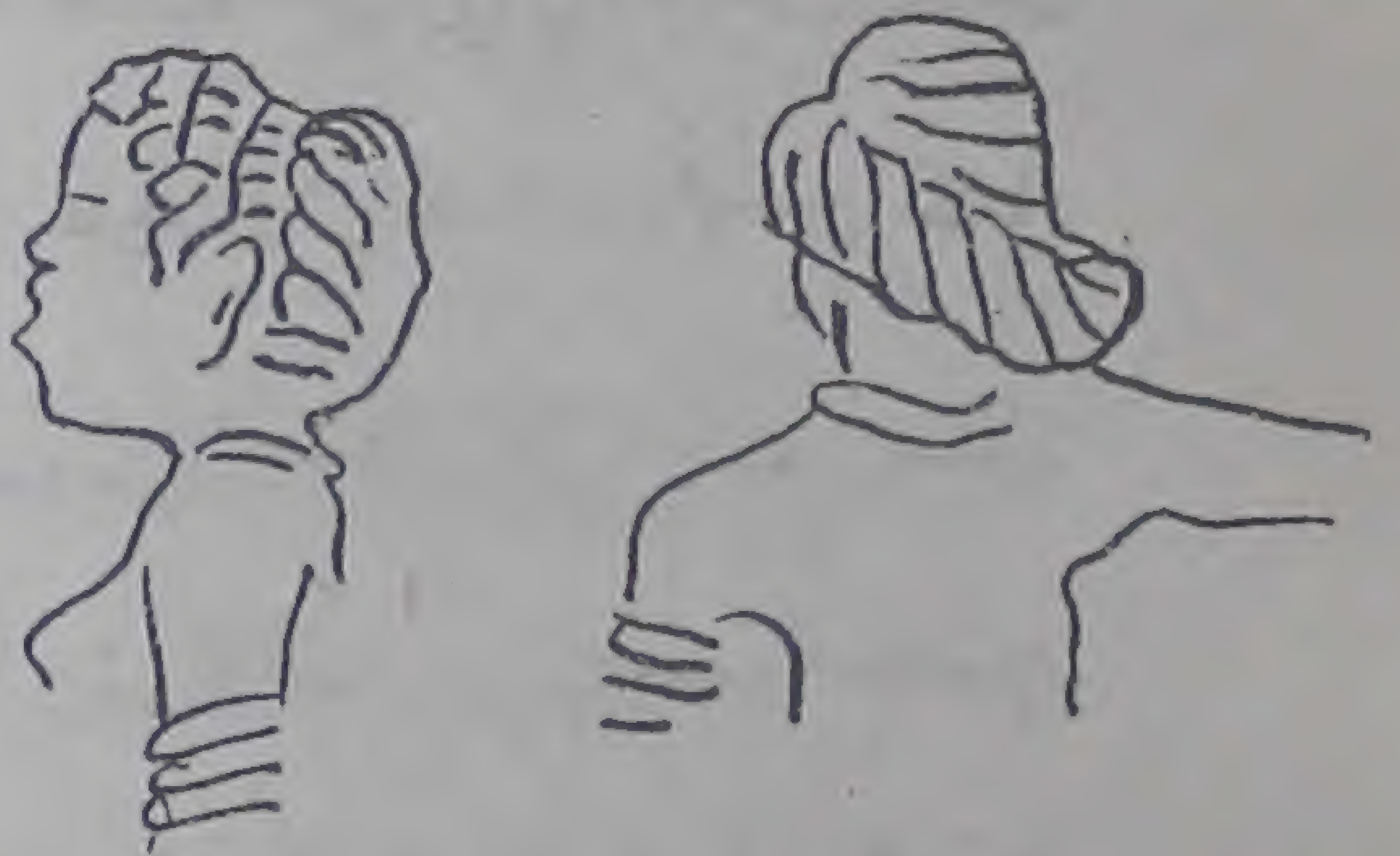
کچھ عورتیں دو چوٹیوں کی ایک چوٹی بنا کر سر کے اوپر باندھ لیا کرتی تھیں۔ زیادہ تر ان چوٹیوں کی تعداد چار ہوتی تھی۔ اور بالوں کو اس

طرح سنوارا جاتا تھا کہ دو چوٹیاں سامنے کی طرف کندھے پر لٹکتی رہتی تھیں اور باقی دو چوٹیاں سر کے پیچھے لے جاکر باندھ لی جاتی تھیں۔

بالوں کو سنوارنے کا ایک عجیب انداز یہ تھا جس میں بالوں کی کچھ لٹیں بغیر گوندھے چھوڑ دی جاتی تھیں بقیہ بالوں کا سر کے پیچھے جوڑا بنا لیا جاتا تھا۔



ساتھ ہی ساتھ صرف جوڑا بنانے کا بھی رواج تھا۔ اس طرح جوڑے کے اوپر دوشیزائیں ایک ٹوپی پہن لیا کرتی تھی۔ اس انداز سے سر پہ ٹوپی پہننے کا رواج آج بھی مصری عورتوں کا طغرائے امتیاز ہے۔ سر کے اوپر چھوٹے چھوٹے چھلے دار بال رکھے جاتے تھے اور بقیہ بالوں کی ایک موٹی لمبی سی چوٹی سر کے بائیں طرف بنائی جاتی تھی اسے سر کے پیچھے سے لاکر داہنے کندھے پر چھوڑ دیا جاتا تھا



آرائشِ خم کاکل کے عام طریقوں کے علاوہ ایک انداز اور تھا جسے اختیار کرنے والی خواتین بالعموم دولت مند گھرانوں سے تعلق رکھتی ہوں گی۔ ظاہر ہے اس میں وقت زیادہ لگتا ہوگا اور پھر اس میں ایک ڈھانچے کی ضرورت پڑتی تھی۔ ڈھانچے کو سر پہ ٹوپی کی طرح پہن لیا جاتا تھا۔ پھر اس کے اوپر سر کے پیچھے لٹکتے ہوئے بالوں کی کئی چوٹیاں گوندھ لی جاتی تھیں۔ اس طرح یہ چوٹیاں اس ڈھانچے پر سر کے پیچھے سے لاکر سامنے، دائیں اور بائیں طرف ڈال دی جاتی تھیں۔



موجودہ دور میں ہندوستانی عورتوں کی آرائشِ خم کاکل اور بال سنوارنے کے مختلف انداز جیسے گھنگھرالے بال رکھنا یا ترشوا دینے" Bobbed " کا فیشن پڑھی لکھی خواتین میں زیادہ پایا جاتا ہے۔ اور بالوں کو کنگھی سے پیچھے لے جاکر ایک یا دو چوٹیاں کرنے کا رواج عام طور پر سن رسیدہ عورتوں میں عام ہے چھوٹی لڑکیوں کی بیشتر دو سے چار تک چوٹیاں کی جاتی ہیں۔ سر کے پیچھے بالوں کا جوڑا بنانے کا رواج متوسط طبقہ کی خواتین میں عام ہے۔ بالوں کو سنوار کر سر کے پیچھے فیتے یا ربن سے باندھنے کے انداز کو پونی ٹیل اسٹائل کہتے ہیں۔ کالج میں پڑھنے والی سنجیدہ لڑکیاں اس اسٹائل کو زیادہ اختیار کرتی ہیں۔ دراصل بالوں کو سنوارنے کے مختلف النوع انداز سے عورت کی رنگا رنگ فطرت کا اظہار ہوتا ہے۔ بالوں کے اسٹائل سے ان کی نفسیات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ وہ کانسے کی مورتی جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے اُس سے پتہ چلتا ہے کہ بالوں کو سنوارنے کا یہ ڈھنگ اور دوسرے مختلف انداز جو آج بھی اسی طرح رائج ہیں ان کی ابتدا ہمارے ملک میں امکانی طور پر آج سے تقریباً پانچ ہزار سال پہلے ہوئی تھی۔

باوا کرشن گوپال مغموم

سرسوتی دیوی

سرسوتی! تیرا اک ادنےٰ سا پُجاری میں بھی ہوں
بھیک تو دیتی ہے جس کو وہ بھکاری میں بھی ہوں

عہدِ طفلی میں نظر آئی تھی اک شب خواب میں
آج بھی ہیں تیرے جلوے دیدۂ بے تاب میں

سحر دل پر کرنے والی تیری باتیں یاد ہیں
دن وہ اب منقوش دل پر ہیں، وہ راتیں یاد ہیں

میری آنکھوں میں بسی ہے موہنی مُورت تری
ایک پرتو ہے تصوّر کا، نہیں صورت تری

تیری سج دھج، تیرا شوقِ جامہ زیبی کیا کہوں
دل نوازی کیا کہوں، وہ دل فریبی کیا کہوں

مادرِ تقدیس پیکر! اے مری روح و رواں!
تیرے اعضا سے عیاں ہیں تیری عظمت کے نشاں

گوشِ اقدس کے "کرن پھولوں" سے بجلی شرمسار
ہیں گلوئے پاک کی زینت مہ و انجُم کے ہار

لالہ و گُل تجھ پہ صدقے، سنبل و ریحاں نثار
تابشِ رُخ پر جلالِ نیّرِ تاباں نثار

سُرخ بِندی کی چمک تیری جبینِ صاف پر
جوہر آئینوں کا قرباں، چہرۂ شفّاف پر

وہ خمِ ابرو، وہ دل کش حسنِ مژگانِ دراز
مصدرِ الفاظ و معنیٰ وہ لبِ افسوں طراز

مثلِ موجِ مے ہمیشہ کیف برساتے ہوئے
گُل فشانی شمع کی مانند فرماتے ہوئے

گیسوؤں کے سلسلے میں حشر کی راتوں کا طُول
تیری گردِ راہ تارے، تیرے فرشِ راہ پھول

The Goddess of Learning ———————— देवी सरस्वती

اے کہ تیری چال پر کبکِ خراماں کا گماں — ہر ادا پر ایک شاخِ گُل بداماں کا گماں

تیرے دستِ راست کی زینت کتابِ دلنشیں — تیرے دستِ چپ کی زیبائش ربابِ دلنشیں

"شعر و نغمہ" تیری ہر موجِ نفس کا زیر و بم — اک کنول کے پھول کا فرشِ حسیں زیرِ قدم

سامعہ قربان تیرے نطقِ گوہر بار پر — وجد کرتا ہوں ترے سحر آفریں اشعار پر

انگلیوں کی زد میں آ جاتا ہے جب تارِ رباب — مست ہو جاتی ہے پیری جھوم اٹھتا ہے شباب

نغمۂ لاہوت ہوتا ہے محیطِ کائنات — دیدۂ بیدار پر کھلتے ہیں اسرارِ حیات

نغمگی کے سحر سے مسحور ہو جاتا ہوں میں — حلقۂ ارض و سما سے دور ہو جاتا ہوں میں

تازگی سی تازگی ملتی ہے محسوسات میں — اک نئی تحریک ہوتی ہے مرے جذبات میں

خود بخود چھڑتے ہیں نغمے بے خودی کے ساز پر — وجد کرتے ہیں فرشتے بھی مری آواز پر

روح کی گہرائیوں سے خود ابل پڑتے ہیں شعر — دل کی سیپی سے گہر بن کر نکل پڑتے ہیں شعر

منزلِ مقصود پھر بھی میرے ہاتھ آتی نہیں — تشنگی میرے دلِ بے تاب کی جاتی نہیں

محسنوں کی پاک محسن! اے رفیقوں کی رفیق! — شاعروں کے دل کی دیوی! اے ادیبوں کی شفیق!

تیرے قدموں پر عقیدت سے جھکا جاتا ہوں میں — آج اپنے دل کا ارماں تا بہ لب لاتا ہوں میں

اک ذرا اپنا کرم تو مجھ پہ ارزاں اور کر — شعر گوئی میں مجھے مشہورِ دوراں اور کر

شعر میرے قدر میں جنسِ گراں ہو کر رہیں
نقش جو بھی دل سے ابھریں جاوداں ہو کر رہیں

---

۱ स्वर्गि संगीत

مشیر الحق مجری آبادی

دیواری مشاعرہ

(غالب کا ایک خیالی خط، جس کی تمام باتیں حقیقی ہیں)

میری جان میر مہدی!

تم نے اپنی دلّی کے من چلوں کے بارے میں بھی کچھ سنا۔ کل بیٹھے بیٹھے اچانک یہ خیال آیا کہ لاؤ ذرا اپنے مزار تک ہو آؤں۔ سنا ہے دلّی والے میری برسی بہت دھوم سے مناتے ہیں۔ ہاں تو کل جب میں وہاں پہونچا تو رات کا وقت تھا۔ ایک سناٹے کا عالم تھا۔ ایسے میں ایک مردِ بزرگ میرے مزار پر کھڑا بہت خشوع و خضوع کے ساتھ ہاتھ اُٹھائے دعا مانگ رہا تھا۔ معلوم نہیں اپنی عافیت کا طالب تھا یا میری نجات کا۔ اس کا حلیہ کیا لکھوں، ننگے سر ننگے پیر، چارخانے کا تہہ بند، لمبا موٹا کرتا۔ داڑھی بے تحاشا بڑھی ہوئی۔ پہلے تو طبیعت بجھ کر رہ گئی کہ دیکھنے ہم بھی گئے مُفتے پہ تماشا نہ ہُوا پھر اس تصوّر سے تسلی ہوئی کہ میرے ایسے اور نہ جانے کتنے ہی مجھ سے بڑے شاعروں کے مزار پر تو یہ ایک مردِ بزرگ بھی نظر نہ آتا ہوگا۔ اس طرح دل کو تسلّی دے کر جب میں اس شخص کے قریب پہنچا اور علیک سلیک کی تو اس نے ایک عجیب انکشاف کیا۔

اس نے بتایا کہ بڑے لوگ تو میری یاد سال میں ایک دن مناتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر طرف مشاعرے منعقد کئے جاتے ہیں۔ تقریریں کی جاتی ہیں۔ رسالوں کے نمبر نکالے جاتے ہیں، جس میں کچھ لوگ تو ایسے ہوتے ہیں جو مضمون لکھ کر یا شعر چھپوا کر مجھ پر اور اڈیٹر کی سات پشتوں پر احسان کرتے ہیں اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جن کے مضامین اور اشعار کو رسالے میں جگہ دے کر اڈیٹر صاحبان ان پر رحم اور ان کے گھر والوں پر ظلم کرتے ہیں۔ جو لوگ بہت اونچے ہوتے ہیں وہ ریڈیو کے ذریعہ اپنے خیالات دنیا میں پھیلا دیتے ہیں۔

لیکن ایک بہت بڑا طبقہ ایسا ہے جن پر نہ تو اڈیٹر احسان کرتے ہیں نہ مشاعرہ کمیٹی انھیں منہ لگاتی ہے اور یہی میرے اصل پرستار ہیں۔ ان کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔ ان لوگوں نے اڈیٹروں، مشاعرہ کمیٹیوں اور اربابِ ریڈیو کی جتھہ بندی کے خلاف اپنے کو منظّم کر لیا ہے اور انھوں نے مشاعرے کی ایک نئی قسم ایجاد کی ہے اس کا نام ہے دیواری مشاعرہ۔

اس مشاعرہ کا نہ تو کوئی وقت متعین ہوتا ہے، نہ اس کے دعوت نامے جاری کئے جاتے ہیں۔ نہ اشعار کی تعداد پر کوئی پابندی ہوتی ہے نہ عروض و قوافی کی کوئی قید ہوتی ہے۔ بس اظہارِ جذبات جس طرح بھی ممکن ہو! ہاں خوب یاد آیا۔ ایک شرط بہت ضروری ہے اور وہ ہے جگہ کا تعیّن۔ یہ مشاعرہ میرے مقبرہ کی دیواروں کے علاوہ اور کہیں نہیں ہو سکتا۔

میں اس مردِ بزرگ کی یہ بات سن کر اپنی دلّی کے من چلوں کی اس ادا پہ جھوم گیا۔ اگر انھوں نے میرا مزار نہ بنوایا ہوتا تو پھر بھلا میرے پرستار کس طرح میرے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے۔ میں نے گھوم پھر کر اپنے چاہنے والوں کے "نقشِ قلم" کو اچھی طرح دیکھا اور اس خیال سے کہ میرا پیارا میر مہدی اس لطف سے محروم نہ رہے کچھ چیزیں نقل کر نا لایا۔ میں نے اس میں کچھ تصحیح نہیں کی ہے تاکہ تم تک وہ چیزیں ہو بہو، لفظ بلفظ پہنچیں۔

لو دیکھو ایک صاحب ہیں "حسین احمد ہاپوڑی، کاریگر کارخانہ ہوا محل" انھوں نے صرف ایک شعر اور ایک مصرعہ پر قناعت کی ہے۔ فرماتے ہیں

"غالب ترے مزار پر آئے چلے گئے۔ حسرت یہی ہے کہ ہم ہائے چلے گئے
نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنیں" دعا گو نام حسین احمد ہاپوڑی"

ان "دعاگو" کے بعد فتح گنج لکھنؤ کے ایک صاحب احسان اللہ نامی نے مجھ پہ یوں احسان فرمایا

"السلام علیکم   ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اُٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا فقط"

۳۰۔ اکتوبر ۵۹ء کو محمد شریف سوری از راہِ شرافت مجھ سے ملنے آئے لیکن ملاقات نہ ہوسکی اس لئے اپنی یاد دلانے کے لئے یہ پیام چھوڑ گئے

"آئے تھے غالب کو دیکھنے
معلوم نہ تھا کہ وہ دفن ہوگئے

محمد شریف سوری تو اچانک شعر کہہ چلے"

اس کے بعد جناب غیاث الدین نے بہت ہی حسرت سے فرمایا۔

"یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست غالب
ترے مزار پر آکر صرف تو ہی نہ ملا"

غیاث الدین کے بعد قصبہ شیخوپور بدایوں سے محمد مظہر الدین حسن صدیقی عرف بنّن صاحب تشریف لائے اور یوں گویا ہوئے۔

"شعر کہنے کو زبان ترستی ہے غالب
یاد آتا نہیں لکھوں تو بھلا کیا لکھوں"

ان کے بعد "مزمل خاں اور رفن خاں ۲۶۔ نومبر کو نظام الدین محبوبِ الٰہی میں فاتحہ پڑھنے آئے تو غالب کے مزار پر بھی آئے" لیکن ان لوگوں پر شاید اتنی رقّت طاری تھی کہ وہ اپنے جذبات کا اظہار اس اطلاع کے علاوہ اور کسی طرح نہ کرسکے۔

پھر میرے ایک اور کرم فرما "شمشاد حسین مراد آبادی محلہ کچا باغ بہادر گنج" سے تشریف لائے اور اپنی آمد کا نقش ان الفاظ میں چھوڑ گئے۔

آؤگے پھر کبھی جو ابھی جا رہے ہو تم   بیکار میرے سر کی قسم کھا رہے ہو تم
شمشاد خدا کے واسطے باز آؤ عشق سے   نہ حق رنج و غم میں گھلے جا رہے ہو تم

پھر میرے دوست منشی ہرگوپال تفتہ کے ایک بھائی نے میری یوں عزّت افزائی کی۔

"सैठ रामलाल अलीगढ़
अलीगढ़ वाले का सलाम पहुँचे
तारीख २१-५-५९
साथ में बाबू लाल सराफ़"

میاں سیّد تم تو جانتے ہو کہ میں ہندی میں کورا ہوں۔ یہ تو تفتہ کا دل رکھنے کی خاطر اتنی سیکھ لی تھی کہ "نقل را چہ عقل" کے مطابق جو کچھ وہاں لکھا دیکھا وہ تمہیں دکھا رہا ہوں۔ اب یہ مجھے نہیں معلوم کہ یہ نثر ہے یا نظم —— اور سچ پوچھو تو اردو ہی میں جو کچھ لکھا گیا ہے اسی کے بارے میں بھلا کیا لکھ سکتا ہوں۔ ان شہ پاروں کو اگر نثر کہوں تو ہاتھ سے پرستار چھوٹیں اور نقادوں کے سامنے الگ جوابدہی کرنی پڑے، اور اگر انھیں شعر کہوں تو پھر اگلے سال شاید میری برسی نہ منائی جائے۔ اس لئے میاں اس خطرے کو کیوں مول لوں۔ میں نے تو جو کچھ اپنے مقبرے کی دیواروں پر لکھا دیکھا ہے اسے تمہیں سنا رہا ہوں۔ اب سنو کہ ان علی گڑھ والے سیٹھ رام لال کے بعد "غالب کے استاد اشتیاق علی خاں صاحب بریلی تنگ بدتمیزی" تشریف لائے مگر انھوں نے مناسب نہ سمجھا کہ شاگرد کی مزید عزّت افزائی کریں اس لئے وہ صرف اپنے نام تخلّص اور وطن کے بارے میں اطلاع دے کر واپس چلے گئے۔

پھر ایک نوجوان کرم فرما کی آمد ہوئی۔ انھوں نے اپنا کلام سنانے سے پہلے اپنا تعارف ان الفاظ میں کرایا۔

"سوانح حیات   نام محمد احمد، تخلّص وفا۔ ۱۹۴۰ء میں بدایوں محلہ فرشوری ٹولہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام آل احمد ہے اور ۱۹۴۹ء میں ہائی اسکول پاس کر کے کراچی چلے آئے اور آپ کو کراچی ہی آکر شاعری کرنا شروع کی۔ آج بتاریخ ۲۲۔ اپریل ۱۹۵۹ء کو غالب کو دیکھنے کے واسطے دہلی آئے۔"

سوانح حیات کے بعد آپ نے یہ دو شعر عطا کئے:

آئے ہیں بدایوں سے ہزاروں میل سے   پر ہم دیکھ نہ سکے غالب کو اپنی نظر سے
نظارے دیکھ دیکھ کے رہ گئے   ہم غالب کا مزار دیکھ کے رہ گئے

جنابِ ذاکر علی لکھنوی کو یہ بدایونی شاعری پسند نہیں آئی اس لئے انھوں نے نومبر ۵۹ء میں ان شعروں پر تنقید کی اور صرف ایک بلیغ جملہ لکھ گئے کہ:

"تم شاعر نہیں ہو۔"

پیارے میر مہدی، یہ ایک ہلکی سی جھلک ہے اس دیواری مشاعرے کی، اب مجھے اجازت دو۔

عافیت کا طالب
غالب

ع-م

نئی کتابیں اور رسالے

ذکرِ آزاد - عبدالرزاق ملیح آبادی

مولانا ابوالکلام آزاد اتنی کم سنی میں اور اس قدر جلد مشہور ہو گئے تھے کہ جب بیسویں صدی کی پہلی نسل نے آنکھ کھولی تو وہ ہمارے قومی رہنما بن چکے تھے - اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ آگ لگا اور قید و بند کی سختیاں سہہ چکے تھے - پھر بھی ہم میں سے اکثر کو مولانا آزاد کے ذاتی حالات کے بارے میں زیادہ واقفیت نہیں - بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو دوسروں سے اپنی کوئی بات چھپانا نہیں چاہتے کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی برائیوں پہ تو کیا اپنی اچھائیوں پر بھی پردہ ڈالے رہتے ہیں - مولانا ایک عالی حوصلہ اور غیرت دار انسان تھے - ان کے پندار کو یہ گوارا نہ تھا کہ اپنے مسائل دوسروں کے سامنے رکھیں - یہ گویا ایک قسم کا اقرار ہوتا کہ کوئی ایسا بھی مسئلہ ہے جو آزاد بذاتِ خود نہیں حل کر سکتے - مولانا کی خود اعتمادی یہ ماننے کو تیار نہ تھی - وہ اپنے کو ایک غیر معمولی انسان تصوّر کرتے تھے - وہ جذبات سے شاذ و نادر ہی مغلوب ہوئے اور نہ انھیں ان لوگوں سے ہمدردی تھی جو جلد جذبات سے مغلوب ہو جاتے ہیں -

مولانا کی پہلی سوانح حیات "تذکرہ" ہے جس میں انھوں نے اپنے آبا و اجداد کے حالات اور اپنی ذہنی نشو و نما بیان کی ہے - دوسری قابلِ ذکر سوانح حیات عبدالرزاق ملیح آبادی کی "مولانا آزاد کی کہانی خود ان کی زبانی" ہے - اس میں مولانا کے ذاتی حالات تو ہیں لیکن اسی قدر جتنا کہ وہ بتانا چاہتے تھے - تیسری کتاب اس نہج کی جناب ہمایوں کبیر صاحب نے انگریزی میں انڈیا ونس فری ڈم (ہندآزاد ہوتا ہے) کے نام سے شائع کی - یہ گویا مولانا کی سیاسی سوانح ہے - دراصل مولانا کا ارادہ تھا کہ وہ اپنے سیاسی تجربات کو تین جلدوں میں لکھیں بلکہ کبیر صاحب کو سنائیں جو ان کا انگریزی میں ترجمہ کر کے شائع کرائیں - پہلی جلد میں چوں کہ صرف ۱۹۴۷ء تک کے حالات ہیں لہٰذا اس کتاب سے غلط فہمیاں پھیل گئی ہیں ایک تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا نے ہمارے بعض قومی رہنماؤں کے بارے میں منصفانہ رائے نہیں دی (شاید وہ اگلی جلدوں میں اس کی تلافی کرتے) پھر مخلصانہ اختلافِ رائے میں کوئی حرج نہیں - لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ مولانا خود اپنی ذات کو خطا و نسیان سے بالا سمجھتے تھے - اگر ہم یہ تسلیم بھی کر لیں کہ وہ بہت پہلے سے سمجھ لیتے تھے کہ ہر سیاسی مسئلہ کیا موڑ لے گا اور اس کا تدارک بھی بتا دیتے تھے تو بھی اس کتاب میں جس انداز سے ان کی سیاسی دُور اندیشی کی مثالیں دی گئی ہیں ان میں مبالغے کا شائبہ نظر آتا ہے - "انڈیا ونس فری ڈم" کے پڑھنے کے بعد مولانا کے تدبّر کا قائل ہونا پڑتا ہے بلکہ یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ وہ شاید مافوق الانسان تھے -

عبدالرزاق ملیح آبادی مرحوم کی کتاب "ذکرِ آزاد" پڑھنے سے یہ گمان بڑی حد تک زائل ہو جاتا ہے اور ایک خوش گوار احساس ہوتا ہے کہ مولانا بھی ہمیں لوگوں کی طرح گوشت پوست کے بنے ہوئے انسان تھے جن سے غلطیاں ہوتی تھیں جو اپنی غلطیوں کو مانتے تھے - جو نہ صرف اپنی ناز برداری کراتے تھے بلکہ خود بھی روٹھے ہوؤں کو مناتے تھے - ملیح آبادی اور مولانا کا ساتھ کوئی اڑتیس برس رہا - شروع میں ملیح آبادی مولانا سے جلتے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ آدمی بہت "دماغ دار" ہے - پھر ملاقات ہوئی تو ان کے گرویدہ ہوئے - مولانا نے اردو اور عربی اخبار نکالے - ملیح آبادی ان کے ایڈیٹر ہوئے - ملیح آبادی نے مولانا آزاد سے اختلافِ رائے بھی کیا - الگ بھی ہو گئے - مولانا کے خلاف مضامین بھی لکھے - لیکن خلافت تحریک سے وزارتِ تعلیم تک دونوں میں ہمیشہ ذہنی رفاقت رہی - دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کی

محبّت اور عزّت برقرار رہی۔

ملیح آبادی عرصہ تک مولانا کے ساتھ ایک ہی مکان میں رہے۔ انھوں نے مولانا کو جوش وجلال اور حزن و ملال میں دیکھا، انھوں نے ان کے ساتھ جیل میں زندگی بسر کی۔ اور یہ خاص بات دیکھی کہ کم آمیز آزاد جب کسی کو ملول و دلگیر دیکھتے تو اس کے پاس بیٹھ جاتے۔ ہنستے ہنساتے، دل بہلاتے، ہمّت بڑھاتے۔ انھوں نے جیل میں مولانا کے ساتھ مل کر لوگوں سے عملی مذاق بھی کیا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ انھوں نے مولانا کے ضبط کے پہاڑ کو تین بار آنسوؤں میں پگھلتے ہوئے دیکھا۔ یہ تین موقعے تھے۔ بیگم آزاد کی موت، ایک ملازم کی موت اور ملیح آبادی کو گیفتر ہو جانے پر۔

اس ایک کتاب سے مولانا کا دل کش کردار ہمارے سامنے آجاتا ہے اس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کی رائے میں ذہن کو نپولین کی طرح ایک منظم اسٹور روم بنانا چاہیئے۔ مولانا نے جیل میں مسلم باورچی خانے کی جگہ مارواڑی باورچی خانے سے کھانا لینا پسند کیا۔ مولانا ورزش سے بہت دُور بھاگتے تھے۔ مولانا کے خاص دوستوں میں آغا حشر بھی تھے۔ مولانا جب کسی کو بناتے تھے تو اسے 'میرے بھائی' کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ مولانا اپنی تحریروں پر محمد حسین آزاد کی طرح بار بار نظر ثانی کرتے تھے۔

کتاب میں مولانا کی غیر مطبوعہ تقریریں بھی ہیں انھوں نے اکتوبر ۱۹۲۱ء میں خلافت کانفرنس آگرہ میں اپنی افتتاحی تقریر کے دوران میں جو باتیں کہیں اُس کی تیزی ملاحظہ کیجئے:۔

"ہر مسلمان کے قلب پر یہ حقیقت نقش ہے اور ہونا چاہئے کہ جب تک انگریزی گورنمنٹ اپنے اس ابلیسانہ گھمنڈ سے باز نہ آجائے مسلمانوں کے مطالبات شرعی کو پورا نہ کردے، عراق کی سرزمین اس کی مداخلت سے پاک نہ ہو جائے ایشیائے کوچک میں اس کی کوئی طاقت مخالفت نہ کرے۔ قسطنطنیہ سے تمام شرائط اور پابندیاں اٹھا نہ لی جائیں، ہندوستان کو آزادی نہ دی جائے۔ اس وقت تک انگریزی گورنمنٹ مسلمانوں کے مقابلے میں فریق محارب ہے۔ اگر مسلمانوں کے دل میں ایک آخری چنگاری ایمان کی باقی ہے تو کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ وہ صلح و صفائی کا ہاتھ انگریزوں کی طرف بڑھائے۔ مسلمان اپنے ان آباد شہروں کو چھوڑ دے، جنگلوں میں چلا جائے۔ وہاں سانپوں کے ساتھ صلح کرے بچھوؤں کے ساتھ صلح کرے مگر انگریزی گورنمنٹ کے ساتھ صُلح نہیں کر سکتا۔

لیکن ہاں جس آن اور جس لمحے حالات میں تبدیلی ہو جائے، حالات پلٹ جائیں۔ جو فریق محارب ہے وہ فریق محارب نہ رہے، جس آن برٹش گورنمنٹ میں تبدیلی ہو جائے گی، حقیقی تبدیلی آجائے گی دھوکے کی نہیں... مسلمانوں میں سے ہر فرد تیار ہو گا کہ صلح و اتفاق کا ہاتھ بڑھائے۔"

اس تقریر میں مولانا نے یہ بھی فرمایا کہ "ہندوستان کے مسلمانوں کا فرض شرعی ہے کہ ہندوستان کے ہندوؤں سے کامل سچائی کے ساتھ پیمان محبّت باندھ لیں اور ان کے ساتھ مل کر ایک نیشن ہو جائیں۔"

ملیح آبادی کو آزاد کا باسویل کہا جا سکتا ہے۔ لیکن دراصل وہ باسویل سے اُونچا مقام پانے کے مستحق ہیں کیوں کہ باسویل کی طرح اپنے ہیرو کے محض مداح نہیں بلکہ جرأت مند ناقد بھی تھے۔ وہ اپنے محبوب مولانا کے بعد بمشکل ڈیڑھ برس زندہ رہے۔ لیکن مرنے سے پیشتر یہ کتاب لکھ کر نہ صرف آزاد بلکہ ملک و قوم سے حقِ دوستی ادا کر گئے۔

صفحات ۴۰۸ قیمت ۷ روپے، کاغذ عمدہ، کتابت طباعت دیدہ زیب ملنے کا پتہ:۔ دفتر آزاد۔ ۲۲/۸۔ ساگر دت لین کلکتہ ۱۲ (م۔ ع۔ ح)

جذباتِ مشرق۔ مصنّف دیوان سنگھ مفتون۔

ضخامت ۵۳۶ صفحے۔ تقطیع ۲۲ - ۳۶/۸۔ کاغذ، کتابت طباعت عمدہ جلد اور جلد پوش اعلیٰ۔ قیمت ۱۲ روپے۔ ملنے کا پتہ۔ دیوان سنگھ مفتون۔ پوسٹ بکس ۱۰۸۲ دہلی۔

اخبار ریاست میں ایک مستقل کالم 'جذباتِ مشرق' کے عنوان سے تھا۔ اس میں ہندی، پہاڑی اور پنجابی کے معروف شعراء، عارفوں اور درویشوں کے منظومات اردو ترجمے کے ساتھ شائع ہوا کرتے تھے۔ انھیں ترجموں اور منظومات کو اب کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا ہے۔ ان صفحات میں بہاری پدماکر و دیگر ہندی شعراء کے منظومات کا اقتباس، فرید، کبیر اور بھائی گورداس جیسے عارفان کامل کا کلام ترجمے کے ساتھ شامل ہے۔ اردو رسم الخط میں شاعری اور اخلاق کے اس بے بہا گنجینے کو شائع کر کے مرتب نے ایک نہایت مفید ادبی خدمت انجام دی ہے متعدد اصحاب نے کتاب کے شروع میں کتاب کا تعارف لکھا ہے جن میں احتشام حسین، عبدالمجید سالک مرحوم، ڈاکٹر زور قادری، محمد اجمل خاں اور بخشی غلام محمد قابلِ ذکر ہیں۔ ہندی کے اصل اشعار جلی قلم سے لکھے گئے ہیں۔ کتاب دیدہ زیب بھی ہے اور ہمارے تہذیبی سرمائے کا آئینہ بھی۔ اس سے قبل سردار دیوان سنگھ ایک نہایت

یادگار آپ بیتی 'ناقابلِ فراموش' کے نام سے شائع کر چکے ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ ان کی یہ تازہ تصنیف بھی اسی طرح قبولِ عام حاصل کرے گی جس طرح ناقابلِ فراموش نے حاصل کیا تھا۔

یوروپین اور انڈو یوروپین شعرائے اردو۔ مصنف خواجہ یوسف الدین —— ۱۵۷۔ مقابل اردو ہال حمایت نگر حیدرآباد دکن۔ ضخامت ۱۴۴ صفحے تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶، کاغذ، کتابت، طباعت، جلد، جلدپوش اوسط۔ قیمت غیر مجلد ۲ روپے۔ مجلد ۲٫۵۰ روپے۔ اس مفید اور معلوماتی کتاب میں مصنّف نے اردو اور فارسی کے آرمینی اور انگریز اور اردو کے اینگلو انڈین، انڈو پرتگالی انڈو جرمن، انڈو فرنچ، انڈو اطالوی اور متفرق انڈو یوروپین شعراء کے حالات مع کلام درج کئے ہیں۔ ایک باب اردو کے انڈو یوروپین شاعرات کے لئے بھی وقف کیا ہے۔ اس کتاب کا مقصد عوام کو اردو کے ان یوروپین اور انڈو یوروپین شاعروں سے روشناس کراتا ہے جنھوں نے اس زبان کی نشو و نما اور اشاعت ترقی میں ہمہ تن کوشش کی۔ کتاب مصنّف ہی سے مل سکتی ہے۔

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء۔ مصنّف خورشید مصطفےٰ رضوی۔

ضخامت ۸۵۷ صفحے۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶۔ کاغذ کتابت، طباعت اوسط۔ جلد اوسط، جلد پوش عمدہ، قیمت مجلد ۷ روپے۔ ملنے کا پتہ۔ مکتبہ بُرہان اردو بازار جامع مسجد دہلی۔

کتاب کا پیش لفظ اور تعارف ڈاکٹر تاراچند اور ڈاکٹر اشرف نے لکھا ہے۔ کتاب مجاہدانِ آزادی مولانا ابوالکلام آزاد اور سبھاش چندر بوس کے نام معنون کی گئی ہے۔ یہ ضخیم کتاب نوجوان مصنّف نے بڑی دیدہ ریزی اور محنت کے بعد لکھی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے واقعات کا پورا احاطہ کیا ہے۔ اور اسے دل چسپ بنانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اس کتاب میں انقلاب ۵۷ء کے واقعات کے علاوہ پیچھے کے عہد کا سیاسی پس منظر اور انقلاب کے محرکاتِ عمل ہمارے سامنے آجاتے ہیں کتاب کو تاریخی اعتبار سے مستند بنانے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ شکست و فتح کے تذکروں میں اعتدال اور توازن سے کام لیا گیا۔ کتاب قابلِ مطالعہ ہے۔

ایک زندگی ایک صدی

علامہ برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی کی زندگی اور ادب کا جائزہ مُصنّف تاجور سامری، ناشر کتب خانہ انجمن ترقی اردو دہلی۔ ضخامت ۲۰۸ صفحے قیمت ۳ روپے تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶، کتابت، طباعت، جلد، جلد پوش اوسط۔ تاجور سامری، کیفی مرحوم کے شاگردوں میں سے ہیں۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۵۷ء تک وہ ان کے ساتھ وابستہ رہے۔ اس کتاب میں اس وابستگی کے منظرِ اوّل سے لے کر ان کی موت تک کے حالات بڑے دل چسپ پیرائے میں درج ہیں۔ وہ اپنے روزنامچے میں کیفی صاحب سے متعلق کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے۔ 'ورق ورق' کے عنوان سے اس روزنامچے کا انتخاب کتاب میں درج ہے۔ سوانح عمری اور تنقید و تبصرہ بھی کتاب کے اہم باب ہیں۔ تنقید و تبصرہ میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ عقیدت نے تاجور سامری کو غلط بیانیوں پر مجبور نہیں کیا۔ آخر میں کیفی صاحب کی نظم و نثر کے نمونے درج ہیں۔ یہ کتاب کیفی صاحب کی طویل زندگی اور ان کی طویل ادبی خدمات کا ایک اچھا آئینہ ہے۔

شعرائے امروزۂ ایران - مولفہ ڈاکٹر سید رغیب حسین - لکھنؤ یونی ورسٹی۔

ناشر کتاب خانہ نامی۔ ۵۔ اے بیری روڈ الہ آباد۔ ضخامت ۱۶۰ صفحے۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶۔ کاغذ، کتابت، طباعت عمدہ۔ جلد، جلد پوش اوسط۔ قیمت کتاب پر درج نہیں۔ اس وقت جب کہ ہندوستان میں فارسی درس و تدریس کا سلسلہ رو بہ انحطاط ہے۔ اس مفید کتاب کا مرتب کرنا اور شائع کرنا قابلِ مبارک باد ہے اس کتاب میں فہرست سخنوراں کے ماتحت ۱۲ شعرا کے نام درج ہیں۔ جن میں ایرج مرزا بہار پور داؤد، عارف قزوینی اور لاہوتی کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ یہ کتاب ہندوستانی یونی ورسٹیوں کے طلبا کے لئے بہت مفید ثابت ہوگی۔

کلیاتِ غواصی - مرتبہ پروفیسر محمد بن عمر مرحوم۔

ناشر ادارہ ادبیات اُردو حیدرآباد دکن۔ ضخامت ۲۰۸ صفحات تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ کتابت اچھی، طباعت اور کاغذ اوسط۔ قیمت چار روپے۔ غواصی گولکنڈے کا ملک الشعرا ہوا ہے۔ یہ کتاب اس کے کلام پر مشتمل ہے۔ اس میں قصیدے، غزلیں، رُباعیاں، نظمیں، مثنویاں، ترکیب بند اور مرثیے درج ہیں۔

تہذیب اور اس کے ہیجانات۔

سگمنڈ فرائڈ کی کتاب سولیزیشن اینڈ اٹس ڈسکنٹنٹس کا اردو ترجمہ پروفیسر احمد سعید صدر شعبہ فلسفہ و نفسیات دیال سنگھ کالج لاہور نے کیا ہے۔

ناشر اردو مرکز لاہور۔ ضخامت ۱۳۰ صفحے۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶۔ قیمت دو روپے چار آنے۔ کتاب کے نام ہی سے کتاب کی اہمیت ظاہر ہے۔ ترجمہ رواں ہے اور عام ترجموں کے نقائص سے بڑی حد تک محفوظ۔

گلی گلی (افسانے) مصنف۔ رام لعل۔

ضخامت ۲۱۲ صفحے۔ کاغذ، کتابت، طباعت اوسط، جلد جلد پوش عمدہ۔

قیمت ۴ روپے۔ ملنے کا پتہ۔ پنچ پبلیشرز۔ سرودی منزل، امین آباد، لکھنؤ۔

اس مجموعے میں رام لعل کے پندرہ افسانے شامل ہیں۔ ان افسانوں میں انھوں نے بڑی خوبی کے ساتھ اپنے گرد و پیش کی زندگی کی عکاسی کی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مشاہدہ بڑا وسیع ہے۔ اور آج کے سماجی اور اقتصادی مسائل پر ان کی گہری نظر ہے۔ ان کا اندازِ بیاں دل چسپ اور سلجھا ہوا ہے۔ (م۔ش)

ویران بہاریں (افسانے) مصنف۔ ستیش بترا۔

ضخامت ۱۸۳ صفحے۔ کاغذ، کتابت وطباعت اوسط۔ جلد جلد پوش عمدہ۔ قیمت تین روپے۔ ملنے کا پتہ۔ پنچ پبلیشرز۔ سرودی منزل۔ امین آباد، لکھنؤ۔

یہ ستیش بترا کے ۱۲ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ستیش بترا اگرچہ افسانہ نگاری کی دُنیا میں تازہ وارد ہیں۔ مگر انھوں نے خداداد صلاحیت اور اپنی محنت سے فن پر کافی قدرت حاصل کرلی ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں حالات و واقعات سے قطع نظر کرداروں کی ذہنی کیفیات کی عکاسی پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ اور یہی ان کے فن کی خوبی ہے۔ (م۔ش)

کچّی دیواریں (ناول) مصنف۔ شاہد کبیر۔

پبلیشرز۔ آہلو والیہ بک ڈپو۔ قرول باغ نئی دہلی۔ قیمت ڈھائی روپے۔

ضخامت ۱۵۱ صفحے۔ کاغذ، کتابت اور جلد اوسط۔

اس ناول میں ایک مثالی داستانِ محبت پیش کی گئی ہے۔ جنم کا اندھا اویناش روپا کے قُرب سے اپنی زندگی کو پُرکیف پاتا ہے۔ روپا اس کے لئے اپنی آنکھیں دے دیتی ہے۔ اویناش کو روشنی مل جاتی ہے۔ اس غم میں کہ اویناش سما کا ہو جانے کے بعد اس کو قبول نہ کرے گا، روپا گھل گھل کر ختم ہو جاتی ہے۔ اور اس طرح محبت کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔ (م۔ش)

موصولات

شفق زار۔ مصنف پرکاش ناتھ پرویز۔ قطعات کا مجموعہ۔ ۴۰ صفحے۔ تقطیع ۳۰×۲۰/۱۶۔ قیمت ۵۰ نئے پیسے۔

تعبیر۔ مرتب سید خورشید۔ سلسلۂ مطبوعات، بزمِ خوبانِ ادب، پشاور۔ انتخابی مجموعہ۔ ۱۸۰ صفحے۔ تقطیع ۳۰×۲۰/۱۶۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

صبح، دوپہر، شام۔ مصنف ستیہ پال آنند۔ اسکیچ ناول۔ ۲۰۰ صفحے۔ ۳۰×۲۰/۱۶۔ قیمت ۳ روپے ۵۰ نئے پیسے۔

پھول مالا۔ مصنف۔ منے آغا ذکی لکھنوی۔ ناشر جعفر رضا جعفر لکھنوی۔ نمبر ۲۳ جگت نرائن روڈ، گولہ گنج، لکھنؤ۔ ذکی صاحب کے کلام کا مجموعہ۔ ۹۶ صفحے۔ تقطیع ۳۰×۲۰/۱۶۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

موجِ کوثر۔ مرتبہ نفیس سندیلوی۔ حضرت مولانا کوثر سندیلوی مرحوم کے کلام کا مجموعہ۔ ۲۰۷ صفحے۔ تقطیع ۳۰×۲۰/۱۶۔ قیمت کتاب پر درج نہیں ہے۔

رگِ سنگ۔ مصنف دانش فرازی۔ سلسلۂ مطبوعات ادارہ منزل، مدراس ۲۔ قطعات کا مجموعہ۔ ۴۶ صفحے۔ تقطیع ۳۰×۲۰/۱۶۔ قیمت ایک روپیہ۔

اردو کا دربار۔ مصنف راجہ محمد شریف بی۔ اے۔ شائع کردہ۔ کل پاکستان انجمن ترقی اردو شاخ جامعہ شرقیہ لائل پور۔ تخلیقی ڈرامہ۔ ۱۰۰ صفحے تقطیع ۳۰×۲۰/۱۶۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے۔

نکہت و نغمہ۔ مصنف ناظر الحسینی۔ پیش کردہ۔ اردو اکیڈیمی ۲۰ گمیدان بگان لین کلکتہ ۱۶ مصنف کے کلام کا مجموعہ۔ ۴۸ صفحے۔ تقطیع ۳۰×۲۰/۱۶۔ قیمت ایک روپیہ۔

مینائے غزل۔ مصنف بشیر فاروق۔ ناشران، مکتبہ لالہ زار، حبیب جون بلڈنگ الفنسٹن اسٹریٹ کراچی۔ مصنف کے کلام کا مجموعہ ۱۹۲ صفحے۔ تقطیع ۳۰×۲۰/۱۶ قیمت تین روپے۔

رازِ حیات۔ مصنف شاد گکراوی۔ ملنے کا پتہ نظامی بک ایجنسی بدایوں۔ یو۔پی۔ مصنف کا مجموعہ کلام۔ ۷۲ صفحے۔ تقطیع ۳۰×۲۰/۱۶ قیمت ایک روپیہ چار آنے۔

احاطے۔ مصنف احمد عظیم آبادی۔ ملنے کا پتہ۔ ۴۵۔ ٹاٹا اسٹیٹ جمشید پور۔ ۵۔ مصنف کا مجموعہ کلام۔ ۴۴ صفحے۔ تقطیع ۳۰×۲۰/۱۶۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے

رسالے

اردوئے معلّٰی 'غالب نمبر' دلّی یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کا یہ تحقیقی مجلہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے مرتب کیا ہے۔ پہلا شمارہ 'غالب' سے متعلق تحقیقی مضامین کے لئے وقف کیا گیا ہے۔ زیرِ نظر شمارے میں مولانا امتیاز علی عرشی ڈاکٹر اشرف، حضرت نیاز فتح پوری اور قاضی عبدالودود کے مضامین کے علاوہ بہت معلوماتی اور تحقیقی مضامین خود ڈاکٹر فاروقی کے قلم سے شائع ہوئے ہیں۔ پرانی مطبوعات اور اخباروں کے حوالوں سے فاروقی صاحب نے غالب کا سکۂ شعر، خمسۂ غالب، قصیدۂ غالب، ترجمۂ غالب کے عنوانات کے تحت مفید معلومات درج کئے ہیں۔

غالب اور بے صبری کے عنوان سے فاروقی صاحب نے تلامذۂ غالب' مصنفہ مالک رام کے مندرجہ چند تسامحات کی تصحیح بھی فرمائی ہے۔ کاغذ، کتابت طباعت عمدہ، تصاویر بھی شامل رسالہ۔ رسالہ $\frac{18 \times 22}{8}$ کے ۱۶۰ صفحوں پر مشتمل ہے۔ قیمت تین روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی دہلی۔

نقوش 'پطرس نمبر' مرتب محمد طفیل، ادارۂ فروغ اردو لاہور۔ قیمت سات روپے۔ ضخامت ۶۴۰ صفحات۔ پروفیسر احمد شاہ بخاری پطرس کی مشہور شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ وہ انگریزی کے ایک قابل پروفیسر، اردو کے بے مثل ادیب اور نقاد اور ایک سنجیدہ سیاست داں تھے۔ انھوں نے جس شعبۂ حیات میں قدم رکھا وہیں کامیابی حاصل کی۔ ایسے ذہین اور طبّاع لوگ کم پیدا ہوتے ہیں۔ اس شمارے میں ان کی شخصیت سے متعلق کم وبیش ۴۳ مضامین شامل ہیں۔ جن میں میرٹھ ولڈسے لے کر محمد طفیل تک ہر قسم کے صاحب ذوق لوگ ملتے ہیں۔ بیشتر ان میں ایسے ہیں جو پطرس کے رفیق رہے ہیں۔ اور انھوں نے اس باغ و بہار شخصیت کی صحبت سے فیض اٹھایا ہے۔ رسالے میں تخلیقات پطرس کے تحت منظومات، افسانے، ڈرامے، ناولٹ، مزاحیہ مضامین، فنی مضامین تنقیدی مضامین، نیاز مندان لاہور کا سلسلہ، ادب لطیف، دیباچے، سفرنامے، بچّوں اور عورتوں کے لئے، خطوط، پطرس کے مشاہیر، اور تصاویر کے ذیلی عنوانات کے تحت ادب کا بیش بہا خزانہ شامل ہے۔ یہ رسالہ پطرس کے متعلق ایک جامع کتاب بھی ہے اور اس کی تخلیقات کا مجموعہ بھی۔

اٹھارھویں صدی کے آخر میں مغل حکومت

براؤن کے مراسلات کی اشاعت

بھارت کے "نیشنل آرکائیوز" نے "انڈین ریکارڈز سیریز" کے تحت جو تازہ ترین کتاب شائع کی ہے۔ وہ "براؤن کے مراسلات" ہیں۔ اس کتاب میں اٹھارویں صدی کے آخر میں مغل حکومت کے انتشار کی ایک نمایاں تصویر پیش کی گئی ہے۔

یہ نئی کتاب شری کے۔ ڈی بھارگو نے مرتب کی ہے اس میں شاہ عالم کے دربار کی ان سازشوں اور جھگڑوں کی تصویر پیش کی گئی ہے جن کی وضاحت میجر جیمز براؤن نے کی ہے۔ میجر براؤن وہ افسر تھے جنھیں وارن ہسٹنگز نے دربار کی صورت حال کے بارے میں رپورٹ پیش کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ اس کتاب میں اس زمانے میں دہلی اور گرد و نواح کے ابتر حالات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

۱۷۸۲ء میں نجف خاں کی موت کے بعد شاہ عالم کا دربار بچی کھچی طاقت اور اقتدار کے لئے لالچی امراء اور سرداروں کے درمیان جتھہ بندی کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ شہنشاہ خود بہت کمزور تھا اور ان لوگوں اور واقعات پر قابو پانے سے عاجز تھا۔

ان حالات میں وارن ہسٹنگز نے خیال کیا کہ کمپنی کی طرف سے تھوڑی بہت جد وجہد کی بدولت شاید شاہ عالم کا قوت و اقتدار پھر قائم ہو جائے۔ سلطنت کا چراغ گل ہونے والا تھا۔ اس کی حدود سمٹ کر دہلی اور قرب و جوار تک رہ گئی تھیں اور کوئی سیاسی اقتدار باقی نہ رہا تھا۔ لیکن ایک طاقت ایسی تھی جو آخر تک سلطنت کے قبضے میں رہی اور وہ طاقت اس سلطنت کا نام تھا۔ اس کے نام میں ایک جادو تھا اور یہ نام طاقت اور اقتدار کے تمام وسائل کو برانگیختہ کرتا تھا۔ شاہ عالم کو ہندوستان کی سیاست میں ابھی تک ایک اہم مقام حاصل تھا۔ لیکن یہ مقام اس کو اپنے ذاتی اثرات سے حاصل نہ ہوا تھا بلکہ وہ شہنشاہی کی روایات کا مالک تھا۔ اور اس کی ذات ان لوگوں کے لئے کشش کا باعث تھی جو طاقت اور اقتدار کے بھوکے تھے۔

میجر جیمز براؤن کے مشن کی داستان کافی مشہور رہی ہے اور اکثر مورخوں نے اپنی تحقیقات میں براؤن کے اصلی مراسلات سے استفادہ کیا ہے۔

ضروری اطلاع

زائد مصارف کی وجہ سے اس ماہ سے "آج کل" کا چندہ بڑھا دیا گیا ہے۔ شرح چندہ حسب ذیل ہے:-

سالانہ چندہ:-	ہندوستان میں:- سات روپے پاکستان میں:- سات روپے (پاک)
غیر ممالک سے:-	۱۰ شلنگ ۶ پنس یا ڈیڑھ ڈالر
فی پرچہ:-	ہندوستان میں - ۶۰ نئے پیسے پاکستان میں - دس آنے (پاک) غیر ممالک میں - ۱ شلنگ یا ۱۵ سینٹ

قبول شدہ منظومات کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے اس لئے کچھ مدت تک غیر طلبیدہ نظمیں عام طور پر قبول نہیں کی جائیں گی۔



Edited and Published by the Director, Publications Division, Old Secretariat, Delhi—8
and Printed by the Model Press Private Ltd., Delhi.

Regd. No. D-509.

آج کل

اساڑھ شک سمت ۲

جولائی ۱۹۶۰ء

۶۰ نئے پیسے

ترتیب

سرورق :۔ کالی بدریا چھائی
رسالے کی پشت پر۔ پنگھٹ پر

سالانہ چندہ :۔ ہندوستان میں :۔ سات روپے
پاکستان میں :۔ سات روپے (پاک)
غیر ممالک سے :۔ ۱۰ شلنگ ۶ پنس یا ڈیڑھ ڈالر

فی پرچہ :۔ ہندوستان میں ۔ ۶۰ نئے پیسے
پاکستان میں ۔ دس آنے (پاک)
غیر ممالک میں ۔ ۱ شلنگ یا ۱۵ سینٹ

اُردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

مجلسِ ادارت

محمد مجیب — جامعہ ملیہ دہلی
محی الدین قادری زور — حیدرآباد
گوپی ناتھ امن — دہلی
خواجہ احمد فاروقی — دہلی
رحمان راہی — سری نگر
یو، ایس موہن راؤ ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن
جی، این، ایس راگھون ڈپٹی ڈائرکٹر (ایڈیٹوریل)
جی نجا ناتھ ڈپٹی ڈائرکٹر (پروڈکشن)
بال مکند عرش ایڈیٹر (شعبۂ اردو سیکرٹری)
مدیر مسئول

اسسٹنٹ ایڈیٹر :۔ مظفر شاہ

جلد ۱۸ ۔ نمبر ۱۲

اشاڑھ شک سمت ۱۸۸۲
جولائی ۱۹۶۰ء

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر آج کل، اردو اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۸

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ حکومت ہند

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

مُلاحظات

چار بڑی طاقتوں کے سربراہوں کی کانفرنس شروع ہونے سے پہلے ختم ہوگئی، جس کی وجہ سے بین اقوامی تعلقات کی تلخی کچھ زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اس کانفرنس کی ناکامی کے وجوہ پر غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ بڑی طاقتوں کو ایک دوسرے پر کوئی اعتماد نہیں رہا اور ان کی باہمی عداوت عالمی مسائل کے حل کی راہ میں حائل ہے۔ ان حالات سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ صرف بڑی طاقتیں امن کے مسئلہ سے نہیں نپٹ سکتیں۔ یہ کام وہ چھوٹی طاقتیں جو کسی گروہ میں شامل نہیں زیادہ اچھی طرح انجام دے سکتی ہیں۔

اس کانفرنس کی ناکامی سے جو صورت حال پیدا ہوئی ہے اس کی نزاکت کا شدت کے ساتھ احساس کیا جارہا ہے۔ وزیر اعظم پنڈت نہرو اور صدر ناصر کی حالیہ گفتگو کے بعد جو مشترکہ اعلان نکلا ہے اس میں کہا گیا کہ اگر صورت حال کو اور زیادہ خراب ہونے سے نہ روکا جا سکا تو عالمی جنگ چھڑنے کا اندیشہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں امنِ عالم کے استحکام کی کوششوں کو تیز تر کرنے کی ضرورت ہے۔

روس نے یکم مئی کے یو ٹو جہاز کے واقعہ کی بنا پر امریکہ کے جارحانہ رویہ کی سلامتی کونسل میں شکایت کی۔ روس کی یہ قرارداد منظور نہ ہوئی سلامتی کونسل نے ایک اور قرارداد منظور کی جس میں چار بڑی طاقتوں پر زور دیا گیا ہے کہ وہ مشترک مسائل پر جس قدر جلد ممکن ہو ادارۂ اقوامِ متحدہ سے کام لیتے ہوئے دوبارہ گفتگو شروع کریں۔ اس نے یہ بھی اپیل کی کہ تمام حکومتیں اپنے بین اقوامی تعلقات میں طاقت کے استعمال کی دھمکی دینے سے پرہیز کریں، ایک دوسرے کے اقتدارِ اعلیٰ کا احترام کریں اور ایسے اقدام نہ کریں جن سے کشیدگی بڑھے۔

لندن میں دولتِ مشترکہ کے وزرائے اعظم کی کانفرنس ہوئی، جس میں باہمی مفاد کے معاملات پر خاص کر گفت و شنید کی گئی۔ جنوبی افریقہ میں نسلی امتیاز کی جس پالیسی پر عمل کیا جارہا ہے اور اسی کے نتیجے کے طور پر حال ہی میں جس بربریت کا مظاہرہ ہوا۔ اس کی آواز بازگشت یہاں تک پہونچی، وزرائے اعظم نے غیر رسمی گفتگو میں اس پر غور و خوض کیا۔ چناں چہ کانفرنس کے بعد اعلانیہ میں کہا گیا کہ دولتِ مشترکہ کی برادری میں مختلف رنگ و نسل کے ممالک شامل ہیں اور ان ملکوں میں اچھے تعلقات رہنا چاہئیں۔ اعلانیہ میں یہ بھی کہا گیا کہ دولتِ مشترکہ کے تمام ملکوں کا مقصد عالمی امن ہے۔ وہ اس مقصد کے حصول کے لئے ہر ممکن کوشش کرنے کو تیار ہیں اور تمام امن پسند ممالک سے اشتراکِ عمل کرنا چاہتے ہیں۔

روس نے ایک اور مصنوعی سیارہ چھوڑ کر خلائی سفر کی دشواریوں پر قابو پانے کے لئے ایک اور قدم بڑھایا ہے۔ اس سیارہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایک مصنوعی انسان کو بٹھایا گیا جس پر وہ تمام اثرات مرتب ہوں گے جو خلاء کے سفر میں اصلی انسان پر ہو سکتے ہیں۔ اس مصنوعی سیارے کا وزن چار ٹن سے زائد ہے۔ اس سے خلاء میں سفر کرنے والے خلائی جہاز کے لئے راستہ ہموار ہوگیا اور آئندہ اصلی انسان محفوظ طریقے پر خلاء میں بھی جا سکے گا۔ یہ بڑا اچھا تجربہ ہے اور اس سے انسانی معلومات میں بیش بہا اضافہ ہوگا۔

فضا ابنِ فیضی

اک چراغ اور جلایا میں نے

ہونٹ کلیوں کے کھلے روحِ چمن بول اُٹھی
بات شبنم سے جو پوچھی تو کرن بول اُٹھی
گیسوئے شوق کی ایک ایک شکن بول اُٹھی
خال و خط سے مرے رعنائیِ فن بول اُٹھی
جلوۂ فکر کو صد رنگ بنایا میں نے
اک چراغ اور جلایا میں نے

جادۂ غم مرے قدموں میں سکوں پاتا ہے
کون پھولوں سے یہ تلوے مرے سہلاتا ہے
نقشِ عزمِ جواں راہ کو مہکاتا ہے
چہرۂ منزلِ مقصود نکھر آتا ہے
قافلے کو نئی راہوں پہ لگایا میں نے
اک چراغ اور جلایا میں نے

ہر قدم خلدِ صفا خلدِ یقیں ملتی ہے
پاؤں کے نیچے ستاروں کی زمیں ملتی ہے
دل کہیں اور، نظر اور کہیں ملتی ہے
اس سے آگے تو فضا اور حسیں ملتی ہے
ہو کے سرشارِ طلب پاؤں بڑھایا میں نے
اک چراغ اور جلایا میں نے

دیکھ تو شوخیِ آغاز کہاں تک پہنچی
میری تہذیبِ وطن ساز کہاں تک پہنچی
لبِ جمہور کی آواز کہاں تک پہنچی
وقت کی شبنمیں پرواز کہاں تک پہنچی
وقت کو شیوۂ پرواز سکھایا میں نے
اک چراغ اور جلایا میں نے

پی گیا وقت وہ دیرینہ روایات کا رس
نئے ذہنوں میں ہے اب تازہ خیالات کا رس
لب سے غیروں کے بھی ٹپکا ہے مری بات کا رس
بھر کے پیمانوں میں خود اپنے ہی جذبات کا رس
تشنہ کامانِ زمانہ کو پلایا میں نے
اک چراغ اور جلایا میں نے

بزم میں تشنہ لبی کس کی نشہ تاب نہیں
کون سی کشتِ تمنا ہے جو شاداب نہیں
بربطِ زندگی حسرت کشِ مضراب نہیں
کوئی عالم بھی ہو افسوں زدۂ خواب نہیں
گدگدا کر غمِ دوراں کو ہنسایا میں نے
اک چراغ اور جلایا میں نے

زندگی زمزمہ پیرائے سکوں اور سہی
عصرِ حاضر کا یہ بیدار فسوں اور سہی
شمعِ محرابِ نظر، سوزِ دروں اور سہی
موسمِ گل! کوئی تقریبِ جنوں اور سہی — سر آتش کدہ فردوس سجایا میں نے
اک چراغ اور جلایا میں نے

وہ قفس ہے نہ وہ بے بال و پری کی باتیں
پھول ہیں اور نسیمِ سحری کی باتیں
پھر و شبنم میں ہیں پھر ہمسفری کی باتیں
ختم ہیں دورِ پریشاں نظری کی باتیں — دھوپ کو غم کی کیا عیش کا سایا میں نے
اک چراغ اور جلایا میں نے

یہ ہر اک سانس پہ لو دیتی ہوئی شمعِ عمل
انجمن میں یہ تمدن کے منظر تاب کنول
یہ بہکتے ہوئے قوموں کی سیاست کے محل
زندگی ہے کہ جگر کی کوئی بھرپور غزل — وقت کو خوابِ جوانی کا دکھایا میں نے
اک چراغ اور جلایا میں نے

کون یہ نغمہ زناں دیکھئے محفل سے اٹھا
درد ہنستا ہوا آغوشِ غمِ دل سے اٹھا
ہنس پڑی صبح کہ پردہ رُخِ منزل سے اٹھا
شورِ طوفانِ بلاخیز جو ساحل سے اٹھا — موجِ طوفاں کو کناروں پہ سلایا میں نے
اک چراغ اور جلایا میں نے

چھاؤں آفات کی دیکھی ہے گھنی میں نے بھی
کی ہے فرہادِ صفت کوہ کنی میں نے بھی
تازہ کی ہے خلشِ سینہ زنی میں نے بھی
برگِ گل کو کہا ہیرے کی کنی میں نے بھی — مختلف بول میں یہ گیت سنایا میں نے
اک چراغ اور جلایا میں نے

شبنم افروز ہے شعلوں کی وہ برساتوں میں
جو کفِ گل میں ہے کانٹوں کی وہ سوغاتوں میں
صبح کے سینے سے لپٹی ہے جو وہ راتوں میں
روشنی مانگے خضر جس سے وہ ظلماتوں میں — راستہ چشمۂ حیواں کا بتایا میں نے
اک چراغ اور جلایا میں نے

مہکے مہکے یہ مری زلفِ سخن کے سائے
یہ جواں چاندنی یہ نخلِ چمن کے سائے
آنکھیں ملتے ہوئے یہ عہدِ کہن کے سائے
اس کے شاہد ہیں یہاں گنگ و جمن کے سائے — اے خرابات وطن! تجھ کو بسایا میں نے
اک چراغ اور جلایا میں نے

یومِ غالب

خطبۂ استقبالیہ جو ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صدر شعبۂ اردو نے
دہلی یونیورسٹی کے یومِ غالب کے موقع پر پڑھا

عالی جناب ڈاکٹر ذاکر حسین، محترم وائس چانسلر ڈاکٹر راؤ،
عزت مآب سفیرانِ گرامی، خواتین اور حضرات!

میں دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو اور یومِ غالب کی اس تقریب میں آپ کی تشریف آوری پر مسرت اور شادمانی کے جذبات کا اظہار کرتا ہوں اور پوری گرم جوشی اور صمیمِ قلب کے ساتھ آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔

در دل ز تمنائے قدم بوسِ تو شورے است
شوقت چہ نمک دادہ مذاقِ ادبم را

ہماری خوش بختی ہے کہ یومِ غالب کے افتتاح کے لئے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب گورنر بہار تشریف لائے ہیں جو دیدہ ور ادیب، بالغ نظر ماہرِ تعلیم اور ہندوستانی تہذیب کے بڑے دل نواز ترجمان ہیں۔ ان کے ذہن کی جودت، نظر کی بلندی، دل کا گداز اور شخصیت کا جادو ہماری قومی زندگی کا انمول سرمایہ ہے۔

قرباں پاسِ غلط کردۂ خود می دارند
ورنہ یک سرو دریں باغ بانداز تو نیست

انھوں نے جامعہ ملیہ کو اپنے خونِ جگر سے سینچا ہے۔ علی گڑھ کے گمنہ پیکر میں نیا خونِ زندگی دوڑایا ہے اور ہمیں فکر و نظر اور علم و حکمت کے وہ معیار دئے ہیں جو ناقۂ شوق کو منزلِ مراد تک پہونچا سکتے ہیں۔

ان کے یمنِ قدم سے یقین ہے کہ ہمارے کام کا بھی حوصلہ بڑھے گا اور ان کی پسند ہمارا سب سے بڑا انعام اور ان کی ہدایت ہمارے لئے سب سے بڑی سعادت ہوگی۔

میں ان کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر چند جملے اپنے شعبہ کے متعلق عرض کرنا چاہتا ہوں اور وہ اس لئے کہ ان سے وہ گرمیٔ قلب حاصل ہوگی جو مایوسیوں میں امیدوار اور تہی دستی میں دل کو غنی بنا دیتی ہے۔ جو بارِ حیات کو ہلکا کر دیتی ہے، کام کا حوصلہ بڑھا دیتی ہے اور جس کا نتیجہ ہمیشہ 'زکنارِ تو جواں برخیزم' ہوتا ہے۔

حضور والا! ہماری یونیورسٹی کو اس دہلی سے نسبت ہے جو ہندوستان کا قلب و جگر، جمہوریۂ ہند کا دار الخلافہ اور ہماری رنگا رنگ تہذیب کا علامتی مرکز ہے۔ جنت عدن است کہ آباد باد ۔ اس کے علاوہ دہلی ہند آریائی زبانوں کا گہوارہ ہے۔ آریوں، راجپوتوں، ترکوں اور مغلوں کے زمانے سے دہلی اور اس کے گرد و نواح ہی کی بولی ہندوستان کی معیاری زبان رہی ہے۔ اردو کی بنیاد بھی جس بولی پر قائم ہے اس کا تعلق بھی اسی سرزمین سے ہے۔ اس لئے اردو کا اگر کوئی مصدر و ماخذ ہے تو دہلی، مبدء و مخرج ہے تو دہلی، گہوارہ و آشیانہ ہے تو دہلی۔ حاتم سے حالی تک سارے اسالیب یہیں وجود میں آئے ہیں۔ یہاں کے چپہ چپہ پر اردو کی تاریخ لکھی ہوئی ہے۔

ایک ایسے شہر میں جس کو ہندوستانی تہذیب سے اتنا گہرا تعلق ہے ایک ایسے شہر میں جس کو مومن و غالب، ذوق و ظفر اور پروفیسر رام چندر

اور پنڈت کیفی سے اتنی گہری نسبت ہے۔ اس میں اور بالخصوص اس کی یونیورسٹی میں، جو تہذیبی اور علمی ادارہ ہے اردو کی خدمت کے ذرائع اور وسائل پیدا کرنا بہت بڑی نیکی ہے۔ آپ کو یہ معلوم کرکے خوشی ہوگی کہ صدر جمہوریۂ ہند اور دہلی یونیورسٹی کے وزیٹر عالی جناب ڈاکٹر راجندر پرشاد صاحب بالقابہ کے اعلان مورخہ ۹۔ نومبر سنہ ۱۹۵۹ء کی رو سے ہماری دانش گاہ میں اردو کا علیحدہ شعبہ قائم ہوگیا ہے۔ اس اعلان میں ان جاں فروش کوششوں کا پرتو ہے جو ایک نئے معاشرہ کی تعمیر اور ایک نئی تہذیب کے فروغ کے لئے ہمارے ملک میں کی جا رہی ہیں۔ یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ ہماری قومی زندگی کی تشکیل میں تمام عناصر کو یکساں اہمیت حاصل ہے اور اس کی عمارت وسیع اور مضبوط بنیاد پر قائم ہوگی۔ یہ دلیل ہے اس بات کی کہ ہندوستانی سماج برابر کثرت میں وحدت کو تلاش کر رہی ہے اور وہ لالہ و گل و نسترن سب ہی کے رنگوں کو اپنی آنکھوں میں جگہ دینا چاہتی ہے۔

ہمارے لئے یہ بات بھی بڑے فخر کی ہے کہ یہ کام شعبۂ ہندی کی خوش دلی، امداد اور تعاون سے ہوا ہے اور ان رفیقوں نے ہمارے کام کو ایک اہم تہذیبی قدر سمجھ کر اس میں اعانت کی ہے۔

شعبۂ اردو کے قیام کے سلسلہ میں عالی جناب ڈاکٹر وی کے آر، وی راؤ وائس چانسلر دہلی یونیورسٹی نے جو کوششیں کی ہیں وہ ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ ان کی ذات گرامی، ادب اور تہذیب کی بہترین اقدار کی مظہر ہے اور وہ نئے ہندوستان کی تہذیبی ترقی کے لئے جدید ہندوستانی زبانوں کے فروغ اور حسن اختلاط کو ضروری سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر راؤ اس نکتہ سے بھی رمز شناس ہیں کہ ہندوستان کی گوناگوں کثرت کے اندر وحدت کا جو باریک رشتہ ہے وہ عارفوں کے وجدان، فلسفیوں کی فکر اور فن کاروں اور شاعروں کے تخیل ہی کی مدد سے زیادہ وسیع، مضبوط اور پائیدار بنایا جا سکتا ہے۔ ان کا یہ احسان دہلی پر اور ہماری آئندہ نسلوں پر ہے۔

اس وقت ہمارے شعبہ کی عمر تین مہینے اور اٹھارہ دن ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تھوڑی سی مدت میں کوئی بڑا علمی کام پیش کرنا ناممکن ہے۔ آپ تعلیمی اور تحقیقی کاموں کے درد سے آشنا ہیں ان میں تعجیل پر سرسوں نہیں جمتی۔ کام کو برسوں پر اور بہت سے منصوبوں پر پھیلانا ہوتا ہے اور جب بنیادیں نیچی رکھی جائیں تو عمارت کا جلد نظر آنا بھی ممکن نہیں۔

تاہم میں چند بنیادی مقاصد کی طرف چشم سخن سے اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ ہماری خواہش یہ ہے کہ اردو کا مطالعہ جدید ہند آریائی زبانوں کے ساتھ ہو۔ اور اس کے مرقع کو ہندوستانی تہذیب کی محراب پر آراستہ کیا جائے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اردو کی جڑیں ہماری گنگا جمنی تہذیب میں دور تک چلی گئی ہیں اور وہ شورسینی اپ بھرنش کا ورثہ ہے جو ہمیں بارھویں صدی کے قریب ملا ہے۔ ہندوستان میں چودہ بڑی قومی زبانیں ہیں جن کے پاس لائق فخر ادبی دولت ہے ان میں اردو بھی شامل ہے بلکہ اس اعتبار سے اردو سب سے ممتاز مقام رکھتی ہے کہ ہندوستان کی کوئی دوسری زبان سرکاری زبان یعنی ہندی سے اتنی قریب نہیں جتنی اردو ہے۔ اردو اور ہندی کے ۷۵ فی صدی الفاظ و اسما مشترک ہیں۔ اس کے ضمائر اور حروف ایک ہیں۔ اصول و قواعد ایک ہیں۔ دونوں کا مبدأ و مخرج ایک ہے۔ دونوں نے ایک ہی ماں کے پیٹ میں پاؤں پھیلائے ہیں۔ یہ شرف کسی اور زبان کو حاصل نہیں۔

آزادی سے پہلے دلوں کی تقسیم کی جو نامبارک کوشش کی گئی اس میں ایک بات یہ بھی تھی کہ اردو والوں کا ہندوستان کی دوسری زبانوں سے وہ گہرا تعلق باقی نہیں رہا جو پہلے تھا۔ حالانکہ عبدالرحمن اور امیر خسرو سے لے کر انشا اللہ خاں انشا اور سید طالب علی بلگرامی رس نایک تک سب ایک سے زیادہ زبانوں کے عالم تھے اور ان کی تخلیقات میں کئی زبانوں کی توانائی تھی۔

حضور والا! ہندوستان کے چمن زار میں بہت سے خوش رنگ پھول ہیں۔ اس کی تزئین و آرائش صرف ایک پھول سے نہیں ہو سکتی۔ ہم اردو کا رشتہ جدید ہند آریائی زبانوں اور اپنی رنگا رنگ تہذیب سے جوڑنا چاہتے ہیں اس لئے کہ سوال ان تہذیبی منطقوں کو ختم کر دینے کا نہیں بلکہ ان میں زیادہ ارتباط اور ہم آہنگی پیدا کرنے کا ہے۔

اس وقت اردو کی تعلیم کا انتظام دہلی کے سات کالجوں میں ہے اور ان میں طالب علموں کی تعداد ایسی ہے کہ اس کی نظیر دہلی کی تاریخ میں نہیں۔ لیکن ہم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی بنیاد تحقیقی کام پر اٹھانا چاہتے ہیں۔

پچھلے پانچ سالوں میں ہمارے یہاں سے تین پی ایچ ڈی کے مقالے منظور ہو چکے ہیں جن کو ہندوستان کے مشاہیر اہل علم نے متفقہ طور پر سراہا ہے۔

اردو شاعری میں ہندوستانی تہذیب کے عناصر

اردو اور پنجابی کا لسانیاتی رشتہ

میسور میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء ٹیپو سلطان کے زمانے سے ۱۹۴۷ء تک

اس وقت آٹھ ریسرچ اسکالر کام کر رہے ہیں۔ ان کے بھی موضوعات ایسے ہیں جن سے انشاء اللہ ہندوستانی کلچر کی بصیرت اور معرفت میں اضافہ ہوگا۔

جناب والا! آپ سے زیادہ اس حقیقت کا محرم اور کون ہوگا کہ ہمارے بیش قیمت مخطوطات یورپ کی لائبریریوں کی زیب و زینت ہیں

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارا

غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

میں نے اپنے یورپ کے قیام میں بعض نایاب اور نادر مخطوطات کے عکس حاصل کئے ہیں اور خدا کا شکر ہے کہ ہم ڈاکٹر راؤ، وزارت تعلیم اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی امداد و اعانت سے اس قابل ہو گئے ہیں کہ ان کو تعلیقات اور حواشی کے ساتھ اور ایک پلان کے تحت شائع کر سکیں۔ اس سلسلہ کی پہلی کتاب انشاء اللہ جلد منظر عام پر آ جائے گی۔

دوسرا کام جو ہم کر رہے ہیں وہ دہلی کے دبستان Delhi School of Urdu Literature کی چند اہم شخصیتوں پر Monographs کی تیاری ہے۔ اس کام کو بھی ہم تہذیبی تقاضوں کو سامنے رکھ کر کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے کہ سماج کا حال فرد کا سا ہے۔ اس کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ اس کی الگ صبح و شام ہوتی ہیں۔ اس کو کچھ چیزیں وراثت میں ملتی ہیں کچھ گرد و پیش سے حاصل ہوتی ہیں۔ ان سب کا اس طرح جائزہ لینا کہ مرکز و محیط کا فرق مٹ جائے اور نفس اجتماعی کے ساتھ تخیل اور جذبہ کے نقش و نگار بھی سامنے آ جائیں از بس ضروری ہے۔ اس کے علاوہ ادبستان دہلی کی شخصیتوں پر دہلی کی آب و ہوا اس کی سرزمین لاحقہ و عارضہ، اشجار و انہار، جمادات اور نباتات کا اثر ان کی شاعری اور لب و لہجہ پر بہت گہرا پڑا ہے اور ان کی آب و گل میں یہ طبعی خصوصیتیں کچھ اس طرح سرایت کر گئی ہیں کہ ان کے اسالیب الفاظ و محاورات اور انداز فکر کو اسی تہذیبی پس منظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اس سلسلے کا پہلا مانوگراف پروفیسر رام چندر پر ہوگا جو قدیم دلی کالج کی بڑی ممتاز شخصیت تھے۔

شعبۂ اردو کے علیحدہ قیام کے بعد اس ضرورت کو بڑی شدت سے محسوس کیا گیا کہ کوئی رسالہ ایسا ہو جو اردو کو ہندوستانی تہذیب اور ادب کے مرقع میں سجائے۔ اردو زبان و ادب کے متعلق تحقیقی اور تہذیبی مضامین شائع کرے اور اہل اردو کو ہندوستان، ایشیا اور یورپ کی دوسری زبانوں کی تخلیقات سے روشناس کرائے۔ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی طرف سے 'اردوئے معلیٰ' کا اجراء ان ہی مقاصد کے پیش نظر ہوا ہے جس کا غالب نمبر ابھی تھوڑی دیر میں وائس چانسلر ڈاکٹر راؤ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی خدمت میں پیش کریں گے ـــــ

شاہاں یہ شاہاں دہند ـــــ

ڈاکٹر صاحب قبلہ! اس صحیفۂ یادگار کو پیش کرتے ہوئے مجھے شرم محسوس ہوتی ہے۔ یہ بہت ہی حقیر کام ہے لیکن کبھی کبھی یوسف کی خریداری کی کوشش ایک سوت کی اٹیا سے بھی کی جاتی ہے۔

اسی طرح شعبۂ اردو کے جن منصوبوں کا میں نے ذکر کیا ہے ان کی اہمیت کے ساتھ مجھے اپنے وسائل اور ذرائع کے محدود ہونے کا بھی شدید احساس ہے۔ لیکن اردو کی خدمت ایک سرمایۂ سعادت ہے جو ہم تہی دستوں تک پہنچا ہے۔ اگر ہم اس نیکی کے فروغ دینے میں کچھ بھی مدد کر سکے تو یہ خدائے کریم کی بخشش خاص ہوگی۔ اپنی بے ہنری اور کم مائیگی کا بھی احساس ہے لیکن دل میں لہو کی ایک بوند اور تھوڑی سی آشفتگی ہے جو اس جہد حیات میں بہت بڑا سہارا ہے۔ اگر یہ شاخ آرزو برومند

ہوگئی اور ہم اپنے حلقہ میں دید و دریافت اور تنقید اور تحقیق کا صحیح ذوق پیدا کر سکے تو یہ اردو کی اور ہندوستانی تہذیب کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔

اردوئے معلیٰ کی ابتداء غالب سے کرنا نہایت مبارک اور مستحسن ہے۔ ان دونوں میں ہے بھی صدف و گوہر یا جسم و جان کا سا تعلق۔ لیکن ہماری یہ خواہش ہے کہ نئے ادب کا خمیر اس طرح اُٹھایا جائے کہ اس میں ماضی کے لایق رشک ورثہ کو سمو دیا جائے اور ادبی تاریخ کی روایتیں اس میں بندھ جائیں۔

یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم ماضی کے صحت مند عناصر کو پہچانیں اور دید و دریافت سے کام لے کر اس کی صحیح قدر و قیمت متعین کریں۔ لطیفہ کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ

بعض حلقوں میں یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ غالب کو اپنے زمانے کا بہت بڑا صوفی اور درویش دل ریش ثابت کیا جائے۔ حالانکہ وہ فارسی خطوط جن کو پہلی دفعہ اس نمبر میں شائع کیا جا رہا ہے ان میں غالب صاف صاف حضرت غمگیں کو لکھتے ہیں ۔۔

حضور میں سپاہی زادہ ہوں۔ میرے اجداد صحرانشین ترک تھے۔ میری کل قابلیت بس اس حد تک ہے کہ ایک دو مصرعے موزوں کر لیتا ہوں اور ایک دو گُر ہر فن کے یاد کر رکھے ہیں۔ مجھ کو تصوف سے کیا علاقہ اور درویشی سے کیا نسبت۔ واللہ میرا حال اس سے زیادہ نہیں کہ وجودِ باری تعالیٰ کی وحدانیت اور یکتائی اور دیگر اشیا کی عدمیت میرے دل پر منقوش اور مرتسم ہے۔ نہ ریاضت اور مجاہدہ۔ اس عاصی کی ہمت ایک یا دو پیمانہ شراب پر منحصر ہے۔ رات کو پی کر بے خبر سو جاتا ہوں۔ نہ دین سمجھتا ہوں اور نہ دنیا۔ اللہ بس باقی ہوس۔"

یہ اعتراف تو خداوند کے سامنے تھا۔ اب دیکھئے خدا کے حضور میں عرض کرتا ہے:۔

حسابِ مے و رامش و رنگ و بو — ز جمشید و بہرام و پرویز جو
کہ از بادہ تا چہرہ افروختند — دلِ دشمن و چشمِ بد سوختند
نہ از من کہ از تابِ مے گاہ گاہ — بدریوزہ رُخ کردہ باشم سیاہ

مجھے غالب کی جو ادا سب سے زیادہ پسند ہے وہ ان کی بشریت اور اس پر فخر و ناز ہے۔ وہ خود فرماتے ہیں:

خوئے آدم دارم آدم زادہ ام

ان کی عظمت کا راز ان کی دل کش انفرادیت انسان دوستی اور آفاقیت میں پوشیدہ ہے۔ انھوں نے کبھی اپنی شخصیت پر تہ بہ تہ نقاب نہیں ڈالے اور پردہ کے نقش و نگار کو حقیقت باور نہیں کرایا۔ وہ جیسے ہیں اپنے آپ کو ظاہر کرتے ہیں۔ "ہر چہ می نمایم ہستم"۔ یہی بے باک صداقت مہذب رندی، سنجیدہ ظرافت اور تصوف اور تجربہ کی تازہ کاری ہے جو اردو ادب کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ اور اسی لئے ضروری ہے کہ ان کی یاد سے برابر دل کو روشن رکھا جائے۔

غالب رسم و رواج اور تقلید کے پابند نہیں ہیں۔ شیخ و برہمن ان کی نظر میں ایک ہیں۔ ان کے یہاں اصل چیز عقیدہ سے وفاداری ہے۔ ملتیں اہم نہیں ہیں ان کے مٹنے سے جو ایمان بنتا ہے وہ اہم ہے۔ ان کی انسانیت کے دائرے میں دیر و حرم اور زنار و تسبیح کا فرق مٹ جاتا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"میں تو بنی آدم کو مسلمان ہو یا ہندو یا نصرانی عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں۔"

ان کے دوستوں میں ہندو بھی ہیں مسلمان بھی۔ کاشانۂ دل کے ماہِ دو ہفتہ مرزا ہرگوپال تفتہ بھی، نورِ چشم میر مہدی اور انگریز بھی۔ جن میں کوئی ان کا امید گاہ تھا کوئی دوست کوئی یار اور کوئی شاگرد۔

مرزا غالب نے جس وقت ہوش کی آنکھ کھولی مغلیہ سلطنت کی شمع ٹمٹما رہی تھی۔ لارڈ لیک کی فوجیں دلی تک پہنچ گئی تھیں۔ انگریزی نظم و نسق قائم ہو چکا تھا اور شہنشاہ عالم و عالمیان کی حکومت قلعۂ معلیٰ تک رہ گئی تھی۔ پُرانا نظامِ حیات درہم برہم تو ہوتا رہا لیکن نیا وجود میں نہیں آیا۔ پُرانی قدریں مضمحل ہو ہو کر ختم تو ہونے لگیں لیکن نئی وجود میں نہیں آئیں۔ اس وقت نقش جادہ ناپیدا تھا اور زندگی منزل و محمل سے بے نیاز تھی۔

اس شکست و ریخت کے زمانے میں جب موج خوں ہمارے سر سے گزر رہی تھی مرزا غالب نے دل میں سرور اور آنکھوں میں نور پیدا کیا۔ انھوں نے زندگی کی تکلیفوں پر رنجیدہ ہونے کے بجائے اس کا ایک حوصلہ

ایک ہمت عطا کی اور نئے نظام اور نئے زمانہ کی اس وقت تائید کی جب سرسید کو بھی اس کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔

غالب سے پہلے اردو شاعری کے پاس جذبات تھے، احساسات تھے۔ زبان و بیان کے کرشمے تھے لیکن وہ حسین اور شوخ ذہانت نہیں تھی جو پیکرِ الفاظ میں روح پھونک دیتی ہے۔ یہ مرزا کا عطیہ ہے۔ انھوں نے ہمیں نئے خیالات دئے۔ ان کے ادا کرنے کا ایک نیا اسلوب دیا اور سوچنے کے لئے حکیمانہ انداز اور جانچنے کے لئے تنقیدی شعور۔ اس طرز میں متین قلم کی شگفتگی ہے، اس کا پرمعنی اختصار ہے۔ اس کا نہ کانہ بانکپن ہے۔ یہ انداز و اسلوب حال اور مستقبل دونوں کے لئے اہم ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ دیوانِ غالب کا ترجمہ چینی اور انگریزی زبانوں میں ہو رہا ہے اور یومِ غالب' اب ایشیا اور یورپ کے مختلف ملکوں میں منایا جاتا ہے۔ آج بھی کابل ریڈیو سے ایک خاص پروگرام غالب کے اعزاز میں نشر کیا جائے گا۔ اس سے قبل ایران کے "تالارِ فردوسی" میں غالب کی نوّے سالہ برسی کا جشن منایا جا چکا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو نے بھی ہمارے "یومِ غالب" کو ریکارڈ کرنے کا ارادہ کیا ہے جس کے لئے وہ شکریہ کے مستحق ہیں۔

ہمارا ارادہ ہے کہ سنہ ۱۹۶۹ء میں غالب کی صد سالہ برسی منائیں اور اس موقع پر غالب کی اردو نظم و نثر کو ایک مجلّہ میں بہت خوبصورت شائع کریں اور اس تقریب میں ان تمام ملکوں کا تعاون حاصل کریں جو اس مرتبہ تنگیٔ وقت کی وجہ سے شریک نہیں ہو سکے اور ان تہذیبی نمائندوں کا بھی تعاون وسیع پیمانے پر حاصل کریں جنھوں نے اس موقع پر کرم فرمایا ہے۔

آخر میں ایک مرتبہ پھر میں آپ حضرات کا پوری گرم جوشی کے ساتھ خیر مقدم کرتا ہوں۔

مَتے آغا قزلباش کی

غزل

سوزشِ زخمِ دل بڑھی بھی نہیں — ہاں مگر درد میں کمی بھی نہیں

اُٹھ رہی ہے یہ کیوں گھٹا پہ گھٹا — ہم نے توبہ ابھی تو کی بھی نہیں

چشمِ ساقی کی گردشیں توبہ — پی لی جی بھر کے اور پی بھی نہیں

مجھ سے تو ماسوا محبت کے — اور کوئی خطا ہوئی بھی نہیں

اُن کے آنے کی کیا کریں اُمید — اب تو تاروں میں روشنی بھی نہیں

دل کے مٹنے کا جان جانے کا — غم نہیں ہے مگر خوشی بھی نہیں

کروٹیں لے رہا ہے پروانہ — شمعِ محفل ابھی جلی بھی نہیں

کیا ہوا کس لئے خموش ہیں آپ
بزم میں آج تو ذکی بھی نہیں

اینش کمار

قصّۂ درد سُناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم

ہماری بستی میں ایک افسانوں کی مجلس ہے جسے 'بزمِ ادب' کہتے ہیں۔ اس کے حسبِ معمول ایک سیکرٹری ہیں، اچھے خاصے پہلوان۔ ادب اسے پہلوانوں کا ویسے تو بس پتے کا بیر ہوتا ہے مگر یہ سچ مچ سیکرٹری ہیں۔ بدقسمتی سے یونیورسٹی میں نوکر ہیں اور میرے گھر کے قریب ہی رہتے ہیں۔ ایک دن راستہ میں روک لیا اور کہنے لگے۔ "سنا ہے آپ کو شعر و شاعری کا شوق ہے۔"

"کہاں سے سُنا ہے آپ نے؟" میں نے سہم کر پوچھا۔

"آپ کے دوستوں سے، آپ کے شاگردوں سے۔"

"یہ خبر کسی دشمن نے اڑائی ہوگی۔"

"آپ کسرِ نفسی کرتے ہیں۔"

"کسرِ نفسی! واہ صاحب۔ شعر لکھنا بھی کوئی فخر کی بات ہے۔ یہ تو ایک دبا ہے مجھے بھی تیس پینتیس سال ہوئے چمٹی تھی۔ ڈفرنشل کیلکولس کے تمام فارمولے بھلا دئے۔ پھٹے ہوئے کپڑے، بکھرے ہوئے بال۔ بانگِ درا بغل میں دبائے نیو ہوسٹل کی تیسری منزل پر چکر لگایا کرتے تھے .... عجیب آدمی ہیں آپ بھی۔ کیسی یادیں تازہ کرادیں۔ دفتر سے آرہا تھا۔ بھوک لگی ہوئی تھی۔ آپ نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ خود تو پہلوان ہی بنے رہیں گے اور ہمارا تمام دن، تمام رات ہفتہ بھر وہ گت بنے گی جو تیس سال پہلے بنا کرتی تھی۔ اس وقت کم از کم شعر لکھ کر تو دل بہلا لیا کرتے تھے۔ کہاں سے لائیں گے ہم وہ ماحول اور وہ جوانی کی غیر ذمہ دارانہ روشیں .... آپ بزمِ ادب کے سیکرٹری ہیں یا ہنگامہ خیز بلیس۔

معلوم ہوتا ہے دفتر میں آپ کو کچھ کام نہیں۔ ابھی سوچ رہا تھا کہ فزکس ڈیپارٹمنٹ کے تیسرے پنجسالہ پلان کے دوران میں ضرورت کے مطابق پورے دو کروڑ روپیہ کہاں سے آئے گا۔ کہ آپ نے وہ آگ لگائی کہ بجھائے نہ بنے۔ مشکل سے شاعری سے چھٹکارا پایا تھا۔ اب تو تخلص بھی بھول چکا ہوں۔ چھپن سال کا سن۔ تیس سال کی متواتر گورنمنٹ سروس۔ جانتے ہو، گورنمنٹ سروس کیا ہوتی ہے۔ تمام شیخی اور شوخی کا کچومر نکال دیتی ہے۔ شعر و سخن — یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے — اب تو اتنی بھی جرأت نہیں کہ کہہ سکیں 'رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے!'

سیکرٹری صاحب میری طرف دیکھ رہے تھے اور متحیر تھے کہ کس بلا کو چھیڑ لیا۔ 'یوں راگ سے جیسے باجا' والا معاملہ معلوم ہوتا ہے۔ ظاہراً کیسے سنجیدہ آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ ایک معزز عہدے پر ممتاز ہیں۔ پُررعب شکل بنا رکھی ہے۔ کسے معلوم کہ ان کے اندر کیا ہنگامے برپا ہیں۔ کتنے ایسے مرحلوں سے گذر چکے ہیں 'ایک افسانۂ رنگیں ہے جوانی سے'۔ لیکن اب تو 'ایسی لگتی ہیں جیسے خواب کی باتیں'۔

شام کو کھانا بالکل نہ بھایا۔ کچھ بیوی سے خفا ہوئے کچھ بچوں کو ڈانٹا۔ رات جوں توں کاٹی۔ صبح سر تھام کر جب بیٹھے تو جی چاہا کہ دفتر سے چھٹی لے لیں۔ لکھ دیں کہ رات کو نیند نہیں آئی۔ لیکن صاحب بہادر کیا کہیں گے۔ سائنس دان ہیں۔ جذبات پر قابو ہے۔ انھیں کیا معلوم کہ 'ہر اک تارِ بستر خارِ بستر' کیا ہوتا ہے۔ نیند نہیں آئی۔ چھٹی چاہیئے کیسی غیر معقول بات ہے۔ ادھر خیال آیا کہ اگر آج ہم دفتر نہ گئے تو

بے چاری فزکس لیبارٹری کا کیا بنے گا جس پر پونے دو کروڑ روپیہ خرچ ہونا ہے۔ آنے والی نسلیں کیا کہیں گی۔ ایک سیکرٹری کی نادانی کی وجہ سے ایک دوسرے سیکرٹری کو ایک رات نیند نہ آئی اور ہندوستان چاند کے تعاقب کی دوڑ میں پیچھے رہ گیا۔ حبِّ وطن نے زور مارا اور جھٹ سے تیار ہو کر دفتر پہنچ گئے۔

میز پر ایک چھپا ہوا کارڈ پڑا تھا جس پر اُسی سیکرٹری کا نام کولرج کا ایلبٹراس یاد آ گیا۔ کہیں نہیں چھوڑے گا کم بخت۔ آج ہی صاحبِ بہادر سے کہیں گے کہ اس دفتر میں ایک ہی سیکرٹری رہ سکتا ہے۔ دیکھا تو دعوت نامہ تھا۔ جان میں جان آئی۔ سنیچر کے روز چائے پر مدعو کیا گیا تھا۔ نہیں ہم چائے پر نہیں جائیں گے۔ نہیں، نہیں جائیں گے۔ نہیں جائیں گے ہرگز نہیں جائیں گے۔ اتنا سوچتے سوچتے ہم فزکس لیبارٹری کی تعمیر میں مصروف ہو گئے۔

دو دن بعد ہی سنیچر وار آ پہنچا اور ہم صاحب موصوف کے گھر پر وارد ہوئے۔ ڈرائنگ روم میں چند احباب پہلے سے ہی موجود تھے۔ مستورات بھی تھیں۔ تعارف شروع ہوا۔ پہلے مجھے پیش کیا گیا اور پھر۔۔۔۔۔ یہ ہیں پریذیڈنٹ بزمِ ادب۔ زمین نیچے سے نکل گئی۔ ابھی سنبھلنے نہ پایا تھا کہ پریذیڈنٹ صاحب نے میرؔ کا ایک شعر پڑھ دیا۔ انھیں کیا معلوم کہ "یاں تو اک مصرع میں پہلو سے نکل جاتا ہے دل۔"

آگے۔۔۔۔۔۔ صاحب کی باری آئی۔ انھوں نے اُلٹے میری تعریف کرنا شروع کر دی۔ شاعر کی حمد و ہجو دونوں خطرناک ہوتی ہیں۔ دونوں سے خوب واقف ہوں۔ غصہ تو بہت آیا اور جی چاہا کہ بھاگ نکلوں مگر چائے کی بلّوری پیالیاں سامنے دھری تھیں اور ان پر چمچوں کی جھنکار۔ یہ ایک ایسی ترغیب ہے جس کا میں کبھی مقابلہ نہیں کر سکا اور پھر مستورات کے سامنے بزدلی دکھانا ایک مرد کے شایاں نہیں۔

تعارف کا سلسلہ جاری ہُوا۔ جناب۔۔۔۔ صاحب۔۔۔۔ جناب ۔۔۔۔۔ صاحب۔ کوئی تخلص چھوڑا بھی ہے ان شاعروں نے۔ سات اختر ہیں، چھ شاد ہیں، چھ شمس اور چھ بسمل۔ آزاد، بیتاب اور ظفر پانچ پانچ ہیں۔ حسن، رضا، سحر، شوق اور نسیم چار چار۔ علیٰ ہذا القیاس۔

اتنے میں ہمارے لئے بھی چائے کی پیالی آ گئی۔ مجمع میں اضافہ ہونا شروع ہوا۔ گفتگو ٹولیوں میں بٹ گئی اور ہلکی ہلکی دھیمی باتیں ہونا شروع ہو گئیں۔ اتنے میں ایک کونے سے آواز آئی

رند کرتے نہیں گناہ زاہد   جتنے پرہیزگار کرتے ہیں

اتنا کہنا تھا کہ شعرا کے خون نے جوش مارا اور ان کے ہاتھ جیب میں رکھے کاغذ کے پُرزوں، نوٹ بکوں اور ڈائریوں پر جا پڑے۔

پھر کیا تھا۔ وہی ہوا جو ہوا کرتا ہے۔ مصرع طرح تھا ع

اک پُر فریب شام لباسِ سحر میں ہے

مصرع طرح، مشاعرے کی غزلیں، پرانی یادیں پھر تازہ ہونے لگیں ع

مجھ کو بیمار کیا تجھ کو مسیحا کر کے

یہی تھا نا مصرع طرح۔ ۱۹۲۴ء کے کسی مہینے کی کسی شام کو جب میں نے پہلے پہل مشاعرہ میں شرکت کی تھی۔ حکم تھا کہ مقررہ تاریخ کے پانچ بجے شام تک تمام غزلیں تیار ہو جائیں۔

کیا غزل بھی کوئی اچکن ہے جو حسب وعدہ معین وقت پر تیار ہو جائے۔ لیکن جب دن آیا بیسیوں غزلیں تیار تھیں۔ کتنا آسان ہے مشاعرے کی غزل لکھنا۔ ردیف مسیحا لیں لکھتے جاؤ، دریا، قطرہ، صحرا، دنیا، عقبیٰ، کعبہ، لیلےٰ، سودا، فردا، چرچا، لالہ، زیبا، صہبا، رُسوا۔ اور آگے بڑھو تو اوجِ ثریّا، زلفِ چلیپا، چاہے چار صفحے لکھ ڈالو۔ سب شاعرانہ الفاظ ہیں۔ پھر دیکھو کہ بیمار اور مسیحا کی طرح کون سا لفظ کس کے ساتھ موزوں ہے۔ قطرہ کو دریا کر کے، معنے ہوں یا نہ ہوں، مشاعرے کی محفل میں سر دھنیں گے۔ لیلےٰ کو محمل سے جوڑ دو۔ لالہ کو صحرا سے۔ کراس ورڈ پزل ہے اردو شاعری۔ متعدد شاعرانہ الفاظ ہیں اور شاعرانہ استعارے۔ تربت، آنسو، گل و بلبل، شمع و پروانہ، شیریں فرہاد، شیخ و برہمن، رند و زاہد، ساقی، نشیمن ۔۔۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔

ہم نے بھی تو اسی طرح غزل لکھی تھی اس دن۔ کچھ یاد نہیں۔ صرف ایک ہی شعر یاد ہے جس پر مجلس میں خوب ہنگامہ مچا۔ سر دھنے گئے، دستِ تحسین بلند ہوئے۔ واہ واہ کے نعرے لگے۔ "کیا خوب شعر ہے"۔ "مکمل شعر ہے صاحب"، "معشوق کی سنگدلی کا نقشہ"، "کیا کہنے"۔ "غضب کر دیا"۔ تین چار دفعہ شعر پڑھنا پڑا۔ اب تو اُسے اپنانے میں بھی ہچکچاہٹ ہوتی ہے۔ یہ تھا وہ شعر ؂

تجھ کو یوں بزم میں جل جانے سے کیا ملتا ہے
شمع نے پوچھا یہ پروانے کو رُسوا کر کے

کیا ہے اس شعر میں ، چند الفاظ ہیں - بزم ، جل جانا ، شمع پروانہ ، رُسوا اور اُن کی تُک بندی - سچ پوچھیے - جب میں نے یہ شعر لکھا کسی قسم کی بے اعتنائی یا سخت دلی کا تجربہ میرے دل میں نہیں تھا - دماغی کاوش کا نتیجہ تھا جو لفظوں کے ہیر پھیر کرنے میں ہوتی ہے - استعارہ تو سینکڑوں سالوں سے بار بار کھیلا جا چکا ہے اور مرنے میں نہیں آتا -

مشاعرے کی شاعری سے اس کا ماحول زیادہ دل کش ہوتا ہے - شعر تو وہی داد پاتے ہیں جو سطحی ہوں اور لفاظی میں رہیں - گہرائیوں میں جانے کی کسے فرصت ہوتی ہے - جہاں تیس چالیس غزلیں ہر مضمون پہ ہر لہجہ میں کہی جاتی ہوں وہاں کوئی کیا کاوش کرے اور کیا جذب - سامعین دلجوئی کے لئے آتے ہیں درس کے لئے نہیں -

کئی قسم کے خیالات دل میں گزر رہے تھے کہ ...... صاحب نے پُر ترنم شعر برسانا شروع کر دیا - پھر کیا تھا - جھڑی لگ گئی - ایک کے بعد دوسرا ، پھر تیسرا - دو غزلے ، سہ غزلے - ایک طوفان برپا ہوا - تمام مجلس لطف سے جھوم رہی تھی - مستی کا عالم تھا - کیا کہا گیا کچھ یاد نہیں -

' حرفوں سے حرف کٹ گئے فردِ گناہ میں ' دو گھنٹے تک دھما چوکڑی مچی رہی - اتنا ضرور یاد ہے کہ شعر جتنا دروغ آمیز ہوتا تھا اتنا ہی زیادہ تحسین کا مستحق - کون تھا وہ شاعر جس نے اپنے عقیدہ کی حقیقت کا یقین دلانے کے لئے کہا تھا - ع ' جھوٹ جو اشعار کا زیور ہے وہ ان میں نہیں ' - اردو شاعری میں جھوٹ ہی اشعار کا زیور سمجھا جاتا ہے - بیچارے افلاطون کا کیا قصور تھا کہ اس نے اپنی ریپبلک میں شاعر کو اس لئے جگہ نہ دی کہ وہ جھوٹ کہتا ہے - حقیقت بیان نہیں کرتا نقل پیش کرتا ہے -

اردو شعراء کی اصطلاح میں جھوٹ کا ایک نام شوخی ہے - خدا سے شوخی ، واعظ و زاہد سے شوخی ، شیخ و برہمن سے شوخی - جس دن ابلیس نے بغاوت کا علم بلند کیا اس دن شاعر کا جنم ہوا - بار بار خدا کو للکار کر دعوے کرتا ہے کہ دنیا میں نہ صرف سوز بلکہ رنگینی بھی جن پہ شاعر پلتے ہیں میری وجہ سے ہے تیری وجہ سے نہیں -

می تپد از سوزِ من خونِ رگِ کائنات

تو بہ بدن جاں دہی شور بجاں من دہم   تو بہ سکون رہ زنی - من بہ تپش رہبرم

جبرئیل کو مخاطب ہو کر آپ فرماتے ہیں کہ تمہارا عالم

' کس قدر خاموش ہے یہ عالمِ بے کاخ و کُو '

اور میرا عالم ' سوز و ساز و درد و داغ و آرزو و جستجو '

اور آگے

گر کبھی فرصت میسّر ہو تو پوچھ اللہ سے   قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو

شاعر نے نہ صرف ' سوز و ساز و درد و داغ و آرزو و جستجو ' ہی ابلیس سے سیکھا ہے بلکہ شیخی اور شوخی بھی - ابلیس نے ہی تو پہلے پہل نافرمانی اور گستاخی سکھائی تھی - پھر کیا تھا ؎

مجھ کو پیدا کر کے اپنا نکتہ چیں پیدا کیا

نقش ہوں اپنے مصوّر سے گلا رکھتا ہوں میں

تو شب آفریدی چراغ آفریدم ...... وغیرہ وغیرہ

علامہ تو یہاں تک کہہ گئے ؏   می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندے دگر

ایک شاعرِ گستاخ کا منہ کون بند کر سکتا ہے -

واعظ و زاہد سے گستاخی بھی اردو شاعری میں ایک فیشن ہے - گستاخی پر داد ملتی ہے شعر پر نہیں - اسی شعر نے ان تمام شعراء کو بھڑکایا تھا

رند کرتے نہیں گناہ زاہد   جتنے یہ پرہیزگار کرتے ہیں

اگر اکبر الہ آبادی کہے

ناتجربہ کاری سے واعظ کی یہ باتیں ہیں

اس رنگ کو کیا جانے پوچھو تو کبھی پی ہے

تو سمجھ میں آ سکتا ہے - وہ تو ظریف تھے اور کچھ کچھ شاعر بھی - یہاں تو غالب اور اقبال بھی اسی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں

غرورِ زہد نے سکھلا دیا ہے واعظ کو

کہ بندگانِ خدا پہ زباں دراز کرے

اقتباس فضول ہے - اردو شاعری کا بیشتر حصہ زہد کی مذمت پہ ہی مشتمل ہے جسے شاعری کی انتہا سمجھا جاتا ہے حالانکہ اس میں سوائے ہزار بار دہرائی ہوئی شوخی کے اور کچھ نہیں ہوتا -

جھوٹ کا دوسرا نام مبالغہ ہے - مبالغہ شعر کی جان سمجھا جاتا ہے جتنا زیادہ مبالغہ اتنا قیمتی شعر - شاعر جب آہ بھرتا ہے تو تمام کائنات کے

تختے" الٹا دیتا ہے۔ 'چرخ کیا اور چرخ کی اوقات کیا'۔ جب آنسو بہاتا ہے تو طغیانی سے حضرت نوح بھی نہیں بچ سکتے۔ شاعر کا نالہ وہ بگولہ ہے۔ 'جس نالے سے شگاف پڑے آفتاب میں'۔ اس کے معشوق کے پاؤں اتنے نازک ہیں کہ 'اُٹھا سکتے نہیں رنگِ حنا کو' اس کی تصویر اس لئے نہیں کھچوائی کہ 'چہرہ نہ کہیں عکس کے بدلے اُتر آئے'۔ اس کے کمر تو ہے ہی نہیں 'خدا جانے ناڑا کہاں باندھتے ہیں'۔ اکبر الہ آبادی کی حسبِ معمول ظرافت ملاحظہ ہو۔

مغرب نے خوردبیں سے کمر اُن کی دیکھ لی

مشرق کی شاعری کا مزا کرکرا ہوا

غلو کسی حد تک پُر لطف ضرور ہوتا ہے۔ مشاعرے کے شعر بھی پُر لطف ہوتے ہیں۔ ان میں شعریت کتنی ہوتی ہے یہ اور بات ہے۔ مشاعرے میں ترنم ہوتا ہے۔ شاعر کی شخصیت ہوتی ہے اس کی حرکات ہوتی ہیں اور سامعین کی نرالی ادائے تحسین۔ ایک ایسا ماحول ہوتا ہے جسے دلجوئی کا بہترین ذریعہ شمار کیا جائے۔ کبھی کوئی اچھا شعر بھی سننے میں آتا ہے ورنہ وہی تشبیہیں اور ان تشبیہوں کا وہی استعمال۔ صرف الفاظ کے سلسلے کا ادل بدل ہوتا ہے۔ بلبل روتی ہے اور گل بے اعتنائی سے خاموشی اختیار کئے رکھتا ہے۔ پروانے کا جلنا عاشق کی قربانی کی انتہائی حد ہے۔ فرہاد کی کوہ کنی سے کہیں بڑھ کر۔

تشبیہ شعر کی جان ضرور ہے۔ لیکن تشبیہ فردہ نہیں ہونی چاہیئے۔ یہاں تو تشبیہ رسم بن چکی ہے۔ دماغ سے نکلتی ہے دل سے نہیں۔ اس کی تہ میں حس نہیں ہوتا، تجربہ نہیں ہوتا، شخصیت نہیں ہوتی۔ شعر شاعر کا اپنا نہیں ہوتا۔ صرف اسی کے ساتھ منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ سودا کا شعر ذوق کا شعر ہو سکتا ہے اور ذوق کا شعر انشاء کا۔ غالب سے پہلے صرف میر ہی ایک شاعر ہے جس کے کلام میں شخصیت پائی جاتی ہے۔ جہاں ہم کہہ سکتے ہیں کہ فلاں شعر میر کا ہے اور کسی کا نہیں ہو سکتا۔ غالب اقبال، حالی میں انفرادیت ہے۔ اکثر اردو شاعری کا تو وہی حال ہے جو انگریزی ادب میں اٹھارھویں صدی کے کلاسیکی شعراء کا تھا۔ وہی گھسی پٹی ہوئی بے جان تشبیہیں، وہی 'شاعرانہ' الفاظ کا شوق۔

شعر میں تجربہ اور شخصیت کا احساس تبھی ہوتا ہے جب شاعر تشبیہوں کا مالک ہو ان کا غلام بن کر نہ رہ جائے۔ میر غلام نہیں، غالب غلام نہیں، اقبال غلام نہیں۔ غالب کا شعر غالب کا شعر ہے اور دور سے پہچانا جاتا ہے۔ اقبال نے تمام پرانی تشبیہیں استعمال کی ہیں۔ درجنوں ہر ایک صفحہ پر موجود ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ تشبیہ ہی اقبال کی شاعری کا سب سے قیمتی جوہر ہے لیکن اقبال نے ان میں نئی جان ڈال دی ہے۔ نئے رنگ میں ڈھالا ہے۔ ہر قسم کے مضامین میں ان کو کھینچا ہے جس سے نہ صرف مضمون پر نئی روشنی پڑی ہے بلکہ تشبیہوں میں بھی نئی روح۔ موجودہ تعلیم کی بابت کہتا ہے ؎

گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما

لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ

شکوہ کی مجبوری یوں بیان کرتا ہے ؎

نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں

ہم نوا میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں

ہندوستان کی پھوٹ کا نتیجہ بربادی ہے ؎

نشانِ برگِ گل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گلچیں

تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں

کہاں تک اقتباسات پیش کئے جائیں۔ تشبیہ اقبال کے ہاتھ میں گیند کی طرح کھیلتی ہے۔ ہمارے اکثر شعراء تو گیند کے پیچھے ہی بھاگتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی اقبال بھی نہ بچ سکا۔ مصرع ملاحظہ ہو ع

ٹپک اے شمع آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے

ٹپک، شمع، آنسو، پروانہ شاعری کے سب پرزے موجود ہیں۔ شعر نہیں ہے۔

مشاعرہ ایک تفریحِ طبع کی بزم ہے جس میں میں اکثر شریک ہوتا ہوں اور گھنٹوں محظوظ رہتا ہوں۔ لیکن جب وہی نظمیں کتابی صورت میں سامنے آتی ہیں تو وہ بات نہیں ہوتی ان کا مشاعرہ پن اُڑ جاتا ہے اور باقی کھوکھلی نظر آتی ہیں۔ نظم وہ ہے جو بار بار پڑھی جا سکے اور جتنی پڑھی جائے اتنی پُر لطف ہو۔ کیٹس کی اوڈز بار بار پڑھی جاتی ہیں اور باسی نہیں ہوتیں۔ اقبال کا 'فلسفۂ غم' یا 'شمع و شاعر' کبھی بے لطف نہیں ہوگی۔

غزل کی ایک کمزوری یہ بھی ہے کہ ایک شعر کا دوسرے شعر سے تعلق نہیں ہوتا۔ ایک شعر میں شاعر ہجر کے غم میں مبتلا ہے تو دوسرے میں شراب کے نشہ میں چور اور تیسرے میں گل و گلزار کی رعنائیوں میں مست۔ یہاں تک کہ ہر ایک شعر دوسرے شعر سے مختلف اور اکثر متضاد ہوتا ہے کیونکہ وہ دماغی کاوش کا نتیجہ ہے کسی تجربے پر مبنی نہیں۔ جذباتی تجربہ تو بیک وقت ایک ہی قسم کا ہوتا ہے۔ ماتم اور شادی دونوں سے لگاؤ نہیں رکھتا۔

تشبیہ شعر کی جان ہے بذات خود شعر نہیں۔ غالب کا یہ شعر دیکھئے

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

کیا ہے اس شعر میں۔ سادہ سا ہے۔ تشبیہ کے تصنع سے قطعی مبرا ہے۔ بچوں کا سا لگتا ہے۔ ہر ایک شعر گو سمجھتا ہے کہ اس نے سینکڑوں ایسے شعر لکھ ڈالے ہیں یا بے سمجھے کر لکھنے سے گریز کیا ہے۔ آسمان کیا ہے، زمین کیا ہے، انسان کیا ہے۔ مان لیا کہ یہ فلسفے کے بنیادی اور پیچیدہ سوالات ہیں جن کا ابھی تک حل نہیں مل سکا۔ لیکن ان میں شعریت کیا ہے۔ کون سی انوکھی بات ہے جس کے لئے غالب کی تعریف کی جائے۔ ایسے شبہات اُن لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں جو شعر کی اصلیت کو نہیں جانتے۔ جو سمجھتے ہیں کہ شعریت خیال یا تصور میں ہے۔ کیسا انوکھا خیال ہے، کیا گہرائی ہے اس شعر میں صاحب، کہاں پہنچ گئے ہیں آپ۔ ایسے کلمات تحسین اکثر سننے میں آتے ہیں۔ شعریت خیال کا تمتع نہیں ہے۔ گو خیال کا تمتع بھی ایک اچھی نظم کا جزو ہے۔ شعریت صوتی مٹھاس نہیں۔ گو صوتی مٹھاس بھی اس کا جزو ہے خیال کا تمتع فلسفہ ہے۔ صوت کی مٹھاس موسیقی ہے۔ شعریت فلسفہ اور موسیقی دونوں کا مرکب ہے۔ شعریت الفاظ ہیں۔ کولرج نے ڈیڑھ سو سال ہوئے کہا تھا۔ شعریت الفاظ ہیں، بہترین الفاظ بہترین سلسلہ میں۔ الفاظ کیا ہوتے ہیں یہ سمجھنا بھی کون آسان کام ہے۔

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ لغت اٹھاؤ اور لفظ کے معنی دیکھ لو اور بس۔ سائنس اور حساب میں بلاشبہ لفظ یہی مقام ہوتا ہے آکسیجن ایک گیس کا نام ہے۔ نفع قیمت خرید پر قیمت فروخت کی زیادتی کا نام ہے۔ قدم آگے بڑھانے کا نام چلنا ہے۔ سائنس دان لفظوں کو معنوں کی ترجمانی کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اس کا مقصد معنوں کا صحیح اظہار ہے۔ اسے کچھ غرض نہیں کہ کن کن الفاظ میں اور کس زبان میں وہ اظہار ہوتا ہے سائنس کی کتاب ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کی جاتی ہے اور اسے کچھ ایذا نہیں پہنچتی۔ شاعری کی یہ حالت نہیں۔ شاعری وہی الفاظ ہیں جن میں شعر ادا ہوا ہے۔ سادہ سے سادہ شعر اپنی شخصیت رکھتا ہے جو انہیں الفاظ سے پیدا ہوتی ہے۔

Whence have flowers & verdure sprung ?

What is cloud ? What is air ?

کیا یہ غالب ہے کیا یہ شعر ہے۔ خیال کا تمتع یا غیر تمتع وہی ہے۔ تصور بھی وہی۔ اور نہ اس سادہ شعر میں کوئی تشبیہی یا معمولی تعلق ہے جس میں ترجمہ کی مشکل پیش آئے جو مثال کے طور پر ایسے اشعار میں پیش آتی ہے۔

نالۂ بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
ہم نوا میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں

اردو اور فارسی کے علاوہ کون سی زبان ہے جو ہمنوائی، بلبل کی نالہ سنجی، گل کی خاموشی میں جو صدیوں کی شاعرانہ روایات اور جذبات پوشیدہ ہیں ان کی ترجمانی کر سکے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا

یہ اردو یا قدرے فارسی کا شعر ہے۔ اردو زبان کا جزو ہے۔ اس کا جدا کرنا اتنا مشکل ہے جتنا قالب کا جان سے۔ ذرا اس چھوٹے سے پنجابی مصرع کو دنیا کی کسی زبان میں ترجمہ کر دیجئے تو جانوں — شالا جوانیاں ماڑیں۔ تین عام فہم الفاظ ہیں کوئی تشبیہ نہیں۔ کوئی شاعرانہ لفظ نہیں۔ لیکن کس قدر زور ہے، خلوص ہے، درد و اثر ہے ان لفظوں میں۔ جو ترجمہ کرنے سے اڑ جاتا ہے۔ پھول جڑ سے اکھڑ جاتا ہے۔ جو دروازہ کھل سم سم سے کھلتا ہے۔ وہ کھل گندم یا کھل جو سے نہیں کھلتا۔ شعر کے الفاظ میں بھی اسی قسم کا جادو ہے جو تبدیلی برداشت نہیں کر سکتا۔ ملاحظہ ہو یہ مصرع

ڈولی چڑھدیاں ماریاں ہیر چیکاں مینوں لے چلے بابلا لے چلے وے۔

عام فہم مصرع ہے جسے ہر ایک رکشا ڈرائیور گاتا پھرتا ہے۔ کچھ فلسفہ نہیں کچھ خیالات کی گہرائی نہیں، کچھ تصور کی بلندی نہیں، کچھ تشبیہوں کی

جدت نہیں ۔ لیکن کچھ جادو ہے اس مصرع میں، جو تڑپا دیتا ہے ۔ جو سینکڑوں بار دہرانے کے باوجود اسے تازہ رکھتا ہے ۔ ذرا اس مصرع کی اصلیت ملاحظہ ہو ۔

ڈولی ۔ کون سی زبان ڈولی کا ترجمہ کر سکتی ہے کچھ عرصہ کی بات ہے کہ ایک انگریز دوست جو پنجابی زبان سے اچھی خاصی واقفیت رکھتے تھے ، پوچھنے لگے ڈولی کیا ہوتی ہے ؟ دس منٹ کی کوشش کے باوجود میں ان کو کوئی حقیقی تصور نہ دے پایا اور آخر کہہ دیا کہ کسی شادی کے موقع پر دکھاؤں گا ۔ لیکن لاہور میں تو ان دنوں بھی دُلھن کو لے جانے کے لئے موٹر کا عام رواج ہو چکا تھا اور میں اپنا وعدہ پورا نہ کر سکا ۔ کون سمجھ سکتا ہے ڈولی چڑھنے کو جس نے پنجابی شادی کا نقشہ نہیں دیکھا ۔ ڈولی چڑھنے کا پنجابی زبان سے چولی دامن کا ساتھ ہے ۔ دُلھن اب موٹر میں سوار ہوتی ہے ۔ لیکن ہم اس رسم کو اب بھی ڈولی ہی کہتے ہیں ۔

ہیر ۔ ایک عورت کا نام ہے ۔ کیا یہ کسی عورت کا نام ہے ۔ جب ہم ہیر کا لفظ بولتے ہیں تو صرف ایک پنجابی ہی جانتا ہے کہ اس کے دل میں کیا جذباتی تاثرات پیدا ہوتے ہیں ۔ رومانی کیفیتوں کی ایک رستیخیز اُبھرتی ہے ۔ راج کماری بھی ایک عورت کا نام ہے ۔ راج کماری کہنے سے آپ کے دل میں کچھ نہیں ہوتا ۔ لیکن اگر یہ آپ کی ہمشیرہ یا والدہ یا بیوی کا نام ہو تو صرف ایک عورت کا نام نہیں رہتا کچھ جذباتی سا لفظ بن جاتا ہے ۔ اور اگر راجکماری ایک ایسی عورت ہو جس کے پاس ______________

' آ کے بیٹھے بھی نہ تھے ہم کہ نکالے بھی گئے ' تب اس لفظ کے بولنے سے ایک ہنگامہ سا برپا ہو جاتا ہے ۔ ہیر پنجابی زبان کا حصہ ہے ، پنجابی ماحول کا حصہ ، پنجاب کی رومانی تاریخ کا حصہ جسے پنجاب کا ہر فرد بشر محسوس کرتا ہے ۔

چیکاں ۔ اس مصرع کا مرکزی لفظ ہے ۔ میرے انگریز دوست جنھوں نے دو سال رومانی محبت کے بعد شادی کی تھی اس مصرع کی حقیقت تک نہ پہنچ سکے ۔ انگریز دُلھن چرچ سے برفانی سفید لباس میں ملبوس گلدستہ ہاتھ میں لئے مسکراتی ہوئی نکلتی ہے اسے حقیقی خوشی ہوتی ہے اُسے کیا معلوم کہ شادی کے موقع پر چیکاں کیسے نکلتی ہیں ۔ ذرا اُن کم سن بچیوں سے پوچھئے جو والدین کے گھرانوں کی چوکھٹ سے پہلی بار ہمیشہ کے لئے جدا ہوتی ہیں ۔ ان کے والدین سے پوچھئے ۔ عجیب نظارہ ہوتا ہے ۔ سخت سے سخت دل پگھل جاتے ہیں ۔

ہُنے چلے ۔ ہمیں سمجھ سکتے ہیں ۔ نئے چلے کیا ہوتا ہے ۔ انگریز عورت جاتی ہے لے جائی نہیں جاتی ۔ لیکن پنجابی عورت اور خاص کر ہیر کے وقت کی پنجابی عورت ' میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں ' کچھ سال ہوئے بیک وقت دو قسم کی اٹھنیاں رواں تھیں ۔ ایک چاندی کی اور دوسری نکل کی ، ایک چلتی تھی ، ایک چلائی جاتی تھی ۔ معاف کیجئے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ پنجابی عورت نکل کی اٹھنی ہے ۔

بابلا ۔ باپ ، باپو ، پیو ، بابل ، بابلا ہم معنی الفاظ ہیں لیکن باپو اور بابل میں زمین آسمان کا فرق ہے ۔ جیسے بھرا اور ویر میں ۔ اور یہاں تو بابلا میں ایک لے جائی جاتی ہوئی لڑکی کی درد بھری پکار ہے جس میں مٹھاس ہے ، پیار ہے ، جادو ہے ، پیارا سا لفظ ہے کوئی اور لفظ اس کی جگہ نہیں لے سکتا ۔ کھل سم سم والا معاملہ ہے ۔

' ہُنے چلے ' کا دہرانا جذباتی ہیجان میں ایک لا محدود اضافہ کر دیتا ہے الفاظ کا دہرانا بھی شاعر کا ایک ہتھیار ہے جس سے وہ کئی کام لیتا ہے ۔ مختلف قسم کے تاثرات پیدا کرتا ہے ۔ ملاحظہ ہو

' نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب ' کیسی حسرت ہے اس کے دہرانے میں

یہ شعر ملاحظہ ہو جو صرف دہرانے سے ہی شعر بن گیا ہے ؎

اے محتسب نہ پھینک ارے محتسب نہ پھینک ظالم شراب ہے ارے ظالم شراب ہے

کولرج کو دیکھئے

Alone, alone, all, all, alone
Alone on a wide, wide, sea.

ایک وسیع سمندر میں اکیلا پن ، اس اکیلے پن میں بے پناہ اداسی کا نقشہ کس خوبی سے کھینچا گیا ہے ۔ معمولی چھوٹے چھوٹے الفاظ اکیلے اکیلے کھڑے ہیں ۔

یہ تھے الفاظ ۔ اب ان سے مرکب مصرع کو لیجئے ۔ کیا دردناک نظارہ ہے ۔ ہیر کی حالت ایک عام پنجابی دلھن کی نہیں ہے ۔ اس وقت کا تصور کیجئے جب ایک گاؤں کی پنجابی لڑکی سوائے نزدیکی رشتہ داروں اور سکھی سہیلیوں کی محبت کے وہ بیاہ میں کوئی خوشی نہیں رکھتی تھی جس نے شاید پانچ میل پر دوسرا گاؤں بھی نہیں دیکھا تھا ۔ جھنگ سے رنگ پور کھیڑیاں ، اونٹ کا کجاوہ ایک اجنبی خاندان ، اس وقت کے رواج ، شاید چھ ماہ تک واپس آنا نصیب

نہ ہو اور طرہ یہ کہ ہیر صرف ماں باپ اور سکھی سہیلیوں کی جدائی کے لئے نہیں روہی جیسے ایک عام لڑکی روتی ہے۔ ہیر کیدارے سے شادی کرنا نہیں چاہتی۔ اس کے دل کا مالک اس سے زبردستی ہمیشہ کے لئے چھینا جا رہا ہے۔ وارث شاہ کا یہ سادہ مصرع ہیر کے ٹوٹے ہوئے دل کے ٹکڑوں کا عکس ہے۔ ایک رسمی پکار نہیں ہے۔ ایک مجروح جگر کی چیخ ہے۔ ٹریجیڈی کا کلائمکس ہے۔

یہ ہیں الفاظ جسے شاعری کہتے ہیں۔ معنوی لحاظ سے ان الفاظ کے دو حصے ہیں۔ ایک لفظی جو لغت میں ملتا ہے دوسرا جذباتی یا ماحولی Suggestive or associational جس کی تشریح نہیں ہو سکتی۔ جو شاید ہر ایک کے لئے مختلف ہوتا ہے۔ میرے لئے جس کی پیدائش رنگ پور کھیڑیاں میں ہوئی اور جس نے اس بڑ کے درخت کے نیچے بیٹھے کھیلے ہیں جس کے نیچے رانجھا نے جوگی کے لباس میں آکر دھونی لگائی تھی اور جو سو ہی قدم پر اس پیپل کے درخت کے نیچے گھنٹوں تقریباً ہر روز تاش کھیلتا ہے جہاں ہیر سہیلیوں کے ساتھ پینگ جھولنے آتی تھی۔ ہیر کا لفظ کچھ اور ہی معنی رکھتا ہے۔

لفظ صرف معنوی ہی نہیں ہوتا صوتی بھی ہوتا ہے۔ گل اور پھول کے معنی ایک ہی ہیں۔ گل اپنے اندر ایرانی روایات لئے ہوئے ہے۔ اس کے جذباتی معنے کچھ مختلف ہیں۔ یہ ٹھیک ہے لیکن صوتی لحاظ سے بھی ان دو لفظوں میں فرق ہے۔ جو مٹھاس اور گھلاوٹ گل و بلبل سے پیدا ہوتی ہے پھول اور بلبل سے پیدا نہیں ہوتی۔ بعض ماہر لسانیات تو یہ سمجھتے ہیں کہ اکثر الفاظ کی بنیاد صوتی ہی ہے۔ بڑبڑانا، دھماکا، بھونکنا، آہٹ، کانا پھوسی سینکڑوں الفاظ ایسے ہیں جن کی صوتی بنیاد جھٹ پہنچانی جاتی ہے۔ شیکسپیئر لاکھ کہے کہ نام میں کیا دھرا ہے۔ گلاب کو کسی نام سے پکارو گلاب ہی ہے۔ ذرا روز Rose کو ہپ پا پوٹمس Hippopotamus پکار دو تو پتہ چلے۔ جس نے یہ جانور دیکھا ہے وہی جان سکتا ہے کہ کتنا صوتی اور لسانی ماہر تھا وہ شخص جس نے یہ نام ایجاد کیا۔

صوتی لحاظ سے لفظ نہ صرف انفرادی حیثیت رکھتا ہے بلکہ سماجی بھی۔ وہ ایک مصرع کا حصہ ہے جہاں نہ صرف وہی لفظ استعمال ہو سکتا ہے بلکہ اسی جگہ پر۔ ابھی میں نے بانگ درا کھولی ہے اور پہلا ہی مصرع پڑھا ہے،

پرستش اعمال سے مقصد تھا رسوائی میری

ذرا رسوائی کی جگہ بدنامی، بربادی پڑھیے۔ ایک ہی معنے ہیں۔ سکتہ بھی نہیں پڑتا۔ لیکن شعر ٹھیک کر آسمان سے زمین پر گر جاتا ہے۔ صرف اس لئے نہیں کہ پرستش اعمال اور مقصد کے ساتھ رسوائی کی فارسیت ہی "جچتی" ہے اور نہ صرف اس لئے کہ دونوں لفظوں میں صوتی لحاظ سے ستارہ اور کیچڑ کا فرق ہے بلکہ اس لئے بھی کہ صوتی لحاظ سے بدنامی مصرع کی روانی (Rhythm) میں کچھ رکاوٹ ڈالتا ہے۔ کولرج نے کہا تھا بہترین الفاظ بہترین سلسلہ میں۔ سلسلہ میں ہی تو روانی ہے۔ ذرا وارث شاہ کے مصرع کو اس طرح پڑھیے ڈولی چڑھدیاں ہیر چیکاں ماریاں کیا ہو گیا ہے۔ ماریاں کا لفظ ایک جگہ سے دوسری جگہ بدل دیا گیا ہے۔ وہی الفاظ ہیں وہی معنی، وہی خیال، وہی تصور۔ لیکن وہ جادو نہیں ہے جسے شعر کہتے ہیں۔ یہ سماجی حیثیت لفظ کا چوتھا حصہ ہے۔ شاعری میں لفظ ایک شہری کی حیثیت رکھتا ہے جس کے لئے ضروری ہے کہ اپنے ہمسایوں سے مل جل کر رہے۔

ان "الفاظ" سے شعر بنتا ہے خیالات سے نہیں، تشبیہات سے نہیں جذبات سے نہیں، موسیقی سے نہیں، فلسفہ سے نہیں۔ گو یہ سب چیزیں الفاظ کا حصہ ہیں۔

اب پڑھیے غالب کے شعر کو

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

چیز کا لفظ معنوی اور صوتی دونوں لحاظ سے غیر شاعرانہ معلوم ہوتا ہے۔ انگلستان کے اٹھارھویں صدی کے شعراء اسی مغالطہ میں پڑے رہے اور سینکڑوں الفاظ کو غیر شاعرانہ قرار دے کر خارج کر دیا۔ لیکن یہ لفظ یہاں دونوں لحاظ سے ایک عجیب کیفیت پیدا کرتا ہے۔ شعر کی جان ہے ذرا ہٹا کر دیکھئے ابر کیا شئے ہے مضحکہ خیز بن جاتا ہے اس لئے کہ شعر الفاظ ہیں وہی الفاظ جو شاعر استعمال کرتا ہے۔

حامد چھپروی

(ایک ایکٹ کا ڈراما)

اقبال فردوس میں حوروں کے درمیان

[فردوس کی فضا نور و نکہت میں شرابور ہے اور اس کی بہار آفرینیوں اور رنگینیوں میں کھویا ہوا ایک بھاری بھرکم بدن کا انسان محوِ خیال ہے اپنے گنگنانے کی آواز آتی ہے ۔ آواز بتدریج بڑھتی جاتی ہے ۔ اچانک چند حوریں آپس میں اٹھکھیلیاں کرتی ، فردوس کی خوش گوار فضا میں محوِ خرام ہیں ۔ یکایک گنگنانے کی آواز سن کر اور اس اجنبی کو فردوس میں اس حالت میں دیکھ کر حیرت سے ایک دوسرے کی جانب دیکھتی ہیں]

حور :- دنیائے آب و گل سے یہاں آنے کے بعد یہ کون شخص ہے جو یہاں بھی متفکر نظر آتا ہے دنیا والے تو ساری عمر "لطف فردوس" اور "وصالِ حور" کی امید پر گذار دیتے ہیں ۔ پھر یہ کون ہے جو یہاں بھی "یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک" کی فکر میں ہے ۔

دوسری حور ۔ بہت زمانہ گذرا یہاں سے آدم و حوا سطحِ ارض پر بھیجے گئے تھے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ انھیں کی ایک اولاد ہے ۔

(حوریں اقبال کے پاس جاتی ہیں)

اقبال ۔ (حوروں کو اپنی طرف آتے دیکھ کر)

نہ کر دیں مجھ کو مجبورِ نوا فردوس میں حوریں
مرا سوزِ دروں پھر گرمیٔ محفل نہ بن جائے

[حوریں سن لیتی ہیں اور اقبال کے پاس آکر نہایت تو بہ شکن ادا سے دیکھ کر پوچھتی ہیں]

حور ۔ کیا تو وہی گستاخ اقبال تو نہیں جس نے ایک مرتبہ اپنا 'شکوہ' بھیج کر آسمانوں میں ایک ہنگامہ پیدا کر دیا تھا ؟

اقبال ۔ اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے ۔

حور ۔ اچھا وہ نہ سہی ! تو ابھی زمین سے آ رہا ہے بتا مظلوم 'حوا' کی بیٹیوں کا دنیا میں کیا حال ہے ؟

اقبال

ہزار بار حکیموں نے اس کو سلجھایا
مگر یہ "مسئلۂ زن" رہا وہیں کا وہیں

دوسری حور ۔ کائنات میں 'وجودِ زن' کی اہمیت کیا ہے ؟

اقبال ۔

'وجودِ زن' سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

حور ۔ اے محترم ہستی ! تو ہر چیز پر غور و فکر کرنے کا عادی ہے ۔ کیا صرف یہی کہہ دینا ہماری جنس کے لئے کافی ہے ؟ 'ایشیائی عورت' ایک عرصہ سے سسک سسک کر اپنی مظلومیت پر آنسو بہا رہی ہے لیکن آج تک کسی ادیب ، شاعر اور مفکر کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ اس کی مجروح و شکستہ زندگی میں تبدیلی لانے کے لئے انقلاب کا پیام دے ۔ ظلم کی حد تو یہ ہے کہ مردوں نے اپنی محفلوں سے ہماری عزیز "حوا" کی بیٹیوں کو "ناقص العقل" کہہ کر نکال دیا ۔ اے محترم شاعر ! اب تو ہی بتا کہ کیا 'ایشیائی عورت' اپنی خرابی کی خود ہی ذمہ دار ہے ؟

اقبال ۔

قصورِ زن کا نہیں ہے کچھ اس خرابی میں
گواہ اس کی شرافت پہ ہیں مہ و پرویں

حور ۔ تو اے مردِ خود مند ! آخر اس کا راز کیا ہے ؟

اقبال۔ اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش
مجبور ہیں، معذور ہیں مردانِ خرد مند

[حوریں اس مفکرِ اعظم کی بے چارگی پر مسکرا دیتی ہیں۔ ایک حور آگے بڑھتی ہے اور اقبال سے سوال کرتی ہے]

حور:۔ اے محترم ہستی! سنا ہے کہ آج کل دنیا میں "حوا" کی بیٹیاں "آزادی" کے لئے جدوجہد کر رہی ہیں۔ جلوت کو خلوت پر ترجیح دے کر گھر کی چار دیواری سے نکلنا چاہتی ہیں اور "سوشل" حیثیت حاصل کرنے میں مصروف ہیں۔ کیا یہ صورتِ حال ایشیائی عورتوں کے لئے خوش آئند ہے؟

اقبال
رسوا کیا اس دور کو جلوت کی ہوس نے
روشن ہے نگہ آئینۂ دل ہے مکدّر
بڑھ جاتا ہے جب ذوقِ نظر اپنی حدوں سے
ہو جاتے ہیں افکار پراگندہ و ابتر
آغوشِ صدف جس کے نصیبوں میں نہیں ہے
وہ قطرۂ نیساں کبھی بنتا نہیں گوہر
خلوت میں خودی ہوتی ہے خودگیر ولیکن
خلوت نہیں اب دیر و حرم میں بھی میسّر
ضمیرِ عصرِ حاضر بے نقاب است
کشادش در نمودِ رنگ و آب است

اس لئے ایشیائی عورتوں کو میرا مشورہ ہے کہ
جہاں تابی ز نورِ حق بیاموز

حور۔ گویا آپ بھی ایشیائی "عورت" کو دنیا کے دیدار کے بدلے گھر کی چار دیواری میں قید رکھنے کے حق میں ہیں۔ آپ کی نظر میں ایشیائی "عورت" کے لئے خلوت ہی جلوت سے بہتر ہے۔

دوسری حور۔ تو پھر "آزادیٔ نسواں" کے متعلق آپ کا کیا ارشاد ہے؟

اقبال۔
اس بحث کا کچھ فیصلہ میں کر نہیں سکتا
گو خوب سمجھتا ہوں کہ یہ زہر ہے وہ قند
کیا فائدہ کچھ کہہ کے بنوں اور بھی معتوب
پہلے ہی خفا مجھ سے ہیں تہذیب کے فرزند
کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ
"آزادیٔ نسواں" کہ زمرد کا گلوبند؟

حور:۔ "زمرد کا گلوبند" یعنی وہ طوقِ غلامی جو بڑی سختی سے آدم کے بیٹوں نے حوا کی بیٹیوں کے گلے میں ڈال رکھا ہے؟ آپ بھی اسی طوقِ غلامی پر ایشیائی "عورتوں" کو راضی و آمادہ رکھنا چاہتے ہیں؟ آپ بھی ایشیائی "عورتوں" پر مردوں کے بے جا تسلط کو جائز قرار دیتے ہیں؟

اقبال۔ بالکل۔

حور۔ کیوں؟

اقبال۔ اس لئے کہ
جوہرِ مرد عیاں ہوتا ہے بے منتِ غیر
غیر کے ہاتھ میں ہے جوہرِ عورت کی نمود
راز ہے اس کے تپِ غم کا یہی نکتۂ شوق
آتشیں لذّتِ تخلیق سے ہے اس کا وجود
کھلتے جاتے ہیں اسی آگ سے اسرارِ حیات
گرم اس آگ سے ہے معرکۂ بود و نبود
اس لئے ع "نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد"

حور۔ میں نے تو سنا تھا کہ آپ "انسانیت" کے بڑے ہمدرد ہیں اس لئے انسانوں میں کسی قسم کی تفریق و تقسیم روا نہیں رکھتے۔

اقبال۔ جس تفریق و تقسیم کو خود خدا نے متعین کیا ہے اس کو کون انسان ہے جو مٹا دے۔ الرجال قوامون علی النساء مرد عورتوں پر ایک غالب اور بالا رہنے والی طاقت ہے۔

دوسری حور۔ آپ تو خود مفکر ہیں۔ غور و فکر کو بڑی اہمیت دیتے ہیں اور لوگوں کو اس کی تلقین بھی کرتے ہیں۔ علم جو غور و فکر کے لئے ضروری ہے اور جسے خود قرآن نے بھی انسان کے لئے ضروری قرار دیا ہے کیا آپ ایشیائی عورت کے لئے اسے ضروری سمجھتے ہیں؟

اقبال۔
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت
بے گانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن
ہے عشق و محبت کے لئے علم و ہنر موت

حُور۔ اے محترم ہستی! آپ یہ بتائیں کہ آپ کی نظر میں ایشیائی عورت کا کیا مقام ہے؟ اس کا کیا فرض ہے؟ اور اس کے لئے آپ کا کیا پیغام ہے؟

اقبال۔
ملت از تکریم ارحام است و بس — ورنہ کارِ زندگی خام است و بس
از امومت گرم رفتارِ حیات — از امومت کشفِ اسرارِ حیات
از امومت پیچ و تابِ جوئے ما — موجِ گرداب حبابِ جوئے ما
آں رخِ رستاق زادے جاہلے — پست بالائے سطبرے بدگلے
نا تراشے پرورش نا دادۂ — کم نگاہے کم زبانے سادۂ
دل ز آلامِ امومت کردہ خوں — گردِ چشمش حلقہ ہائے نیلگوں
ملت ار گیرد ز آغوشش بدست — یک مسلمانِ غیور و حق پرست
ہستیٔ ما محکم از آلامِ اوست — صبحِ ما عالم فروز از شامِ اوست
واں تہی آغوش نازک پیکرے — خانہ پروردِ نگاہش محشرے
فکرِ او از تابِ مغرب روشن است — ظاہرش زن باطنِ او نازن است
بندہائے ملتِ بیضا گسیخت — تا ز چشمش عشوہ ہا حل کردہ ریخت
شوخ چشم و فتنہ زا آزادیش — از حیا نا آشنا آزادیش
علمِ او بارِ امومت برنتافت — بر سرِ شامش یکے اختر نتافت

ایں گل از بستانِ ما نارستہ بہ
داغش از دامانِ ملت شستہ بہ

لالہ گویاں چو انجم بے شمار — بستہ چشم از ظلامِ روزگار
پا نبردہ از عدم بیروں ہنوز — از سوادِ کیف و کم بیروں ہنوز
مضمر اندر ظلمتِ موجودِ ما — آں تجلی ہائے نامشہودِ ما
شبنمے بر برگِ گل ننشستۂ — غنچہ ہائے از صبا ناخستۂ
بر دمد ایں لالہ زارِ ممکنات — از خیابانِ ریاضِ امہات
قوم را سرمایہ اے صاحب نظر — نیست از نقد و قماش و سیم و زر
مالِ او فرزندہائے تندرست — تر دماغ و سخت کوش و چاق و چست
حافظِ رمزِ اخوت مادراں — قوتِ قرآن و ملت مادراں

حُور۔ اے محترم ہستی! عرصۂ دراز سے ظلم و ستم کے تیر و نشتر تو اس نیم جاں کو جاں بلب کرتے رہے۔ تیری اس بات نے تو اور پیچیدگی پیدا کر دی اس لئے اے محترم ہستی تو "ایشیائی عورت" کو زندگی بسر کرنے کے لئے ایک مکمل اور صحیح "ماڈل" عطا فرما۔

اقبال۔ اے فردوس کی حُورو! میں حوا کی بیٹیوں کو زندگی بسر کرنے کا مکمل اور صحیح نصب العین دے کر آیا ہوں۔ وہ "مادر اولادِ آدم" ہے اور تندرست و توانا بچے سے ہی رابطۂ ملّی کو تقویت ہوتی ہے۔ ایشیائی عورتوں کو مریم اور فاطمہ کی زندگی کو اپنا نمونہ بنانا چاہیئے۔

حُور۔ کیوں؟ دنیا میں بہت سی ایسی عورتیں گذری ہیں جنھوں نے ہر شعبۂ زندگی میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ تو پھر مریم اور فاطمہ ہی کی زندگی کو کیوں نمونہ بنایا جائے؟

اقبال۔ اس زمانے کے کورچشم انسان، جو تہذیب اور شرافت کے مدّعی ہیں، درحقیقت راست بازی اور یقین سے کوسوں دُور پڑے ہوئے ہیں۔ ان کی عقل اندھی ہے، دل مردہ ہے، روح بے حس ہے اور یہ کوتاہ نظر صرف مادی کشش ہی میں اُلجھ کر رہ گئے ہیں اس لئے ایشیائی عورتوں کو مریم اور فاطمہ کی زندگی کو اپنا نمونہ بنانا چاہیئے کیونکہ ؎

"مریم از یک نسبتِ عیسیٰ عزیز" اور فاطمہ کی اس لئے کہ ؎

مادرِ آں مرکزِ پرکارِ عشق — مادرِ آں کارواں سالارِ عشق
آں یکے شمعِ شبستانِ حرم — حافظِ جمعیتِ خیر الامم
تا نشیند آتشِ پیکار و کیں — پشتِ پا زد بر سرِ تاج و نگیں
واں دگر مولائے ابرارِ جہاں — قوتِ بازوئے احرارِ جہاں
در نوائے زندگی سوز از حسین — اہلِ حق حریت آموز از حسین
سیرتِ فرزندہا از امہات — جوہرِ صدق و صفا از امہات
مزرعِ تسلیم را حاصل بتول — مادراں را اسوۂ کامل بتول

دوسری حور۔ آپ نے مردوں کو "حیاتِ دوام" کا پیغام دیتے ہوئے "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز" کی تلقین کی ہے لیکن "ایشیائی عورتوں" کو کیا حکم ہے؟

اقبال۔ از سرِ سود و زیاں سودا مزن

حُور۔ سُنا ہے کہ آپ نے آدم کے بیٹوں کو "تقلید" سے انحراف کی تلقین کی ہے۔ اس ضمن میں "حوا" کی بیٹیوں کے لئے کیا پیغام ہے؟

اقبال۔ یہ کہ ؏ گام جز بر جادۂ آبا مزن

ایک حُور۔ میں نے سُنا ہے کہ کسی آسمانی عورت نے زمینی عورت کو پیغام دیا

ہے کہ ―

اے زناں، اے مادراں، اے خواہراں   زیستن تا کے مثالِ دلبراں؟
دلبری اندر جہاں مظلومی است   دلبری محکومی و محرومی است
در دو گیسو شانہ گردانیم ما!   مرد را نخچیرِ خود دانیم ما
مرد صیادی بہ نخچیری کند   گردِ تو گردد کہ زنجیری کند
خود گداز از بہائے او مکر و فریب   درد و داغ و آرزو و مکر و فریب
گرچہ آں کافر حرم سازد ترا   مبتلائے درد و غم سازد ترا
ہمسرِ او بودن آزارِ حیات   وصلِ او زہر و فراقِ او نبات
مارِ پیچاں! از خم و پیچش گریز   زہر ہایش را بخونِ خود مریز

[اقبال مسکراتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ]

اقبال۔ ہاں میں نے بھی یہ پیغام سنا ہے مگر اس سے اس مادرانہ محبت پر کوئی حرف نہیں آتا جس کو میں 'عورت' کے لئے ضروری قرار دیتا ہوں میں نے اس بارے میں عورتوں کو اپنا صحیح مشورہ دے دیا ہے کہ

چہرہ اش روشن دلے بے نور جاں   معنیء او بر بیانِ او گراں
حرفِ او بے سوز و چشمش بے نمے   از سرورِ آرزو نا محرمے
فارغ از جوشِ جوانی سینہ اش   کور و صورت ناپذیر آئینہ اش
بے خبر از عشق و از آئینِ عشق   صعوۂ رو کردۂ شاہینِ عشق
زندگی اے زندہ دل دانی کہ چیست   عشقِ یک بیں در تماشائے دوئی است

مرد و زن وابستۂ یک دیگر اند   کائناتِ شوق را صورت گر اند
زن نگہ دارندۂ نارِ حیات   فطرتِ او لوحِ اسرارِ حیات
آتشِ ما را بجانِ خود زند   جوہرِ او خاک را آدم کند
در ضمیرش ممکناتِ زندگی   از تب و تابش ثباتِ زندگی
شعلۂ کز وے شررہا در گسست   جان و تن بے سوزِ او صورت نہ بست
ارجِ ما از ارجمندیہائے او   ما ہمہ از نقش بندیہائے او
حق ترا داد است اگر تابِ نظر   پاک شو قدسیتِ او را نگر

عورت۔ اے محترم شاعر! تو سارے انسانی نظام ہائے زندگی میں انقلاب لانے کی سعی کرتا رہا لیکن تو نے ایشیائی عورتوں کی مشکلات کی گرہ نہیں کھولی۔ آخر ایسا کیوں ہے؟

اقبال۔ میں بھی مظلومیٔ نسواں سے ہوں غمناک بہت،
نہیں ممکن مگر اس عقدۂ مشکل کی کشود

[عورتیں ایک اندازِ بیزاری کے ساتھ اٹھتی ہیں اور نظریں جھکائے آہستہ آہستہ چلی جاتی ہیں۔ اقبال انھیں جاتے ہوئے دیکھتے رہتے ہیں اور جب وہ نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں تو اپنا مصرع گنگنانے لگتے ہیں
―― یہ اک مردِ تن آساں تھا تن آسانوں کے کام آیا]

― پردہ ― گرتا ― ہے ―

سکندر علی وجد

گہوارۂ مسیح

اے شب چراغ، تجھ سے منوّر دلِ چمن — کھلنے سے تیرے دولتِ کون و مکاں ملی
پُرکیف و دل نواز تبسّم کا شکریہ — تیری مہک سے میرے قلم کو زباں، ملی
خوش قسمتی سے دیدۂ محرومِ دید کو — گلشن میں تیری ہستیٔ راحت نشاں، ملی
کس نے عطا کئے یہ نقوشِ منظر فریب — یہ حُسن، یہ ادا، یہ نزاکت کہاں، ملی
شفّاف چاندنی سے بنی ہے تری قبا — ضو بار پتیوں میں تری کہکشاں، ملی
تاروں کو رشک ہے ترے روئے صبیح پہ — تیری جلو میں روحِ چمن نغمہ خواں، ملی
آغاز ہے شباب کے رنگین دور کا — تجھ کو حسین شب کی دلھن تو جواں، ملی
لیکن ترا لباسِ عروسی کفن بھی ہے — مثلِ حباب کم تجھے عمرِ رواں، ملی
نیرنگِ صبح و شام نہیں ہے ترے لئے — کیوں دو گھڑی کے واسطے تاب و تواں، ملی؟

یوں مسکرا کے چھوڑ نہ بزمِ طرب ابھی
اے ماہِ نو، جوان ہے لیلائے شب ابھی

سفید کیکٹس کا پھول جولائی، اگست اور ستمبر کے مہینوں میں رات کے ابتدائی حصّے میں کھلتا ہے اور صرف چار پانچ گھنٹے اپنے حسن کی بہار دکھا کر صبح سے پہلے مُرجھا جاتا ہے۔ رنگ، ساخت اور خوشبو کی لطافت و نزاکت کے اعتبار سے پھولوں کی دنیا میں اس دولتِ مستعمل کا جواب مشکل ہے۔ اس پھول کی پنکھڑیوں کی اندرونی ترتیب میں بچّوں کے جھولے کی شکل بنتی ہے اس لئے اس کو "گہوارۂ مسیح" بھی کہتے ہیں۔